شیخ ابو نصر سراجؒ
کتاب اللمع
فی التصوف
تصوف کی اولین کتاب کا اولین اردو ترجمہ
یزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ
تصوف فاؤنڈیشن
۱۴۱۹ھ
www.maktabah.org

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ق (القرآن ۶۲:۲)

تزکیۂ نفس اور کتاب و حکمت کی تعلیم

بعثتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقاصد عظیمہ تھے۔
ان ہی مقاصد کے لیے "تصوف فاؤنڈیشن" وقف ہے۔

تصوف فاؤنڈیشن

۱۴۱۹ھ

بانی: ابونجیب حاجی محمد ارشد قریشی
فون ۰۴۲-۷۵۹۹۵۴۳

تصوّف کی اوّلین کتاب کا اوّلین اردو ترجمہ

مصنف

شیخ ابو نصر سراجؒ

(م ۳۷۸ھ)

مترجم

سیّد اسرار بخاری

○

تصوّف فاؤنڈیشن

لائبریری ○ تحقیق و تصنیف و تالیف و ترجمہ ○ مطبوعات

۲۴۹؍ این سمن آباد — لاہور — پاکستان

شوروم : المعارف ○ گنج بخش روڈ ○ لاہور

یکے از مطبوعات تصوّف فاؤنڈیشن

کلاسیک اور اہم کتبِ تصوّف کے مستند اُردو تراجم

ناشر	:	ابو نجیب حاجی محمّد ارشد قریشی بانی تصوّف فاؤنڈیشن ۔ لاہور
طابع	:	زاہد بشیر پرنٹرز ۔ لاہور
سالِ اشاعت	:	۱۴۲۰ھ —— ۲۰۰۰ء
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	۳۰۰ روپے
واحد تقسیم کار	:	المعارف۔ گنج بخش روڈ۔ لاہور، پاکستان

۳ — ۱ — ۰۰ — ۵۰۶ — ۹۶۹ — آئی ایس بی این

○

تصوّف فاؤنڈیشن ابو نجیب حاجی محمّد ارشد قریشی اور ان کی اہلیہ نے اپنے مرحوم والدین اور لختِ جگر کو ایصالِ ثواب کے لئے بطور صدقہ جاریہ اور یادگار یکم محرم الحرام ۱۴۱۹ھ کو قائم کیا جو کتاب و سُنّت اور سلف صالحین و بزرگانِ دین کی تعلیمات کے مُطابق تبلیغ دین، و تحقیق و اشاعت کُتب تصوّف کے لیے وقف ہے۔

فہرست

باب	مضمون	صفحہ

باب	مضمون	صفحہ

باب	مضمون	صفحہ

پیش لفظ

اسلام میں جونہی خلافتِ راشدہ کا مبارک دور ختم ہوا اور اس کی جگہ ملوکیت نے سنبھالی تو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت حکومت سے الگ ہو کر اس کے اخلاقی اور روحانی نظام کی حفاظت پر کمر بستہ ہو کر میدان عمل میں نکل آئی۔ اس بات کا غیروں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اگر اس موڑ پر مسلمانوں کی یہ جماعت اپنا یہ محاذ نہ سنبھالتی تو اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام تباہ ہو جاتا۔ خلافت بظاہر ملوکیت میں تبدیل ہو گئی مگر اسلام کا نظامِ اخلاق وعبادات، فکر وعمل کی پاکیزگی، خدا رسی اور خدمت گزاری اسی شان سے قائم رہی یہ ضرور ہوا کہ پہلے یہ سب کچھ حکومت کے فرائض میں شامل تھا اب بے سروسامان فقرار کی جماعت نے یہ خدمت اپنے ذمے لے لی۔ چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس تبدیلی کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت ومحبت کے محور بھی بدل گئے اب بادشاہ خلفار نہ تھے لوگ رضا کارانہ طور پر اور عقیدت کے ساتھ ان کے احکام کی تعمیل نہیں بلکہ چھڑی کے خوف سے ان کی بات مانتے تھے جب کہ فقرا چھڑی نہ رکھنے کے باوجود لاکھوں لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے لگے تھے۔

ایک ہاتھوں سے دوسرے ہاتھوں میں اسلام کے اخلاقی وروحانی نظام کی اس تبدیلی نے کئی مسائل پیدا کیے۔ سب سے ضروری مسئلہ یہ تھا کہ اس پاکیزہ نظام کو مستقل حیثیت دینے کے لیے پائیدار قدم اٹھایا جائے چنانچہ مشاہیر صوفیا اپنی اپنی جگہ پر اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کی تشکیل وتدوین میں مصروف ہو گئے۔ یہاں یہ اعتراض بالکل لغو ہے کہ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے مزید کسی چیز کی تدوین وترتیب کی کیا ضرورت تھی۔ قارئین سے مخفی نہیں کہ قرآن مجید کے ساتھ

ساتھ حامل قرآن کو بھی مبعوث فرمایا گیا اور ان کی خصوصیات یہ بتائی گئیں کہ وقت اور حالات کے مطابق قرآن مجید کی تشریح و تعبیر اسی ذاتِ گرامی کے سپرد ہے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نباضِ حق کی حیثیت سے بیمار انسانیت کا علاج شروع کیا اور بالآخر آپ نے اسے ایک صحت مند جسم میں بدل دیا۔ بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ اب بھی چند ایسے نفوس قدسیہ ہوں جو حکومت سے الگ رہ کر کسی کا حریف اور حلیف بنے بغیر تزکیۂ نفس اور اخلاقی تربیت کا عظیم الشان ادارہ سنبھالیں اسی ضرورت کے پیشِ نظر صوفیا کرام نے اپنا کام شروع کیا۔

یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ جہاں کہیں اسے خارجی طور پر کوئی دھچکا لگا تو ٹھیک اسی وقت خود اس کے اپنے بطن سے ایک ایسی قوت نے جنم لیا جس نے اسے دوبارہ پہلے سے بھی زیادہ آب و تاب بخش دی۔ خلافت سے ملوکیت کی طرف اقتدار کا انتقال کوئی معمولی بات نہ تھی لیکن اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا اس سے کچھ بھی نہ بگڑا۔

فقرا کی ایک ایسی بے سروسامان جماعت اٹھی جس نے صفا کی چوٹی سے بلند ہونے والے آوازۂ حق کی گونج کو نسیم و صبا بن کر چمنستانِ دھر کے کونے کونے میں پھیلا دیا آج کون اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ دور دراز ممالک میں قلب و نظر کے سومنات کسی گروہ نے فتح کیے تو وہ یہی گروہ ہے جو اپنی درویشی، سادگی، قلب و نگاہ کی عفت اور حسن کردار کی بدولت ہر جگہ توحید خداوندی کی داستانیں رقم کرتا گیا۔

ان خدامست درویشوں نے صرف وعظ و نصیحت پر اکتفا نہیں کی بلکہ انھوں نے اپنے مشن کے اصول و فروع مرتب کرنے میں انتہائی محنت اور ژرف نگاہی سے کام لیا۔ تاریخ کے اوراق ٹٹولنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیا کرام نے دوسری صدی ہجری کے اواخر میں باقاعدہ طور پر تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے انتہائی سادہ اور عام فہم زبان میں کتابیں لکھیں اور قرآن اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ایسے طریقے بتائے جن سے عبادات میں کشش، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں لطف اور زندگی میں ایک حسن اور معنویت پیدا ہو گئی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی کتاب عبداللہ بن المبارک المروزی (م ۱۸۱ھ) نے۔

"کتاب الزہد" کے نام سے لکھی۔ اس میں انھوں نے زہد کے بارے میں احادیث جمع کیں اس کے بعد حارث بن الاسد المحاسبی (م ۲۴۳ھ) نے "الرعایۃ لحقوق اللہ" اور "کتاب التوہم" لکھیں۔ پھر محمد بن علی الحکیم الترمذی نے متعدد کتابیں تحریر فرمائیں اسی طرح محمد بن عبد الجبار النفری (م ۳۵۴ھ) نے "کتاب المواقف" اور "کتاب المخاطبات" اور ابو اللیث نصر بن محمد السمرقندی (م ۳۹۳ھ) نے "بستان العارفین" لکھی۔ یہ ساری کتابیں کسی ایک ایک موضوع سے متعلق اور مختصر تھیں۔ حسن اتفاق سے اسی دور میں قدرت نے اپنی مرضی سے ایک ایسی شخصیت پیدا کردی جس نے تصوف کو زندگی کے لیے جامع دستور العمل قرار دے کر ایسی عدیم النظیر کتاب لکھی جو آگے چل کر تصوف کی بنیادی اور اہم ترین کتاب شمار ہونے لگی۔ یہ شخصیت طاؤس الفقرا ابو نصر سراج رحمۃ اللہ علیہ (م ۳۷۸ھ) کی ہے بعد میں تصوف کی جتنی بنیادی کتابیں لکھی گئیں وہ دراصل کتاب اللمع کی صدائے بازگشت تھیں، اور ان پر کتاب اللمع کی گہری چھاپ موجود ہے ابو نصر سراج نے تصوف کی تمام فکری و عملی تعلیمات کا ماخذ کتاب و سنت کو قرار دیا تھا اس لیے بعد میں بھی وہی کتابیں حلقۂ تصوف میں زیادہ بار پاسکیں جنھوں نے ہُوبہُو یہی انداز اپنایا۔ تصوف کی اُمّہات الکتب کی ترتیب اس طرح قائم کی جاسکتی ہے:

کتاب اللمع فی التصوف،	ابو نصر سراجؒ	م ۳۷۸ھ
التعرف لمذہب اہل التصوف،	ابوبکر الکلاباذیؒ	م ۳۸۵ھ
قوت القلوب،	ابو طالب المکیؒ	م ۳۸۶ھ
طبقات الصوفیہ،	عبد الرحمٰن السلمیؒ	م ۴۱۲ھ
حلیۃ الاولیاء،	ابو نعیم الاصفہانیؒ	م ۴۳۰ھ
الرسالۃ القشیریہ،	ابو القاسم القشیریؒ	م ۴۶۵ھ
کشف المحجوب،	سید علی بن عثمان الہجویریؒ	م ۴۷۰ھ
فتوح الغیب،	سید عبد القادر جیلانیؒ	م ۵۶۲ھ
تذکرۃ الاولیاء،	شیخ فرید الدین عطارؒ	م ۶۲۰ھ
عوارف المعارف،	شیخ شہاب الدین سہروردیؒ	م ۶۳۲ھ

بلاشبہ ان کتابوں میں بعض کتابیں مضامین کی بلندیٔ افکار کی رفعت اور عالمانہ حیثیت میں کتاب اللمع سے بڑھ گئی ہیں مگر یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیئے کہ انھیں اصل لائن کتاب اللمع نے ہی دی ہے اس لیے اس کا الفضل للمتقدم کا حق اپنی جگہ محفوظ ہے اور اس میں کوئی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

صاحبِ کتاب

آپ کا نام نامی عبداللہ بن محمد بن یحییٰ، ابو نصر سراج اور لقب طاؤس الفقرا تھا، طوس میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں معروف تھا۔ آپ کے ابتدائی حالات نہیں ملتے، عبدالرحمٰن السلمی نے تاریخ الصوفیہ میں مختصر حالات لکھے ہیں۔ تذکرۃ الاولیاء غالباً پہلی کتاب ہے جس میں نسبتاً تفصیلی حالات ملتے ہیں۔ اس کے بعد نفحات الانس اور شذرات الذہب میں بھی تھوڑے بہت حالات مل جاتے ہیں، آپ نے اپنے وقت کے مشہور علماء سے علم حاصل کیا ان میں جعفر الخلدی (م ۳۴۸ھ) ابوبکر محمد بن داؤد الدّقی (م ۳۶۰ھ) اور احمد بن محمّد السائح[1] کے نام سرِفہرست ہیں۔ چونکہ یہ حضرات علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی کے بھی مسلّمہ شیوخ تھے اس لیے ابو نصر سراج نے باطنی علوم کی زیادہ تر تکمیل بھی انہی مشائخ کے ہاں کی۔

آپ کے شیخ طریقت ابو محمد عبداللہ بن المرتعشؒ (م ۳۲۸ھ) تھے۔ کتاب اللمع میں پانچ مقامات پر شیخ ابو محمدؒ کا ذکر آیا ہے گو ان کے مرشد ہونے یا ان سے بیعت کرنے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا، تاہم دیگر تذکرہ نویسوں نے صراحت کی ہے کہ ابو نصر سراج نے شیخ ابو محمد عبداللہ بن المرتعشؒ کے ہاتھ پر بیعت کی[2] اور باطنی فیوض سے مالامال ہوئے۔ شیخ ابو محمد عبداللہ بن محمّد المرتعش کا سلسلہ طریقت اس طرح ہے: آپ نے حضرت جنید بغدادیؒ (م ۲۹۸ھ) انھوں نے حضرت سری سقطیؒ (م ۲۵۳ھ) انھوں نے معروف کرخیؒ، انھوں نے داؤد طائیؒ، انھوں نے

---

[1]: نکلسن کا خیال ہے کہ احمد بن محمد السائح دراصل احمد بن محمد السالمی ہے السائح غلطی سے لکھا گیا ہے لیکن یہ خیال تحقیق طلب ہے۔

[2]: نفحات الانس ۱۸۰ مطبوعہ کانپور

حبیب عجمیؒ، انھوں نے حسن بصریؒ، انھوں نے امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ اور انھوں نے مرشدِ ازل محبوبِ کل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔[۱]

شیخ ابو نصر سراج نے صوفیا کی روایت کے مطابق بڑے بڑے سفر کیے۔ اس دوران کئی نامور صوفیا اور مشائخ سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ آپ نے بصرہ، بغداد، دمشق، رملہ انطاکیہ، اطرابلوس، قاہرہ، دمیاط، بسطام، تستر اور تبریز کے بطور خاص سفر اختیار کیے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے سری سقطیؒ اور سہل تستریؒ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا۔[۲]

جلالتِ شان

آپ علومِ ظاہری و باطنی کے عالم، زاہد و عابد اور انتہائی باکمال شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا جامیؒ نفحات الانس میں آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"درفنونِ علم کامل بود و در ریاضت و معاملات شانے عظیم داشت"[۳]

شیخ فریدالدین عطارؒ ایسے نامور صوفی کی اس شہادت کے بعد آپ کی جلالتِ شان کے بارے میں کیسے شک ہو سکتا ہے، لکھتے ہیں:

"آں عالمِ عارف آں حاکمِ خائف آں امین زمرۂ کبار، آں نگین حلقۂ فقرا آں زبدۂ مشائخ شیخ ابو نصر سراج رحمۃ اللہ علیہ اما مے برحق بود و یگانۂ مطلق و متعین و متمکن و اورا طاؤس الفقرا گفتندے و صفت و نعت او نہ چنداں است کہ در قلم و بیان آید یا در عبارت و زبان گنجد۔ ۔ الخ"[۴]

روحانی مرتبہ

چونکہ صوفیائے کرام اصلاحِ باطن پر زیادہ زور دیتے ہیں اس لیے ہمیں حلقۂ تصوف میں کسی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ پہلو بطور خاص مدِ نظر رکھنا چاہیئے اور اسی پیمانے سے ہم مختلف بزرگوں کے مراتب کا اندازہ لگاتے ہیں شیخ ابو نصر سراج نے جہاں تصوف کو علمی بنیاد

۱؎ : اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید: ۲۷ مطبوعہ ایران
۳؎ : تذکرۃ الاولیا: ۱۷۴

۲؎ نفحات الانس: ۱۸۰

فراہم کی ٹھیک وہاں آپ نے تقویٰ اور تعلق باللہ کی بھی ایسی مثالیں قائم کیں جو ہر زمانے میں لائقِ تقلید رہیں گی۔

حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب کشف المحجوب میں شیخ ابونصر سراج کا یہ واقعہ لکھا ہے:

"ایک دفعہ شیخ ابونصر سراجؒ رمضان المبارک میں بغداد میں تشریف لائے آپ نے مسجد "شونیزیہ" میں قیام فرمایا یہاں آپ کو عبادت کے لیے ایک الگ حجرہ دیا گیا، آپ نے پورا مہینہ مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیے۔ اس دوران تراویح میں پانچ بار قرآن مجید ختم کیا، ہر روز رات کے وقت خادم انھیں ایک روٹی حجرہ میں دے آتا رمضان المبارک ختم ہوا اور آپ عید کی نماز پڑھا کر روانہ ہو گئے تو خادم نے دیکھا کہ پورے مہینے کی تیس روٹیاں جوں کی توں حجرہ میں رکھی ہوئی ہیں۔"[1]

واللہ اعلم اس عالی مرتبت شیخ نے رمضان المبارک کا پورا مہینہ کیا کھا کر گزارا؟ معلوم ہوتا ہے کہ مالکِ حقیقی کی محبت میں بھوک کو طعام دوست سمجھ کر اسی سے لذت و قوت حاصل کرتے رہے۔

آتشِ عشق

مولانا جامیؒ کا بیان ہے:

"ایک دفعہ "ذکرِ یار" کی محفل گرم تھی کہ معرفت کے کسی نکتے پر آپ کو وجد آگیا بے خودی کی کیفیت ظاہر ہوئی اور قریب بھڑکتے ہوئے آتش دان میں سر رکھ کر سجدہ ریز ہو گئے۔ لوگ پریشان ہو گئے جونہی اس حالت سے افاقہ ہوا آپ نے سر اٹھایا تو لوگوں نے دیکھا کہ چہرے پر کہیں آگ کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔ اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: جو شخص محبوبِ حقیقی کی چوکھٹ پر اپنی آبرو قربان کر دیتا ہے آگ اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔"[2]

---

[1]: کشف المحجوب : ۴۱۷ مطبوعہ ایران۔

[2]: نفحات الانس : ۱۸۰ مطبوعہ کانپور۔

آپ نے پوری زندگی ظاہری و باطنی علوم کی نشر و اشاعت میں گزاری جس باکمال شخصیت نے ساری زندگی کام ہی پڑھنے پڑھانے کا کیا ہو، اس سے فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے مگر افسوس ہے کہ تاریخ نے یہ تمام حالات محفوظ نہیں رکھے۔ آپ کے تلامذہ میں سے ابو الفضل بن الحسین السرخی کی بہت شہرت ہوئی۔ ابو الفضل بن الحسین السرخیؒ وہ بزرگ ہیں جن کی نگاہِ کیمیا اثر نے شیخ ابو سعید ابن ابو الخیر ایسا باکمال بزرگ اور عظیم المرتبت صوفی پیدا کیا۔[۱]

طبقات الصوفیا کے مولف ابو عبد الرحمٰن محمد بن الحسین السلمیؒ بھی آپ کے شاگردوں میں سے تھے گو انھوں نے طبقات الصوفیا میں اپنے نامور استاذ کا ذکر نہیں کیا "الرسالۃ القشیریہ" کے مقدمہ میں ملک کے مشہور محقق جناب ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب نے نور الدین شربیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابو نصر سراج" ابو عبد الرحمٰن محمد بن الحسین السلمیؒ کے اٹھائیس اساتذہ میں سے ایک تھے۔[۲]

سفرِ آخرت

آپ نے ۳۷۸ھ میں طوس میں انتقال فرمایا اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے۔[۳] مولانا جامیؒ کا بیان ہے: "آپ نے وفات سے پہلے ارشاد فرمایا کہ جو میت میرے مزار کے سامنے سے گزاری جائے گی اس کی بخشش ہو جائے گی۔ چنانچہ طوس میں آج تک یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ ہر جنازہ پہلے آپ کے مزار پر لایا جاتا ہے کچھ دیر کے لیے اسے مزار کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور پھر قبرستان لے جایا جاتا ہے۔[۴]

کتاب اللمع

یقینی طور پر تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کتاب اللمع کس سن میں لکھی گئی لیکن چونکہ مصنف کی تاریخ وفات ۳۷۸ھ پر اتفاق ہے اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کتاب اللمع چوتھی صدی

۱؎ : نفحات الانس : ۱۸۱
۲؎ : رسالۃ القشیریہ : ۲۶، ۲۷
۳؎ : نفحات الانس : ۱۸۰
۴؎ : ایضاً : ۱۸۱

ہجری کے وسط کی تصنیف ہے اس لیے اسے تصوف کی قدیم ترین کتابوں میں شمار کرنا غلط نہیں [1]

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کا بیان ہے :

"آج سے چالیس سال قبل دنیا کتاب اللمع کے صرف نام سے آشنا تھی ۱۹۰۹ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے استاذِ فارسی اور عاشقِ کتبِ تصوف ڈاکٹر نکلسن نے دو قلمی نسخے کھوج نکالے ایک نسخہ ۶۸۳ھ کا لکھا ہوا تھا دوسرا ۵۴۸ھ کا۔ پانچ سال کی دیدہ ریزی کے بعد دونوں نسخوں کا مقابلہ کرکے پروفیسر موصوف نے اصل کتاب کو غایت اہتمام کے ساتھ ۱۹۱۴ء میں شائع کر دیا اور متعدد مفید اضافے بھی کیے ... الخ" [2]

کتاب اللمع سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں حقیقت و معرفت کا ایسا گنجینہ ہے جس میں پیچیدہ افکار ہیں اور نہ فلسفیانہ مباحث، ہر موضوع کو جابجا قرآنی آیات، احادیث نبویہ، اقوال مشائخ، خوبصورت اشعار اور نادر حکایات و امثال سے مزین کیا گیا ہے۔ ہر بات کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ متاخرین صوفیاء کی کتابوں میں جو دقیق فنی بحثیں اور الٰہیات کے موضوع پر انتہائی پیچ دار مضامین نظر آتے ہیں کتاب اللمع میں کہیں ان کا وجود نہیں ہے، تصوف کیا ہے؟ تصوف۔ باطن کی صفائی، تعلق باللہ اور عبادات میں دلکشی و جاذبیت محسوس کرنے کا نام ہے اور یہ چیزیں عین اسلام کا مقصود اور قرآن کی دعوت ہیں۔ کتاب اللمع میں یہ مقام حاصل کرنے اور اسے طبیعت ثانیہ بنانے کے سادہ اور عام اصول بیان کیے گئے ہیں۔

مصنف نے کتاب ان الفاظ سے شروع کی ہے :

"اما بعد فانی قد استخرت اللہ ... [3] الخ" میں نے اللہ تعالیٰ سے بہتری و بھلائی کی دعا کے ساتھ اس کتاب کا آغاز کیا۔ بعد میں صوفیا کے نزدیک تصوف کا مفہوم، تصوف کے مختلف علوم اور معمولات کے بارے میں صوفیاء کے نظریات و اقوال، تصوف کے اصول بڑے بڑے

---

[1] : تصوفِ اسلام، مولانا عبدالماجد دریا آبادی : ۱۲

[2] : تصوفِ اسلام : ۱۲ [3] : کتاب اللمع : ۲

صوفیا کے حالات اور ان کی خدا ترس زندگیوں کی جھلکیاں، اشعار، سوالات و جوابات، لطیف اشارات و نکات، مصطلحات اور حقائق تصوف پر مستقل الواب باندھے گئے ہیں۔

شیخ ابو نصر سراجؒ نے کتاب کے آغاز میں بیان کیا ہے: "سألنی سائل عن البیان عن علم التصوف و مذھب الصوفیہ۔ مجھ سے ایک سائل نے علم تصوف کی حقیقت اور صوفیائے کرام کے نظریات کے بارے میں سوالات کیے۔" اس سے معروف مستشرق نکلسن نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شیخ ابو نصر نے یہ کتاب کسی دوست کی فرمائش پر لکھی ہے۔ ہماری رائے میں فاضل مستشرق کا یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کیونکہ تصوف کی اکثر قدیم کتابوں کا یہی اسلوب ہے کہ مؤلف شروع میں فرماتے ہیں کہ مجھ سے کسی شخص نے فلاں مسئلے کے متعلق دریافت کیا۔ اس سے یہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ چار سو صفحات کی پوری کتاب کسی دوست کی درخواست پر لکھی گئی ہے۔

کتاب اللمع سے پہلے تصوف کی کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جو اپنے موضوع پر جامع ہو اور اس کے تمام علوم و فنون سے بحث کرتی ہو۔ کتاب اللمع پہلی کتاب ہے جو تصوف کو ایک علم کی حیثیت سے متعارف کراتی ہے۔

خصوصیات

کتاب اللمع کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے تاریخ تصوف کے مؤلف لکھتے ہیں:

"اس کتاب کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سراجؒ نے ایک باب اس موضوع پر باندھا ہے کہ قرآن و حدیث سے صوفیا کا طریق استنباط کیا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ سماع اور وجد پر ابو سعید ابن الاعرابیؒ نے اپنی تصنیف "کتاب الوجد" میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے سراجؒ نے ان کا اقتباس اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے چونکہ کتاب الوجد دنیا سے ناپید ہو چکی ہے اس لیے ان اقتباسات کی اہمیت واضح ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ سراجؒ نے آداب پر بہت شرح و بسط سے لکھا ہے اتنا مواد تصوف کی کسی کتاب میں نہیں مل سکتا۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ سراج نے اپنی تصنیف کو ایسے اشعار سے مزین کیا ہے جو برمحل اور مفید مطلب ہیں۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تمام مصطلحات فنِ تصوف کی شرح درج کر دی ہے۔ چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے

شطحیاتِ صوفیہ کے چند نمونے پیش کر کے ان کی مناسب تاویل بھی لکھ دی ہے، جو عموماً صوفیاء میں مقبول ہے۔ ساتویں خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سراجؒ نے ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا ہے جو صوفیانہ عقائد کے ضمن میں لوگوں کے دماغوں میں جاگزیں ہو گئی تھیں اور آج بھی جاگزیں ہیں آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ سراج نے لفظ صوفی کو صوف (اون) سے مشتق تسلیم کیا ہے حالانکہ ان کے زمانے میں بہت کم لوگ اس بات کو تسلیم کرتے تھے۔ نویں خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ سراج نے اعلیٰ صوفیانہ واردات و مشاہدات کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور بہت سے صوفیوں کی شطحیات کی تاویل بھی کی ہے مگر اصولی طور پر وہ تصوف کو جنیدؒ کی طرح مقید بالکتاب والسنۃ تسلیم کرتے ہیں اور اسی لیے انھوں نے ہر باب میں ہر مسئلے میں قرآن و حدیث سے استشہاد اور استنباط کیا ہے اور انھوں نے اس بات کی بھی صراحت کر دی ہے کہ جو بات کتاب و سنت سے ثابت ہو جائے اسے ہر صوفی کو بلا چون و چرا قبول کر لینا چاہیئے کیونکہ اسلامی تصوف کا ماخذ صرف قرآن اور حدیث ہے۔ دسویں خصوصیت یہ ہے کہ سراج نے اس کتاب میں ان تمام غیر اسلامی عقائد مثلاً حلول اور اتحاد کی بڑی شدت کے ساتھ تردید کی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں اسماعیلیہ، قرامطہ، باطنیہ اور زنادقہ کے ذریعے اسلامی تصوف میں داخل ہو گئے تھے اس کے علاوہ سراج نے جگہ جگہ اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ ایک صوفی اور ایک عام مسلمان میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ صوفی مذہب کے باطنی پہلو پر زیادہ اصرار کرتا ہے اور تزکیہ نفس کو ارکانِ شریعت کی بجاآوری پر مقدم رکھتا ہے [1]

کتاب اللمع کا اصل ماخذ قرآنِ مجید ہے اسی لیے ابو نصر سراج نے جگہ جگہ قرآن مجید کی آیات سے استدلال کیا ہے۔ کتاب اللمع میں جس کثرت سے قرآنی آیات لائی گئی ہیں اور ان سے معرفت کے خصوصی نکات اور اشارات اخذ کیے گئے ہیں اگر ان کے ساتھ شیخ ابو نصر کے استنباط اور ضروری وضاحتیں بھی شامل کر لی جائیں تو کتاب اللمع بجا طور پر ایک مختصر صوفیانہ تفسیر کہلائی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید کے بعد کتاب اللمع کا دوسرا بڑا ماخذ حدیث ہے۔ کتاب اللمع کے مطالعے سے مصنف کی دقتِ نظر اور مطالعہ کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

---

[1] : تاریخ تصوف : ۲۳۸، ۲۳۹۔

قرآن وحدیث کے بعد کتاب اللمع کے اہم ماخذ یہ کتابیں ہیں :

اخبارِ مکّہ ، مؤلفہ ازرقی ۔

کتاب المشاہدات مؤلفہ عمرو بن عثمان المکّی ۔

کتاب السنن مؤلفہ ابو داؤد السجستانیؒ ۔

آداب الصلوٰۃ مؤلفہ ابوسعید الخرازؒ ۔

مؤلفاتِ ابو تراب نخشبیؒ ۔

کتاب المناجات مؤلفہ جنید بغدادیؒ ۔

کتاب الوجد مؤلفہ ابوسعید ابن الاعرابیؒ ۔

کتاب معرفۃ المعارفات مؤلفہ ابراہیم الخواصؒ ۔

شرح شطحیات ابو یزید بسطامی مؤلفہ جنید بغدادیؒ ۔[1]

کتاب اللمع کے مضامین

کتاب کے کل ابواب ۱۲۳ ہیں چند ابواب کا اجمالی تعارف یہ ہے :

باب ۱ : علم تصوف کی توضیح وتشریح ، صوفیہ کے اصول اور عقائد ، علماء و فقہا کے مقابلے میں ان کی حیثیت اسلامی تصوف قرآن وحدیث ہے ۔

باب ۲ : محدثین کے طبقات کی تفصیل ۔ احادیث کی شناخت کا معیار ، علم حدیث میں محدثین کی خصوصیت ۔

باب ۳ : فقہاء کے مختلف طبقات کی تفصیل اور ان علوم کی تصریح جن میں انھیں مہارت حاصل ہے ۔

باب ۴ : صوفیاء کے نظریات اور اشغال واعمال اور خصائص جن کی بنا پر انھیں محدثین اور فقہا پر ترجیح حاصل ہے ۔

باب ۵ : صوفیاء کے وہ آداب واحوال اور علوم جن کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز ہیں ۔

---

[1] : تاریخ تصوف : ۳۲۱

باب ۶ : دیگر امور کے لحاظ سے صوفیا اور علماء میں فرق، یہ بات علماء بھی جانتے ہیں کہ اسلامی تصوف قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے۔

باب ۷ : ان لوگوں کی تردید جو یہ کہتے ہیں کہ صوفیہ عموماً جاہل ہوتے ہیں اور قرآن مجید اور حدیث سے تصوف کا ثبوت نہیں ملتا۔

باب ۸ : تفقہ فی الدین سے کیا مُراد ہے۔

باب ۱۰ : صوفی کی وجہ تسمیہ، یہ لفظ ان کے لباس (صوف) سے مشتق ہے۔

باب ۱۱ : ان لوگوں کا رد جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کوئی صوفی نہیں تھا۔ دراصل بہت سے صحابہ صوفی تھے مگر ان کو اس نام سے یاد نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ شرفِ صحبت سب سے ارفع منصب ہے۔

باب ۱۲ : علم باطنی کا اثبات۔

باب ۱۵ : توحید کا بیان، موحد کی صفات اور توحید کی تشریح جنیدؒ، شبلیؒ، ابوسعید خرازؒ اور احمد بن عطا بغدادیؒ کے اقوال۔

باب ۱۸ : ان وسائل کا بیان جن سے خدا کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے۔ حسین نوریؒ کا قول کہ عقل کے ذریعے سے کوئی شخص خدا کو نہیں جان سکتا۔ معرفت دراصل ایک انعام ہے جو اللہ کی طرف سے مخصوص بندوں کو ملتا ہے۔

تصوف کی کتابوں میں کتاب اللمع کا مقام

ہم پہلے یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ کتاب اللمع سے پہلے تصوف کی تمام کتابیں کسی ایک خاص موضوع سے متعلق تھیں۔ کتاب اللمع پہلی کتاب ہے جس نے تصوف کو ایک ہمہ گیر اور جامع فکر کے طور پر متعارف کرایا ہے، اس میں انتہائی سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے تاکہ ہر شخص استفادہ کر سکے، یہ شرف بھی کتاب اللمع ہی کو حاصل ہے کہ متقدمین صوفیا کے اقوال، اشارات، نکات، معمولات اور واقعات کو اس نے پہلی بار پوری تفصیل کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا ہے اگر اس موقع پر یہ ساری چیزیں اس طرح جمع نہ کی جاتیں تو بعد میں آنے والے

لوگوں کے لیے یہ سارا ذخیرہ ضائع ہو جاتا، آج قدیم العہد صوفیائے کرام کے اقوال و اشارات جاننے کے لیے ہمارے پاس بنیادی مآخذ کتاب اللمع ہی ہے۔

اگرچہ کتاب اللمع کے دور میں یونانی علوم و افکار کی یلغار شروع ہو چکی تھی مگر شیخ ابونصر سراجؒ نے انتہائی ہوش مندی اور احتیاط سے پوری طرح ان مباحث سے اپنا دامن بچایا ہے انھوں نے کتاب اللمع میں کتاب و سنت کی فطری زبان اور سادہ لب ولہجہ اپنایا ہے گویا انھیں اس بات کا احساس تھا کہ اگر آج تصوف کی پہلی بنیادی کتاب کی ترتیب میں عجمی لہجہ اختیار کیا گیا تو آیندہ ہر کتاب اسی انداز میں لکھی جائے گی۔ صاحبِ کتابُ اللمع کی اسی بالغ نظری اور دور اندیشی کا نتیجہ ہے کہ بعد میں تصوف کی بیشتر اہم کتابوں میں کتاب اللمع ہی کا انداز اپنایا گیا۔ رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب اور عوارف المعارف ایسی کتابوں کا یہی انداز ہے۔ اگر تصوف کے نام سے آدمی الرجک نہ ہو تو کتاب اللمع پڑھتے وقت قاری قطعاً یہ فرق نہیں کر سکتا کہ وہ قرآن مجید کی جامع اور مختصر تفسیر پڑھ رہا ہے یا منتخب احادیث کی حسین شرح، وہ اولوالعزم خدا ترس مسلمانوں کی تاریخ دیکھ رہا ہے یا اسلامی عقائد و افکار کی کوئی کتاب اس کے سامنے ہے۔

اگرچہ کتاب اللمع کی زبان سادہ اور عام فہم ہے تاہم عربی زبان و ادب کی پوری پوری چاشنی اس میں موجود ہے۔ پھر تصوف کی تمام کتابوں میں اس اعتبار سے کتاب اللمع کو ترجیح حاصل ہے کہ اس میں جس کثرت سے جا بجا برمحل انتہائی خوبصورت اشعار لائے گئے ہیں کسی اور کتاب میں اتنے اشعار نہیں ہیں۔

اُردو ترجمہ

ہماری معلومات کے مطابق ابھی تک کسی زبان میں کتاب اللمع کا ترجمہ نہیں ہوا۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ کتاب اللمع کے پہلے مستند اُردو ترجمہ کی سعادت "اسلامک بک فاؤنڈیشن" کے حصے میں آئی ہے۔ یوں تو "فاؤنڈیشن" نے تصوف کی کئی انتہائی قیمتی اور نایاب کتابیں اصل اور تراجم کی صورت میں اہلِ علم کے پاس پہنچائی ہیں مگر کتاب اللمع کا ترجمہ شائع کر کے "فاؤنڈیشن" نے اہلِ دل کے دل جیت لیے ہیں۔ کتاب کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے مرحبا

اور جزاک اللہ کے الفاظ نکلتے ہیں۔ فاؤنڈیشن کے بانی حاجی محمد ارشد قریشی خود صاحب علم آدمی ہیں اور وہ کتاب کو جس خوبصورتی اور نفاست سے چھاپتے ہیں اس کی داد نہ دینا بہت بڑی بیداد ہے۔

کتاب کے مترجم پروفیسر سید اسرار بخاری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ راقم السطور کو برسہا برس سے بخاری صاحب سے شرف نیاز حاصل ہے۔ میرا دیانتدارانہ تجزیہ ہے کہ بخاری صاحب کو اللہ تعالے نے دل و دماغ کی جو خوبیاں ودلیعت کی ہیں وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ بخاری صاحب سادات کے ایک معروف علمی و روحانی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں آپکو اردو، عربی، فارسی اور انگریزی پر یکساں دسترس حاصل ہے میرے خیال میں تاریخ، تصوف، عقائد اور عربی زبان و ادب میں شاید ہی کوئی قابل ذکر کتاب یا موضوع ایسا ہو جو بخاری صاحب کی نگاہ سے نہ گزرا ہو۔ آپ جب کسی موضوع پر زبان کھولتے ہیں تو دل چاہتا ہے:

ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

گھنٹوں ایک ایک موضوع پر بولتے چلے جاتے ہیں مگر کیا مجال کہ کہیں اکتاہٹ محسوس ہو ان کی ایک ایک بات میں سو سو بات ہوتی ہے۔ راقم السطور جب کبھی علمی تشنگی محسوس کرتا ہے تو بخاری صاحب کی خدمت میں جا حاضر ہوتا ہے اور انھیں کسی موضوع پر چھیڑ کر دو چار ماہ کیلئے کثرت سے علمی خوراک کا ذخیرہ اکٹھا کر لیتا ہے۔ پڑھنے کو تو بے شمار لوگ علم پڑھ لیتے ہیں اور عالم فاضل کہلاتے ہیں مگر "آں کہ یافتہ نمی شود آنم آرزوست" کا جذبہ کہیں بھی جاکر تسکین حاصل نہیں کرتا۔ بخاری صاحب اس قحط الرجال میں علم کا مرکب نہیں علم کے راکب ہیں۔ قدرت نے پوری فیاضی سے انھیں اخّاذ ذہن، نقّاد دماغ اور رسا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ آپ انتہائی سادہ درویش منش اور شرافت واخلاق کے پیکر ہیں۔ راقم السطور کے ساتھ آپ کی شفقت اور محبت سرمایۂ زندگی ہے۔ علم آپ کا اوڑھنا بچھونا، درویشی آپ کی طبیعت ثانیہ اور اخلاق و شرافت آپ کا خمیر ہیں۔

کتاب اللمع ایسی اہم کتاب کا ترجمہ ایسی ہی شخصیت کا حق تھا جس میں یہ ساری خوبیاں

موجود ہوں۔ بحمداللہ حق بحقدار رسید۔ بخاری صاحب نے کتاب اللمع کا ترجمہ انتہائی شگفتہ اور سلیس زبان میں کیا ہے۔ کتاب کو دیکھ کر ترجمے کا گمان ہی نہیں ہوتا زبان میں اردو محاورے اور روزمرے کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کے مقصد سے سرمُو انحراف نہ ہو۔ آپ نے کتاب میں یہ اہتمام کیا ہے کہ جہاں کہیں قرآنی آیات مختصر درج تھیں وہاں مفہوم کی وضاحت کی خاطر پوری آیات درج کر دی ہیں ساتھ ہی ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے۔ آیات کا اردو ترجمہ برصغیر کے معروف فاضل مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا دیا گیا ہے، جو ہر لحاظ سے کتاب اللہ کا شایان شان ترجمہ ہے۔ یہ فقیر اس عظیم الشان کتاب کے بہترین اردو ترجمے پر جناب بخاری صاحب کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی بارگاہِ قدس میں دعا کرتا ہے کہ اللہ رب العزت تمام مسلمانوں کو تزکیۂ نفس کا وہ بہترین مقام نصیب فرمائے جس پر ہمارے نامور اسلاف فائز تھے۔ آمین!

خاک نشین

سید محمد فاروق القادری ایم اے

خانقاہ عالیہ قادریہ شاہ آباد شریف

گڑھی اختیار خاں ــــ رحیم یار خاں

مقدمہ

ہم تک یہ کتاب جن صوفیہ کرام کے ذریعے پہنچی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ بغداد سے ابوالقاسم علی بن الامام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد بن الجوزی، ابواسماعیل بن علی بن باتکین الجوہری، ابوعبداللہ محمد بن عبدالواحد بن احمد بن المتوکل علی اللہ اور ابوالمنجا عبداللہ بن عمر بن علی ابن زید بن اللیثی وغیرہ اور دمشق سے ام الفضل کریمۃ بنت عبدالوہاب بن علی بن الخضر القرشیۃ، جب کہ ان تمام نے اسے ابوالوقت عبدالاول بن عیسیٰ بن شعیب بن اسحاق السجزی الصوفی الہروی المالینی سے حاصل کیا۔ اور ان کا بیان ہے کہ یہ کتاب انھوں نے ۴۶۵ھ میں چند مہینوں کے دوران ابو نصر احمد بن ابونصر الکوفانی سے انھوں نے ابومحمد الحسن بن محمد الجنوشانی سے اور انھوں نے ابونصر عبداللہ بن علی الطوسی السراج سے نقل کی ہے [1]

تمام تعریفوں کے لائق وہ رب الارباب ہے جس نے مخلوقات کو اپنی قدرتِ کاملہ سے وجود بخشا اور انھیں اپنی صنعتوں کی نشانیوں اور اپنی ربوبیت کے شواہد کے ذریعے اپنی معرفت عطا کی، پھر ان میں سے بہترین اور نیکوکار لوگوں کو چن لیا اور ان میں سے جسے جس خصوصیت سے چاہا مختص فرمایا، انھیں اپنی معرفت سے نوازا، اپنی ہی مرضی کے مطابق اپنے احکامات کا مکلف بنایا اور انھیں جس قدر ہدایت و توفیق عنایت کی اس میں انھیں مختلف ٹھہرایا، جیسا کہ لوگ اخلاق، رزق،

---

(۱) : ان سطور کے راقم کتاب اللمع کے وہ نامعلوم مدیر ہیں جن کی وساطت سے یہ کتاب ہم تک پہنچی ہے۔ (مترجم)

وقتِ موت اور اعمال کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

بلاشبہ جملہ معلومات و مفہومات اس کی کتابِ مبین میں موجود اور احادیثِ نبوی و مکاشفاتِ اولیا میں مذکور ہیں، جو چاہے ان سے درسِ حیات لے ورنہ موت و ہلاکت سے ہمکنار تو ہونا ہی ہے بے شک اللہ سننے جاننے والا ہے۔

اور بے شمار درود و سلام ہو معظم الانبیا، شمس الاولیا، قمر الاصفیا، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم، اللہ کے بندے اور رسول پر اور سلامتی ہو ان کی آل پر۔

اللہ سے بہتری اور بھلائی کی دعا کے ساتھ میں نے اس کتاب کا آغاز کیا اور اس میں صوفیہ کرام کے نزدیک تصوف کے مفہوم، اس کے جملہ علوم پر ان کی گفتگو، اصولِ تصوف، مسلکِ صوفیہ کی بنیاد، ان کے حالاتِ زندگی اشعار و اقوال سوالات و جوابات، مقامات، احوال، لطیف اشارات، فصیح عبارات و اصطلاحات اور حقائق پر مستقل ابواب باندھے ہیں

ترتیبِ کتاب کے دوران ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ فروع کی مکمل وضاحت اور اصول کے لطیف پہلوؤں کو اس انداز سے اجاگر کیا جائے، کہ اس کے ذریعے حال قائم رہے فکر عشقی کا غلبہ ہو اور خدائے عز و جل کی بخشش و عطا سے حصہ حاصل ہو۔ اور یہ بھی ملحوظ رکھا ہے کہ اس کی ترتیب صوفیہ کے قائم کردہ نمونے پر ہو۔ اور واضح بیان و دلائل سے معمور ہو۔

قاری کو چاہئے کہ کامل توجہ، حضورِ قلب، کشادہ ظرفی، خوش فکری اور حسنِ نیت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے۔ اور خدا کا شکر ادا کرے کہ جس نے اسے صوفیہ کرام کے طائفے سے دوستی اور ان کے منکرین و مخالفین سے دشمنی کرنے کی توفیق عطا فرمائی یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کی تعداد کم ہوتی ہے مگر اللہ کے ہاں ان کی وقعت زیادہ ہے۔ عقل سلیم رکھنے والوں کو آج کے دور میں اس حقیقی گروہِ صوفیہ کے طرزِ عمل سے آگاہی حاصل کرنا چاہئے تاکہ وہ ان میں اور جھوٹا سوانگ رچانے والوں میں تمیز کر سکیں اور اس طرح غلطی و گناہ سے امن میں رہیں۔

صوفیہ کرام اس دھرتی پر اللہ کے اسرار و حِکم اور اس کی معرفت کے امین ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو اس کی مخلوقات میں سے بہترین مخلص بندے، اس کے متقی دوست اور سچے نیکو کار پرستار ہیں۔

ان ہی میں سے اخیار، ابرار، مقربین ابدال اور صدیقین ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے اپنی معرفت سے زندہ رکھا۔ جن کے اعضاء و جوارح کو اپنی بندگی سے آراستہ کیا جن کی زبانوں کو اپنے ذکر سے مسرور کیا جن کے باطن کو اپنی خاص توجہ سے پاکیزہ بنایا جنھیں خصوصی دائمی توجہ اور بہترین انجام سے نوازا، جن کے سروں پر تاجِ ولایت رکھا' رشد و ہدایت کے گہنے عطا کئے اور کمال مہربانی سے اپنے سامنے اکٹھا کر کے ان کے دلوں میں بس گیا۔ نتیجۃً وہ (صوفیہ) ماسوا اللہ سے مستغنی ہو گئے اسی کی ذات اعلیٰ صفات کو دنیا و مافیہا پر ترجیح دی، اسی کے ہو کر رہ گئے اسی پر بھروسہ کر کے اس کے در پر پڑ گئے، اسی کے فیصلے کے سامنے سر خم کیا ہر آزمائش پر صبر کیا، اس کی خاطر وطن کو ترک کیا اقرباء سے جدا ہوئے، اپنے نام و نسب کو بھلا دیا، جملہ اسباب و تعلقات سے کنارہ کش ہوئے اور اسی کی ذات کے لئے خلائق کو چھوڑ کر اسی سے انس قائم رکھتے ہوئے غیر سے متنفر ہوئے " ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم "[1]

(ترجمہ: یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے)

فمنهم ظالم لنفسه "[2]	تو ان میں کوئی اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔
قل الحمد لله و سلام على	تم کہو سب خوبیاں اللہ کو اور سلام اس کے
عباده الذين اصطفى[3]	چنے ہوئے بندوں پر۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہمارے آج کے دور میں صوفیہ کرام کے علوم و معارف سے متعلق گفتگو کرنے والے بکثرت پائے جاتے ہیں اور اسی طرح اہل تصوف سے بتکلف ظاہری مشابہت رکھنے والوں، تصوف کی مختلف تشریحات کرنے والوں اور اس کے متعلق طرح طرح کے سوالات کے جوابات دینے والوں کی بھی کمی نہیں بلکہ ان میں سے بیشتر نے تو کوئی نہ کوئی لایعنی کتاب اور بے بنیاد نظریات بھی خود سے منسوب کر رکھے ہیں جو کہ ہرگز مستحسن اقدام نہیں۔ کیونکہ متقدمین شیوخ

(اور اللہ دغابازوں کا مکر نہیں چلنے دیتا)

بے شک اللہ ہی اچھے کاموں کی توفیق دینے والا ہے۔

---

(۱) الحدید: ۲۱ (۲) فاطر: ۳۲ (۳) النمل: ۵۹
۵۷ ۳۵ ۲۷

نے تصوف کے جملہ مسائل اور نکات کی سیر حاصل تشریحات کی ہیں اور انھوں نے یہ کام ظاہری، صوفیانہ روپ دھار کر نہیں بلکہ فی الواقع طویل مجاہدات، ریاضاتِ شاقہ، وجد، سیرِ منازل اور اللہ سے منقطع کرنے والے ہر تعلق کو یکسر توڑ کر انجام دیا۔

انھوں نے تصوف کو متعارف کرانے کے فریضے سے پہلے علم حاصل کیا پھر عمل کیا اور اس کے بعد تحقیق کا فرض ادا کیا اور اس طرح (ہمارے سامنے) علم حقیقت اور عمل کا ایک بہترین امتزاج پیش کیا۔

ہم نے اس کتاب میں تمام واقعات اور روایات کی اسانید کو چھوڑ کر اختصار کی خاطر صرف اصل متن پر ہی اکتفا کیا ہے اور بلاشبہ یہ سارا کام فقط میرے رب کی توجہ و عنایت سے مکمل ہوا۔ الحمد للہ۔

کتاب میں کسی طرح کی کمی بیشی یا غلطی کے سلسلے میں ہی ذمہ دار ہوں اور اس کے لیے اللہ سے معافی کا خواستگار۔ متقدمین صوفیہ کرام کے جس قدر اقوال و آثار نقل کیے گئے ہیں وہ ان کے اپنے ہی الفاظ میں ہیں۔ ان میں کسی طرح کی بناوٹ یا اضافے سے کام نہیں لیا گیا جیسا آج کے نام نہاد صوفیوں نے مضامینِ تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں اپنے مطالب و الفاظ پہنانے کی کوشش کر کے ان کے احوال و حقائق کو مسخ کرنے کی جسارت کی ہے۔

بے شک اللہ ہی ایسے لوگوں کا احتساب کرنے والا اور ان کو ان کی برائی کی سزا دینے والا ہے جنھوں نے صوفیۂ عظام، جن کے بیان کردہ مضامین تصوف ہم نے یہاں اس کتاب میں جمع کیے ہیں، کے کلام کو اپنا رنگ دے کر پیش کیا یا ان کو خود سے منسوب کیا تاکہ وہ اس سے اپنی شہرت کا سامان کر سکیں، لوگوں میں کوئی مقام حاصل کر سکیں یا انھیں اپنا معتقد بنا کر ان سے اپنا الو سیدھا کرائیں۔ بے شک ایسے لوگوں نے امانت کا دامن چھوڑ کر خیانت کا راستہ اختیار کیا۔ اور جس خیانت کے وہ مرتکب ہوئے ہیں وہ دنیوی مال و اسباب میں خیانت کرنے سے کہیں بڑھ کر ہے:

"و اللہ لا یھدی کید الخائنین"[1]

---

[1] یوسف : ۵۲

(۱)

تعارفِ تصوف، مسلکِ صوفیہ اور حیثیت علماء

ان کا مقام

مجھ سے کسی شخص نے علم تصوف اور مسلکِ صوفیہ کے بارے میں استفسار کرتے ہوئے سوال کیا کہ لوگ مذکورہ موضوعات کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ کچھ تو ان کی فضیلت بیان کرنے میں بہت غلو سے کام لیتے ہیں بعض انھیں دائرۂ معقولیت سے باہر لے جاتے ہیں، کچھ انھیں لہو و لعب اور جہالت سے آنکھیں بند کر لینے کا عمل گردانتے ہیں۔ بعض لوگ انھیں تقوی، تقشف، اونی لباس پہننے، بے تکلف پاکیزہ گفتگو کرنے اور پاکیزہ لباس پہننے وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ اور کچھ انھیں الحاد و گمراہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الغرض وہ یہ چاہتا تھا کہ میں اسے ایسا جواب دوں کہ جو مسلک صوفیہ کے اصولوں کتاب اللہ کی اتباع، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی، صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے اخلاق و اطوار اور اللہ کے صالح بندوں کے آداب سے ہم آہنگ ہو۔ اور میں اپنے جواب کو قرآن و سنت کی روشنی میں اس مدلل انداز سے بیان کروں کہ حق و باطل جدا جدا نظر آئیں۔ تصوف کی جملہ اقسام اپنی اپنی جگہ واضح ہو جائیں۔ اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ کیا علم تصوف علومِ دینی میں سے ایک ہے؟

مذکورہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مومنوں کو کتاب اللہ سے تمسک کرنے اور اسے مضبوطی سے تھامنے کا حکم دے کر ان کے دلوں سے جملہ شبہات کو دور کر دیا اور دین کی بنیادیں مستحکم کر دیں۔ جیسا کہ فرمایا:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّ	اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو سب مل
لَا تَفَرَّقُوا (۱)	کر آپس میں اور پھوٹ نہ جانا۔

---

(۱) : آل عمران : ۱۰۳

اور فرمایا :

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى [1] — اور نیکی اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔

اور پھر ایک اور مقام پر اللہ نے فرشتوں کے بعد اپنے بندوں میں سے افضل اور دینی اعتبار سے اعلیٰ رتبہ رکھنے والوں کا ذکر فرمایا۔ اور خود اپنی وحدانیت پر فرشتوں کے بعد انہی بندگانِ خاص کو گواہ ٹھہرایا، جیسا کہ ارشاد ہے :

شَهِدَ اللّٰهُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ [2] — اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف سے قائم ہو کر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے آپ نے فرمایا :

"علماء انبیاء کے وارث ہیں"[3]۔

میرے نزدیک "اولوالعلم" سے مراد ورثۃ الانبیاء (الانبیاء کے وارث) ہے۔ کیونکہ کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنے والے، اتباعِ رسول میں مجاہدہ کرنے والے، صحابہ وتابعین کی پیروی کرنے والے، اور اس کے متقی پسندیدہ بندوں کے راستے پر چلنے والے یہی لوگ ہیں۔

اس کے نیک بندوں کی تین قسمیں ہیں۔ محدثین، فقہاء اور صوفیہ، اور ان ہی تین اقسام کے لوگوں کا تعلق "اولوالعلم قائماً بالقسط" سے ہے جو کہ انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ اسی طرح علوم کی بے شمار اقسام ہیں۔ جن میں سے ایک، علمِ دین ہے جس کی تین قسمیں ہیں۔ علمِ قرآن، علمِ سنن وبیان اور علمِ حقائق ایمان۔ اور یہی وہ علوم ہیں جو محدثین، فقہاء اور صوفیاء میں متداول ہیں۔

الغرض جملہ علومِ دین مذکورۃ الصدر تین آیاتِ مبارکہ، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

---

(۱) المائدہ : ۲ ۵ (۲) آل عمران : ۱۸ ۳

(۳) ابن ماجہ : کتاب : ۱۰، باب : ۳، کتاب : ۳۹ باب ۱۹

اور اولیاء اللہ کے قلوب سے صادر ہونے والی حکمت سے خارج نہیں اور اس کی اصل حدیث الایمان ہے ۔ جب جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دین کے تین اصولوں اسلام، ایمان اور احسان ظاہری و باطنی کے بارے میں سوال کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو ظاہر ہے اور ایمان بھی وہ ہے جو ظاہری بھی ہو اور باطنی بھی مگر احسان حقیقتِ ظاہر و باطن کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ ہادی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"احسان یہ ہے کہ تو اس طرح اللہ کی عبادت کرے کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے"۔ جبریل نے یہ سن کر آپ کی تصدیق کی۔

علم کا قریب ترین رشتہ عمل سے ہے۔ اور عمل کا تعلق اخلاق سے ہے۔ جب کہ اخلاص یہ ہے کہ بندہ اپنے علم و عمل کے ساتھ اپنے معبودِ حقیقی کی خوشنودی حاصل کرے۔ مومنین کے یہ تینوں اصناف (محدثین، فقہاء اور صوفیاء) علم و عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور اپنے مقاصد و مراتب کے لحاظ سے فضیلت میں باہم یکساں نہیں ہوتے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم ان کی باہمی فضیلت اور درجات کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (۱) — اور ان کے جن کو علم دیا گیا درجے بلند فرمائے گا۔

اور فرمایا:

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۲) — اور ہر ایک کے لیے اپنے اپنے عمل کے درجے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

انظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض (۳) — دیکھو ہم نے ان میں سے ایک کو ایک پر کیسی بڑائی دی۔

---

(۱) المجادلہ: ۱۱ ھ۵۸ — (۲) الاحقاف: ۱۹ ۴۶

(۳) بنی اسرائیل: ۲۱ ۱۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لوگ آپس میں اس طرح برابر ہیں جیسے کنگھی کے دندانے، کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں مگر صرف علم اور تقویٰ کی بنیاد پر۔

اگر کسی کو دین کے اصول، فروع، حقوق، حقائق، حدود اور احکام کی ظاہراً باطناً سمجھ نہ آئے تو اس پر لازم ہے کہ وہ محدثین، فقہا اور صوفیہ کی طرف رجوع کرے۔ ان مذکورہ تینوں اصناف کے لوگ علم و عمل حقیقت اور حال سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اور انھیں علم، عمل، مقام، کلام، فہم و فراست اور بیان میں سے اسی قدر حصہ ملتا ہے کہ جس قدر انھوں نے حاصل کیا اور جو کھو دیا سو اس سے جاہل رہے۔ ان میں کسی کو یہ کمال حاصل نہیں ہوتا کہ تمام علوم کا احاطہ کر سکے، جو جس مقام پر فائز ہوتا ہے وہ فقط اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے۔ انشا اللہ میں آگے چل کر ان جملہ اصنافِ عباد کے اس پہلو سے بحث کروں گا کہ انھوں نے کس کس علم یا عمل کی کونسی قسم پر عبور حاصل کیا۔ ان کی فضیلت میں باہمی فرق کی کیا وجوہات ہیں اور یہ کہ ان میں سے اعلیٰ طبقہ کونسا ہے۔

طبقاتِ محدّثین اور ان کے مخصوص علوم و فنون

اس عنوان کے تحت طبقاتِ محدثین، ان کا طریقِ روایت، معرفتِ حدیث اور علم حدیث میں ان کے مخصوص مقام کے بارے میں بیان کریں گے۔

محدثین کرام نے خود کو حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری صورت سے متعلق رکھا اور کہا کہ یہ دین کی اساس ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَ	اور جو کچھ تمھیں رسول عطا فرمائیں وہ لو اور
مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا [1]	جس سے منع فرمائیں باز رہو۔

جب انھیں (محدثین) اس طرح قرآن حکیم نے خطاب کیا تو وہ اس سلسلے میں دور دراز کے سفروں پر روانہ ہو گئے، راویانِ حدیثِ رسول سے ملاقاتیں کیں، ان کے پاس قیام کیا، ان سے احادیث نقل کیں اور صحابہ و تابعین سے جو کچھ روایت کیا گیا اُسے جمع کیا پھر ان تمام معلومات کو اکٹھا کر کے محفوظ کر لیا جو انھیں صحابہ و تابعین کے حالاتِ زندگی، اعمال و آثار، مسالک، احکام میں اختلاف، اقوال، احوال اور ان کے اخلاق کے بارے میں میسر آسکیں۔ انھوں نے تمام روایات کو بذاتِ خود سنا اور انتہائی ضبط و احتیاط کے ساتھ درایت کے کڑے اصولوں کے مطابق ان کی صحت کا خیال رکھا اور یہ بھی پیش نظر رکھا کہ راوی ثقہ ہو تو یہی صفات اس سے پہلے کے راوی میں بھی موجود ہوں کہ جس سے اس نے روایت کیا۔ اور اس طرح ثقاہت کا یہ سلسلہ حدیث کے پورے سلسلۂ اسناد میں آخر تک

---

(۱) الحشر: ۷

چلا جائے۔

انھوں نے راویانِ حدیث سے نقل وضبط کے دوران ان کی جائے بود وباش سے بھی واقفیت حاصل کی اور ان کے اسماء، کنیتوں اور سنین پیدائش و وفات کو بھی مدون کیا۔ اور یہ بھی معلوم کیا کہ راویانِ حدیث میں سے کس نے کتنی حدیثیں روایت کیں، کس سے روایت کیں اور کس سے نقل کیں۔ اور ان میں سے کس سے دورانِ نقل غلطی ہوئی، کس نے ارادی طور پر غلطی کی اور کس نے غیر ارادی طور پر۔ مختصر یہ کہ مذکورہ تمام اصول وضوابط کو برپا کرنے کے بعد انھیں دروغ گو اور راست گو راویوں کے ناموں کا علم ہو گیا، ایسے راویوں کا پتہ چلا جو روایت میں اکیلے تھے، یا ان کی روایت دوسروں کی روایت سے بحیثیت الفاظ مختلف تھی، بہر حال انھیں یہ علم ہو گیا کہ ہر حدیث کو کتنے راویوں نے بیان کیا اور اس کے نقل کرنے والوں میں کیا کمزوری تھی۔

اس کے بعد محدثین نے تمام احادیث کو اکٹھا کر کے ان کے علیحدہ علیحدہ باب قائم کیے، صحیح احادیث کو ان احادیث سے جن میں اختلاف تھا یا جس کا راوی ضعیف تھا، جدا کر دیا تاکہ متفق علیہ اور مختلف فیہ احادیث میں فرق واضح ہو۔ اور ہر کم اور زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے راوی کی روایت کی خوب چھان بین کی۔ مختلف علاقوں کے ائمہ کی احادیث کو سمجھا اور طبقات رواۃ کے بارے میں بھی واقفیت حاصل کی کہ ان میں بلحاظ عمر کون چھوٹا تھا اور کون بڑا۔ کون پہلے تھا اور کون اس کے بعد اس کے علاوہ ان محدثین کرام نے روایتِ حدیث میں راویوں کے اختلاف سے متعلق جملہ اسباب وعلل ترمیم وتنسیخ اور ان کی جائے بود وباش کا پوری طرح جائزہ لیا۔ چونکہ حدیث دین کی اساس ہے اور محدثین کرام اس فن میں ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں حتیٰ کہ ان میں سے بعض تو یہ حق رکھتے ہیں کہ فنی مہارت اور زبردست قوتِ حافظہ رکھنے کے لحاظ سے علماء پر جرح، رد اور قبولِ حدیث کے سلسلے میں ان کی گواہی قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل، امر ونہی اور دعوت کے سلسلے میں ان کی گواہی بھی قابلِ قبول ہوتی ہے۔ قولِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمھیں
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ	سب امتوں میں سے افضل کیا کہ تم لوگوں

یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَہِیْدًا ؕ[1] پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

اس آیت کی تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ شہدائے سے مراد اصحاب حدیث ہیں۔ جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے صحابہ اور تابعین کے اقوال و افعال پر گواہ ہوں گے۔ اور یکون الرسول علیکم شہیدا کا مفہوم یہ ہے کہ خود سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقوال و افعال، احوال اور اخلاق کے بارے میں محدثین کرام کی گواہی پر شاہد ہیں۔

قول نبوی ہے:

جس نے (میرے قول و فعل سے متعلق) مجھ پر جھوٹ باندھا وہ یہ جان لے کہ جہنم ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔[2]

ایک اور حدیث ہے کہ اللہ ان کے چہروں کو رونق و تازگی بخشے جو مجھ سے سن کر اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔[3] آپ کی دعا ہی کا اثر ہے کہ محدثین کے چہروں پر رونق ہوتی ہے۔

محدثین نے فن حدیث کے مفہوم و معنی اور اصول و قوانین کے بارے میں باقاعدہ تصنیفات کی ہیں اور علوم دینی کے اس اہم شعبے میں کئی معروف ائمۂ فن بھی ہیں جن کے معاصرین ان کی فضیلت علمی، دیانت اور عبقریت و ذہانت کی بنا پر ان کی امامت پر متفق ہیں۔ اس ضمن میں خاصی تفصیلات موجود ہیں تاہم جو کچھ بیان کیا گیا وہ سمجھنے والوں کے لیے کافی ہے۔

---

(۱) البقرۃ: ۲: ۱۴۳ (۲) صحیح بخاری: کتاب: ۳، باب: ۳۸
(۳) ابو داؤد: علم: ۱۰

طبقاتِ فقہا اور ان کے مخصوص علوم و فنون

اگرچہ طبقات فقہاء کو محدثین پر فضیلت حاصل ہے مگر وہ محدثین سے کاملاً اتفاق کرتے ہیں۔ فقہاء، فہمِ حدیث، استنباط اور ترتیب احکام میں وقت نظری، حدودِ دین اور اصولِ شریعت میں گہری تحقیق کا ملکہ رکھتے ہیں۔ انہی نے کتاب وسنت اور اجماع و قیاس کی روشنی میں ناسخ و منسوخ، اصول و فروع اور خصوص و عموم کو جدا جدا بیان کر کے ان میں فرق کو واضح کیا ہے۔ مسلمانوں کی سہولت کے پیشِ نظر قرآن وحدیث کے احکام کو بیان کیا اور یہ بتایا کہ وہ کونسی آیات و احادیث ہیں جن کا حکم تو منسوخ ہے مگر ان کی تحریری صورت باقی ہے۔ اور وہ کونسی آیات و احادیث ہیں جن کی تحریری صورت باقی نہیں مگر ان کا حکم موجود ہے۔ اور وہ کونسی آیات و احادیث ہیں جو لفظی حیثیت سے تو عام ہیں مگر مفہوم کے اعتبار سے خاص ہیں، یا لفظی طور پر خاص ہیں اور معنوی اعتبار سے عام ہیں۔

اسی طرح اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ کن آیات و احادیث میں خطاب جماعت سے ہے مگر اس سے مراد کوئی ایک فرد ہے۔ یا کس مقام پر خطاب ایک سے ہے اور مراد جماعت ہے۔

انھوں نے جہاں مخالفین کو عقلی دلائل سے بھرپور جواب دیئے وہاں گمراہوں کی واضح دلائل سے رہنمائی بھی کی ہے۔ اور لاریب ان کی یہ تمام مساعی فقط خدمتِ دین کے لیے تھیں۔

انھوں نے استنباطِ احکام میں بالترتیب نصِ قرآنی، حدیث رسول، نصِ قرآنی پر قیاس اور اجماعِ امت کو اپنا محور بنایا۔ جنھوں نے ان سے مناظرہ کرنا چاہا ان سے باقاعدہ آداب

مناظرہ کے مطابق گفتگو کی۔ اور جو مجادلہ کرنا چاہتے تھے ان سے اسی کے آداب کے مطابق پیش آئے۔ اور اپنے مخالفین کا مقابلہ حتمی دلائل وشواہد کے ساتھ کیا۔ الغرض انھوں نے ہر بات موقع ومحل کی مناسبت سے کی۔ ہر شرعی حد کو قائم رکھا، مختلف پیچیدہ اصطلاحات والفاظ کے معانی واضح کئے، مزید یہ وضاحت بھی کر دی کہ اوامر ونواہی میں سے کون سے احکامات ضروری ہیں کون سے مستحسن ہیں اور کون سے ترغیبی وترہیبی ہیں۔ جن احکام میں اشکال تھا رفع کر دیا، عقدے کھول دیئے، قوانین واضح کر دیئے، شبہات زائل کر دیئے، اصول سے فروع کی تخریج کی، اجمال کی تشریح کی اور حدود دین کو اس احتیاط کے ساتھ بیان کیا کہ کوئی کمی باقی نہ رہی اور اس بات کی ہرگز گنجائش باقی نہ چھوڑی کہ کوئی شخص کسی کی تاویل وغیرہ میں آسکے (یعنی احکام کو بہت واضح کر کے بیان کیا۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی فقہاء کا طائفہ ہی ہے جس نے مسلمانوں کے حدود وقوانین کی حفاظت کی۔ اور یہی ہیں جن کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے:

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین۔[1]	توکیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس سے اللہ تعالیٰ کوئی اچھا کام لینا چاہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔[2]

فقہاء کرام نے علوم فقہ میں مستقل تصنیفات چھوڑی ہیں۔ اور ان میں مشہور ائمہ فن ہو گذرے ہیں جن کی امامت پر امت کا اجماع ہے۔

اس بارے میں مزید کچھ کہنا باعث طوالت ہوگا۔ بہرحال عقل مند کم سے ہی زیادہ کا کام لے سکتا ہے۔

---

(۱) التوبہ: ۱۲۲ (۲) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ۱۰

طبقاتِ صوفیہ اور اُن کے نظریات و احوال اور خصائص و محاسن

صوفیہ کرام کے تمام طبقے محدثین و فقہائے کے معتقدات سے کامل اتفاق کرتے ہیں۔ اور ان کے علوم و فنون مطالب و مفاہیم اور طریقوں سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے بشرطیکہ ان میں لہو و لعب پر مبنی بدعات کی آمیزش نہ ہو اور خود ان محدثین و فقہائے پر پیروی رسول کا غلبہ ہو۔

وہ صوفیہ کرام جو علمی لحاظ سے فقہاء و محدثین کے مرتبے کے نہیں ہوئے وہ قوانین حدود شریعت کے مشکل مسائل کے حل کے سلسلے میں انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور جس مسئلے پر فقہاء محدثین متفق ہوں اس کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جہاں فقہا و محدثین میں اختلاف پایا جاتا ہو وہاں صوفیہ کا طریق یہ ہے کہ احسن، اولیٰ، اور مکمل ترین صورت کو اپنایا جائے تاکہ اللہ نے جو احکام صادر فرمائے ہیں ان پر انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ عمل ہو سکے۔ صوفیہ کے ہاں امور دین کے سلسلے میں کسی قسم کی چھوٹ، تاویل، آسائش ڈھونڈنے اور شبہات کو راہ دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

جو کچھ سطور گذشتہ میں بیان ہوا وہ تو صوفیہ کے اس طرز عمل کے بارے میں تھا جو وہ فقہا و محدثین کے ظاہری متداول علوم کے بارے میں اپناتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان کے عمل کا ایک اور درجہ ہے اور وہ ہے۔ مراتب بلند کی جانب بڑھنا۔

الغرض صوفیہ اخلاق جمیلہ اور عبادات و حقائق عبادت و اطاعت کے جن بلند ترین احوال و منازل پر فائز ہوتے اور جن اسرار و رموز سے وہ مختص ٹھہرے وہ فقہا محدثین کو حاصل نہ ہوئی۔

صوفیہ کے مخصوص آداب، احوال اور علوم

صوفیہ کرام کی کچھ خصوصیات ہیں جن میں وہ باقی لوگوں سے منفرد ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے

کہ وہ جب فرائض کی ادائیگی اور افعال ممنوعہ سے اجتناب کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی اپنے سے غیر متعلق چیزوں کو علیحدہ کر دیتے ہیں اور ہر اس تعلق کو ختم کر دیتے ہیں جو ان کے اور مطلوب و مقصود کے درمیان حائل ہو۔ اور ان کا مطلوب و مقصود فقط اللہ ہی ہے۔

اور ان کے کچھ مخصوص آداب ہیں مثلاً زیادہ کے مقابلے میں تھوڑی سی دنیوی دولت پر قناعت قوتِ لایموت ضروری لباس، بچھونا اور دیگر انتہائی ضروری چیزوں پر گذارہ، امیری پر فقیری کو ترجیح کثرت کے مقابلے میں قلت پر قناعت، شکم سیری پر بھوک کو اختیار کرنا، غرور، فخر اور علو مرتبت سے کنارہ کشی چھوٹوں پر شفقت اور ہر ایک سے تواضع سے پیش آنا خلقِ خدا کے لیے ضرورت کے وقت قربانی دینے کی جرأت، دنیا حاصل کرنے والوں پر رشک نہ کرنا، اللہ سے حسنِ ظن، طاعت میں سبقت تمام اچھائیوں کی طرف قدم بڑھانا، توجہ الی اللہ، فقط اللہ سے لو لگانا، آزمائشوں پر صبر اختیار کرنا۔ اللہ کے ہر فیصلے پر اظہار رضامندی، مسلسل مجاہدہ نفس، مخالفتِ خواہشات اور اس نفس امارہ سے دشمنی جسے اللہ نے امارۃ بالسوء کے نام سے پکارا اور جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یہی نفس امارہ ہی وہ بدترین دشمن ہے جو تیرے پہلوؤں میں موجود ہے، (الغرض یہ وہ خوبیاں ہیں جو صوفیہ کرام کے اعلیٰ کردار کا جزو لاینفک ہیں)

خلوصِ اعمال

صوفیہ کے آداب و خصائل میں سے کچھ یہ بھی ہیں کہ وہ اللہ کی پوشیدہ حکمتوں پر غور کرتے ہیں۔ اس کا خوف ہر وقت دل میں موجود رکھتے ہیں، دلوں میں برے خیالات اور غافل کر دینے والے ایسے افکار جنھیں بجز ذاتِ علیم و خبیر کے کوئی نہیں جانتا، کو ذہنوں میں جگہ نہیں دیتے۔ گویا وہ اس حالت میں اپنے معبودِ حقیقی کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں کہ ان کے دل حاضر، ارادے مجتمع اور نیتیں سیدھی ہوتی ہیں۔

بلاشبہ اللہ جل شانہ، اپنے بندوں کی وہی عبادت قبول فرماتا ہے جو خالصتاً اسی کے لیے ہو جیسا کہ ارشاد فرمایا:

الا للہ الدین الخالص ہاں خالص اللہ ہی کی بندگی ہے۔ (الزمر: ۳)

صوفیہ اور حقیقتِ حقوق

صوفیہ کے خصائل میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اولیاء اللہ کے راستوں پر چلتے ہیں۔ اس کے بندگان خاص کی منزلوں کو پانے کو سعی کرتے ہیں۔ اور حقوق کی اصلیت جاننے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور یہ سب کچھ وہ روح کی مکمل توجہ، نفس کشی، اللہ کی راہ میں زندگی پر موت کو ترجیح دینے، عزت کے بجائے اللہ کی خاطر ذلت قبول کرنے کا ایثار، گو ہر مراد پانے کے لیے آسائش کی جگہ تنگی اور ارادہ حق کو اپنا ارادہ تصور کرنے کے ساتھ حاصل کرتے ہیں۔

مذکورہ تمام احوال وحقائق اور حقیقتِ حقوق کی وادیوں میں سے پہلی وادی ہے۔

کیا تجھے معلوم نہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ "ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ تو حارثہؓ نے جواباً عرض کیا: "میں نے نفس کو دنیا سے کنارہ کش کر لیا، راتیں جاگتے بسر کیں اور دن پیاسے گذارے، اور اب کیفیت یہ ہے کہ میں عرش الٰہی کو صاف دیکھتا ہوں، اہل بہشت مجھے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے نظر آتے ہیں اور اہل جہنم کو آگ میں ہجوم کرتے ہوئے اپنے سامنے پاتا ہوں اور حارثہ کے اس بیان پر رسول اللہ نے فرمایا:

تو نے حقیقت کو پا لیا۔ بس اسی پر خود کو قائم رکھو۔

دیگر علوم ومعانی میں صوفیہ کا امتیازی مقام

کئی ایسی آیات واحادیث موجود ہیں۔ جن کا مفہوم بیان کرنے میں صوفیہ دیگر طبقاتِ اہل علم سے بہت ممتاز ہیں۔ اور جو تفسیر یا استنباط وہ کرتے ہیں وہ اعلیٰ اخلاق کی دعوت دیتی ہے احوال وفضائل اعمال کی بلندیوں سے سرفراز کرتی ہے اور دین میں ایسے بلند وارفع مقامات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جو صرف مؤمنین میں سے ایک مخصوص گروہ یعنی صوفیہ، صحابہ کرام اور تابعین کا حصہ ہیں۔ اور یہی وہ احوال وآداب اور اعلیٰ خوبیاں ہیں جو ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصا ہیں جیسا کہ آپ نے فرمایا:

"اللہ نے مجھے بہتر ادب واخلاق سکھایا۔"

اور اللہ نے آپ کی بلندیٔ اخلاق کو اس طرح بیان فرمایا:

وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ اور بے شک تمہاری خُو کو بڑی شان کی ہے (القلم: ۴)

صوفیہ کرام نے آیات واحادیث کی جو تفاسیر کی ہیں یا ان سے جو استنباطات کئے ہیں

وہ علماء و فقہاء کے بس کا روگ نہیں یہ کام صرف وہ صوفیہ کر سکتے ہیں جو اولوالعلم قائماً بالقسط کے دائرے میں آتے ہیں۔ ان کے ذمے یہی کچھ ہے وہ ان کا اقرار کریں اور ان کی حقیقت کو تسلیم کریں۔ مثلاً کچھ حقائق جو صوفیہ نے بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں: توبہ کی حقیقت، اس کی صفات، توبہ کرنے والوں کے درجات اور ان کے حقائق۔

ورع (پرہیزگاری) کی باریکیاں، اہل ورع کے احوال،

اہل توکل کے طبقات

اللہ کے فیصلوں کے آگے سر خم کرنے والوں کے مقامات۔

اور صبر کرنے والوں کے مراتب۔

اس کے علاوہ اور کئی ایسے احوال و آداب ہیں جن کے بارے میں صوفیہ کی اپنی تشریحات اور حقائق ہیں جو فقط انہی کا حصہ ہیں

صوفیہ میں سے ہر ایک اپنی اپنی بساط کے مطابق ان حقائق کو بیان کرتا ہے۔

یعنی جس قدر حصہ علم و دانش کا اللہ انھیں عطا فرماتا ہے، اسی کے مطابق وہ بیان کرتے ہیں۔

صوفیہ عظام کی خصوصیات کے بارے میں ایک بات یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ حرص، امید، ریاکاری، پوشیدہ خواہشات اور شرکِ خفی کے اسباب و علل سے بھی باخبر ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ کس طرح ان برائیوں سے خلاصی پاکر اللہ کی پناہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

وہ ہمہ وقت اللہ ہی سے صدقِ دل کے ساتھ التجا کرتے ہیں۔ اور اپنے ہر معاملے کو اسی پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی کے آگے سرِ نیاز خم کرتے ہیں اور اسی کے سہارے ہر قوت و خوف سے خود کو محفوظ رکھتے ہیں۔

صوفیہ کرام نے ایسے مسائل و نکات علوم دینیہ میں پیدا کیے، جو فقہاء و علماء کی فہم سے بالا ہیں اور یہ باریک مسائل ان اشارات میں مخفی ہوتے ہیں جن کی نشاندہی صرف صوفیہ کی بصیرت ہی کر سکتی ہے۔ جیسے عوارض و علائق، حجابات، پوشیدہ اسرار، مقامات اخلاص، احوال معارف، حقائق

انکار، درجات قرب، حقیقت توحید، منازلِ تعزیر، حقیقتِ بندگی، وجودِ عالم کو ازل کے ساتھ مٹانا (یعنی صرف ازل جو کہ اللہ کا حکم ذاتی ہے اور ہمارے وجود سے قبل بھی اسی طرح موجود تھا جیسے اب ہے کے ذریعے کائنات کے وجود کو جو بہر طور ازل کے مقابلے میں نیست ہے، فانی گردانا جائے .)
قربِ قدیم سے حادث کا معدوم ہو جانا عطا کرنے والے کے دیدار کی بقا، عطا، محسن کی فنا اور احوال و مقامات سے گذر، احساس مقصد کو احساس مقصود میں فنا کر دینا، اور دشوار گذار تاریک راستوں کو طے کرنا یہ ہیں وہ موضوعات جو صوفیہ ہی کا حصہ ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جنھیں مذکورہ تمام موضوعات سے متعلق پیچیدگیوں کا علم ہے۔ خلوت ہو کہ جلوت وہ ہر وقت ان پر کاربند رہتے ہیں۔ اور ان کی آبیاری خونِ جگر سے کرتے ہیں۔ انھیں ان سے اس قدر آگہی حاصل ہوتی ہے کہ وہ ان کے ذائقے اور کمی بیشی کے بارے میں صحیح معلومات دے سکتے ہیں۔ وہ ان نکات و مسائل کے بارے میں کسی کے بے دلیل دعوے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور وہ ان میں سے غلط و صحیح کی پہچان رکھتے ہیں۔ یہ اجمالی گفتگو تفصیلات سے کہیں بڑھ کر ہے اور یہ کسی طرح بھی قرآن وسنت سے باہر نہیں۔ ان کے اہل لوگ اس کی سمجھ رکھتے ہیں۔ اور علماء ان کا انکار نہیں کرتے۔ مگر کچھ ظاہری علوم رکھنے والے اس علمِ تصوف کے قائل نہیں۔ کیونکہ وہ کتاب اللہ اور احادیثِ رسولؐ میں سے صرف ظاہری احکام ہی کا علم رکھتے ہیں۔ اور وہی کچھ جانتے ہیں جس سے وہ اپنے مخالفوں پر سبقت لے سکیں۔ اور یہ عمل آج ہمارے دور کے وہی لوگ اپناتے ہیں جو دنیوی جاہ و منصب اور شان و شوکت کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ آپ کو ایسے ملیں گے جو تصوف میں مشغول رہنا چاہتے ہوں۔ کیونکہ اس میں جفاکشی اور محنت کرنا پڑتی ہے یہ گھٹنوں کو تھکا دیتا ہے اور دل میں درد کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس میں آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، اور یہ چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو چھوٹا بنا دیتا ہے۔ لوگ کوئی اس وادی میں قدم رکھنے کی ہمت کرتا ہے نفس کو اس کے حصول میں کوئی حظ نہیں آتا کیونکہ اس میں نفس کشی، دنیا و مافیہا سے بے خبری اور خواہشات سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء ظاہر اس علم (تصوف) کو ترک کر کے ایسے علم میں مشغول ہو گئے ہیں، جو انھیں دین میں بے جا گنجائش، تاویلات اور رخصت کی اجازت دے اور جو بشری لذتوں سے زیادہ قریب ہو اور عیش کوش طبائع پر بار نہ ہو۔

۵

صوفیہ عظام پر چند الزامات اور اُن کی تردید

ائمۂ دین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ جل جلالہ نے قرآن حکیم میں صوفیہ کا ذکر ذیل کے اسمائے کے ساتھ کیا ہے۔

قرآن حکیم میں صوفیہ کے مختلف اسماء[1]

الصادقین (سچے) الصادقات (سچی عورتیں) القانتین (ادب والے فرمانبردار) القانتات (ادب والی فرمانبردار عورتیں) الخاشعین (عاجزی کرنے والے) الموقنین (یقین والے) المخلصین (فقط اللہ کی بندگی کرنے والے) المحسنین (نیکی والے) الخائفین (اللہ کا خوف رکھنے والے) الراجین (امید رکھنے والے) الوجلین (ڈرنے والے) العابدین (عبادت کرنے والے) السائحین (روزے رکھنے والے) الصابرین (صبر والے) الراضیین (راضی رہنے والے) المتوکلین (توکل والے) المخبتین (تواضع والے) الاولیاء (اللہ کے ولی) المتقین (تقویٰ والے) المصطفین (منتخب چنے ہوئے) المجتبین (چنے ہوئے) الابرار (نیکوکار) المقربین (قرب والے) اور ایک اسم، مشاہدین کا ذکر اس آیت میں یوں فرمایا:

اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ[2] (یا کان لگائے اور متوجہ ہو)

---

(۱) ان اسماء میں سے اکثر قرآن حکیم میں بعینہٖ موجود ہیں مگر چند ایک بعینہٖ موجود نہیں تاہم مختلف آیات سے یہ ثابت ضرور ہوتے ہیں۔ جیسے "راجین" کہ یہ اسم جوں کا توں کسی آیت میں بھی مذکور نہیں۔ لیکن آیت: "أولئك يرجون رحمة الله" البقرۃ: ۲۱۸ سے ثابت ہے۔ (مترجم)

(۲) ق: ۳۷/۵۰۔

اور صوفیہ کے ایک اسم المطمئین کا ذکر یوں فرمایا :

أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱) — سن لو! اللہ ہی کی یاد میں دلوں کا چین ہے

اس کے علاوہ قرآن میں مزید اسمار صوفیہ بھی مذکور ہیں جیسے السابقین (سبقت لے جانے والے) المقتصدین (میانہ رو) اور "المسارعین الی الخیرات" بھلائیوں میں جلدی کرنے والے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

میری امت میں کئی ایسے بکھرے غبار آلود بالوں والے اشخاص موجود ہیں۔ کہ اگر وہ کسی معاملے میں اللہ پر قسم کھا جائیں تو وہ ان کو ان کی قسم میں سچا فرما دے (۲)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وابصہ سے (ایک استفسار کے جواب میں) فرمایا : اپنے دل سے پوچھو (۳) حالانکہ آپ نے کبھی کسی اور صحابی سے اس طرح کی بات نہیں کی۔

ایک روایت میں ہے :

میری امت میں سے ایک شخص، کہا جاتا ہے کہ وہ اویس قرنی ہیں جن کی شفاعت پر قبائل ربیعہ و مضر کے برابر افراد جنت میں داخل کیے جائیں گے (۴)

اور فرمایا :

میری امت میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب تلاوت کرتے ہیں تو مجھے ان کے دلوں پر خشیتِ الٰہی کے طاری ہونے کا سماں دکھایا جاتا ہے اور طلق بن حبیب ان ہی میں سے ہیں۔

اور فرمایا :

میری امت کے ستر ہزار افراد بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ لوگ کون ہوں گے؟ آپ نے فرمایا : جو خود کو داغتے ہیں اور

---

(۱) الرعد : ۲۸ ۱۳ (۲) سنن ترمذی : کتاب المناقب : باب : ۵۴، ۶۵

(۳) سنن دارمی : کتاب البیوع باب : ۲ (۴) سنن نسائی : کتاب القیامہ : باب : ۱۲

نہ ہی جادو منتر کی طرف رجوع کرتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں(۱)

اس ضمن میں آثار اخبار اس قدر کثرت سے تواتر کے ساتھ موجود ہیں کہ سب کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ بہر صورت جو کچھ ذکر سطور بالا میں مختلف اسمار اور افراد کا ہوا ان سے مراد امت محمدیہ کے صوفیہ ہی مراد ہیں۔

اگر امت مسلمہ میں صوفیہ کرام موجود نہ ہوتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ان کا ذکر نہ فرماتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اپنی کتاب محکم میں ان کا تذکرہ فرماتا۔ . .

جب ہم نے یہ جان لیا کہ لفظ ایمان تو تمام مؤمنین کو شامل ہے اور صوفیہ کو خصوصی اسمار سے پکارا گیا جیسا کہ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں۔ تو یہ بات واضح ہوگئی کہ عامۃ المسلمین پر ان کو خصوصیت حاصل ہے۔

ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ انبیار کرام علیہم السلام عند اللہ سب سے بڑے مقام کے حامل ہوتے ہیں۔ انبیار علیہم السلام اور اولیار کرام کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کا اپنے رب سے راز و نیاز کا تعلق ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ پر کمال درجے کا ایمان و یقین رکھنے کے ساتھ اس کے احکام پر بھی پوری طرح عمل پیرا ہوتے ہیں۔

انبیار علیہم السلام بشری تقاضوں جیسے خورد و نوش، نیند اور دیگر عوارض سے مبرا نہیں ہوتے۔ انھیں اولیار کرام پر وحی، رسالت اور نبوت کے سبب جو فوقیت حاصل ہے۔ اس میں کوئی بھی ان کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔

ہوتے مگر انہیں اولیار کرام پر وحی، رسالت اور نبوت کے باوصف جو فوقیت حاصل ہے اس میں کوئی بھی ان کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ۲۱، ۵۰۔

۶

صوفیہ کرام کی نظر میں فقہائے ظاہر کی حیثیت اور فقہ کی مدلّل تعریف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جسے اللہ تعالیٰ بھلائی سے نوازنا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے"۔

حسن بصریؒ فقیہہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"فقیہہ دنیا سے دل نہ لگانے والے، آخرت کو چاہنے والے، اور امور دین میں بصیرت رکھنے والے کو کہتے ہیں"۔

قولِ باری تعالیٰ ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ[1]	تو کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے، کہ دین کی سمجھ حاصل کرے۔

مذکورہ آیت مبارکہ میں لفظ دین، ظاہری و باطنی احکامات سے عبارت ہے۔ اسی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ احوال و مقاماتِ سلوک کے احکامات و معانی کی سمجھ حاصل کرنا طلاق، ظہار، قصاص، قسامت حدود اور غلاموں کو آزاد کرنے جیسے مسائل جان لینے اور سمجھ لینے سے کسی طرح کم فائدہ مند نہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ احکام ظاہری سے متعلق مسائل سمجھنے کی ضرورت اس قدر نہیں پڑتی جس قدر باطنی احکامات کے مسائل کی۔ کیونکہ ظاہری احکامات کے مسائل ہر وقت پیش نہیں

---

(۱) التوبہ ۹: ۱۲۲

آتے بلکہ جب بھی اس طرح کی کوئی صورت واقع ہو تو کسی فقیہہ سے اس کے بارے میں پوچھ لیا جاتا ہے ۔ اور اس طرح اس مسئلے کے پھر واقع ہونے تک سوال کرنے والا اس سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن باطنی احکاماتِ احوال و مقاماتِ سلوک کا جاننا عمر کے ہر حصے میں ہمہ وقت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جیسے صدق، اخلاص، ذکر الٰہی اور ترکِ غفلت جیسے احوال کو اختیار کرنے کے لیے کوئی معین وقت نہیں بلکہ بندے پر ہر لمحہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان پر عمل پیرا رہے۔ صوفیہ عظام ان احوال و مقامات سے کامل آگہی رکھتے ہیں اور اس کی جملہ تفصیلات بیان کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔

بندے کو اس بات کا علم رکھنا چاہئے کہ اس کا ارادہ جو خیال کیا ہے۔ اگر وہ حقوق سے تعلق رکھتا ہو تو اسے پورا کرے اور کسی خواہشِ نفس سے متعلق ہو تو اسے ترک کرے۔ جیسا کہ رب کائنات جل جلالہ نے فخر رسل سید الکونین علیہ التحیۃ والسلام سے خطاب فرمایا:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱)	اور اس کا کہا نہ مانو جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہشات کے پیچھے چلا اور اس کا کام حد سے گزر گیا۔

الغرض مذکورہ بالا احوال کا تارک وہی ہو سکتا ہے جس کے قلب پر غفلت کی تاریکیاں چھا گئیں ہوں۔

موضوعات تصوف کی وسعت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ قرآن و سنت سے جس قدر احکامات تصوف، صوفیہ کرام نے اخذ کئے وہ بہر حال فقہاء کرام کے مستنبط احکام سے کہیں بڑھ کر ہوں کیونکہ علم تصوف کی وسعتوں کو محدود نہیں کیا جا سکتا اس کے راستے لطیف اشارات، دشوار گزار صحراوں، دلکش خیالات اور عطا و بخشش کے خزانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اور اس کا ادراک رکھنے والے ہر آن اہل طلب کی جھولیاں بھر رہے ہیں۔

اس دنیا میں ہر علم کی ایک حد ہے اور یہ حد تصوف پر آکر ختم ہو جاتی ہے جب کہ تصوف کی حد کسی دوسرے علم پر ختم نہیں ہوتی اس کو کسی دوسرے علم کی احتیاج نہیں۔ اس کا یہ طریق ہے کہ سالک کو اپنے اعلیٰ مدارج کی طرف لے جاتی ہے۔ اس علم کا کوئی کنارہ نہیں کیونکہ اس کے مقصود

---

(۱) الکہف: ۲۸

کی کوئی حد نہیں اور علمِ تصوف کا وہ اعلیٰ ترین درجہ جسے علم الفتوح کہتے ہیں، اللہ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس کے قلب کو اپنے کلام کی سمجھ عطا کر کے اپنے خطاب سے صحیح استنباط کا ملکہ عطا فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا[1]

تم فرما دو اگر سمندر میرے رب کی باتوں کیلئے سیاہی ہو تو ضرور سمندر ختم ہو جائے گا اور میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔ اگرچہ ہم ویسا ہی اور اس کی مدد کو لے آئیں۔

اور فرمایا:-

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ[2]

کہ اگر احسان مانو گے تو میں تمہیں اور دوں گا۔

بندوں پر اس کے فضلِ خاص کی کوئی نہایت نہیں۔ انہیں ہر حال میں شکر ادا کرتے رہنا چاہیئے کیونکہ شکر ادا کرنا خود اپنی جگہ ایک نعمت ہے اور مستوجبِ شکر ہے۔ اور اس کے بے پایاں لطف وکرم کا ضامن۔

---

(۱) الکہف : ۱۰۹ (۲) ابراہیم : ۷

علومِ دینیہ اور اس کے ماہرین

علوم دینیہ میں سے ہر علم اس کے ماہرین سے مخصوص ہے۔ جب کہ علماء کی ایک جماعت نے علم شریعت میں تخصیص سے انکار کیا ہے۔ اور امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف وہی کچھ لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیا جو ان پر نازل کیا گیا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (۱)

اے رسول! پہنچا دو جو کچھ تم پر تمھارے رب کی طرف سے اتارا گیا۔

اور اسی ضمن میں قول نبوی ہے: "جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم بھی جان لو تو ہنسو گے کم اور روؤ گے زیادہ۔"

اگر وہ علم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ منور میں موجود تھا مگر صحابہ اس سے بے خبر تھے اس کے پھیلانے کی اجازت ہوتی تو ضرور صحابہ کو اس سے آگاہ کیا جاتا۔ اور اگر صحابہ اس کے بارے میں سوال کرنا درست سمجھتے تو ضرور پوچھتے (یعنی یہ بات ثابت ہو گئی کہ کچھ علوم ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں تخصیص ہوتی ہے)

اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسے افراد موجود تھے جو بعض مخصوص علوم سے بہرہ ور تھے۔ جیسا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اسماء منافقین کا علم رکھتے تھے

(۱) المائدہ: ۶۷

جو انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا تھا۔ اور اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ان سے منافقین کے ناموں کے بارے میں پوچھتے تو کہتے "کیا میں ان میں سے ہوں"؟

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر علوم سکھائے ہیں! اور یہ علوم آپ نے میرے سوا کسی اور کو نہیں تعلیم کئے۔

تخصیص علوم کے باب میں ہم نے تفصیلی ذکر تو اس کتاب کے آخر میں کیا ہے یہاں اس کے بارے میں صرف اسی قدر کہنا ہے کہ جو علم، صوفیا کرام محدثین اور فقہار عظام کے ہاں متداول ہے۔ وہ علم دین ہے جس کی ہر شاخ سے واقفیت رکھنے کے لیے اہل علم میں سے مخصوص افراد ہیں جنھوں نے علم دین کی تمام اصناف پر علیحدہ علیحدہ تصانیف اور اقوال ہمارے لیے چھوڑے ہیں۔

الغرض ہر علم اور ہر فن کے اپنے اپنے ماہرین ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ محدثین نے کبھی اپنے مسائل کے حل کے لیے فقہار کی طرف رجوع کیا ہو۔ اور نہ ہی کبھی فقہار نے فقہ کی پیچیدگیوں کے بارے میں محدثین سے گفتگو کی۔

اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی شخص مقامات سلوک و لطائف قلب کے بارے میں صوفیہ کے علاوہ کسی سے معلومات حاصل کر سکے۔

اور کسی کو بھی یہ بات زیب نہیں دیتی کہ کسی کے بارے میں معلومات نہ رکھتے ہوئے کوئی بات کرے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو بلاشبہ خود کو ہلاکت میں ڈالے گا۔ اللہ ہمیں اس طرح کی غلطیوں کے ارتکاب سے اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین

○

۸

صوفی کو 'صوفی' کیوں کہتے ہیں؟

ایک شخص نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ تو نے محدثین کو علم حدیث، اور فقہار کو علم فقہ سے منسوب کیا۔ مگر صوفیہ کو کسی مخصوص کیفیت، حال یا علم سے منسوب نہ کیا۔ جب کہ زاہدوں کو زہد، توکل کرنے والوں کو توکل اور صبر کرنے والوں کو صبر سے منسوب کیا۔

میرا جواب یہ ہے کہ صوفیہ کو کسی ایک صفت یا علم سے منسوب نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ معدنِ علم اور طرح طرح کے احوال محمودہ سے متصف ہوتے ہیں، ہمہ وقت منازلِ ترقی طے کرتے رہتے ہیں، ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتے ہوئے اپنے رب کی قربتوں سے شاد کام ہوتے ہیں۔ اور ہر لحظہ اللہ سے بہت قریب ہونے کے مشتاق رہتے ہیں۔ اب ایسی حالت میں ان کو کسی ایک مخصوص علم یا حال سے منسوب کرنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ لہٰذا میں نے ان کے ظاہری لباس ہی سے انھیں منسوب کیا (یعنی اون کا لباس پہننے والے) کیونکہ اون کا لباس پہننا انبیاء علیہم السلام اور اولیاء و اصفیاء کا شعار رہا ہے جیسا کہ بیشتر روایات اس کی مؤید ہیں۔

اگر میں نے ان کو ان کے ظاہری لباس کی مناسبت سے ہی ایک نام سے یاد کیا ہے تو فقط اس لیے کہ یہی لفظ صوفی ہی ان کے تمام علوم، اعمال اور اخلاقِ حمیدہ کا پتہ دیتا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کا ذکر کیا تو انھیں ان کے ظاہری لباس کی مناسبت سے حواری کے نام سے پکارا۔ جیسا کہ ارشاد ہے: و اذ قال الحواریون[1] الخ

---

(۱) المائدہ: ۱۱۲ ۵

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو اس لیے حواریون کے نام سے پکارا گیا کہ وہ سفید لباس پہنتے تھے۔ اللہ نے انہیں ان کے لباس سے منسوب کر کے پکارا ان کے اعمال، احوال اور علوم و اخلاق سے نہیں۔

میرے نزدیک صوفیہ بھی اپنے ظاہری لباس سے اسی طرح منسوب کر کے پکارے جاتے ہیں جیسا کہ سفید لباس پہننے کے باعث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو حواری کہا گیا۔ اور بلاشبہ صوف پہننا انبیاء و اولیاء کا طریق ہے۔

اصطلاح صوفی کی تحقیق

کسی نے پوچھا کہ صحابہ کرام اور ان کے بعد کے لوگوں میں تو صوفیہ کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ اگر کوئی تذکرہ ہے بھی تو فقط زاہدوں، عابدوں، سیاحوں فقراء اور صحابہ کرام کا۔

ہم اللہ کی توفیق سے یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پاک سے مشرف ہونے کی ایک اپنی حرمت اور خصوصیت ہے اور جن نفوس قدسیہ کو یہ سعادت حاصل رہی انہیں صحابی کے نام سے ہٹ کر کسی اور نام سے موسوم کرنا تو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اور کیا آپ پر یہ عیاں نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم، زاہدوں، عابدوں، اللہ پر توکل کرنے والوں، فقراء، مجاہدہ نفس کرنے والوں اور صابروں کے امام تھے، اور انھوں نے جو مقام بلند (مقام صحابیت) حاصل کیا وہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ہی کا اثر تھا۔

اس لحاظ سے صحابیٔ رسولؐ ہونا خود سب احوال سے بڑھ کر ہے اور اس سے بڑی کوئی فضیلت نہیں۔ اور ایسی صورت میں صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی اور نام سے یاد کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ (اسی بنا پر صحابی کو صوفی کے نام سے نہیں موسوم کیا گیا)

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ صوفی بعد کے زمانے کی ایک خود ساختہ اصطلاح ہے جسے بغدادیوں نے گھڑا، حالانکہ ایسا نہیں کیونکہ حضرت حسن بصری جنھوں نے بعض صحابہ کا دور پایا تھا کہتے ہیں کہ:

"میں نے طواف کعبہ کے دوران ایک صوفی دیکھا اور اسے کچھ دینا چاہا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میرے پاس چار درہم موجود ہیں جو میرے لیے کافی ہیں۔"

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں: "اگر ہاشم الصوفی نہ ہوتے تو مجھے ریار کی حقیقت معلوم نہ ہو سکتی۔"

تاریخ مکہ کرمہ پر مشتمل ایک کتاب اخبار مکہ[1] میں محمد بن اسحاق بن یسار اور دوسرے راویوں سے روایت ہے کہ "اسلام سے قبل مکہ پر ایک ایسا دور بھی آیا تھا کہ بیت اللہ کا طواف کرنے والا کوئی نہ تھا، ان حالات میں کسی دور دراز مقام سے ایک صوفی آتا اور طواف کر کے واپس چلا جاتا۔"

اگر مذکورہ روایت درست ہے تو ثابت ہوا کہ لفظ صوفی قبل از اسلام بھی مروج تھا اور نیکوکار لوگوں پر اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ باقی اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ثبوت علمِ باطن

اہل ظاہر کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ہم تو صرف ظاہری طور پر علم شریعت کو جاننے کا اقرار کرتے ہیں، جب کہ علم باطن اور علم تصوف سراسر بے معنیٰ ہیں۔ اللہ کی توفیق و تائید سے ہم یہ جواب عرض کرتے ہیں کہ علم شریعت ایک ہی علم او راسم ہے جو دو لفظوں روایت اور درایت کو شامل ہے یعنی علم شریعت بیک وقت اعمال ظاہری و باطنی کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ علم جب تک دل میں رہے باطنی کہلاتا ہے اور زبان تک پہنچے تو ظاہری۔ گویا علم کی دو قسمیں ہوئیں۔ ظاہری اور باطنی، اور یہ علم شریعت ہی ہے جو ظاہری و باطنی اعمال کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

اعمال ظاہری سے مراد وہ اعمال ہیں جو انسان کے ظاہری اعضاء انجام دیتے ہیں پھر اعمال ظاہری کی دو قسمیں ہیں، عبادات اور احکامات۔ عبادات میں طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد وغیرہ شامل ہیں جب کہ حدود طلاق، غلاموں کو آزاد کرنا، خرید و فروخت کے مسائل، وراثت اور قصاص وغیرہ احکامات میں شمار ہوتے ہیں۔ اور جملہ احکامات و عبادات انسان کے ظاہری اعضاء سے ہے۔

جہاں تک اعمال باطنی کا تعلق ہے، تو وہ قلب سے متعلق ہیں۔ جیسے مقامات، احوال

---

(۱): اخبار مکہ: تاریخ مکہ سے متعلق ایک کتاب جس کے مصنف کے بارے میں نکلسن لکھتا ہے: POSSIBILY THE WORK OF AZRAQI یعنی ممکن ہے اس کے مصنف ازرقی ہوں۔ (مترجم)

یعنی تصدیق، ایمان، یقین، صدق، اخلاص، معرفت، توکل، محبت، رضا، ذکر، شکر، توبہ، خشیت، تقویٰ، مراقبہ، فکر، اعتبار، خوف، امید، صبر، قناعت، تسلیم، تفویض، قرب، شوق، وجد، حزن، ندامت، حیا، شرم، تعظیم اور ہیبت۔

مذکورہ اعمالِ باطنی کا اپنا اپنا مفہوم و معنی ہے اور ان میں سے ہر ایک کی صحت و عدم صحت پر آیات قرآنیہ اور احادیث نبوی شاہد ہیں۔ جس نے ان کو جان لیا وہ ان کا عالم ٹھہرا اور جس نے ان کو نہ سمجھا وہ ان سے بے خبر رہا۔

جب ہم علم باطن کا نام لیتے ہیں تو ہماری مراد ان اعمالِ باطنی کا علم ہوتا ہے جو قلب پر جاری ہوتے ہیں۔ اور علمِ ظاہر کا مفہوم ان اعمال ظاہری کا علم ہے۔ جو انسان کے ظاہری اعضاء انجام دیتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :

وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً[1]۔ — اور تمھیں بھرپور دیں، اپنی نعمتیں، ظاہر اور چھپی۔

یہاں اس آیت مبارکہ میں نعمۃ و ظاهرۃ سے اعمالِ ظاہری مراد ہیں۔ جو انسان کے ظاہری اعضاء کے لیے اللہ کی نعمت ہیں جب کہ نعمۃ باطنۃ قلب پر جاری ہونے والے احوال کو کہتے ہیں۔ گویا ظاہری اور باطنی اعمال کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور ان میں سے کوئی ایک، کسی دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

فرمانِ الٰہی ہے :-

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ[2] — اور اگر اس میں رسول اور اپنے ذی اختیار لوگوں کی طرف رجوع کرتے تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے، یہ بعد میں کاوش کرتے ہیں۔

---

(۱) لقمان: ۲۰ (۲) النساء ۸۳

آیت مذکورہ میں مستنبط علم سے مراد علم باطن ہے جو کہ علم تصوف سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ قرآن و حدیث سے اخذ کردہ نکات اور علوم صوفیہ کرام ہی کا حصہ ہیں۔ انشاء اللہ ہم آگے چل کر ان میں سے کچھ کا ذکر کریں گے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ علم، قرآن، حدیث اور اسلام ہر ایک کے دو دو رخ ہیں یعنی ظاہری و باطنی۔

صوفیہ علوم ظاہری و باطنی کے ثبوت کے لیے بے شمار عقلی و نقلی دلائل رکھتے ہیں جن کی تفصیلات میں جانا یہاں حد اختصار سے تجاوز کا باعث ہو سکتا ہے۔ بہر حال جو کہا گیا یہ بھی صاحب فہم کے لیے کافی ہے

حقیقتِ تصوف

تصوف کی حقیقت کے بارے میں محمد بن علی القصابؒ، جو حضرت جنیدؒ کے استاد تھے، نے فرمایا: تصوف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اعمال کا نام ہے۔ جو انھوں نے ایک مبارک عہد میں شرفاء و صلحاء کے ایک گروہ کے سامنے انجام دیئے۔

جنید بغدادی نے تصوف کی تعریف یوں بیان کی: یہی تصوف ہے کہ تیرے اور تیرے رب کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ رہے۔

جناب رویمؒ بن احمد نے ماہیتِ تصوف پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے: اپنے نفس کو اللہ کی مرضی کے مطابق رکھنا ہی تصوف ہے۔

سمنونؒ تصوف کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: تو کسی دنیوی چیز کا مالک بنے اور نہ کوئی شے تیری مالک بنے، یہی تصوف ہے۔

ابو محمد جریری نے کہا: ہر بری اور خسیس عادت کو چھوڑ کر پاکیزہ عادات اپنا لینا تصوف ہے۔

عمرو بن عثمان مکیؒ کے نزدیک تصوف یہ ہے کہ بندہ ہر وقت عمل صالح اختیار کرنے کا خواہاں رہے۔

علی بن عبدالرحیم قناد معنی تصوف کو یوں بیان کرتے ہیں: اپنے مقام و مرتبہ کو

محبت الٰہی کے جذبے میں گم کر کے فنا سے کنارہ کش ہو کر دوام سے واصل ہونا حقیقت تصوف ہے۔

صوفیہ کون ہیں؟

صوفیہ کرام کی کیا تعریف ہے اور وہ کون ہیں۔ اس سوال کا جواب عبدالواحد بن زید یوں دیتے ہیں: صوفیہ وہ ہیں جو اپنی عقلوں اور قلوب کو مصائب و آلام کے باوجود ثابت قدم رکھتے ہیں۔ اور نفس کے ہر شعلۂ شر انگیز کو مرشدِ کامل کی اتباع سے سرد کر دیتے ہیں۔

ذوالنون مصری کہتے ہیں: جسے طلب تھکا نہ سکے اور سلب بے قرار نہ کرے وہ صوفی ہے اور صوفیہ ان لوگوں کا طائفہ ہے جنھوں نے ہر شے پر اللہ ہی کو غالب جانا، یہی وجہ ہے اللہ نے انھیں ہر چیز پر غلبہ عطا کیا۔

ایک صوفی سے کسی نے پوچھا کہ کس کی صحبت میں بیٹھوں؟ انھوں نے کہا: صوفیہ کی صحبت اختیار کرو کیونکہ وہ قبیح چیزوں سے بچنے کے طریقے جانتے ہیں اور مادی قوت و عظمت کو اپنے ہاں جگہ نہیں دیتے۔ ان کی صحبت تجھے اس قدر بلند کر دے گی کہ خود پر ناز کرے گا۔"

جنید بن محمد کا قول ہے: صوفیہ اللہ کے پسندیدہ بندے ہیں جب چاہتا ہے انھیں ظاہر کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے پوشیدہ کر دیتا ہے۔

ابوالحسین نوریؒ فرماتے ہیں: صوفی وہ ہے جو سماع سنتا ہے اور اسباب کو تابع کر لیتا ہے۔"

اہلِ شام صوفیہ کو فقراء کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بھی قرآن کریم میں صوفیہ کو فقراء کے نام سے ہی پکارا ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[1] — ان فقیروں کے لیے جو راہ خدا میں روکے گئے۔

ابوعبداللہ احمد بن محمد بن یحییٰ الجلاء صوفی کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہم تعریف صوفی کو شرط علم سے مشروط نہیں کرتے بلکہ صوفی وہ ہے جو اسباب سے بے نیاز ہو کر اللہ کے ہاں قریب ترین مقام پر فائز اور اللہ کی جانب سے ہر مقام کو جاننے کی نعمت سے بہرہ ور

---

(۱) البقرۃ: ۲۷۳

ہوتا ہے۔ لفظ صوفی سے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اصل میں صَفَوِی تھا ادائیگی میں ثقیل ہونے کے باعث صوفی کہا جانے لگا۔

ابوالحسن قناد کہتے ہیں، صوفی، صفا سے مشتق ہے اور صفا سے مراد اللہ کے لئے ہمہ وقت بشرطِ وفاداری قیام میں رہنا ہے۔

بعض کے نزدیک صوفی وہ ہے جسے دو عادتوں یا حالتوں کا سامنا ہو تو وہ ان میں سے اعلیٰ ترین پر پابند ہو۔

صوفیہ کی ایک رائے کے مطابق بندہ، عبودیت میں ثابت قدم ہو جانے اور اللہ کی جانب صفارِ قلب پا لینے کے بعد حقیقت سے آگہی حاصل کرتا ہے اور احکام شریعت سے قریب تر ہو جاتا ہے یعنی صفار، باطن کے حصول کے بعد ہی کوئی بندہ صوفی بنتا ہے۔

اگر کوئی آپ سے صوفی کی تعریف دریافت کرے تو جواب یہی ہے کہ معرفتِ الٰہی سے بہرہور اپنے رب کے احکامات پر ثابت قدمی سے عمل پیرا کسی چیز کو یقین کی حد تک پہچان لینے کے بعد تسلیم کرنے والے اور اپنے مقصود کے حصول میں خود کو گم کر دینے والے کو صوفی کہتے ہیں۔

ابوالحسن قناد کہتے ہیں۔ اگرچہ ظاہری لباس کی مناسبت سے ہر صوفی کو صوفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، مگر حقیقتاً صوفیہ اپنے احوال و مقامات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔

ابوبکر شبلی رہ لفظ صوفی کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ صفاء باطن کی بنا پر صوفیہ کو اس نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا باطن صاف ہو جاتا ہے جس کی مناسبت سے ہی انہیں صوفی کہا جاتا ہے۔ اور آپ نے مزید فرمایا کہ صوفیہ اصحابِ صفہ کی یادگار ہیں۔

جہاں تک ظاہری لباس کے اعتبار سے صوفی کے پکارے جانے کا تعلق ہے تو اس کے ثبوت کے لیے کئی روایات پیش کی جا سکتی ہیں مگر طوالت مانع ہے۔ مختصر یہ کہ انبیا علیہم السلام اور سلف صالحین نے صوف پہننے کو اپنا شعار بنایا۔

تصوف سے متعلق ابراہیم بن مولد الرقی نے کوئی سو سے زائد جوابات دیئے ہیں۔ بہر صورت جو کچھ ہم نے اس ضمن میں پیش کیا وہ بھی کافی ہے۔

علی بن عبدالرحیم القنادؒ نے تصوف اور اہل تصوف کے انحطاط پر یہ اشعار کہے ہیں ؎

○ اهل التصوف قد مضوا صار التصوف مخرقه

صار التصوف صيحة و تواجد و مطبقه

○ مضت العلوم فلا علوم و لا قلوب مشرقه

كذبتك نفسك ليس ذی سنن الطريق المخلقه

○ حتى تكون بعين من عنده العيون المحدقه

تجری عليك صروفه و هموم سرك مطرقه

ترجمہ اشعار: اہل تصوف باقی نہ رہے اور تصوف فسانہ بن کر رہ گیا۔ حالت یہ ہے کہ چیخ و پکار دکھاوے کے سوز و وجد اور ایک نام ہی کیفیت کو تصوف کا نام دیا جانے لگا۔

اب علوم رہے نہ روشن دل مجھے تیرے نفس نے جھوٹی خبر دی اور یہ کوئی اچھا طریق نہیں۔ یہاں تک کہ تو اس شخص کی مثل ہو گیا کہ جس کو چاروں طرف سے آنکھیں گھور رہی ہوں اور تجھ پر اس (تصوف) کے حادثات گذر رہے ہیں مگر تیرے باطنی ارادے پسپا ہیں۔

بعض مشائخ کرام نے تصوف کی تعریف تین طرح سے کی ہے۔

وہ کہتے ہیں: صفائے قلب، حسن خلق، اور اتباع شریعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تصوف ہے۔

○ ترک ملکیت، لغو گفتگو سے پرہیز اور فقط اللہ کو اپنے لئے کافی سمجھنا تصوف ہے۔

○ اللہ کا بندے کو صفائے باطن کی صفت سے متصف کرنا ہی تصوف ہے۔

میں نے حصری سے صوفی کی تعریف پوچھی تو انھوں نے فرمایا: صوفی ایسے بندے کو کہتے ہیں جسے نہ زمین نے اپنے اوپر اٹھا رکھا ہو اور نہ آسمان اس پر سایہ فگن ہو۔ یعنی نہ آسمان نے

براہ راست اس کو اپنے سایہ تلے رکھا ہوا ہے اور نہ ہی زمین نے اٹھا رکھا ہے بلکہ وہ اللہ کے سہارے قائم رہتا ہے اور ہر واقعے کو منجانب اللہ تصور کرتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں نے اللہ کے کلام میں اپنی رائے کو شامل کیا تو کون سا آسمان مجھے پناہ دے گا اور کونسی زمین مجھے اپنے اوپر اٹھائے گی۔

○

٩

توحید اور مؤحد

یوسف بن حسین رازیؒ نے فرمایا: ایک شخص نے ذوالنون مصریؒ سے حقیقتِ توحید بیان کرنے کے لیے عرض کیا تو انھوں نے فرمایا: حقیقتِ توحید یہ ہے کہ تو یہ جان لے کہ جملہ اشیا میں قدرتِ الٰہ اس طرح موجود ہے کہ اسے ان اشیاء میں شامل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ وہ پہلے ہی سے ان میں اصلاً موجود ہوتی ہے۔ اور اللہ نے ہر چیز کسی مشق یا کوشش کے بغیر تخلیق کی ہے، اس کی صفت ہی ہر شے کی علت ہے جب کہ اس کی صنعت کی کوئی علت نہیں۔ آسمانوں اور زمینوں کی تدبیر کرنے والا سوائے اس کے اور کوئی نہیں۔ اور تیرے وہم و گمان میں اس کا جو بھی تصور موجود ہے وہ قطعی اس سے مختلف ہے۔

حضرت جنیدؒ توحید کے بارے میں فرماتے ہیں: توحید یہ ہے کہ مؤحد (اللہ کو ایک جاننے والا) پوری طرح اللہ کے کمال احدیت کے ساتھ اس کی وحدانیت کا یقین کرتے ہوئے یہ جان لے کہ اس کی ذات واحد ہے کہ نہ اسے کسی نے جنم دیا اور نہ اس نے کسی کو جنم دیا۔ اور اس کے علاوہ تمام اضداد، امثال، اشباہ اور معبودوں کی مکمل نفی کرے۔

ایک اور موقع پر جنید بغدادیؒ نے موضوعِ توحید پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا: توحید ایک ایسا مفہوم ہے کہ جس میں تمام اشیاء و رسوم معدوم اور جملہ علوم ختم ہو کر رہ جائیں۔ اور صرف اسی کی ذات لم یزل باقی رہ جائے۔

مذکورہ بالا دونوں تعریفیں توحید ظاہری سے متعلق نہیں۔ اور جو تعریف ہم اب پیش کرتے ہیں اس کا تعلق توحید خاص سے ہے۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں۔ توحید خاص یہ ہے کہ بندہ اللہ کے حضور ایسے وجود کی مانند ہو جس پر اس کی تدبیر کے تصرفات اس کے احکامِ قدرت کے وقوع کے ساتھ جاری رہیں، وہ بحرِ توحید کی موجوں سے کھیلتا ہوا اس طرح فنائے نفس سے ہمکنار ہو کہ دعوتِ خلق سے اسے سروکار نہ رہے وہ قربِ حق تعالیٰ کے ایسے مقام پر فائز ہو کہ فنائے نفس کی منزل پر پہنچ کر اس کی حس و حرکت بھی رخصت ہو جائے۔ اور یہاں تک کہ وہ وجودِ وحدانیتِ رب کو قبول کرنے کا احساس تک بھی نہ کر سکے۔ اور وہ اپنے انجام کو آغاز جان لے تاکہ اس کی حالت اس کے وجود میں آنے سے قبل کی سی ہو جائے۔

مزید فرمایا کہ توحید، علائقِ زمانی کی تنگنائیوں سے نکل کر میدانِ سرمدیت میں قدم رکھنے کا نام ہے۔

جنید کے قول "اس کی حالت اس کے وجود میں آنے سے قبل کی سی ہو جائے" کی وضاحت کے لیے ہم یہ آیت مبارکہ پیش کرتے ہیں:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ[1]	اور اے محبوب! یاد کرو جب تمہارے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی نسل نکالی۔

اور جنید بغدادی خود اپنے قول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس وقت جب کہ بندوں کے وجود نہ تھے تو صرف ارواح نے ہی اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا تھا یعنی بندہ اپنے وجود کو اسی طرح نیست کر دے جیسے یوم الست کو صرف روح تھی اور اسی نے اقرارِ توحید کیا تھا۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ سے ایک شخص ولف بن جحدر نے توحید مجرد کی حقیقت کے بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے فرمایا: تجھ پر افسوس ہے کہ توحید مجرد کے بارے میں زبانی وضاحت چاہتا ہے حالانکہ جس نے توحید کو الفاظ کا جامہ پہنایا وہ ملحد ہوا، جس نے اس کی طرف اشارہ کیا وہ مشرک ٹھہرا، جو اس سے خاموش رہا وہ جاہل ہے جس نے خود کو واصل سمجھا اسے کچھ ہاتھ

---

(۱): الاعراف: ۱۷۲

نہ آیا، جس نے خود کو قریب سمجھا وہ دور ہے اور جس نے بتکلف وجد طاری کیا اس نے سب کچھ کھو دیا۔

جان لو کہ تم نے جب کبھی اسے اپنے اذہان، عقول اور خیالات کی مدد سے بزعم خود پوری طرح پہچاننے کی کوشش کی تو بے شک تمھارا نتیجہ باطل اور تمھارے اپنے وجود ہی کی طرح مصنوعی ثابت ہوا۔

اگر ہم یہاں ابوبکر شبلیؒ علیہ الرحمۃ کے توحید سے متعلق مذکورہ بالا قول کی کچھ وضاحت پیش کر دیں تو بے محل نہ ہوگا۔ کہنا یہ ہے کہ ان کی تمام تر تعریف توحید کا خلاصہ، قدیم کو حادث کے ذریعے پہچاننے سے علیحدہ کرتا ہے یعنی یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان جو کہ حادث ہے وہ اللہ کی ذات قدیم کو واقعتاً پہچان سکے یا اس کا وصل حاصل کر سکے۔

بندوں کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق اس کی حمد و ثنا اور عبادت انجام دیتے رہیں۔

یوسف بن حسین نے توحید کی تین تعریفیں بیان کی ہیں:

○ پہلی:

توحید عامہ سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ صرف وحدانیت کے پیش نظر رہتے ہوئے اضداد، امثال، اشکال اور انداد غائب ہو جائیں۔ اس حالت میں کہ حقیقتِ تصدیق کے غائب ہو جانے اور حقیقتِ اقرار کے باقی رہنے کے ساتھ رغبت و خوف سے سکون ملے۔

مذکورہ تعریف میں حقیقتِ تصدیق کے غائب ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ حقیقتِ تصدیق کے باقی رہنے سے بندہ رغبت و خوف سے سکون نہیں پا سکتا۔

○ دوسری:

توحید اہل حقائق: اس توحید کی ایک ظاہری تعریف اس طرح ہو سکتی ہے کہ رویتِ اسباب واشباہ کے غائب ہو جانے کے ساتھ اقرارِ وحدانیت ہو۔ اور یہ اقرار اس طرح ہو کہ امر و نہی پر ظاہر و باطن میں عمل ہو۔ اور قیام شواہد و استجابت کے ساتھ رغبت و خوف ماسوا کا ازالہ کیا جائے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ معارضۂ رغبت وخوف کے ازالے کا کیا مطلب جب کہ دونوں حق ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بلا شبہ رغبت وخوف دونوں حق ہیں اور دونوں اپنی جگہ موجود مگر انھیں غلبۂ وحدانیت نے اس طرح مغلوب کر رکھا ہے جیسے سورج کی روشنی ستاروں کی روشنی پر غالب آجاتی ہے اور وہ بظاہر نظر نہیں آتے۔

تیسری:

توحید خاص، اور وہ یہ ہے کہ بندہ اپنی حقیقت، وجد اور قلب کے ساتھ اللہ عزوجل کے حضور میں اس طرح حاضر ہو کہ اس کے تصرفات تدبیر اس پر جاری ہوں اور اس کے احکام قدرت اس پر اس طرح مرتب ہوں کہ بندہ بحر توحید میں غوطہ زن ہو کر اپنی مراد کو واقعتاً پانے کے بعد اپنے نفس اور حواس کو فنا کر چکا ہو اور وہ پھر سے اسی طرح ہو گیا ہو جیسا کہ ہونے سے قبل تھا اور اس کا بیان جیسا کہ حضرت جنید نے کہا، اللہ کے اس قول میں ہے "و اذ اخذ ربك من بنی آدم" اس آیت کا ذکر ہم پیچھے کر آئے ہیں۔

حقیقت توحید کے بارے میں مشائخ عظام کا ایک اور بیان بھی ہے، اور وہ بیان ہے اس پر فائز ہستیوں کا۔ انھوں نے اس کے بارے میں جو اشارات دیئے ہیں وہ اگرچہ سمجھنے سے بالا ہیں تاہم بعض کا ہم یہاں ذکر کر کے ان کی ممکن حد تک شرح بھی پیش کرتے ہیں۔

یہ اشارات دراصل ایک پیچیدہ علم ہے جو اس کے اہل لوگوں پر تو واضح ہیں، اور جب ان کی تشریح کی جاتی ہے تو ان کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے ان کی تشریح پر اس بات نے ابھارا کہ میں نے ان کا اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے جب کہ کتاب کو وہ بھی پڑھیں گے جو اسے سمجھ لیں گے اور وہ بھی جو نہیں سمجھ پائیں گے اور ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔

ہم نے جن اشارات کا ذکر کیا ہے ان میں سے رویم بن احمد بن یزید البغدادی کا یہ قول ہے کہ توحید آثار بشریت کے مٹنے اور صرف الوہیت کے باقی رہ جانے کو کہتے ہیں۔

واضح رہے کہ آثار بشریت کے مٹنے سے ان کی مراد عادات نفس کا تبدیل ہو جانا ہے کیونکہ یہ عادات نفس ربوبیت کو اپنی نظر میں اپنے افعال سے منسوب کرتی ہیں، جیسے بندے کا کہنا: انا "میں" جب کہ انا صرف اللہ ہی کہہ سکتا ہے کیونکہ انیت صرف اللہ ہی کے لیے ثابت ہے۔

یہ تو معنی تھا "آثارِ بشریت کے مٹنے" کا اور "صرف الوہیت باقی رہ جانے کا مفہوم یہ ہے کہ قدیم کو حادث چیزوں سے بالکل الگ کرے۔

ایک اور بزرگ کہتے ہیں کہ توحید، توحید کے سوا سب کچھ بھول جانے کو کہتے ہیں۔ یعنی صرف وہی کچھ یاد رہے جس پر حکم حقیقت کا وجوب ثابت ہو۔

مزید کہا کہ وحدانیت حق کے سوا سب کچھ فنا کر دینے اور صرف اس کے باقی رہنے کا نام ہے ماسوا کے فنا سے مفہوم فنا بعد ہے۔ اس طرح کہ اپنے نفس وقلب کے ذکر کو فنا کر کے اللہ کی عظمت اور اسی کے ذکر کو دوام دے۔

ایک شیخ کہتے ہیں کہ توحید میں خلق اور اللہ کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہوتا۔ اور توحید حق تعالے کے لیے ہے جب کہ خلق صرف اس کے طفیل میں ہے۔

توحید کے بیان میں ہم یہ آیت پیش کرتے ہیں اور اسی سے توحید کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ قول باری تعالیٰ ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱)	اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف سے قائم ہو کر۔ اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں جو عزت والا اور حکمت والا ہے۔

اللہ نے اپنی توحید پر خلق سے پہلے گواہی دی گویا من حیث الحق توحید کی حقیقت وہی ہے جس پر اللہ نے خود خلق سے پہلے گواہی دی اور من حیث الخلق اس کی حقیقت وہی ہے۔ جو انھوں نے حقیقت وجد کے اعتبار سے اسی قدر پائی جس قدر اللہ نے ان کے لیے مقرر کی اور جو اس نے ان سے چاہی۔ اور وہ لوگ صرف "ملئکہ اور اولوا العلم اور قائماً بالقسط" ہی ہیں۔

اور بطریق اقرار، توحید میں سب مسلمان برابر ہیں۔ اور جو طریق اقرار کا قابل اعتماد ہے وہ دل سے ہے زبان سے نہیں۔

---

(۱) : آل عمران : ۱۸ : ۳

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کا قول ہے: جس نے توحید کے بارے میں کوئی تصور باندھا، مشاہدہ معانی کیا، علم الاسمار پر عبور حاصل کیا۔ اسمارِ الٰہی کی اللہ کی طرف نسبت کی اور صفات کو اس سے منسوب کیا اس نے توحید کی بو تک بھی نہیں سونگھی مگر جس نے یہ سب کچھ جاننے کے بعد اسے منفی کر دیا وہی موحّد ہے مگر رسمی طور پر حقیقتاً نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خود ذاتِ حق تعالیٰ ہی توحید سے بہتر طور پر آگاہ ہے وہ خود ہی اثبات صفات و نعوت کرتا ہے اور اسی انداز سے کرتا ہے جیسا کہ اس کے لائق شان ہے۔ توحید کو وہ خو اسی لیے بہتر طور پر جانتا ہے کہ اس کے اور توحید کے درمیان کسی ادراک، خیال اور توہم کا وسیلہ موجود نہیں ہوتا۔

بعض عارفین کا کہنا ہے کہ توحید وہ ہے جو صاحبِ بصیرت کو اندھا، عاقل کو متحیر اور ثابت قدم کو دہشت زدہ کر دیتی ہے۔ کیونکہ جو بھی حقیقتِ توحید کو جاننے کے مقام پر فائز ہوتا ہے اس کے دل میں عظمتِ کبریا بسیرا کر لیتی ہے اور اس کی ہیبت اس پر طاری ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں بندہ ہیبت زدہ اور اس کی عقل حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔

ابوسعید احمد بن عیسیٰ خراز علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: مقام اولین اسی کو حاصل ہوتا ہے جو علم توحید کو پا لیتا ہے۔ اور اس کی مدد سے تمام اشیار ماسوا اللہ کے ذکر تک کو قلب سے منفی کر کے فقط اللہ کی یکتائی کو جان لیتا ہے۔

آپ نے مزید فرمایا کہ توحید کی پہلی علامت بندے کا جملہ اشیار سے خروج یا علیحدگی ہے۔ اور تمام اشیار کو ان کے پروردگار کی طرف لوٹاتا ہے حتیٰ کہ مخلوق اپنے رب کے سامنے ہو اور وہ اسے دیکھتا ہو۔ اس صورت میں کہ وہ خود ان میں قائم اور متمکن ہو، پھر وہ انھیں ان کے نفوس میں اس طرح مخفی کر دے کہ وہ خود اپنے نفوس سے مخفی ہو جائیں گویا ان کے نفوس کو ان کے نفوس ہی میں مار کر انھیں اپنے لیے منتخب فرما لے۔ اس طرح کی توحید، ظہور توحید کی حیثیت سے باب توحید میں دیمومیت[1] کے ساتھ پہلا داخلہ ہے۔ اور اس کی وضاحت یوں ہے کہ اشیار ماسوا اللہ کا ذکر

---

(۱) دیمومیت۔ دوام سے ہے یعنی ہمیشہ جاری و باقی رہنا۔ (مترجم)

قلب سے فنا ہو جائے اور اللہ کا ذکر بندے کے قلب پر اس طرح جاری ہو جائے کہ اللہ کے سوا تمام اذکار زائل ہو جائیں (یعنی اسے سب کچھ بھول جائے اور فقط ذکرِ خدا ہی یاد رہے۔)

ہر شے سے خروج کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنی استطاعت کی طرف یا نفس کی جانب کسی چیز کی نسبت نہ کرے۔ ہر چیز کی مضبوطی یا قوت کو اللہ کے ساتھ قائم مانے۔

جملہ اشیار کا اپنے مالک کے حضور حاضر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا مالک و متولی صرف اللہ کو جانے اور ان کا وجود اللہ کے ساتھ قائم مانتے یہ نہ سوچے کہ اشیار خود اپنی ذات سے قائم ہیں جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

وفی کل شی لہ شاھدٌ

یدل علی انہ واحدٌ

(ہر شے اسی کی وحدانیت کی گواہی دے رہی ہے)

اور ہر چیز میں اس کے موجود ہونے سے مراد ہے کہ اگر بندہ اشیار کی طرف نظر کرے تو اس پر تلوین[1] کا غلبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اشیار کا وجود اللہ کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

اور یہ قول کہ "اللہ ان کو ان میں مخفی کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ خود سے خود بے خبر ہوتے ہیں اور انھیں مار دیتا ہے ان کے نفوس ہی میں" اس کی تشریح یہ ہے کہ انھیں کوئی حس نہیں رہتی اور نہ ہی وہ اپنی ظاہری و باطنی حرکات کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ان کی یہ حرکات اگرچہ بظاہر انھی کے اشاروں سے ہوتی ہیں مگر درحقیقت مشیت و تقدیر ایزدی کے سامنے مٹ جاتی ہیں۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ نے ایک شخص سے فرمایا: جانتے ہو؟ تمھاری توحید کیوں درست نہیں ہوتی۔ اس شخص نے عرض کیا: حضور! معلوم نہیں ایسا کیوں ہے۔ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ تو اللہ کو خود اپنے ہی ذریعے جاننا چاہتا ہے۔ مزید کہا کہ فقط اس شخص کو توحید سے کامل آگاہی حاصل

---

(۱) تلوین اور تمکین تصوف کے دو مقامات ہیں۔ مقامِ تلوین میں حالتیں بدلتی رہتی ہیں اور سالک مغلوب الحال رہنے لگتا ہے۔ جب کہ مقامِ تمکین میں سالک کو قرار حاصل ہوتا ہے اور کبھی مغلوب الحال نہیں ہوتا۔ (مترجم)

ہوتی ہے اور اسی کی توحید درست ہوتی ہے جس کا انکار ہی اس کا اقرار ہو۔ اور جب ان سے اس اقرار کی وضاحت پوچھی گئی تو فرمایا: اقرار سے مراد انانیت ہے اور وہ یہ ہے کہ موحد اپنے اقرار کا انکار کرے یعنی ہر چیز میں اپنے اثباتِ نفس کو راہ نہ دے جیسے وہ ہے 'میرا' مجھ سے، میری جانب' مجھ پر اور مجھ میں وغیرہ۔

یہ ضروری ہے کہ موحد انانیت یعنی میں کو ختم کرے اور باطن سے اس کا انکار کرے چاہے بظاہر اس کی زبان پر اقرار ہی کیوں نہ جاری ہو۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ ہی نے ایک اور شخص سے کہا: تو توحیدِ بشری کا طالب ہے کہ توحید خدا کا؟ اس شخص نے جواب دیا: ان دونوں میں کیا فرق ہے آپ نے فرمایا ہاں توحید بشری سزا اور جزا سے ڈرنے کو کہتے ہیں اور توحیدِ خدا یہ ہے کہ تو فقط اللہ ہی کو عظیم سمجھے اور اسی کی توقیر و تعظیم کرے۔

قولِ شبلی علیہ الرحمۃ کی وضاحت یہ ہے کہ عوض پانا اور اللہ کے سوا کسی اور سے طمع رکھنا یا کام بنانے کی توقع کرنا تقاضائے بشریت ہے اسی لیے جس نے صرف اللہ تعالیٰ کی عظمت کے پیشِ نظر اس کو واحد جانا وہ اس شخص کے برابر نہیں ہو سکتا جس نے صرف سزا و جزا کے خوف سے اسے ایک مانا۔ حالانکہ خوفِ عذابِ الٰہی بھی ایک اچھی صفت ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ جس نے علمِ توحید میں سے ذرہ برابر علم بھی حاصل کر لیا گویا اس نے اس قدر بڑا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا کہ اب وہ ایک ذرے کے اٹھانے سے بھی قاصر ہے۔ اور ایک بار فرمایا: کہ جسے علمِ توحید میں سے ذرہ برابر علم اللہ نے عطا کیا تو گویا اس نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو اپنی پلکوں کے ایک بال کی نوک پر اٹھا رکھا ہے یعنی جب اس کے سینے میں اللہ کی وحدانیت کا نور جلوہ گر ہوتا ہے تو ساری کائنات اس کو بہت چھوٹی اور ہلکی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل کائنات کا نور اس کے اندر موجود ہوتا ہے اور جملہ مخلوقات اسے ذرہ برابر دکھائی دیتے ہیں جب کہ ایک روایت کے مطابق حضرت جبریل علیہ السلام کے چھ سو پر ہیں۔ اور دو پر ہی اتنے بڑے ہیں کہ پھیلا دے تو شرق و غرب کو ڈھانپ لے[1]۔ اور ابن عباس سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام کرسی کے پایے کے سامنے

---

(۱) صحیح بخاری: کتاب بدأ الخلق باب ۷

یوں ہیں جیسے زرہ کا ایک حلقہ اور کہا جاتا ہے کہ جبریل علیہ السلام، عرش، کرسی اور وہ مقام جو اہل علم کو حاصل ہے یہ سب مل کر ملکوت سے ماوراء جو کچھ ہے اس کے مقابل مثل ریت کے ایک ٹیلے کے ہے۔ بلکہ اس سے بھی کم۔

ابوالعباس بن عطا بغدادی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ حقیقتِ توحید کی علامت، نسیانِ توحید ہے۔ اور صدقِ توحید یہ ہے کہ اس کے ساتھ ذاتِ واحد کو قائم مانا جائے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ بندہ اللہ کی توحید میں روایتِ توحید کو اپنی تخلیق سے پہلے بھول جائے اور صرف رُویت قیامِ الٰہی کو باقی رکھے، کیونکہ اگر اللہ عزوجل ان کو ان کے ارادے کے مطابق مقصد سے ہمکنار نہ فرمائے تو وہ کبھی توحید کو نہیں پا سکتے۔

ہمارے مشائخ کرام کی موضوعِ توحید پر بیشتر مستقل تصانیف ہیں مگر ہم نے صرف ضرورت کی تکمیل کے لیے ان میں سے بہت کم نکات کا یہاں اس کتاب میں ذکر کیا ہے۔

۱۰

معرفت اور عارف

ابوسعید الخراز رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ معرفت کے سرچشمے دو ہیں (خوف خدا میں) آنکھوں کا آنسو بہانا اور مقدور بھر مجاہدہ کرنا۔

ابو تراب نخشبی علیہ الرحمۃ نے عارف کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا: عارف وہ ہے جسے کوئی چیز مکدر نہ کر سکے اور ہر چیز کو اس سے صفا ملے۔

احمد بن عطار علیہ الرحمۃ کہتے ہیں "معرفت دو چیزوں کے جاننے کا نام ہے ایک اللہ دوسرے حقیقت اللہ کو جاننا یہ ہے کہ بندہ اللہ کی وحدانیت کو ان اسماء و صفات کے ذریعے جانے جو اللہ نے خلق کے لیے ظاہر کر رکھی ہیں اور حقیقت کو جاننے کا مفہوم یہ ہے کہ اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں کیونکہ اللہ کی صمدیت و ربوبیت درمیان میں حائل ہے جیسا کہ قول عزوجل ہے:

وَلَا يُحِيطُونَ بِهٖ عِلْمًا۔ (۱) اور ان کا علم اسے نہیں گھیر سکتا۔

کوئی راستہ حقیقت کو جاننے کا نہ ہونے کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت ہو کر بندوں کی استطاعت سے باہر نہیں، کا ان کو اسماء و صفات کے ذریعے پانے کی اجازت دی ہے مگر حقیقت تک رسائی تو کجا اس میں سے ذرہ برابر کا بھی سمجھ لینا کسی کے بس میں نہیں۔ اس لیے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ عزوجل کی عظمت و کبریائی کی وادیوں میں سے پہلے فرے کے ظاہر ہوتے ہی لاشئی ہو جاتی ہے۔ الغرض معرفتِ حقیقت اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس میں عظمت و کبریائی کی صفت موجود ہو (اور بلاشبہ

---

(۱) : طٰہٰ : ۱۱۰

اس صفت سے صرف ذاتِ واجب الوجوب ہی متصف ہے، اسی مفہوم کو ادا کرتے ہوئے کسی کا قول ہے: اسے اس کے سوا کسی اور نے نہیں جانا اور نہ ہی اس کے سوا کسی نے اس کو چاہا۔ کیونکہ اس کی صمدیت (بے نیازی) احاطہ و ادراک کو روکے ہوئے ہے۔

قول باری تعالیٰ ہے:

ولا یحیطون بشیءٍ من علمہٖ[1] اور وہ نہیں پاتے اس کے علم میں سے

اسی ضمن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ

"پاک ہے وہ ذات کہ جس نے اپنے بندوں کو اپنی معرفت کا سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں بتایا کہ وہ اسے اپنی عقل قاصر سے ہی جانیں۔

ابوبکر شبلی سے پوچھا گیا کہ کب بندہ مقامِ مشاہدہ پر فائز ہوتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جب شاہد ظاہر ہو جائے، شواہد فنا ہو جائیں، حواس جاتے رہیں اور احساس مضمحل پڑ جائے۔

اور جب ان سے مذکورہ کیفیت کے آغاز و انجام کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہا: آغاز اللہ کی معرفت ہے اور انجام اس کی توحید۔ مزید کہا کہ معرفت کی نشانی یہ ہے کہ بندہ خود کو اللہ کے غلبہ و قوت کے قبضے میں سمجھے اور اسی حالت میں اس پر قدرت کی کارروائیاں جاری رہیں۔

معرفت کی ایک علامت محبت بھی ہے کیونکہ جس نے اس کو پہچانا اسی نے اس سے محبت کی۔ ابویزید طیفور بن عیسیٰ البسطامی رحمہ اللہ سے صفتِ عارف کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ نے یوں وضاحت کی کہ پانی کا رنگ وہی ہوتا ہے جو برتن کا۔ اگر اسے سفید برتن میں ڈالا جائے تو تُو اسے سفید سمجھے گا۔ اور سیاہ میں تو اسے سیاہ رنگ کا سمجھے گا حالانکہ مختلف احوال کی تبدیلی اس میں بظاہر یہ تبدیلی پیدا کر رہی ہوتی ہے یعنی پانی اپنی صفائی رنگت کے ساتھ متصف ہوتے ہوئے برتن کے رنگ میں رنگا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر درحقیقت برتن کا رنگ اس کی صفائی اور اصل حالت کو تو نہیں بدل سکتا دیکھنے والا چاہے اسے سفید یا سیاہ پائے مگر وہ اپنی مستقل صفت کے ساتھ متصف رہتا ہے۔ اسی طرح عارف اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے تعلق کی کیفیت دراصل ایک رہتی ہے چاہے احوال بدلتے

---

(۱): البقرۃ: ۲۵۵

ہی رہیں۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ نے عارف کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ وہ ان کی تعریف بیان کرنے والوں کی دسترس سے باہر نکل گئے ہیں۔ اور کسی نے معرفت سے متعلق یہ کہا کہ معرفت، اللہ کی توحید کو مطالعۂ قلوب کے ذریعے اس کے لطائفِ تعریف کے مطابق پانے کو کہتے ہیں۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ سے دریافت کیا گیا کہ اے ابوالقاسم! عارفین اللہ سے کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے جواباً کہا: عارفین اللہ سے اپنے لیے حفاظت و پناہ طلب کرتے ہیں۔

محمد بن فضل سمرقندی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ عارفین اللہ جل جلالہ سے نہ کچھ طلب کرتے ہیں اور نہ ہی وہ کوئی اختیار رکھتے ہیں۔ اسی حالت میں جو انھوں نے پا لیا سو پا لیا، کیونکہ عارفین اللہ ہی کے ساتھ قائم، باقی اور فانی ہیں۔ محمد بن الفضل سمرقندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عارفین اللہ سے اس خوبی کی حاجت رکھتے جس کے ہوتے ہوئے سارے محاسن پورے ہو جاتے ہیں۔ اور جسے کھو کر سارے محاسن قبائح سے بدل جاتے ہیں۔ اور وہ خوبی، استقامت ہے۔ یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمہ عارف کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ لوگوں میں شامل ہو کر بھی ان سے جدا ہوتا ہے۔ مزید کہا کہ عارف ایک بندہ ہی تھا جو ظاہر ہو گیا (یعنی ممتاز ہو گیا)

ابوالحسین النوری سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ اللہ کو عقل پا بھی نہیں سکتی اور اس کے سوا وہ جانا بھی نہیں جا سکتا؟ آپ نے جواب دیا: انتہاء والا بے انتہا کو کیسے پا سکتا ہے یا مصیبتوں کا مکلف اسے کیسے جان سکتا ہے جس کیلئے کوئی مصیبت ہے نہ آفت۔ یا اللہ کی ذات صاحبِ کیفیت کیونکر ہو سکتی ہے جب کہ خالقِ کیفیت بھی وہی ہے۔ یا وہ پابند زمان و مکان کیسے ہو سکتا ہے جبکہ زمان و مکان کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ اور اسی طرح اس نے اول کو اولیت بخشی اور آخر کو مؤخر کیا۔ اگر وہ ذاتِ جل جلالہ اول و آخر کو پیدا نہ فرماتا تو اولیت و آخریت کا علم کیسے ہو سکتا۔ اور ازلیت فی الواقع ابدیت ہے ان دونوں میں کوئی حدِ فاصل نہیں۔ جیسا کہ اولیت آخریت ہے اور آخریت اولیت بعینہٖ یہی حال ظاہریت و باطنیت کا ہے بس اتنی سی بات ہے کہ محبوبِ حقیقی کبھی دولتِ وصال سے نواز دیتا ہے اور کبھی محروم رکھتا ہے صرف اس لیے کہ تجدیدِ لذت ہوتی رہی۔ یعنی وصل و ہجر کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تاکہ وصل کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور وہ بندے کی بندگی کو دیکھتا ہے۔

جس نے اسے اس کی صفت تخلیق سے پہچانا اس نے اسے مشاہدے کے ذریعے نہیں جانا اور یہ صفتِ تخلیق اس کے قول 'کُن' سے متعلق ہے۔

اور ابوالحسین نوری کے قول مشاہدے کے ذریعے پہچاننے سے مراد یہ ہے کہ بندہ یقین و مشاہدۂ قلب کے ساتھ ایمان بالغیب کے حقائق کو پوری طرح جان لے اور ان سے مانوس ہو جائے۔

اللہ کے لیے کسی طرح کی توقیت اور تغیر کو لازم قرار دینا کسی طرح بھی جائز نہیں کیونکہ اس کی ذاتِ واجب الوجوب تو جیسی تھی ویسی ہی رہے گی اور جو اس نے فرمایا یا فرمائے گا دونوں حالت میں برابر ہے۔ قریب تر اس کے لیے بعید تر ہے اور بعید تر اس کے لیے قریب تر۔ بلاشبہ خلق کے لیے اس کی معرفت من حیث الخلق ہی ہوتی ہے۔ اور قرب و بعد، رضا و عدمِ رضا میں خلق کی صفتِ تلوین موجود ہوتی ہے اور یہ اللہ کی صفت نہیں۔

احمد بن عطا علیہ الرحمۃ کا معرفت خداوندی سے متعلق ایک قول جسے ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ سے بھی منسوب کیا جاتا ہے، جب کہ یہ واقعتاً مقدم الذکر ہی کا قول ہے: وہ کہتے ہیں کہ برائیاں تب برائیاں بنتی ہیں جب انہیں اللہ پوشیدہ رکھتا ہے اور نیکیاں تب نیکیاں بنتی ہیں جب وہ انہیں ظاہر و عیاں فرماتا ہے۔

اور یہ نیکی و بدی دو ایسی صفات ہیں جو ازل سے جاری ہیں اور اللہ کے مقبول اور دھتکارے ہوئے بندوں پر اپنے اثرات مرتب کرتی رہتی ہیں۔ مقبول بندوں پر ان کے شواہد روشنی کی صورت میں اور دھتکارے ہوئے بندوں پر اس کی پوشیدگی کے شواہد ظلمت کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں زرد رنگ (چہرے) چھوٹی آستینیں یا جُبّے کسی کام نہیں آتے۔

میرے خیال کے مطابق مذکورہ بالا قول مفہوم کے اعتبار سے ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمہ کے اس قول سے ملتا جلتا ہے کہ خلق کے اعمال اللہ کو راضی یا ناراض نہیں کرتے وہ جس سے راضی ہو جائے انہیں ایسے اعمال میں لگا دیتا ہے جو اس کی رضا کا باعث ہوتے ہیں اور جس سے ناراض ہو جاتے انہیں ایسے کاموں میں مصروف کر دیتا ہے جو اس کی ناراضگی کا سبب بن جاتے ہیں۔

میرے نزدیک ابن عطا علیہ الرحمہ کے قول کی شرح یہ ہے کہ برائیاں اس لئے برائیاں سمجھی جاتی ہیں کہ اللہ ان سے اعراض فرماتا ہے اور نیکیاں اسی لیے نیکیاں بنتی ہیں۔ کہ اللہ ان کی طرف

متوجہ ہوتا ہے اور انھیں قبولیت بخشتا ہے۔

اسی ضمن میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو صحیفے لے کر نکلے ایک ان کے دائیں اور دوسرا ان کے بائیں ہاتھ میں تھا پھر آپ نے فرمایا یہ اہل جنت اور ان کے آباؤ اجداد کے ناموں کی فہرست ہے۔ اور اہلِ دوزخ اور ان کے آباؤ اجداد کے ناموں کی فہرست ہے[1]۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ کا کہنا ہے کہ جب اللہ نے اپنی معرفتِ ذات بندوں کو عطا کر دی تو ان کے نفوس ان سے جدا ہو گئے پھر انھوں نے لذاتِ سرمدی کے شواہد میں سے پہلے نظارے پر کوئی وحشت محسوس نہ کی۔ مذکورہ قول کی وضاحت یہ ہے کہ جس نے اپنے معبود کی عطا کردہ معرفت میں سے پہلے مقام کو پا لیا تو اسے ماسوا اللہ سے نہ کوئی وحشت لاحق ہوئی اور نہ ہی انس۔

حقیقتِ عارف

یحییٰ بن معاذ رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں جب تک بندہ معرفت حاصل کرتا رہتا ہے اسے یہ کہا جاتا ہے کہ تو کوئی چیز اختیار نہ کر اور اپنے اختیار سے دور رہ یہاں تک کہ تجھے عرفان مل جائے۔ اور جب بندہ معرفت پا کر عارف ہو جاتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ اب تو چاہے کوئی چیز اختیار کر یا نہ کر تیری مرضی ہے کیونکہ اب تو جو بھی اختیار کرے گا وہ ہمارے اختیار کے ساتھ ہو گا اور جو کچھ ترک کرے گا تو ہمارے ہی اختیار سے ترک کرے گا۔ اس لیے کہ اب تو اختیار و عدم اختیار دونوں حالتوں میں ہمارے ہی اختیار میں ہے۔ اور مزید کہا کہ یہ دنیا ایک دلہن کی مانند ہے جس نے اسے طلب کیا پھر اس کو خود سے دور نہ کر سکا۔

زاہد اس کے چہرے کو سیاہ کرتا ہے۔ اس کے بالوں کو نوچتا ہے اور اس کے کپڑے پھاڑتا ہے۔ اور عارف اپنے محبوب ازلی سے دل لگائے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

شیخ مذکور کہتے ہیں کہ جب حصولِ معرفت میں عارف سے ادب کا دامن چھوٹ گیا تو وہ ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک ہوا۔

---

(۱) : سنن ترمذی، کتاب القدر، باب ۸

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کہتے ہیں عارف کی تین نمایاں خصوصیات ہیں ۔

پہلی : اس کے سینے میں جب شمعِ معرفت فروزاں ہوتی ہے تو وہ پرہیزگاری کے چراغ کو بجھا نہیں دیتی۔

دوسری : وہ کسی ایسے باطنی علم کا قائل نہیں ہوتا جو اسے ظاہری احکامِ شریعت کی پابندی سے روکے ۔

تیسری : اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات و اکرامات کی کثرت اسے حرام چیزوں کے قریب بھی نہیں جانے دیتی ۔

کسی شیخ کا قول ہے کہ وہ عارف نہیں جس نے آخرت کی فکر کرنے والے نیکوکاروں سے معرفت کا ذکر کیا چہ جائے کہ دنیاداروں سے اگر عارف اپنے رب کی اجازت کے بغیر اس سے توجہ ہٹا کر خلق کی طرف متوجہ ہوا تو وہ رسوا ہوا۔

اے سالک! تو اسے اس وقت تک نہیں پہچان سکتا جب تک تیرے دل پر اس کی حقیقت کا غلبہ نہ ہو تو اسے کیونکر یاد کر سکتا ہے جب تک تیرے دل میں اس کے لطف و کرم کا احساس موجود نہ ہو ۔ کیا تو اس کی صدائے محبت کو بھول گیا ہے ؟ جو اس نے وجودِ خلق سے پہلے تجھے دی تھی ۔

مجھ سے محمد بن احمد بن حمدون الفراء علیہ الرحمہ نے کہا کہ کسی شخص نے عبدالرحمان فارسی علیہ الرحمہ سے کمالِ معرفت کے بارے میں سوال کیا تو کہنے لگے : جب متفرقات ایک ہو جائیں، احوال و مقامات یکساں ہو جائیں اور احساسِ تمیز مٹ جائے تو کمالِ معرفت کا مقام آتا ہے ۔

مذکورہ قول کی وضاحت یہ ہے کہ بندے کا وقت[1] ہر حالت میں ایک ہونا چاہئے اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ اور وہ تمام حالات میں اللہ کے ساتھ لو لگائے رکھے اور ماسوا سے تعلق کو منقطع رکھے اور یہی وہ لازمی امور ہیں جن کے ہوتے ہوئے سالک کو کمالِ معرفت کا مقام حاصل ہوتا ہے ۔

---

(۱) صوفیہ کے نزدیک وقت سے مراد وہ حالت و کیفیت ہے جو سالک کو اللہ سے لو لگانے میں حاصل ہوتی ہے اور اس کیفیت کا برقرار رکھنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے ۔ (مترجم)

ذریعۂ معرفت

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ سے کسی نے پوچھا: آپ نے اللہ کو کس چیز کے ذریعے پہچانا؟ تو انھوں نے فرمایا: اللہ ہی کے ذریعے۔ ایک اور سوال میں ان سے کہا گیا کہ عقل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو انھوں نے جواب دیا: عقل عاجز ہے اور اپنی ہی طرح کسی عاجز چیز کی پہچان ہی کا سبب بن سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب عقل کو پیدا فرمایا تو اس سے سوال کیا: میں کون ہوں؟ جواباً عقل خاموش رہی۔ پھر اس کے سرمۂ وحدانیت لگایا تو پکار اٹھی: اللہ۔ خلاصہ یہ نکلا کہ عقل نے اللہ کو اللہ ہی کے ذریعے جانا۔

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ نے ایک سوال کہ اللہ نے سب سے پہلے بندوں پر کونسا فرض عائد کیا تو فرمایا: معرفت جیسا کہ قول خداوندی ہے:

و ما خلقت الجن و الانس الا	اور میں نے جن اور آدمی اسی لیے بنائے
لیعبدون⁽¹⁾	کہ میری بندگی کریں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لِیَعْبُدُوْنِ (کہ میری بندگی کریں) کی تفسیر لِیَعْرِفُوْنِ (تاکہ میری معرفت حاصل کریں) سے فرمائی۔ یعنی عبادت کرنے سے مراد معرفت الٰہی کا حصول ہے۔

ایک شیخ سے معرفت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: قلب کی گہرائیوں سے جملہ اسماء و صفات کے ساتھ اللہ کی وحدانیت کا اثبات اور اس کی تصدیق کا نام معرفت ہے۔ کیونکہ اسی کی ذات ہی عزت، قدرت، عظمت اور غالب ہونے میں یکتا ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا بے مثال، سمیع، بصیر، بے کیف اور بے مثل ہے۔ اور اللہ ہی قلوب سے اضداد، امثال اور اسباب کو دور فرماتا ہے۔ اور معرفت تو ایک عطیہ ہے۔

معرفت آتش شوق اور وجد ہے جب کہ ایمان نور اور عطا و بخشش ہے۔

مومن و عارف میں یہ فرق ہے کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اور عارف اللہ کی آنکھ سے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ مومن صاحب قلب ہوتا ہے۔ اور عارف قلب نہیں رکھتا۔ قلبِ مومن ذکرِ اللہ سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور عارف کو سوائے محبوب ازلی کے قرار نہیں۔ گویا ایک ذکر حبیب میں محو ہے

تو دوسرا رخ یار کے مشاہدے سے شاد کام۔

معرفت کی تین اقسام ہیں ۔ معرفتِ اقرار، معرفتِ حقیقت، اور معرفتِ مشاہدہ ۔ معرفت مشاہدہ میں فہم، علم اور عبارت و کلام شامل ہے۔

یوں تو معرفت سے متعلق بے شمار اشاراتِ لطیفہ اور تعریفات کاملہ موجود ہیں مگر ان کی وہ قلیل تعداد جو ہم پیش کر آئے ہیں، سالک کے لیے کافی ہیں۔ اس کے علاوہ استدلال کرنے والوں اور ہدایت چاہنے والوں کے لیے بھی ان میں کافی مواد موجود ہے ۔

حسن بن علی بن حویہ دامغانی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ ابوبکر زاہر آبادی نے معرفت کے بارے میں فرمایا معرفت ایک ایسا اسم ہے جس کا معنیٰ قلب میں وجودِ تعظیم کی صورت میں موجود ہوتا ہے ۔ اور یہ سالک کو تشبیہہ[1] و تعطیل[2] سے بچائے رکھتا ہے۔

---

(۱) : ذاتِ حق تعالیٰ کا ظاہری اشیاء میں ظہور تشبیہہ کہلاتا ہے ۔ اس کے مقابل کی اصطلاح تنزیہہ ہے جس سے مراد ذاتِ حق تعالیٰ کا صفاتِ نقص یا صفاتِ ممکنات سے منزّہ ہونا ہے ۔

(۲) : تعطیل ایک مذہب ہے جس میں صفاتِ الٰہی سے انکار کیا جاتا ہے ۔ (مترجم)

(۱۱)

احوال و مقامات

مقامات اور ان کی حقیقت

اللہ کے نزدیک، عبادات، مجاہدات، ریاضات اور اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے کے لحاظ سے بندے کا کیا مقام ہے تو اس کے جواب میں قرآن کے یہ الفاظ پیش کیے جاتے ہیں کہ

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (۱) — یہ اس کیلئے ہے جو میرے حضور کھڑے ہونے سے ڈرے اور میں نے عذاب کا جو حکم سنایا ہے اس سے خوف کرے

اور فرمایا:

وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (۲) — اور فرشتے کہتے ہیں ہم میں ہر ایک کا ایک مقام معلوم ہے۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمۃ قولِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ارواح مجندۃ" کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ارواح اپنے اپنے مقامات کے مطابق جمع ہوں گی۔ اور مقامات یہ ہیں مثلاً توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر، رضا اور توکل وغیرہ۔

---

(۱) : ابراہیم ۱۴ : ۱۴

(۲) : الصافات : ۱۶۴

مفہوم احوال

صفائے اذکار میں سے جو کچھ کیفیات دلوں میں جاگزین ہوتی ہیں یا دل اس میں مقام اختیار کرتے ہیں، احوال کہلاتے ہیں۔

حضرت جنید علیہ الرحمۃ کا قول ہے۔ حال دل پر نزول کرتا ہے مگر ہمیشہ اس میں نہیں رہتا۔ اور یوں بھی کہا گیا کہ حال ذکر خفی کو کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ بہترین ذکر، ذکرِ خفی ہے۔(۱)

حال مجاہدات، ریاضات اور عبادات کے طریق پر نہیں ہوتا بلکہ وہ مراقبہ، قرب، محبت، خوف، رجا، شوق، انس، طمانیت، مشاہدہ اور یقین وغیرہ کی طرح ہے۔

ابو سلیمان دارانی علیہ الرحمۃ نے کہا جب معاملہ قلوب تک پہنچ جاتا ہے تو جوارح استراحت کرتے ہیں۔

ابو سلیمان کا یہ قول دو معانی کا حامل ہے۔ ایک یہ کہ یہاں استراحتِ جوارح سے مراد مجاہدات ہیں اور قلب کو اللہ کے ذکر سے غافل کردینے والے اشتغال وخیالات مذمومہ سے جوارح مامون ہو جاتے ہیں دوسرے یہ کہ بندہ مجاہدہ، اعمال اور عبادات میں اس قدر تمکن حاصل کرلے کہ وہ اس کا ٹھکانہ بن جائیں اور اس کا قلب ان سے لذت وحلاوت پائے۔ اور وہ پہلے کی طرح اب ان میں کرب والم کی کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرلے جیسا کسی نے کہا ہے اور میرا خیال ہے کہ محمد بن واسع نے کہا ہے کہ میں برابر بیس برس تک ہر رات کرب کے عالم میں بسر کرتا رہا جس کے نتیجے میں مجھے مسلسل دس برس کی راحت وآسائش نصیب ہوئی۔

میرا خیال ہے کہ مالک بن دنیا نے کہا کہ میں لگاتار بیس برس تک قرآن مجید کو چباتا رہا تا آنکہ دس برس تک تلاوت کی لذتوں سے کامیاب ہوا۔ جنید بغدادیؒ کا قول ہے۔ تحفظِ حقوق صرف حراستِ قلوب سے ملتا ہے اور جس کا باطن نہیں وہ گناہ پر اصرار کرنے والوں میں سے ہے۔

مقامات کے ضمن میں شیوخ عظام کے بے شمار اقوال وحوایات ہیں اور اسی طرح احوال میں

---

(۱) : مسند احمد بن حنبل : جز : ۱ صفحہ : ۱۷۲، ۱۸۰، ۱۸۷

بھی مگر ہم نے اختصار کی راہ اختیار کی ہے۔

مقامِ توبہ

ابو یعقوب یوسف بن حمدان السوسی علیہ الرحمۃ نے فرمایا؛ اللہ کی جانب متوجہ ہونے والوں کا پہلا مقام توبہ ہے۔ اور توبہ ہر اس چیز سے، جس کو علمِ شریعت نے برا بتایا ہو، سے ہر اس شئے کی طرف رجوع کرنے کو کہتے ہیں جسے شریعت نے اچھا قرار دیا ہو۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں، توبہ یہ ہے کہ گناہوں کو بھلایا نہ جائے۔

جنید علیہ الرحمۃ نے کہا؛ توبہ یہی ہے کہ تو اپنے گناہوں کو بھول جائے۔

ابو یعقوب السوسی علیہ الرحمۃ اور سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ نے توبہ کی جو تعریف فرمائی اس کا تعلق مریدین، طالبین اور سالکین کی توبہ سے ہے۔ اور جنید علیہ الرحمۃ کی تعریف توبہ کہ گناہوں کو بھلا دینا چاہیئے اس کا تعلق محققین کی توبہ سے ہے۔ کیونکہ یہ وہ بندے ہوتے ہیں جن کے قلوب پر عظمت خدا اور اس کے دائمی ذکر کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو وہ گناہوں کو بھول ہی جاتے ہیں۔ جیسا کہ رویم علیہ الرحمۃ نے فرمایا؛ توبہ سے توبہ کرنا ہی توبہ ہے۔ اور اسی طرح ذوالنون مصری علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ عوام گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور خواص غفلت سے۔

توبہ کے بارے میں ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ نے جو کچھ کہا ہے وہ بلاشبہ توبہ کی خاص الخاص تعریف ہے۔ وہ فرماتے ہیں، توبہ یہ ہے کہ تو اللہ کے سوا ہر چیز سے توبہ کرے۔ اور اسی مفہوم کی طرف ذوالنون علیہ الرحمۃ نے یوں اشارہ کیا ہے کہ مقربین کے گناہ ابرار کی نیکیاں ہوتی ہیں۔ مزید کہا کہ ریاءِ عارفین، اخلاصِ مریدین ہے۔

سالک جب طاعات و قرباتِ الٰہی کے ذریعے ابتداً میں اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے دوران ان طاعات و قرباتِ الٰہی میں قرار حاصل کرتا ہے، ان کی تصدیق کرتا ہے اور انوار ہدایت سے مالا مال ہو کر عنایت و رعایتِ خداوندی کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ اس کا قلب عظمتِ الٰہ کا مشاہدہ کرتا ہے صنعتِ صانع اور احسانِ قدیم پر غور و فکر کرتا ہے تو اپنی ارادت و ہدایات کی صورت میں، طاعات و اعمال اور قربتوں کی طرف التفات اور ملاحظہ و سکون سے تائب ہو جاتا ہے۔

ہمارے سامنے تین طرح کے توبہ کرنے والے ہیں۔ ایک وہ جو گناہوں سے توبہ کرتے ہیں دوسرے

وہ جو غفلتوں سے تائب ہوتے ہیں اور تیسرے وہ جو اپنی طاعتوں اور نیکیوں پر نگاہ رکھنے سے توبہ کرتے ہیں۔

ورع

ورع (پرہیزگاری) ایک بلند مقام سلوک ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے "تمھارے دین کا سرمایہ، ورع ہے"۔

اہلِ ورع کے تین طبقے ہیں ایک وہ جو شبہات سے اجتناب کرتا ہے اور یہ شبہات حلال و حرام کے واضح احکامات یا مبہم احکامات سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابن سیرین علیہ الرحمہ فرماتے ہیں، میرے لیے ورع سے بڑھ کر کوئی چیز آسان نہیں جب بھی مجھے کسی چیز میں شک ہو جائے اسے بلا تردد ترک کر دیتا ہوں۔

اہل ورع کا دوسرا طبقہ ہر اس شے سے اجتناب کرتا ہے جس سے ان کا قلب دوری چاہے اور جسے اختیار کرنا انھیں ناگوار ہو۔ یہ مقام صرف اہل تصدیق اور ارباب قلوب (اہل دل) کو حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے۔

ابوسعید خراز علیہ الرحمہ نے ورع کے بارے میں فرمایا: ورع یہ ہے کہ لوگوں پر تم سے ادنیٰ سا ظلم بھی نہ ہونے پائے اور یہاں تک کہ کبھی کوئی تیرے خلاف ظلم یا کسی زیادتی کی دھائی نہ دے۔

حارث محاسبی علیہ الرحمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا ہاتھ ساری زندگی کبھی مشکوک طعام کی طرف نہیں اٹھا۔ جعفر خلدی کہتے ہیں کہ محاسبی علیہ الرحمہ مشتبہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے تو ان کی انگشتِ شہادت کی رگ زور زور سے پھڑکنے لگتی اور اس طرح وہ مشکوک طعام سے خبردار ہو جاتے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ بشر حافی علیہ الرحمہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں کسی دعوت پر بلایا گیا اور جب ان کے سامنے کھانا چنا گیا تو باوجود کوشش کے ان کا ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ سکا۔ انھوں نے تین بار کوشش کی مگر بے سود۔ ایک شخص نے جو اس راز سے آشنا تھا میزبان سے کہا: اس طرح کے باکمال صوفی کو حرام یا مشکوک طعام پر بلانا مناسب نہیں تھا۔ اس واقعہ کو سہل بن عبداللہ کے اسی طرح کے ایک واقعے سے بھی تقویت ملتی ہے۔

میں نے بصرہ میں احمد بن محمد بن سالم کو یہ کہتے سنا کہ سہل بن عبداللہ سے حلال کی تعریف بیان کرنے کے لیے کہا گیا تو فرمایا: حلال کی تعریف یہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اللہ کی نافرمانی کا اندیشہ نہ ہو۔

جس چیز میں معصیتِ خدا کا اندیشہ نہ ہو اس کے بارے میں فقط اشارۂ قلب ہی سے جانا جا سکتا ہے۔ اور اس کے لیے بطور دلیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پیش کرتا ہوں: آپ نے حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اپنے دل ہی سے پوچھ لیا کرو دوسرے لوگ تو جو چاہیں گے کہیں گے۔[1] اور مزید فرمایا: گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ دونوں اقوال سے آپ بخوبی جان سکتے ہیں کہ جائز اور ناجائز معلوم کرنے کے لیے قلبی اشارے کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی گئی۔

اہلِ ورع کا تیسرا طبقہ عارفین و واجدین کا ہے ان کے ورع کی کیفیت کے بارے میں ابو سلیمان دارانی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ ورع یہ ہے کہ تو ہر اس چیز کو برا سمجھے جو تجھے اللہ سے دور کردے۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ ورع کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں: حلال یہ ہے کہ اس میں اللہ کی نافرمانی کا اندیشہ نہ ہو اور حلالِ خالص یہ ہے کہ اس میں اللہ کو بھلا دینے کا شائبہ تک نہ ہو۔

ورع سے متعلق ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ نے فرمایا: تیرا قلب ایک لمحے کے لیے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ رہے یہی ورع ہے۔

الغرض تینوں طبقات اہلِ ورع کی ورع کو اقسام میں ظاہر کیا جائے تو پہلی ورع عام دوسری ورع خاص اور تیسری خاص الخاص ورع ہے۔

زہد[2]

زہد، مقاماتِ تصوف میں سے وہ مقام ہے جو احوال و مقاماتِ بلند کی اساس ہے۔ بلاشبہ اللہ

---

(۱) سنن دارمی: کتاب البیوع: باب ۲

(۲) زہد کا اصطلاحی مفہوم دنیوی خواہشات کو ترک کر کے خود کو عبادتِ خداوندی کے لیے فارغ کرنا ہے۔ اور ایسا کرنے والے کو زاہد کہتے ہیں۔ (مترجم)

کا قرب حاصل کرنے والوں، اس پر توکل کرنے والوں اور ہر حال میں راضی رہنے والوں کے لیے جادۂ الفت کا پہلا قدم ہے۔ جس نے اس مقام پر فائز ہوتے ہوتے اپنی بنیاد مضبوط نہ کی وہ بعد میں آنے والے مقامات کی طرف ترقی نہ پا سکا۔ چونکہ حبّ دنیا ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے اور اس سے زہد اختیار کرنا ہی ہر بھلائی اور اطاعت کی نیو ہے۔ کہتے ہیں کہ جو دنیوی جاہ وحشمت سے محبت کرنے والے کے نام سے مشہور ہوا تو گویا وہ ہزار بُرے ناموں سے موسوم ہوا اور جسے دنیا سے زہد (یعنی کنارہ کشی) اختیار کرنے والے کے نام سے پکارا جائے تو گویا اسے ہزار اچھے ناموں سے یاد کیا گیا۔ اور زہد کا حلال سے گہرا تعلق ہے کیونکہ حلال اختیار کرتے وقت مشکوک اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا ہوتا ہے۔

طبقاتِ زہّاد

زہاد کے تین طبقے ہیں۔ پہلے طبقے کے زہاد کوئی دنیوی ملکیت نہیں رکھتے! اور جس چیز سے ان کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں اس سے ان کے دل بھی خالی ہوتے ہیں یعنی وہ دل میں بھی کسی دنیوی ملکیت کی خواہش نہیں رکھتے۔ جیسا کہ جنید بغدادی علیہ الرحمہ کا قول ہے: زہد ہاتھوں اور دلوں کا طمع سے پاک ہونا ہے۔ سری سقطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: جن چیزوں سے ہاتھ خالی ہوں ان سے دل بھی خالی ہوں تو زہد کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

دوسرے طبقے میں وہ زہاد شامل ہیں جنھیں زہد میں انتہائی رسوخ اور استقلال حاصل ہوتا ہے۔ رُوَیم علیہ الرحمہ ان کے بارے میں کہتے ہیں: دنیا میں جو کچھ ہے اس کی خواہش سے نفس کو روکنا صرف زہد میں راسخ و ماہر صوفیہ ہی کا حصہ ہے۔ کیونکہ خود ترکِ دنیا میں بھی زاہد کو ایک طرح کی نفسانی لذت محسوس ہوتی ہے وہ اس طرح کہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اسے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ الغرض جس نے دل کی گہرائیوں سے ان تمام لذات سے کنارہ کشی یعنی زہد اختیار کیا وہی راسخ و ماہر زہاد میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

زہاد کا تیسرا طبقہ ان صوفیہ پر مشتمل ہے جن کو اس بات کا علم اور یقین ہوتا ہے کہ اگر ساری دنیا ان کی ملکیت اور ان کے لیے حلال قرار دے دی جائے اور انھیں اس پر کسی طرح کے محاسبے کا بھی خطرہ نہ ہو اور وہ بھی جان لیں یہ کہ ایسی حالت میں اللہ کے ہاں ان کے مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی تب بھی وہ دنیا میں زہد ہی کو اختیار کیے رکھیں۔ گویا ان کے زہد کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب

سے دنیا کی کوئی چیز پیدا کی گئی تب سے انھوں نے اس کی طرف نگاہِ التفات نہیں کی ۔ اور اگر اللہ کی نظر میں اس دنیا کی وقعت پَرِ پشہ کے برابر بھی ہوتی تو وہ اس دنیا سے زہد اختیار کرنے کو ترک کر دیتے اور ایسا کرنے سے تائب ہو جاتے ۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں : زہد غفلت ہے کیونکہ یہ دنیا لاشئی ہے اور لاشئی سے کنارہ کشی یعنی زہد اختیار کرنا صوفی کی غفلت ہی ہے ۔

یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمہ نے فرمایا : دنیا ایک دلہن کی مانند ہے جس نے ایک بار اس کا قرب حاصل کیا پھر اس سے دور نہیں ہوا مگر زاہد کی پہچان یہ ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے وہ اس عروس جہاں کے چہرے کو مسخ کرتا ہے ، اس کے بال نوچتا ہے اور اس کے کپڑے پھاڑتا ہے مگر ایک کامل و راسخ زاہد کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب حقیقی جل جلالہ کی محبت میں اس قدر محو و بے خبر ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا کی آراستہ و پیراستہ صورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ۔

مقامِ فقر کی اہمیت کا اندازہ اس آیت مبارکہ سے لگایا جا سکتا ہے ۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ [۱]

(تمھارے صدقات) ان فقیروں کے لیے ہیں جو راہ خدا میں رکے ہوئے ہوں اور وہ زمین میں کاروبار کرنے کے لیے سفر نہ کر سکتے ہوں ۔

اور ارشادِ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے : بندے کے لیے فقر کے گہنے سے بڑھ کر کوئی خوبصورت گہنا نہیں ۔

ابراہیم بن احمد خواص علیہ الرحمہ کا قول ہے :

فقر عزت کا لباس ، انبیاء علیہم السلام کا پہناوا ، صالحین کا پیراہن ، متقین کا تاج ، مومنین کا جمال ، عارفین کا سرمایہ ، مریدین کی آرزو ، اطاعت گذاروں کا قلعہ ، گنہگاروں کا زنداں ، گناہوں

---

(۱) : البقرۃ : ۲۷۳ ۲

کا مٹانے والا، نیکیوں کو بڑھانے والا، درجات بلند کرنے والا، منزل تک پہنچانے والا، اللہ کی خوشنودی کا باعث اور بندوں کی عزت کا باعث ہے۔

فقراء

فقراء تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے پاس اسباب دنیوی میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا وہ کسی سے ظاہراً کچھ طلب کرتے ہیں اور نہ باطناً۔ کسی سے کسی چیز کے ملنے کی توقع نہیں رکھتے۔ اور نہ ہی کسی سے کچھ لینے کی لالچ رکھتے ہیں۔ یہ مقام مقربین کا ہے۔

فقراء کے بارے میں سہل بن عبداللہ کا قول ملاحظہ ہو وہ فرماتے ہیں: کسی کو یہ بات کہنا جائز نہیں کہ صوفیہ، فقیر ہیں بلکہ وہ تو اللہ کی مخلوق میں سب سے بڑھ کر غنی ہوتے ہیں۔

ابوعبداللہ ابن جلار علیہ الرحمہ حقیقت فقر کے بارے میں کہتے ہیں: اپنی دونوں آستینوں کو دیوار پر مار کر کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے۔

ابوبکر زقاق علیہ الرحمہ نے ابوعلی رودباری علیہ الرحمہ سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ فقراء ضرورت کے وقت بھی کسی سے کچھ لینے سے انکار کردیتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: اس لیے کہ فقراء عطا کے بجائے عطا کرنے والے پر ہی اکتفا کیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ابوبکر زقاق نے یہ سن کر کہا یہ تو درست ہے مگر میرا خیال ہے کہ فقراء وہ طائفہ ہے جسے کسی کے عطا کرنے سے کچھ فائدہ بھی نہیں پہنچتا وہ فقط وصل یار کے بھوکے ہوتے ہیں، اور فاقہ انھیں تکلیف نہیں پہنچا سکتا کیونکہ ان کا مطلوب و مقصود تو صرف اللہ ہی ہوتا ہے۔

میں نے ابوبکر طوسی علیہ الرحمہ کو یہ فرماتے سنا کہ ایک طویل عرصہ تک مختلف لوگوں سے یہ سوال پوچھتا رہا کہ آخر فقراء ہر شے پر کیوں فقر اختیار کرتے ہیں مگر کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا اور بالآخر میں نے نصر بن الحمامی علیہ الرحمہ سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا: فقراء ہر چیز پر اس لئے فقر اختیار کرتے ہیں کہ فقر، منازل توحید میں سے پہلی منزل ہے اور مجھے اس جواب نے مطمئن کر دیا۔

فقراء کے دوسرے طبقے کے صوفیہ کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کچھ نہ رکھتے ہوئے بھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے۔ نہ وہ براہ راست مانگتے ہیں اور نہ بالواسطہ۔ بن مانگے کوئی کچھ دے دے تو اسے

رد نہیں کرتے قبول کر لیتے ہیں۔

جنید علیہ الرحمہ نے فرمایا: سچے فقیر کی نشانی یہ ہے کہ نہ کسی سے کچھ مانگتا ہے اور نہ کسی سے مقابلہ کرتا ہے اگر کوئی مقابل آ بھی جائے تو خاموش رہتے ہیں۔

سہل بن عبداللہ سچے فقیر کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: سچا فقیر نہ کسی سے کچھ مانگتا ہے اور نہ ہی اپنے پاس کوئی چیز جمع رکھتا ہے۔

ابوعبداللہ ابن الجلار علیہ الرحمہ کا قول ہے: تجھے حقیقی فقر تب حاصل ہوگا جب کہ تو نے فقر اپنے نفس کی خاطر اختیار نہ کیا ہو۔ اور جب بھی فقر حقیقی تجھے حاصل ہوگا تو وہ ہرگز تیرے اپنے نفس کے لیے نہ ہوگا۔ اور اس حیثیت سے کہ تو نے اپنے لئے فقر اختیار نہ کیا ہوگا تو تو فقیر یعنی محتاج ہی نہ ہوگا بلکہ درحقیقت غنی ہوگا (یعنی مستغنی باللہ)

ابراہیم الخواص فرماتے ہیں: فقیر صادق کی پہچان یہ ہے کہ وہ شکایت زبان پر نہیں لاتا اور مصائب کے اثرات کو ظاہر نہیں کرتا۔ ایسے مقام پر صدیقین فائز ہوتے ہیں۔

فقراء کا تیسرا طبقہ وہ ہے جس کی ملکیت میں کچھ نہیں ہوتا اور جب کبھی کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے تو اپنے ہی ہم مسلک کسی بھائی سے مانگ لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا ہم مسلک بھائی اس کے ایسا کرنے سے خوش ہوگا۔ اور اس طبقے کے فقراء اپنے ہم مسلک بھائیوں سے کچھ طلب کرنے کا کفارہ خلوص کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔

جریری علیہ الرحمہ کے مطابق حقیقی فقیر وہ ہے جو معدوم کو طلب کر کے خود کو موجود سے محروم نہیں کرتا۔

رُوَیم علیہ الرحمہ نے فرمایا: ہر دنیوی شے کے عدم کا نام فقر ہے۔ اور فقیر اُسے کہتے ہیں جو دنیوی اشیاء کو اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے حاصل کرے۔ فقر میں یہ مقام صدیقین کو حاصل ہوتا ہے۔

مقامِ صبر

صبر مقامات سلوک میں سے وہ اہم اور اعلیٰ مقام ہے جس کا ذکر اللہ تعالےٰ نے اس طرح فرمایا ہے:

إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ[1]　　صابروں کو بھرپور اور بے حساب اجر دیا جائے گا۔

جنید علیہ الرحمہ صبر کے بارے میں کہتے ہیں: تکلیف کا فقط اللہ کے لیے اس وقت تک برداشت کرنا کہ وہ ٹل جائے، صبر ہے۔

ابراہیم خواص علیہ الرحمہ کا قول ہے: اکثر لوگ صبر کے بوجھ کو اٹھانے سے فرار اختیار کرکے دنیوی اسباب کی طلب کا سہارا لیتے ہیں اور وہ ان اسباب پر اس طرح بھروسہ کر بیٹھتے ہیں کہ گویا وہی اُن کے رب ہیں۔

شبلی اور ایک اجنبی کا مکالمہ

کسی اجنبی شخص نے ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ سے صبر کے موضوع پر ایک گفتگو کی جو اس طرح ہے:

اجنبی: کونسا صبر، صابرین کے لیے مشکل ترین ہوتا ہے؟

ابوبکر شبلی: صرف اللہ کی اطاعت میں صبر اختیار کرنا مشکل ترین ہے۔

اجنبی: نہیں!

شبلی: خالصتاً اللہ کے لیے صبر اختیار کرنا۔

اجنبی: نہیں!

شبلی: تو کیا وہ صبر کہ جس میں خصوصی انعامات عطا ہوتی ہیں مگر بندہ ادب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

اجنبی: نہیں!

شبلی: (غضب ناک ہوکر) تجھ پر افسوس ہے پھر کونسا صبر ہے جو مشکل ترین ہے۔

اجنبی: مشکل ترین صبر یہ ہے کہ بندہ قربِ الٰہی پانے کے بعد بارگاہِ ایزدی سے دور کئے جانے پر صابر رہے۔

یہ سن کر ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ نے ایسی چیخ ماری کہ قریب تھا ان کی روح جسم سے جدا ہو جاتی۔

---

(۱): الزمر: ۱۰

اصنافِ صابرین

بصرہ میں قیام کے دوران میں نے ابن سالم علیہ الرحمہ سے صبر کرنے والوں کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا: صبر کرنے والے تین طرح کے ہوتے ہیں، متصبر جو بتکلف صبر کرتے ہیں دوسرے صابر جو فی الواقع صبر اختیار کرتے ہیں۔ اور تیسرے صبّار جو بہت زیادہ صبر کرنے والے ہوتے ہیں۔

بتکلف صبر کرنے والا اللہ کے ذریعے صبر کرتا ہے۔ وہ بعض اوقات تو صبر اختیار کرتا ہے اور بعض اوقات اس سے عاجز ہوتا ہے۔ قناد علیہ الرحمہ نے کہا کہ جن چیزوں سے منع کیا گیا ان سے باز رہنا اور جن کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ان پر ثابت قدم رہنا صبر ہے۔

صابر کی یہ علامت ہے کہ وہ للہ فی اللہ صبر اختیار کرتا ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی مصائب پر غم کا اظہار نہیں کرتا۔ مگر اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ فریاد کرے، جیسا کہ ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ میں حالتِ مرض میں ایک صوفی کی عیادت کو گیا تو گفت گو کے دوران اس نے ایک ولدوز چیخ ماری اس پر میں نے اس سے کہا کہ وہ شخص محبت میں صادق نہیں جس نے مصیبت و دکھ میں صبر نہ کیا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا: نہیں بلکہ یوں کہئے کہ وہ شخص سچا محب نہیں جس نے دکھ سے لذت حاصل نہ کی۔

اس ضمن میں شبلی علیہ الرحمہ کا ایک واقعہ ہے کہ جب انھیں شفاخانے میں داخل کیا گیا اور اس کے بعد کچھ احباب بغرضِ عیادت گئے تو انھوں نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ انھوں نے کہا: آپ کے چاہنے والے، اس پر شبلی نے جواباً ان کی طرف اینٹیں پھینکیں اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور آپ نے ان کو پکارا کہ اے محبت کے جھوٹے دعویدارو! کیا تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور میرے دیئے ہوئے دکھ پر صبر تک نہیں کر سکتے۔

جہاں تک صابرین میں سے صنفِ صبّار کا تعلق ہے۔ تو یہ درجہ اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے ذریعے، اللہ ہی کے لیے اور اللہ کو ہی اپنا جاننے پر صبر اختیار کر لیا ہو۔ صبار یعنی انتہائی درجے کا صابر وہ ہوتا ہے کہ اگر مصائب کے پہاڑ بھی اس پر ٹوٹ پڑیں تو بھی اس کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹنے نہیں پاتا۔ اور وہ ظاہری باطنی دونوں لحاظ سے غیر متزلزل رہتا ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ صبر کی وضاحت میں اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

عبرت خططن فی الخد سطرا — قد قرأها من لیس یحسن یقرأ

ان صوت المحب من الم الشوق — وخوف الفراق یورث ضرأ

صابر الصبر فاستغاث به الصبر

فصاح المحب بالصبر صبر

(۱) آنسوؤں نے رخساروں پر جو سطریں رقم کیں وہ اس نے بھی پڑھ ڈالیں جو اچھی طرح پڑھ نہیں جانتا۔

(۲) اس میں کوئی شک نہیں کہ وارفتۂ الفت کی الم شوق و اندیشۂ فراق میں ڈھلی ہوئی صدا زبوں حالی و تنگی سے خالی نہیں ہوتی۔

(۳) محب نے صبر کیا اور یہاں تک صبر کیا کہ خود صبر نے بھی دہائی دی اور محبت کا شیدائی پکار اٹھا کہ اے صبر! صبر کر۔

صبر کا ایک مقام یہ بھی ہے کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام کے سر مبارک پر دشمنانِ خدا نے آرہ چلایا تو انھوں نے ایک دلدوز آہ نکالی اور اللہ نے وحی کی وساطت سے انہیں خبر دی کہ اے زکریا! اگر تیری دوسری آہ مجھ تک پہنچی تو میں تمام زمینوں اور آسمانوں کو ایک دوسرے پر الٹا دوں گا۔

مقامِ توکل

کیا اعلیٰ مقام ہے توکل کا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں ایمان کا ذکر کیا وہاں توکل کو بھی اس کے ساتھ ہی بیان فرمایا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱) — اور اللہ ہی پر بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو۔

اور فرمایا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۲) — اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

---

(۱) : المائدۃ : ۲۳ (۲) ابراہیم : ۱۲

مذکورہ آیاتِ مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے توکلِ متوکلین کو توکل مومنین سے مخصوص کیا اور پھر ایک مقام پر خاص الخاص توکل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ (۲) — اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اسے کافی ہے

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس کے سوا کسی اور پر بھروسہ کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دیتا جیسا کہ سید المرسلین و امام المتوکلین صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمایا:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَكَفَىٰ بِهِ (۳) — اور بھروسہ کرو اس زندہ پر جو کبھی نہیں مرے گا اور اسے سراہتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرو اور وہی کافی ہے۔

اور فرمایا:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ (۴) — اور اس پر بھروسہ کرو جو عزت والا مہربانی والا ہے، جو تمھیں دیکھتا ہے جب تم (نماز کے لیے) کھڑے ہوتے ہیں

درجاتِ توکل

توکل کے تین درجے ہیں۔ توکل عام، توکل خاص اور توکل خاص الخاص۔

پہلے درجے کی تعریف ابو تراب نخشبی علیہ الرحمہ کے الفاظ میں یوں ہے کہ توکل جسم کی عبودیت کا عادی بنانے اور قلب کو ربوبیت و کفایت پر مطمئن رکھنے کا نام ہے۔ یعنی بندے کو کچھ عطا ہو تو شکرِ خداوندی بجا لائے اور اگر محروم رکھا جائے تو قضائے قادر پر صبر و شکر کر کے اطمینان سے بیٹھا رہے۔

توکلِ عام سے متعلق اقوالِ صوفیہ

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ: تدبیرِ نفس کو ترک کرنے اور ہر طرح کے خوف و قوت سے بے نیاز رہنا ہی توکل ہے۔

---

(۱): ابراہیم: ۱۱، ۱۲ (۲): الطلاق: ۳، ۶۵
(۳) الفرقان: ۵۸ ۲۵ (۴): الشعرأ: ۲۱۷، ۲۱۸ ۲۶

ابوبکر زقاق علیہ الرحمہ : توکل یہ ہے کہ ساری زندگی کو فقط ایک دن سمجھ لیا جائے تاکہ کوئی آنے والا دن رہے اور نہ اس کا غم ۔

رُوَیم علیہ الرحمہ : توکل یہ ہے کہ اللہ کے بندے سے وعدے کا اعتبار کیا جائے ۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ : تمام معاملات اللہ پر چھوڑ دینا ہی توکل ہے ۔

توکلِ خاص اقوالِ صوفیہ کے آئینے میں

ابوالعباس ابن عطاء علیہ الرحمہ : جس نے اللہ پر اس کے ماسوا کے لیے توکل کیا تو اس نے اللہ پر ہرگز توکل نہ کیا ۔ توکلِ خاص تو یہ ہے کہ وہ اللہ پر اسی کے لیے اور اسی کے ذریعے ہو ۔ اور اللہ پر توکل کو صرف مقامِ توکل پانے کی خاطر ہی اختیار کیا جائے ۔

ابویعقوب نہر جوری علیہ الرحمہ : توکل ، اسبابِ دنیا و آخرت کی لذتوں سے محرومی اور نفس کی موت کا نام ہے ۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ : توکل کی اصل فقر و فاقہ ہے ۔ متوکل کو چاہئے کہ انتہائی خواہشات اور آرزوؤں کے عالم میں بھی توکل کو ترک نہ کرے ۔ اور ساری زندگی ، ایک لمحے کے لیے بھی اپنے توکل کی جانب متوجہ نہ ہو ۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ : توکل کی مثال اس چہرے کی مانند ہے کہ جس کے ظاہری خد و خال نہ ہوں اور توکل فقط ان لوگوں کا حصہ ہے جو اپنے نفس کو مار چکے ہوں اور عجز و انکساری کی ایسی کیفیت کے حامل ہوں کہ گویا وہ جیتے جی اہلِ قبور ہیں ۔

توکلِ خاص الخاص اور اقوالِ صوفیہ

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ : اللہ کے لیے خود کو اس طرح وقف کر دو کہ تیرا اپنا وجود باقی نہ رہے اور فقط ذاتِ الٰہی ہی باقی رہ جائے جس کو زوال نہیں ۔

بعض صوفیہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی بھی حقیقتِ توکل کے اعلیٰ درجے تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ کمال میں کمال حاصل کرنا فقط ذاتِ حق تعالیٰ کا حصہ ہے ۔

جنید علیہ الرحمہ : ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنا توکل ہے ۔

احمد بن ابی الحواری علیہ الرحمۃ سے ان کے شیخ نے فرمایا: اے احمد آخرت کے کئی راستے ہیں جن میں سے اکثر سے تیرے شیخ کو واقفیت ہے مگر ایک راستہ ایسا ہے کہ جس سے تیرا شیخ محروم ہے اور وہ ہے راہ توکل۔

بعض صوفیہ کا کہنا ہے کہ جس شخص نے توکل کو کاملاً حاصل کرنا ہو اسے چاہئے کہ ایک قبر کھود کر خود کو اس میں دفن کر دے اور دنیا و مافیہا کو بھول جائے۔ اور جہاں تک حقیقتِ توکل بجالہ جاننے کا تعلق ہے۔ تو اسے خلق میں سے کوئی بھی نہیں پا سکا۔

مقامِ رضا اور اہلِ رضا

مقامِ رضا کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے:

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ(۱) اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔

اور فرمایا:

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ(۲) اور اللہ کی رضا سب سے بڑی ہے۔

مذکورہ آیاتِ مبارکہ میں اللہ جل جلالہ نے بندوں سے راضی رہنے کے ذکر کو بندوں کے اس سے راضی رہنے کے ذکر پر اولیت دی اور اس طرح اسے اہم ٹھہرایا۔

رضا اللہ کی جانب ایک دروازہ ہے اور دنیا میں ایک جنت کے برابر ہے۔ رضا یہ ہے کہ بندہ اللہ کے ہر حکم پر راضی رہے۔

رضا اور اقوالِ صوفیہ

جنید بغدادی علیہ الرحمہ: رضا اپنے اختیار سے دستبردار ہونے کا نام ہے۔

قناد علیہ الرحمہ: اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر سکون و اطمینان اختیار کرنے کو رضا کہتے ہیں۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ: اللہ کی قضا پر قلب کا مسرور ہو جانا رضا ہے۔

ابن عطا علیہ الرحمہ: رضا یہ ہے کہ بندہ قلب کو اللہ تعالیٰ کے دائمی اختیار کی طرف متوجہ رکھے کیونکہ وہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے جو کچھ نتائج اپنے بندے کے لیے منتخب فرمائے ہیں وہ اس کے لیے مفید ہیں۔ اس لیے بندے کو ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہنا چاہیئے۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ: اپنی جد و جہد میں رضا کو حاکم بناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ رضا کو خود پر مسلط کر کے اس کی لذتوں اور حقیقتوں سے محروم رہ جاؤ۔

طبقاتِ اہلِ رضا

اہل رضا کے تین طبقے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے کہ وہ اپنے دکھ درد کے اظہار کو یکسر ختم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے دل اللہ کی طرف سے ہر دکھ، غم، آزمائش، آسائش اور منع و عطا کو خوشی سے قبول کرتے ہیں۔

اہل رضا کا دوسرا طبقہ اللہ سے راضی رہنے کے احساس کو چھوڑ کر اللہ کے اس سے راضی رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اور وہ ایسی خواہش اللہ کے اس قول کے مطابق کرتے ہیں کہ " رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ " اور چاہے تنگ دستی، خوشحالی اور منع و عطا کے حالات اس پر آجائیں تو بھی وہ اللہ کے اس سے راضی رہنے پر اپنی رضا کو ترجیح نہیں دیتا۔

تیسرا طبقہ اہل رضا کا مذکورہ حدود سے بھی کہیں آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس طبقے کے صوفیہ نے اللہ کی دائمی عنایت کو رضائے عبد اور رضائے الٰہی کی بنیاد ٹھہرایا۔

ابو سلیمان دارانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں خلق کے اعمال ہی اللہ کو راضی یا ناراض نہیں کرتے بلکہ وہ جس سے راضی ہو جائے پھر اس سے ایسے کام لے لیتا ہے کہ وہ اس کی رضا کا باعث بن جاتے ہیں۔

۱۲

احوال صوفیہ عظام علیہم الرحمہ

مراقبہ [۱]

حالِ مراقبہ کا ذکر ذیل کی ان آیاتِ مبارکہ میں موجود ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا [۲]	اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔
مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ [۳]	کوئی بات وہ زبان سے نہیں نکالتا کہ جہاں اس کے پاس ایک محافظ تیار نہ بیٹھا ہو۔
اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ [۴]	کہ اللہ ان کے دل کی پوشیدہ بات اور سرگوشی کو جانتا ہے۔
وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ [۵]	اور جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ بھی کئی دیگر آیاتِ قرآنیہ میں حالِ مراقبہ کا ذکر موجود ہے۔

حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) مراقبہ کا مفہوم: دل کی ماسوا سے نگہبانی، دل میں مقصود کے تصور کی محافظت کرنا، بندہ کا اپنے علم کو بغرضِ فیضانِ علمِ قدسی حق تعالیٰ کی جانب رجوع کرنا۔

(۲) الاحزاب: ۵۲   ۳۳   (۳) قٓ: ۱۸   ۵۰

(۴) التوبہ: ۷۸   (۵) التغابن: ۴

"اللہ کی بندگی اس طرح بجالاؤ گو یا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ پاتے تو یہی سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔"(۱)

بندہ کا مراقبہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا یقین کرے کہ اس کا رب اس کے باطن کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اور اس کے ان تمام خیالات و تصورات سے بھی بخوبی آگاہ ہے جو اسے اپنے مالک حقیقی کی یاد سے دور رکھتے ہیں۔

ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اللہ سے دلوں کا حال کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے جب کہ دلوں میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی جانب سے دلنشین کیا ہوا ہوتا ہے۔

جنید علیہ الرحمہ کا قول ہے: مجھ سے ابراہیم آجری علیہ الرحمہ نے کہا: اے لڑکے! اگر تو اپنے ارادے سے ذرا برابر بھی اللہ کی طرف لوٹا دے تو یہ سارے عالم سے بہتر ہے۔

حسن بن علی دامغانی علیہ الرحمہ کہتے ہیں اپنے باطن کی حفاظت کر کیونکہ تمہارے باطن کے معاملات سے اللہ تعالیٰ اچھی طرح باخبر ہے۔

اہل مراقبہ کے طبقات

اہل مراقبہ کے تین طبقے ہیں۔

پہلے طبقے کے لوگ جس طرح کے حال مراقبہ پر فائز ہوتے ہیں اس کا حال گذشتہ سطور میں حسن بن علی دامغانی کے قول میں بیان ہو چکا ہے۔

دوسرا گروہ اہل مراقبہ کا وہ ہے جس کے بارے میں احمد بن عطا علیہ الرحمہ نے فرمایا: تم میں سے بہترین وہ شخص ہے۔ جس نے ماسوی اللہ کو فنا کر کے حق کو حق پر مراقب (نگہبان) ٹھہرایا اور اپنے اخلاق و اعمال اور آداب میں جناب ختم الرسل علیہ التحیۃ والسلام کی اتباع کی۔

تیسرے طبقے میں اکابر صوفیہ شامل ہوتے ہیں جو اللہ ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور اس عمل میں اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اور اللہ نے اس طرح کے اپنے مخصوص بندوں کو اس کرم سے نوازا ہے کہ تمام حالات میں وہ انھیں ان کے نفوس کے حوالے کرے گا اور نہ ہی انھیں کسی اور کا

---

(۱) صحیح بخاری: کتاب الایمان باب: ۳۷

محتاج فرمائے گا۔ اور وہی ان کے تمام معاملات کی نگہبانی کرتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا؛

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِيْنَ (۱) — اور وہ نیکوں کو دوست رکھتا ہے۔

ابن عطا علیہ الرحمہ نے خراسان کے کسی دانشور سے جو کہ جہالت کا شیدائی اور تقشف کو اپنائے ہوئے تھا یہ کہا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ جو کچھ تو نے اپنے تن من پر مسلط کر رکھا ہے وہ تیرے پہلو میں ایک میل ہے جو برابر تیرے دل پر چڑھتا چلا جا رہا ہے اور تو اپنے باطن میں اس میل کی نگہبانی کر رہا ہے۔ تجھے تو چاہیے کہ اپنے ظاہر و باطن پر اپنے رب کو نگہبان بنائے کیونکہ اعمال و عبادات انجام دے کر انھیں اپنے ظاہر و باطن میں جگہ دے کر ان کی نگہبانی سے تو کہیں بہتر ہے کہ تو اپنے محبوب حقیقی جل جلالہ کو اپنے دل میں بسا کر اسی کا مراقبہ کرتا رہے۔

حالِ قرب

حالِ قرب کا ذکر مختلف آیاتِ قرآنی میں اس طرح ہوا ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ (۲)	اور اے محبوب! جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں۔
وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۳)	اور ہم شہ رگ سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔
وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (۴)	اور ہم اس کے زیادہ پاس تم سے مگر تمہیں نگاہ نہیں۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ (۵)	وہ مقبول بندے جنھیں یہ کافر پوجتے ہیں وہ آپ ہی اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب ہے۔

---

(۱) الاعراف: ۱۹۶ ۷ — (۲) البقرۃ: ۱۸۶ ۲

(۳) قٓ: ۱۶ ۵۰ — (۴) الواقعۃ: ۸۵ ۵۶

(۵) بنی اسرائیل: ۵۷

آخرالذکر آیت مبارکہ میں وسیلہ سے مراد قرب ہے۔ اوراس سے ماقبل کی آیت میں اللہ نے اپنے سے بندوں کے قرب ہونے کا ذکر کیا۔ اور پھر بندوں کے اس سے قریب ہونے کو وَسِیلے کے معنی میں بیان فرمایا؛

مشاہدہ کرنے والے بندے کے حالِ قرب کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ سے اس کا قلب قریب ہوتا ہے۔ اور یہ قرب اسے اطاعتِ خداوندی اور ظاہراً و باطناً بارگاہ رب العزت میں ہمہ وقت اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ارادے پیش کرنے کے باعث حاصل ہوتا ہے۔

درجاتِ قرب

قرب کے تین درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ بندہ طرح طرح کی اطاعتیں کر کے اور یہ جانتے ہوئے کہ اللہ اس سے بہت قریب اور اس پر قادر ہے، قربِ الٰہی کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔

متقربین میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں مذکورہ حالت پر استقامت حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ عامر بن عبداللہ فرماتے ہیں: میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی کہ جس سے اپنے بجائے اللہ کو قریب تر نہ دیکھا ہو۔ ملاحظہ ہوں اسی ضمن میں چند اشعار

وتحققتك فی السر فناجاك لسانی فاجتمعنا لمعان وافترقنا لمعانی

ان یکن غیبك التعظیم عن لحظ عیانی

فلقد صیرك الوجد من الاحشاء دانی

(۱) میں نے تجھ کو اپنے نہاں خانۂ دل میں پایا تو میری زبان نے تجھ سے سرگوشیاں کیں۔ گویا ہم کچھ اوصاف میں اکٹھے ہو گئے اور کچھ میں جدا۔

(۲) اگرچہ تیری عظمتِ شان نے تجھ کو میری نظروں سے اوجھل رکھا تاہم وجد نے تجھے میری آنتوں یعنی باطن کے قریب کر دیا۔

قرب کے دوسرے درجے کے بارے میں جنید بغدادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: واضح رہے کہ اللہ اپنے بندوں کے قلوب سے اسی قدر قریب ہوتا چلا جاتا ہے کہ جس قدر ان کے قلوب اس سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ لہٰذا تو اس جانب دھیان کر کہ تیرے قلب کے قریب کیا ہے؟

ایک صوفی کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں کہ وہ ان سے اسی قدر قریب ہوتا ہے جتنا کہ وہ اس سے قریب ہوتے ہیں۔

قرب کے تیسرے درجے میں اکابر صوفیہ شامل ہوتے ہیں۔ اور اس کی وضاحت ابوالحسین نوری علیہ الرحمہ کے اس قول سے ہوتی ہے جو انھوں نے ایک ملاقاتی سے بیان فرمایا، ملاقاتی سے آپ نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا بغداد سے۔ آپ نے کہا: بغداد میں کس کی صحبت میں رہے ہو۔ وہ بولا، ابوحمزہ کی صحبت میں، آپ نے اس سے فرمایا جب تو بغداد جائے تو ابوحمزہ سے کہنا کہ جسے ہم قرب القرب سمجھتے رہے ہیں وہ دراصل بعد البعد ہے۔

اسی مفہوم کو ابویعقوب السوسی علیہ الرحمہ یوں بیان کرتے ہیں: جب تک بندے کو قرب کا احساس رہتا ہے قرب باقی نہیں رہتا۔ اور جب وہ قرب کی کیفیت پر فائز ہوتے ہوئے خود کو قرب سے منفی کر دیتا ہے تب اسے قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ سے قریب ہو جاتا ہے۔

محبت

احوال صوفیہ میں سے محبت ایک اہم حال ہے۔ جس کا ذکر مختلف آیات مبارکہ میں کیا گیا ہے۔

قول عزوجل:

فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ[1]	تو عنقریب اللہ ایسے لوگ لائے گا کہ اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے۔

اور فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[2]	اے محبوب تم فرما دو لوگو! اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمہیں دوست رکھے گا۔

---

(۱) المائدۃ: ۵۴
(۲) آل عمران: ۳۱

۵ ۳

اور فرمایا :

يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۱)

وہ ان (معبودوں) کو اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں۔ اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی سے محبت نہیں۔

پہلی آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بندوں سے اپنی محبت کا ذکر بندوں کی اس سے محبت کے ذکر سے پہلے فرمایا۔

دوسری آیت کریمہ میں بندوں کی اس سے محبت اور اس کی بندوں سے محبت بیان کی گئی ہے۔

تیسری آیت مبارکہ میں بندوں کی اس سے محبت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

جو بندہ حالِ محبت پر فائز ہوتا ہے وہ اللہ کے عطا کردہ انعامات کا اپنی چشم بصیرت سے ادراک کرتا ہے۔ قربِ معبود کو ہمہ وقت قلب میں موجود پاتا ہے اور قلب میں اس کی عنایت، حفاظت، ہدایت اور قدیمی محبت کو محسوس کرتا ہے۔ جس بندے کو اس طرح کی کیفیات حاصل ہوں بلاشبہ اس نے کما حقہٗ اللہ جل جلالہٗ سے محبت کی۔

اہلِ محبت کے احوال تین قسم کے ہیں۔ پہلا حال محبتِ عام کا ہے جو اللہ کے احسان اور مہربانی کے نتیجے میں رونما ہوتا ہے۔ سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"دل کی یہ جبلت ہے کہ جس نے اس کو راضی رکھا اس سے محبت کی اور جس نے ناراض کیا اس سے نفرت کی۔"

مذکورہ حالِ محبت کی شرط حضرت سمنون علیہ الرحمہ نے یوں بیان کی کہ دائمی ذکرِ محبوب ہی سے محبتِ خالص حاصل ہوتی ہے کیونکہ جس نے واقعی محبت کی اس نے ذکرِ حبیب کی کثرت کی۔

سہل بن عبداللہ محبت کے بارے میں کہتے ہیں۔ محبت، اللہ کی جانب سے ہر چیز پر راضی رہنے، کیفیت کو ہمیشہ کے لیے اختیار کرنے، اتباعِ رسول اور اللہ کے حضور مناجات و فریاد کی

---

(۱) البقرۃ : ۱۶۵

شیرینی و حلاوت کے باوصف ذکر خداوندی میں دوام پیدا کرنے کا نام ہے۔

سید الشہداء حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے محبت کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرمایا، بندہ اس کی محبت میں اپنی سی پوری کوشش کرے پھر جو حبیب کی منشا ہو وہ کرے، یہی محبت ہے۔

کسی نامعلوم صوفی کا قول ہے کہ ثنائے محبوب سے والہانہ شوق، اس کی اطاعت اور ہر حال میں اس کے حضور سر تسلیم خم کرنے کو محبت کہتے ہیں جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے

لو کان حبك صادقاً لا طعته

ان المحب لمن یحب مطیع

ترجمہ: اگر تیری محبت سچی ہوتی تو اس کی اطاعت اختیار کرتا، کیونکہ جو محبت کرتا ہے وہ اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔

محبت کا دوسرا حال اللہ جل جلالہ کی شانِ بے نیازی، رعب جلال و عظمت، علم اور قدرت پر چشم دل کو وا کرنے سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ محبت کی یہی مذکورہ کیفیت فقط صادقین (سچے چاہنے والوں) اور متحققین کو نصیب ہوتی ہے۔ اسی حالِ محبت کی توضیح میں جناب ابوالحسین نوری فرماتے ہیں: محبت کیا ہے؟ حجابات کا اٹھنا اور رازہائے سربستہ کا ظاہر ہونا۔

ابراہیم خواص علیہ الرحمہ یوں گویا ہیں کہ محبت اپنے جملہ ارادوں کی نیستی اور تمام صفات و حاجات کو جلا کر راکھ کر دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

ابوسعید خراز محبت کی سرمدی لذتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں سعادت و خوش بختی ہے اس بندے کے لیے جس نے اس پیکرِ حسن لم یزل کی محبت کا جام نوش کیا۔ اور اس طرح ربِ جلیل کے حضور مناجات اور اس کے قرب و محبت کی نعمتوں سے شاد کام ہوا کہ قلب محبت کی لازوال دولت سے مالا مال ہو گیا اور اشتیاق و الفت کے سرمدی کیف سے سرشار ہو کر جھوم اٹھا۔ اللہ اللہ! کیا خوب عاشق ہے ایسا بندہ کہ جو حب حبیب میں ہر دم محو اس کا جویاں اور اس کے سوا بے قرار و بے چین ہے۔

محبت کی تیسری کیفیت (حال) ان صدیقین و عارفین سے متعلق ہے جو اللہ کی اپنے بندوں

سے الفتِ قدیم و بے علت کو جانتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اور اسی طرح پاکیزہ و بے داغ محبت کا رشتہ ان کے اور محبوب حقیقی کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ محبت کی اسی قسم کے بارے میں ذوالنون مصری علیہ الرحمہ ارشاد فرماتے ہیں : خالص بے داغ محبت وہ ہے جس میں قلب اور دیگر جوارح سے محبت اس طرح ساقط ہو جائے کہ تمام اشیاء اور بندے کا وجود بھی صرف اللہ کے لیے ہی وقف ہو کر رہ جائے۔ (گویا خود محبت کو اپنے دل میں محسوس کرنا بھی ماسوا اللہ کے وجود کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے جو اونچے درجے کے صوفیہ کا خاصا نہیں۔)

ابو یعقوب السوسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں : کہ محب اپنی محبت میں اس وقت تک سچا نہیں ہو سکتا جب تک وہ احساس محبت سے احساس محبوب تک نہ پہنچ جائے۔ اور اس کو اپنی محبت تک کا علم بھی نہ رہے۔ جب محب، محبت محبوب میں یہاں تک رسائی حاصل کرے تو سمجھ لو کہ اس کی محبت مکمل اور بے کدورت ہے اور وہ محب ہے بغیر محبت کے۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ کا کہنا ہے : محبت، صفات محب کا صفاتِ محبوب سے بدل جانے کو کہتے ہیں۔ شیخ مذکور کی یہ وضاحت دراصل اللہ کے اس قول سے مستفاد ہے جس میں فرمایا گیا کہ ایک مقام ایسا بھی ہے جس میں اللہ فرماتا ہے کہ میں ہی بندے کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ سنتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔

خوف

ہم نے حالِ قرب کے بیان کے بعد حالِ محبت و خوف کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ قرب دو حالتوں کا تقاضا کرتا ہے اور وہ یہ ہیں کہ صوفیہ کے قلوب پر احساسِ قرب کے دوران خوف طاری ہوتا ہے یا محبت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ وہ تقسیم ہے جس کے تحت اللہ نے ہر دل کو تصدیق حقیقت یقین اور خشیت کی دولت عطا فرمائی ہے۔ اور اس کا تعلق کشفِ غیوب سے ہے۔

اگر بندے کے قلب نے قربِ محبوب کے دوران اس کی عظمت، ہیبت اور قدرت کا مشاہدہ کیا تو وہ خوف و حیا کی جانب بڑھے گا اور اگر اس کے قلب نے قرب کے دوران شفقت و محبت اور مہر و احسان کا مشاہدہ کیا تو وہ محبت، شوق، قلق، سوزِ دروں، اللہ کے قدیمی لطف و احسان

اور ایک دائمی تنگی کی کیفیت سے دوچار ہوگا۔ اور یہ سب کچھ صرف اللہ کی مشیت ہی سے ہوتا ہے اور یہی خدائے علیم وعزیز کا وہ مقررہ انداز ہے جس کا تعین اس نے خود فرمایا ہے۔

اقسامِ خوف

خوف کی تین قسمیں ہیں۔

مخصوص بندوں کا خوف، متوسط بندوں کا خوف اور عام بندوں کا خوف،

مذکورہ تینوں اقسامِ خوف کا ذکر مختلف آیات مبارکہ میں بالترتیب یوں کیا گیا ہے:

فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱) — تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (۲) — اور جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرے اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ (۳) — ڈرتے ہیں اس دن سے جس دن الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں۔

عام بندے اللہ کے غضب و عذاب سے ڈرتے ہیں اور سطوتِ معبود سے مطلع ہونے کے سبب ان پر خوفِ خدا طاری ہو جاتا ہے۔

درمیانے درجے کے بندوں کا خوف اللہ سے دوری اور معرفتِ خالص کے مکدر ہونے کے خدشے سے پیدا ہوتا ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ خوف کے بارے میں فرماتے ہیں: خوف کا مطلب اللہ سے اس خدشے کے تحت ڈرتے رہنا ہے کہ کہیں وہ بندے کو اپنے سے دور نہ کر دے۔

ابوسعید خراز علیہ الرحمہ نے فرمایا: میں نے ایک عارف سے خوف کی تعریف پوچھی تو فرمایا: میں تو خود اس تلاش میں ہوں کہ کوئی مجھے خوف کی تعریف سے آگاہ کرے۔ پھر مزید فرمایا کہ اکثر خوف کرنے والے

---

(۱) آلِ عمران: ۱۷۵ ۳ (۲) الرحمٰن: ۴۶ ۵۵

(۳) النور: ۳۷

اس بات سے اللہ کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں وہ اپنے نفس پر شفقت نہ کر بیٹھیں اور اس بات سے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ کوئی ایسا عمل نہ کر بیٹھیں جو انھیں حکم خداوندی سے دور لے جائے۔

ابن خبیق علیہ الرحمہ نے کہا: میرے نزدیک خوف خدا رکھنے والا وہ ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ خوف و امن کی حالت میں رہے جیسا کہ ایک وقت میں مخلوق اللہ کا خوف رکھتی ہے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اللہ اسے مطمئن اور مامون فرما دیتا ہے۔

فناد علیہ الرحمہ کا قول ہے: علامتِ خوف یہ ہے کہ بندہ اپنے نفس کو کسی نیک کام کے زمانۂ حال میں کرنے کے بجائے مستقبل قریب میں انجام دینے کی بیماری نہ لگائے۔

بعض صوفیہ کا خیال ہے کہ ہیجانِ قلوب اور ترہیب سے خوف رکھنا ہی علامت خوف ہے۔

ابن خبیق علیہ الرحمہ نے کہا: میرے نزدیک خائف وہ ہے جو شیطان سے اس قدر خوف نہ رکھے جس قدر کہ خود اپنے نفس سے ڈرے۔

خوف خدا رکھنے والوں میں جو لوگ طبقۂ خواص سے تعلق رکھتے ہیں ان کے خوف کی کیفیت سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ کے اس قول سے معلوم ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

اللہ کا خوف رکھنے والے بندوں کے خوف میں سے ایک ذرہ بھی سارے عالم کے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے تو یہ ان کی نجات کا سامان ہو جائے۔ ان سے اس بارے میں جب سوال کیا گیا کہ اس درجہ کا خوف رکھنے والوں کے پاس کس قدر خوفِ خدا ہوتا ہے تو فرمایا: پہاڑ برابر۔

ابن جلاء علیہ الرحمہ نے فرمایا: خوف خدا رکھنے والا اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ خوف کے اعلیٰ درجے پر فائز بندے فراق محبوب سے لرزاں رہتے ہیں جب کہ نچلے درجے والے پر خوفِ عذاب طاری ہوتا ہے۔ اور اعلیٰ درجے کا خوف پانا تو بہت دور کی منزل ہے کیونکہ جب تک نفس میں کسی طرح کی بھی رعونتیں باقی رہیں خوف کا یہ مقام حاصل ہونا ممکن نہیں۔

نفس کی رعونتوں سے مراد نفس کی تدبیریں، دعویٰ کرنا اور اپنی عبادت گذاریوں پر نظر رکھنا ہے۔

رجاء

جن آیات قرآنی میں رجاء (امید) کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر (۱)	بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے اس کے لیے کہ جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہو۔
ویرجون رحمتہ ویخافون عذابہ (۲)	اس کی رحمت کی امید رکھتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔
فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحاً (۳)	تو جسے اپنے رب سے ملنے کی امید ہو اسے چاہئے کہ نیک کام کرے۔

رجاء (امید) کی تفسیر میں کہا گیا کہ اللہ کی جانب سے اچھا بدلہ پانے کی توقع کرنا ہی احوال تصوف میں وہ حال ہے جسے رجاء (امید) کہا جاتا ہے۔

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مومن کے خوف اور رجاء (امید) کا وزن کیا جائے تو برابر نکلیں گے (۴)

بعض صوفیہ کا قول ہے کہ خوف و رجاء عمل کے دو پر ہیں جن کے بغیر وہ فضائے قبولیت کی جانب پرواز نہیں کر سکتا۔

ابوبکر وراق علیہ الرحمہ نے فرمایا: اللہ کی جانب سے رجاء (امید) ہی اس کا خوف رکھنے والوں کے لیے وہ فرحت بخش نعمت ہے کہ جو حاصل نہ ہو تو دل سکڑ جائیں اور عقلیں جاتی رہیں۔

---

(۱) الاحزاب : ۲۱ ۳۳ (۲) بنی اسرائیل ۱۷
(۳) الکہف : ۱۱۰ ۱۸

اقسامِ رجاء

رجاء (امید) کی تین اقسام ہیں۔

اللہ سے فقط اسی کی امید رکھنا، وسعتِ رحمت کی امید اور ثواب پانے کی امید۔

حصولِ ثواب و وسعتِ رحمت کی امید یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے انعامات کا ذکر سنے اور ان کے عطا ہونے کی امید رکھے۔ اور جب اس کو اپنے رب کے کرم و جود اور بخشش و عطا کا علم ہو جائے تو اس کا دل اپنے معبود کے فضل و کرم کا امیدوار ہو جائے۔ جیسا کہ ذوالنون مصری علیہ الرحمہ سے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی دعا میں اللہ کے حضور عرض کیا کرتے تھے:

اللھم ان سعۃ رحمتك أرجاءُ	اے ہمارے رب ہمارے لیے اپنے
لنا من اعمالنا عندنا و اعتمادنا	اعمال سے بڑھ کر تیری وسعتِ رحمت
علی عفوك أرجاءُ عندنا من	امید افزا ہے۔ اور ہم تیرے عذاب سے
عقابك۔	بڑھ کر تیری عفو و درگذر کے امیدوار ہیں۔

اسی طرح کسی نے یوں کہا: اے میرے رب! جس نے تیری ذات ہی کو اپنے ارادوں کا محور بنایا اور مصائب کی گھڑیوں میں تجھے پکارا بے شک تو نے اس پر اپنے لطف و کرم کے خزانے کھول دیئے۔

اے آرزو بھرے دلوں کی منزل! ہمیں ایسی آسائش سے نواز جو ہمیں بار بار تیری رضا کے چشموں سے سیراب کرے اور تیری قربت سے قریب کر دے۔

اللہ سے واقعتاً امید رکھنے والا در اصل اس کی ذات سے امید رکھنے میں اس قدر ثابت قدم ہوتا ہے کہ سوائے اس کے کسی اور کی تمنا ہی نہیں کرتا۔ گویا وہ اللہ سے اللہ کے قرب ہی کا تمنائی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابو بکر شبلی علیہ الرحمہ نے امید کے بارے میں کہا: اللہ سے امید رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ تیرے نہاں خانۂ دل میں اسی کی آرزو کا گذر رہے۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں ایک وادی میں گھوم رہا تھا کہ ایک عورت سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کہنے لگی: آپ کون ہیں؟ میں نے جواب دیا: مسافر۔ کہنے لگی: کیا قربتِ محبوب میں بھی مسافری کے غم موجود ہوتے ہیں؟۔

مفہومِ خوف وامید (رجاء)

اجل صوفیہ کرام واہل تصوف نے خوف ورجاء کے اصل مفہوم سے متعلق اپنی اپنی آراء دی ہیں جن میں سے احمد بن عطا علیہ الرحمہ کا قول ہے کہ یوں تو لوگ خوف ورجاء کو جانتے ہیں مگر اُن کی حقیقت تک پہنچنے کا طریق صرف یہی ہے کہ ان دونوں کے حصول کے راستے کو طے کیا جائے اور ان دونوں کے حاصل کرنے ہی کو اپنا مقصود نہ سمجھ لیا جائے بلکہ ان کے ذریعے ذات باری تعالیٰ سے صرف اسی کی ذات کے لیے خوف کیا جائے اور اس سے اسی کی تمنا کی جائے۔

اس بارے میں مزید کہا گیا کہ خوف وامید دونوں اس وقت تک نفس کے تابع رہتی ہیں جب تک دل سے غیر پر بھروسہ آرزوئے امن اور یاس وحرماں کے جذبات خارج ہو کر صرف اور صرف للہ فی اللہ خوف ورجاء باقی نہ رہ جائیں۔

ابوبکر الواسطی علیہ الرحمہ کہتے ہیں: کہ خوف کے ساتھ کئی تاریکیاں بھی ہیں جن میں خوف کرنے والا ہمیشہ حیران وپریشان رہتا ہے تا آنکہ رجاء (امید) اپنی روشنیاں لے کر آتی ہے تو سارے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں اور بندہ مقاماتِ راحت تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسے میں قوتِ ارادہ اس پر غالب ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ دن کا حسن ظلمتِ شب سے ہے۔

خوف ورجاء میں صلاح کائنات موجود ہے۔ جب دل خوف کے اندھیروں میں محصور ہو اور رجاء کے راستوں پر چل نکلے تو وہ امیر ہوتا ہے۔

الغرض محبت، خوف اور رجاء (امید) تینوں احوال باہم دگر مربوط ہیں۔

کسی نامعلوم صوفی کا قول ہے کہ جس محبت میں خوف شامل نہ ہو یا جس خوف میں امید کا عنصر نہ ہو وہ آفت زدہ ہے۔ اور اسی طرح جس امید میں خوف نہ ہو وہ بھی آفت زدہ ہے۔

جذب، وشوق

سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لوگ جنت کے مشتاق ہوتے ہیں۔ رب کعبہ کی قسم! کہ جنت ایک ہوائے عطر بیز ہے جو مسرت بخشتی ہے، ایک نہر ہے جو رواں ہے اور ایک بیوی ہے جو حسین ہے۔

حضور سرور کائنات علیہ التحیۃ والسلام اپنی دعا میں فرماتے تھے :

اسئلك لذۃ النظر الی وجهك — اے میرے رب میں تجھ سے لذت دیدار

والشوق الی لقآئك — اور شوق لقا کا طالب ہوں۔

یہاں لذت دیدار سے مراد آخرت میں دیدار الٰہی ہے جب کہ شوق لقا کا مفہوم اس دنیا میں اس کے وصال کا شوق رکھنا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جس کو جنت کا اشتیاق ہوا اس نے نیکیوں میں جلدی کی۔

مزید فرمایا کہ جنت علی، عمار اور سلمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مشتاق ہے۔

کسی بندے کا شوق سے سرشار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لقائے محبوب میں اپنے وجود سے بھی بے پرواہ ہو جائے۔

کسی نامعلوم صوفی نے شوق کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا، دل کا وارفتۂ ذکر یار ہو جانا ہی شوق ہے۔ کسی اور کا کہنا ہے کہ شوق وہ آگ ہے جو اللہ نے اپنے عشاق کے دلوں میں لگا رکھی ہے تاکہ ماسوا اللہ تمام خواہشات و خیالات اور جملہ ارادوں کو بھسم کر دے۔

ابو محمد جریری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں، اگر شوق میں فائدہ نہ ہوتا تو اس کی صعوبتوں کو کوئی نہ اٹھاتا۔

ابو سعید خراز علیہ الرحمہ کا قول ہے کہ اہلِ شوق کے دل اس کی محبت میں وارفتہ اور بے قرار ہوتے ہیں۔ اور کیا ہی عجب کیفیت ہوتی ہے ان بے قراروں کی جن کو اس کے بغیر چین نہیں۔ سوائے اس کے ان کا کوئی ٹھکانہ ہوتا ہے اور نہ کسی سے وہ مانوس ہوتے ہیں۔

مقاماتِ اہلِ شوق

اہلِ شوق، شوق کے تین مقامات میں سے کسی ایک پر فائز ہوتے ہیں۔ پہلا مقام یہ ہے کہ اس میں اہلِ شوق اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقربین کو دیئے جانے والے انعامات و اکرامات ثواب فضل اور رضا کے طالب و مشتاق ہوتے ہیں۔

دوسرے مقام میں بندہ شوق لقائے محبوب میں خود فراموشی کی حد تک صرف وصل یار کا طالب ہوتا ہے۔

تیسرے مقام پر وہ اہلِ شوق فائز ہوتے ہیں جو قرب محبوب کا اس طرح مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں کہ گویا وہ ان کے سامنے ہے غائب نہیں اور اسی کیفیت میں وہ اس کے ذکر سے دل کو فرحاں وشاداں پاتے ہیں۔

مقامِ مذکور کے اہلِ شوق کہتے ہیں کہ شوق تو غائب کے لیے ہوتا ہے جب کہ اللہ عزوجل کی ذات اقدس حاضر ہے غائب نہیں۔ تو ایسے میں احساس شوق نہیں رہتا۔ گویا ایسے لوگ مشتاق ہیں بلا شوق کے اور احساس شوق کا کھو دینا ہی انھیں دوسرے اہل شوق سے ممتاز کرتا ہے۔

اُنس

اللہ سے انس رکھنے کا مفہوم اس پر اعتماد کرنا، اس سے خوش ہونا اور اس سے اعانت طلب کرنا ہے۔ اس کے علاوہ انس کی مزید کوئی تشریح نہیں کی جا سکتی۔

ایک خبر میں ہے کہ مُطرِّف بن عبداللہ بن الشخیر رحمۃ اللہ علیہ (یہ کبار تابعین میں سے تھے) نے حضرت عمر بن عبدالعزیز علیہ الرحمہ کو لکھا: تجھے فقط اللہ ہی کے ساتھ انس رکھنا چاہیئے۔ اور اسی کی صحبت میں رہنا چاہیئے کیونکہ جو اللہ کے بندے ہیں وہ اللہ ہی کے ساتھ انس رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی خلوت میں جلوت سے بڑھ کر اللہ سے انس رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ بہت زیادہ نفرت کرنے والے ہوں وہ انتہائی انس رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ انتہائی انس رکھنے والے ہوتے ہیں وہ بہت زیادہ نفرت کرنے والے ہوتے ہیں۔

کسی نامعلوم عارف علیہ الرحمہ نے انس کے بارے میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جنہیں اس نے حقیقی انس کے مقام پر فائز کرنا چاہا تو انھیں اپنے ماسوا کے خوف سے باز رکھا۔

اللہ کے ساتھ انس رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کی طہارت مکمل ہو اور اللہ کا ذکر خالص طور پر کرتا ہو وہ ہر اس شے سے نفرت کرتا ہو جو اسے محبوب سے غافل کرے اور اس کے نتیجے میں اللہ اس سے انس رکھتا ہو۔

احوال اہل انس

اہل انس کے تین احوال ہیں۔

پہلا یہ کہ بندہ صرف ذکرِ حبیب میں محو رہے اور محبوب سے غافل کر دینے والی ہر چیز سے نفرت کرے، اطاعت کو عزیز جانے اور گناہ سے اجتناب کرے جیسا کہ سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ نے کہا بندے کے اللہ سے انس رکھنے کی پہلی منزل یہ ہے کہ اس کے جوارح اور نفس عقل سے مانوس ہو جائیں۔ اسی طرح عقل، نفس علم شریعت سے مانوس ہو جائے، پھر مجموعی طور پر عقل نفس اور جوارح خالصتاً اللہ کے لیے عمل صالح کرنے سے مانوس ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بندہ پوری طرح اپنے رب سے مانوس ہو کر اسی سے خوشی پاتا ہے۔

انس کا دوسرا حال یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے انس رکھے اور اس کے علاوہ جملہ خیالات و اسباب و مصروفیات سے دوری اختیار کرے۔ جیسا کہ ذوالنون مصری علیہ الرحمہ سے کہا گیا کہ اللہ سے انس رکھنے کی علامت کیا ہے؟ تو فرمایا: جب تو یہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنی مخلوقات سے مانوس کر رکھا ہے تو سمجھ لے کہ وہ تجھے اپنی ذات سے دور کر رہا ہے۔ اور جب تجھے یہ محسوس ہو کہ وہ تجھے اپنی خلقت سے دور کر رہا ہے تو یقین کرے کہ وہ اپنی ذات سے تجھے انس رکھنے کی توفیق بخش رہا ہے۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ نے انس باللہ سے متعلق کہا: اللہ کا خوف رکھتے ہوئے۔ بندے کا اپنی حشمت و عزت کو خود سے منفی کر دینا انس ہے۔

ابراہیم مارستانی علیہ الرحمہ نے کہا: محبوب ہی سے قلبی مسرت کو وابستہ رکھنا انس ہے۔

انس کا تیسرا حال یہ ہے کہ اللہ کے قرب، تعظیم اور ہیبت کی وجہ سے احساس انس کا کھو دینا ہی انس ہے۔ جیسا کہ کسی عارف کا قول ہے: بلاشبہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں۔ جنہیں اس نے اپنی ہیبت میں لے رکھا ہے۔ اور اسی ہیبت نے انھیں ماسوا اللہ سے انس رکھنے سے باز رکھا ہوا ہے۔ اسی طرح ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں کسی نے لکھ بھیجا کہ "اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے قرب سے نامانوس فرمائے۔" آپ نے جواباً لکھا: اللہ تعالیٰ تجھے اپنے قرب سے نامانوس فرمائے کیونکہ جب اس نے تجھے اپنے قرب سے مانوس کیا تو یہ تیرا ارادہ اور تیری چاہت تھی اور جب اس نے تجھے اپنے قرب سے نامانوس کیا تو یہ اس کی مشیت تھی نامانوس کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بندے کو

اپنے قرب سے ہیبت زدہ فرمادے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ انس یہ ہے کہ تو اپنی ذات اور سارے جہاں سے مانوس ہوجائے۔

اطمینان

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ (۱) — اے اطمینان والی جان!

مذکورہ آیاتِ مبارکہ میں مطمئنہ سے مراد مطمئنہ بالایمان یعنی ایمان کے ساتھ مطمئن رہنے والی جان ہے۔

اور فرمایا:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىٕنُّ الْقُلُوْبُ (۲) — وہ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں۔ سن لو! اللہ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے۔

اور قصۂ ابراہیم علیہ السلام میں ارشاد فرمایا:

وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ (۳) — مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آجائے۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ جب قلبِ مؤمن کو اللہ دولتِ سکون سے نواز دیتا ہے اور وہ اس کے ساتھ قرار پکڑ لیتا ہے تو قلبِ مؤمن قوی ہوجاتا ہے اور جملہ اشیاء اس سے مانوس ہوجاتی ہیں۔

حسن بن علی دامغانی علیہ الرحمہ قولِ خداوندی: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ الخ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: پہلے قلوب، بالترتیب معرفتِ جلال کبریائے نرم معرفتِ

---

(۱) الفجر: ۲۷ ۸۹ (۲) الرعد: ۲۸ ۱۳

(۳) البقرۃ: ۲۶۰ ۲

رحمتِ رحیم سے خوش بمعرفت حفاظت و کفائتِ خداوندی سے پرسکون اور معرفتِ لطف و کرمِ کریم سے مانوس ہوتے ہیں، تب کہیں حجاب اٹھتے ہیں۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ سے ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمہ کے اس قول کہ "جب قلب اپنی قوت اکٹھی کرلیتا ہے تو مطمئن ہوجاتا ہے" کی تشریح کے لیے عرض کیا گیا تو فرمایا: اس کا مفہوم یہ ہے کہ قلب تب اطمینان حاصل کرتا ہے جب اسے قوت بخشنے والے کی معرفت حاصل ہو جائے۔

حال اطمینان پر صرف وہ بندہ فائز ہوتا ہے جس کی عقل رسا، ایمان قوی، علم راسخ اور ذکر خالص ہونے کے ساتھ اسے اپنی حقیقت سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

اقسامِ اطمینان

اطمینان کی تین اقسام ہیں۔

پہلی قسم کا اطمینان اُن عام لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو صرف اللہ کے ذکر سے ہی مطمئن ہو جاتے ہیں اللہ کی بارگاہ میں ان کی وسعت رزق اور دیگر آفتوں کے ٹل جانے کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔ جیسا کہ قولِ خداوندی ہے:

"النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ"

یہاں مطمئنہ سے مراد مطمئنہ بالایمان (ایمان کی دولت پاکر مطمئن) ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی دافع و مانع نہیں۔

اطمینان کی دوسری قسم وہ ہے جو خواص کو حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اللہ کے فیصلوں پر راضی، اس کی طرف سے آنے والی ہر مصیبت پر صابر، مخلص، متقی، پرسکون اور مطمئن ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم گویا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (1)	بے شک اللہ ان کے ساتھ ہے جو ڈرتے ہیں اور جو نیکیاں کرتے ہیں۔

اور فرمایا:

---

(1) النحل: ۱۲۸

ان اللہ مع الصٰبرین (۱) بے شک اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

الغرض مذکورہ درجے پر فائز صوفیہ اللہ کے قول "مع الصابرین" کے ذریعے مطمئن ہو گئے گویا ان کی طمانیت اور احساس اطاعت لازم و ملزوم ہیں۔

اطمینان کی تیسری قسم وہ ہے جس سے خاص الخاص بندگانِ خدا بہرور ہوتے ہیں۔ انھیں علم ہوتا ہے کہ ان کے باطن اللہ سے اس کی ہیبت و تعظیم کے طاری ہونے کے سبب مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اور بلاشبہ اللہ کی کوئی انتہا نہیں کہ اسے پایا جا سکے اس کی مثال محال ہے اور کوئی نہیں جو اس کا ہمسر ہو سکے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ جس کا دل اس طرح کی دولت سے مالا مال ہوا سے کسی اور چیز سے کیا اطمینان و سکون مل سکتا ہے۔ اور جو شخص اس طرح کی مزید دولت پانے کا تشنہ رہا وہ ایسے سمندر میں غوطہ زن ہوا جس کی کوئی اتھاہ نہیں۔

مشاہدہ

خدائے لم یزل کا ارشاد ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ۔ (۲)

بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جو دل رکھتا ہو یا کان لگائے اور متوجہ ہو۔

یہاں شہید سے مراد حاضر القلب ہے۔

اور فرمایا:

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ (۳)

(قسم ہے) اور اس دن کی جو گواہ ہے اور اس دن کی جس میں حاضر ہوتے ہیں۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ کہتے ہیں: شاہد خود ذاتِ حق تعالیٰ ہے۔ اور مشہود کون (وجودِ عالم) اور اسی کی ذات برحق نے کل موجودات کو معدوم کیا پھر انھیں وجود عطا کیا۔

---

(۱) البقرۃ ۲: ۱۵۳ (۲) قٓ ۵۰: ۳۷

(۳) البروج ۸۵: ۳

ابوسعید خراز علیہ الرحمہ نے فرمایا: جس نے اپنے قلب سے ذاتِ حق کا مشاہدہ کیا۔ اس سے ماسوا اللہ سب کچھ منفی ہو گیا۔ اور عظمتِ وجود باری تعالیٰ کے سامنے کسی اور شے کا وجود معدوم ہو گیا اور قلب میں فقط وجودِ حق ہی باقی رہ گیا۔

عمر بن عثمان مکی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: جو چیز قلوب کو غیب سے غیب[1] کے ذریعے حاصل ہو اور اسے نہ تو عیاں کیا جا سکے اور نہ وجد[2] سمجھا جا سکے اسے مشاہدہ کہتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ مشاہدہ قلب کے ذریعے رویتِ حق کو حاصل کرنے اور رویتِ عیاں کے اتصال کو کہتے ہیں کیونکہ قلب کے ذریعے رویت تو کشفِ یقین کی کثرت کے سامنے فقط ایک توہم ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا کہ "اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو"۔

آیت مبارکہ کے الفاظ 'وہو شہید' کی وضاحت میں صوفیہ کرام کہتے ہیں کہ شہید سے بچشم عبرت اشیاء کا مشاہدہ کرنے والا اور بچشم غور و فکر ان کا معائنہ کرنے والا مراد ہے۔

عمرو مکی علیہ الرحمہ نے فرمایا، مشاہدہ خلق سے غائب اور اللہ کے حضور حاضر رہنے کو کہتے ہیں۔ اور اسی حضور کو قربِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ اللہ جل ذکرہ نے فرمایا:

وسئلهم عن القرية التي كانت حاضرة البحر[3]	اور ان سے حال پوچھو اس بستی کا کہ دریا کے کنارے تھی۔

آیت کریمہ میں 'حاضرۃ البحر' کا معنی قریبۃ البحر (دریا سے قریب) ہے اور قریبۃ البحر کا مطلب 'شاہدۃ البحر' (دریا کا مشاہدہ کرنے والی) ہے۔

---

(۱) اصطلاح صوفیہ میں جس عالم کی طرف اللہ تعالیٰ انسان کے واسطے کے بغیر نظر کرتا ہے۔ غیب کہلاتا ہے (مترجم)

(۲) وجد: ایسی حقیقی کیفیات جو اس وقت قلب پر وارد ہوں جب کہ قلب شہود (مشاہدہ حق تعالیٰ) میں فانی ہو۔ (مترجم)

(۳) الاعراف: ۱۶۳

عمرو مکی علیہ الرحمہ نے مشاہدے کے بارے میں مزید کہا کہ مشاہدہ زوایدِ یقین کا نام ہے اور یہ زوایہ حضور کے مکاشفات کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جو دائرہ قلب سے کسی طرح خارج نہیں ہوتے۔ اور کہا کہ مشاہدہ حضور کو کہتے ہیں جب کہ یہ حضور بمعنی قرب ہے، جو کہ علم یقین اور اس کے حقائق سے متصل ہوتا ہے۔

احوالِ اہلِ مشاہدہ

احوالِ اہلِ مشاہدہ تین طرح کے ہیں۔

پہلے حال پر فائز لوگ اصاغر کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کے بارے میں ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ نے کہا کہ اشیاء کو عبرت و فکر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

دوسرے حال پر جو لوگ فائز ہوتے ہیں وہ درمیانی درجے والے کہلاتے ہیں۔ ان کی حالت وہی ہوتی ہے جس کی طرف ابوسعید خراز علیہ الرحمہ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا؛ کہ جملہ مخلوقات اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اور اسی کی ملکیت ہیں۔ جب اللہ اور بندے کے مابین مشاہدے کا تعلق استوار ہوتا ہے تو اس کے وہم و خیال میں بھی ماسو اللہ کچھ نہیں ہوتا۔

اہلِ مشاہدہ کے تیسرے حال کے متعلق عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمہ نے اپنی تصنیف "کتاب المشاہدہ"[1] میں لکھا ہے کہ عارفین کے قلوب مشاہدۂ حق تعالیٰ اس حال میں کرتے ہیں کہ فقط حق ظاہر ہوتا ہے اور خلق مخفی۔ گویا وہ ہر شئے میں اسی کو دیکھتے اور جملہ کائنات کا اسی کی آنکھ سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ بیک وقت حاضر بھی ہوتے ہیں اور غائب اور دونوں حالتوں میں صرف اللہ ہی کو موجود پاتے ہیں الغرض وہ اللہ کو ظاہراً و باطناً اور اولاً و آخراً دیکھتے ہیں جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے؛

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ	وہی اول وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن اور
وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲)	وہی سب کچھ جانتا ہے۔

---

(۱) کتاب المشاہدہ کے مصنف ابوعبداللہ عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمہ ہیں۔ یہ ابوسعید خراز کے ہم عصر ہیں۔ ۲۹۱ھ میں بغداد میں انتقال کیا (مترجم)

(۲) الحدید ۳:

مختصراً یہ کہ مشاہدہ ایک بلند کیفیت اور حقائق یقین کی ایک نورانی کرن ہے۔

یقین

کتاب اللہ میں یقین کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں - علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ سے عفو، عافیت اور دنیا و آخرت میں یقین عطا کرنے کی دعا مانگو۔

اور آپ نے مزید فرمایا کہ "اگر میرے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کا یقین کچھ اور بھی بڑھا ہوا ہوتا تو وہ فضا میں چلتے"۔

عامر بن قیس کہتے ہیں اگر میرے سامنے سے حجابات اٹھا دئے جائیں تو میرا یقین کم ہو جائے گا کیونکہ میں تو غیب پر ایمان لایا ہوں جب کہ رفع حجابات کا تعلق وجد و تحقیق سے ہے۔

قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے: خلق کو بعد الموت اسی حالت میں اٹھایا جائے گا جس پر ان کی موت واقع ہوئی ہوگی۔

تجربہ مشاہدہ سے پوری مشابہت نہیں رکھتا لہٰذا بہت ممکن ہے عامر بن قیس کے قول میں میرا یقین سے مراد علم الیقین ہو۔

ابو یعقوب نہرجوری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: جب بندہ یقین کے تمام حقائق کو پالے تو آزمائش اس کے لیے نعمت اور خوشی مصیبت بن جاتی ہے۔

یقین سے مراد مکاشفہ ہے جس کی تین اقسام: پہلی قسم وہ عینی مشاہدہ ہے جو روز قیامت حاصل ہوگا دوسری قسم میں حقیقی ایمان و ایقان کے ساتھ بلا حد و کیف جو مکاشفہ قلوب کو حاصل ہو شامل ہے۔ اور تیسری قسم کا مکاشفہ انبیاء کو معجزات کے ذریعے قدرتِ خداوندی کے ساتھ حاصل ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو کرامات سے۔

کوئی چیز کثرتِ ذکر کی وجہ سے قلب پر اس قدر غالب آجائے کہ خود بخود عیاں ہو جائے مکاشفہ کہلاتا ہے (مترجم)

طبقاتِ اہلِ یقین

بلاشبہ یقین احوالِ سلوک میں اعلیٰ درجہ کا حال ہے اور اس پر فائز بندوں کے تین طبقے ہیں۔ پہلے طبقے والے اصاغر کہلاتے ہیں۔ اور اس میں مریدین اور عوام شامل ہوتے ہیں اور اس کی تعریف کے بارے میں جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ یقین کا پہلا درجہ یہی ہے کہ بندہ اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز پر یقین کرے اور جو کچھ بندوں کے ہاتھ میں ہو اس سے لاتعلقی و مایوسی اختیار کرے۔

اسی ضمن میں جنید بغدادی علیہ الرحمہ کا قول ہے : یقین شک کے اٹھ جانے کو کہتے ہیں۔

ابو یعقوب علیہ الرحمہ نے کہا : جب بندہ اللہ کی جانب سے ہر فیصلے پر راضی ہو تو جان لیں کہ یقین کی کیفیت اس میں راسخ ہو گئی۔

رویم بن احمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں : قلب کا اپنے مقصود کے بارے میں ثابت قدمی کے ساتھ یقین کر لینا ہی یقین ہے۔

دوسرے طبقے کے اہلِ یقین درمیانے درجے والے کہلاتے ہیں، یہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں۔ ان کے یقین کی کیفیت کا اندازہ ابن عطا علیہ الرحمہ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں یقین وہ حالت ہے جس میں تمام عوارض ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائیں۔

ابو یعقوب نہر جوری علیہ الرحمہ کا قول ہے :

جب بندے میں کیفیت یقین راسخ ہو جائے تو وہ یقین کے ایک درجے سے دوسرے درجے کی طرف برابر ترقی کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ یقین ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہو جاتا ہے۔

ابو الحسین نوری علیہ الرحمہ نے فرمایا : یقین مشاہدہ ہے۔

اہلِ یقین میں سے تیسرے طبقے کے لوگوں کو اکابر کہا جاتا ہے۔ یہ مخصوص ترین بندے ہوتے ہیں۔ ان کی کیفیت سے متعلق عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمہ کہتے ہیں : یقین کامل، اللہ کی تمام صفات سمیت اس کی ذات کے مکمل اثبات کو کہتے ہیں۔ اور کہا کہ یقین کی تعریف یہ ہے کہ بندے کا قلب یقین

کے ذریعے حاصل ہونے والے الہام کے ذریعے پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔

ابو یعقوب علیہ الرحمہ کا قول ہے:

بندہ یقین کو نہیں پا سکتا تاوقتیکہ عرش سے لے کر پاتال تک کے تمام اسباب و عوارض سے منقطع نہ ہو جائے جو اس کے اور اللہ کے درمیان حائل ہوں۔ اس کے پیش نظر صرف اللہ کی ذات ہو اور وہ اسے جملہ موجودات پر ترجیح دے۔

یقین ایک ایسی حالت ہے جس کی اعلیٰ ترین صورتوں کی کوئی حد نہیں، بس اتنا ہی جان لینا چاہئے کہ جوں جوں سالک، دین کی حقیقت سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا یقین بھی مدارج ترقی طے کرتا جاتا ہے۔

یقین تمام احوال سلوک کی بنیاد ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس پر آ کر احوال ہوتے ہیں۔ اور یقین ہی تمام احوال کا باطن ہے۔ اور باقی تمام احوال اس کا ظاہر۔ یقین کی اصل غیب کی تصدیق کے ثبوت کا نام ہے۔ بشرطیکہ شک و شبہ درمیان نہ رہے اور اللہ کی بارگاہ میں عرضداشت سے بندے کو لطف و مسرت اور حلاوت حاصل ہو، مزید یہ کہ بندہ پاکیزہ و پرخلوص نگاہوں سے قلب کے ذریعے اپنے محبوبِ ازلی کا نظارہ کرے اور تمام اسباب و علل اور دیگر عوارض سے اس کا دل پاک ہو۔

ارشاد رب العالمین ہے:

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ۔ (۱) بے شک اس میں نشانیاں ہیں فراست والوں کے لیے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ۔ (۲) اور زمین میں یقین والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں جب یقین معنوی لحاظ سے قلب میں جاگزین ہو جائے تو بندہ "مشاہدہ احوال سے بہرہ ور ہوتا ہے یقین کے معنوی حقائق کو جان لینے کے بعد بندہ تفکراتِ عالم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور یہ کیفیت مقام صدیقیت میں سے ایک کشف ہے۔ اس پر فائز لوگوں

---

(۱) الحجر: ۷۵۔ (۲) الذاریات: ۲۰

سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (۱)

تو انھیں ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداور نیک لوگ۔

شہدا انھیں کہتے ہیں جو اپنی جانیں رب کے ہاتھ بیچ ڈالیں اور صالحین سے مراد وہ بندے ہیں جو اپنی امانتوں اور وعدوں کے محافظ رہتے ہیں۔

○

(۱) النساء: ۶۹ ہم

۱۳

قرآن فہمی و اتباعِ قرآن میں متقرب صوفیہ کا مقام

اتباعِ کتاب اللہ

قولِ باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (۱)

وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری اس کی کچھ آیتیں صاف معنی رکھتی ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ جن کے معنی میں اشتباہ ہے۔

اور فرمایا:

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۲)

اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔

اور فرمایا:

یٰسٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ (۳)

حکمت والے قرآن کی قسم۔

اور فرمایا:

حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ (۴)

انتہا کو پہنچی ہوئی حکمت۔

---

(۱) آل عمران: ۷، ۳
(۲) بنی اسرائیل: ۸۲، ۱۷
(۳) یٰسین: ۱، ۲
(۴) القمر: ۵

سرورِ کائنات جناب ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قرآن کریم اللہ جل شانہ کی ایسی مضبوط رسی ہے کہ اس کی عجیب و غریب نادر حکمتیں ختم ہونے میں آتی ہیں اور نہ کثرتِ تکرار سے اس کی حلاوت اور معنوی اعجاز میں بوسیدگی پیدا ہوتی ہے۔ جس نے اس کے مطابق کہا اس نے درست کہا جس نے اس پر عمل کیا وہ ہدایت پا گیا، جس نے اس کے مطابق فیصلہ سنایا اس نے عدل قائم کیا جس نے اسے تھام لیا وہ راہِ راست پر چلا۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جس کو علم حاصل کرنے کا شوق ہو وہ قرآن حکیم کی تلاوت کرے کہ اس میں ساری نسلِ انسانی کا علم موجود ہے۔

قرآن کریم میں اللہ نے ارشاد فرمایا:

الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (۱)	وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں۔

مذکورہ آیت مبارکہ کی تفسیر یوں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ کتاب جسے سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا گیا، مؤمنین کے لیے ہر طرح کے شک و شبہ سے خالی ہے۔ بلاشبہ یہ اللہ ہی کی جانب سے ہے اور اس میں مؤمنین کے لیے امورِ دینی کے سلسلے میں پیش آنے والے ان تمام اشکالات کا حل موجود ہے جو انھیں ایمان بالغیب کے بعد لاحق ہوں۔

ایمان بالغیب دراصل ان تمام باتوں کی تصدیق ہے جو مومنین کو قرآن حکیم کے ذریعے بتائی گئیں مگر وہ ان کی آنکھوں سے غائب ہیں۔

اور ایک آیتِ مبارکہ میں یوں فرمایا:

وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّ	اور ہم نے تم پر یہ قرآن اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے۔ اور ہدایت اور رحمت اور بشارت

---

(۱) البقرۃ: ۱-۳

بُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ (۱) مسلمانوں کو۔

گویا آیت مذکورہ میں اہل فہم کے لیے ایمان بالغیب کے بعد یہ افادہ موجود ہے کہ وہ اس کے ہر حرف میں پوشیدہ علوم کے خزانوں میں سے اسی قدر حاصل کر سکتے ہیں جو ان کے لیے مقدر ہے۔

قرآن کریم کے انہی سربستہ خزائن فہم و ادراک سے متعلق صوفیہ نے ذیل کی آیات مبارکہ کا حوالہ دیا ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (۲) ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔

وَکُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (۳) اور ہر چیز ہم نے گن رکھی ہے ایک بتانے والی کتاب میں۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۴) اور کوئی چیز نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور ہم اسے نہیں اتارتے مگر ایک معلوم اندازسے۔

مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں مِنْ شَیْءٍ سے مراد علم دین اور اللہ تعالیٰ اور خلق کے مابین واقع ہونے والے احوال کا علم ہے۔

اور فرمایا:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (۵) بے شک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے۔

مذکورہ آیت مبارکہ کی وضاحت یہ ہے کہ بے شک یہ قرآن اسی مفہوم کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو صحیح ترین ہو۔

---

(۱) النحل: ۸۹ ۱۶ (۲) الانعام: ۳۸ ۶

(۳) یٰسٓ: ۱۲ ۳۶ (۴) الحجر: ۲۱ ۱۵

(۵) بنی اسرائیل: ۹ ۱۷

اہلِ فہم نے صوفیہ کرام سے یہ بات اخذ کی ہے کہ قرآن جس صحیح ترین بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کا حصول فقط اسی صورت میں ممکن ہے کہ کلامِ الٰہی کی آیات کو حضورِ قلب نصیحت گیری ذکر و فکر اور کمالِ تدبر کے ساتھ تلاوت کیا جائے۔ اور یہی بات اس آیت میں واضح ہے جس میں ارشاد فرمایا:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱)	یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے تمہاری طرف اتاری برکت والی تاکہ اس کی آیتوں کو سوچیں اور عقلمند نصیحت مانے۔

علمائے باطن (صوفیہ کرام) نے ذیل کی ایک اور آیت مبارکہ سے یہ مفہوم اخذ کیا کہ تدبر، تفکر اور عبرت فقط حضورِ قلب ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

اللہ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (۲)	بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جو دل رکھتا ہو یا کان لگائے اور متوجہ ہو۔

یہاں آیت مذکورہ میں شہید سے مراد حاضر القلب ہے۔ اور اسی طرح ایک اور آیت کریمہ میں قلب کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۳)	جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر۔

ایک اور مقام پر ذات باری تعالیٰ نے قلب سلیم ہی کو خلق کا امام ٹھہرایا:

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ	اور بے شک اسی کے گروہ سے ابراہیم ہے جب کہ اپنے رب کے پاس حاضر ہوا غیر سے سلامت دل ہو کر۔

(۱) صٓ: ۲۹ ۳۸ (۲) قٓ: ۳۷ ۵۰
(۳) الشعرآء: ۸۸ - ۸۹ ۲۶ (۴) الصّٰفّٰت: ۸۳ - ۸۴ ۳۷

اہلِ فہم کہتے ہیں کہ قلبِ سلیم سے مراد وہ دل ہے جس میں بجز ذاتِ لم یزل کے کچھ نہ ہو۔
سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ کہتے ہیں: اگر بندے کو قرآن حکیم کے ہر حرف کے ہزار مطالب عطا کیے جائیں تو بھی وہ قرآن کریم کی کسی ایک آیت کے معانی کو پوری طرح نہیں جان سکتا اس لیے کہ قرآن، کلامِ الٰہی ہے اور اس کی صفت۔ جس طرح اس کی کوئی انتہا نہیں اسی طرح اس کی صفت کی بھی کوئی حد نہیں۔ کلامِ الٰہی کا علم اولیاء اللہ کو اسی قدر عطا ہوتا ہے جس قدر ان کا رب چاہتا ہے۔
اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے اور اس کے معانی و مطالب کا کامل حصول خلق کے بس میں نہیں کیونکہ ان کے اذہان حادث[1] اور مخلوق ہیں۔

دعوت[2] و اصطفا

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: دعوت عام ہے جب کہ ہدایت خاص۔ اور آپ نے اس ضمن میں اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِيْ	اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف پکارتا ہے
مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ[3]	اور جسے چاہے سیدھی راہ چلاتا ہے۔

اوپر کی سطور میں مذکور آیت مبارکہ میں دعوت عام ہے اور ہدایت خاص کیونکہ ہدایت سے مراد اللہ کی جانب بڑھنا ہے۔ اور وہ لوگ جنہیں اللہ نے چن لیا اور انھیں عزیز جانا وہ ان لوگوں سے بلند مقام رکھتے ہیں جنہیں اس نے پکارا یا اپنی جانب دعوت دی۔
اصطفا کا ذکر جن آیات مبارکہ میں آیا ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى	تم کہو سب خوبیاں اللہ کو اور سلام اس
عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۔ اٰللّٰهُ	کے چنے ہوئے بندوں پر کیا اللہ بہتر ہے

---

(۱) : کسی شے کے حادث ہونے سے مراد اس کا اپنی ایجاد میں ایک موجد ازلی کا محتاج ہونا ہے (مترجم)
(۲) : دعوت بلغوی معنی: پکارنا، بلانا۔ اصطفاء: لغوی معنی: چننا، منتخب کرنا۔ اصطلاح صوفیہ میں اللہ تعالیٰ کا کسی کو صرف اپنی طرف راغب کر لینا اور بلانا دعوت کہلاتا ہے جب کہ کسی بندے کو چن لینے کو اصطفا کہتے ہیں۔
(۳) : یونس : ۲۵

خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ	یا ان کے ساختہ شریک؟

آیت مذکورہ میں 'سلام' سے اشارہ ہے ان بندوں کی طرف جنھیں اللہ نے چن لیا مگر یہ نہیں بیان فرمایا کہ وہ کون اور کیسے ہیں۔

اور فرمایا:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ۔	اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے رسول اور آدمیوں میں سے۔

مفسرین نے من الناس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہیں، مگر اس کا مفہوم یہ نہیں کہ بندوں میں سے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی چنا ہوا بندہ ہوتا ہی نہیں، کیونکہ ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ اس بات کو واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ	پھر ہم نے کتاب کا وارث کیا اپنے چنے ہوئے بندوں کو تو ان میں کوئی اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اور ان میں کوئی میانہ چال پر ہے اور ان میں کوئی وہ جو اللہ کے حکم سے بھلائیوں میں سبقت لے گیا۔

الغرض سابقہ دونوں آیات میں انبیاء علیہم السلام اور دیگر بندوں کے انتخاب میں فرق قائم کر دیا گیا ہے۔ اور وہ بندے کہ جنھیں کتاب اللہ کا وارث ٹھہرایا گیا بے شک یہی مؤمن ہیں مزید یہ کہ انبیاء علیہم السلام اور دیگر مومنین کے احوال باہم یکساں نہ ہونے کے بارے میں بھی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

فمنهم ظالم لنفسه،

گویا اصطفا کو دو اقسام میں بیان فرمایا: اصطفاء انبیاء جس کی بناء عصمت، تائید، وحی اور تبلیغ پر ہے۔ اور دیگر تمام مومنین کا انتخاب، حسن معاملگی، مجاہدات اور حقائق و منازل پر قائم ہے۔

---

(۱) النحل ۵۹: ۱۶ (۲) الحج ۷۵: ۲۲

(۳) فاطر: ۳۲

ایک مقام پر فرمایا :

"لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" (۱)	ہم نے تم سب کے لیے ایک ایک شریعت اور راستہ رکھا اور اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت کر دیتا ۔ مگر منظور ہے کہ جو کچھ تمہیں دیا اس میں تمھیں آزمائے تو بھلائیوں کی طرف سبقت چاہو ۔

مندرجہ بالا آیت کریمہ میں قطعیہ بتایا گیا کہ مومنین بھلائی کی جانب سبقت کریں جب کہ یہ وضاحت کہ بھلائی کیا ہے؟ دیگر آیات میں بیان فرمائی :

ملاحظہ ہوں اسی ضمن میں چند آیات :

"فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" (۲)	اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو ۔
"مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ" (۳)	اور پرہیزگاروں کو نصیحت ہے ۔
"إِيَّايَ فَاتَّقُونِ" (۴)	اور مجھی سے ڈرو ۔
"إِيَّايَ فَارْهَبُونِ" (۵)	اور خاص میرا ہی ڈر رکھو ۔
"فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ" (۶)	تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو ۔
"فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ" (۷)	تو ان سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو ۔
"فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ" (۸)	تو میری یاد کرو میں تمھارا چرچا کروں گا ۔
"وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا" (۹)	اور اللہ ہی پر بھروسہ کرو ۔

---

(۱) المائدۃ : ۴۸ ۵ (۲) البقرۃ : ۲ ۲

(۳) آل عمران : ۱۳۸ ۳ (۴) البقرۃ : ۴۱ ۲

(۵) البقرۃ : ۴۰ ۲ (۶) آل عمران : ۱۷۵ ۳

(۷) المائدۃ : ۳ ۵ (۸) البقرۃ : ۱۵۲ ۲

(۹) المائدۃ : ۲۳ ۵

"وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ"	حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا۔
"وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا"	اور جنھوں نے ہماری راہ میں کوشش کی۔
"وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ"	اور جو شکر کرے وہ اپنے بھلے کو شکر کرتا ہے۔
"اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ"	اور صبر والے اللہ کو محبوب ہیں۔
"وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ"	اور ان لوگوں کو تو یہی حکم ہوا کہ اللہ کی بندگی کریں۔ نرے اسی پر عقیدہ لائے۔
"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ"	کچھ وہ مرد ہیں جنھوں نے سچا کر دیا جو عہد اللہ سے کیا تھا۔

اس کے علاوہ اور کئی آیات میں اللہ کی جانب رجوع کرنے والوں، صابروں۔ اللہ کا خوف رکھنے والے مردوں اور عورتوں، توبہ، رجوع الی اللہ پر ہی بھروسہ کرنے والوں، تسلیم، قناعت اور ترکِ اختیار کو بیان کیا گیا۔ جیسا کہ ذیل کی چند آیات مبارکہ سے واضح ہے۔

"قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالدُّنْيَا خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى"	تم فرما دو کہ دنیا کا برتنا تھوڑا ہے۔ اور ڈر والوں کے لیے آخرت اچھی۔
"ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ"	یہ جتنی دنیا کی پونجی ہے۔ اور اللہ ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا۔
"وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ"	اور دنیا کی زندگی نہیں مگر کھیل کود۔
"وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ"	اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا مال ہے۔

---

(۱) النساء : ۵۹ ۴ — (۲) العنکبوت : ۶۹ ۲۹
(۳) النمل : ۴۰ ۲۷ — (۴) آل عمران : ۱۴۶ ۳
(۵) البینۃ : ۵ ۹۸ — (۶) الاحزاب : ۲۳ ۳۳
(۷) النساء : ۷۷ ۴ — (۸) آل عمران : ۱۴ ۳

"مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِىْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ"[۱]

جو آخرت کی کھیتی چاہے ہم اس کے لیے اس کی کھیتی بڑھائیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہے ہم اسے اس میں سے کچھ دیں گے۔ اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

اور شیطان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا"[۲]

بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے دشمن سمجھو۔

اور فرمایا:

"اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً"[۳]

بھلا دیکھو تو وہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرالیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے باوصف علم کے گمراہ کیا اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی۔ اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈالا۔

"فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا"[۴]

تو وہ جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔

اسی طرح کی کئی دیگر آیات بھی ہیں جن میں نیکیوں کی جانب سبقت کرنے اور بھلائی کو جزو زندگی بنانے کی تلقین کی گئی۔ اور ان میں صدق و اخلاص کا بھی بکثرت ذکر کیا گیا ہے۔

جہاں تک نیکیوں کو قبول کرنے کا تعلق ہے تو اس میں تمام مومن یکساں ہیں مگر ان کے حقائق اور اصل منزلت سے آگاہی میں وہ ایک جیسے نہیں۔ اور اسی طرح خطاب بھی سب سے یکساں طور پر کیا گیا ہے مگر مخاطبین کے درجے جدا جدا ہیں جن کا ذکر اگلے باب میں ہوگا۔

---

(۱) الشوریٰ: ۲۰   ۴۲   (۲) فاطر: ۶   ۳۵

(۳) الجاثیۃ: ۲۳   ۴۵   (۴) النازعات: ۳۷   ۷۹

۱۴

مخاطبین کلامِ الٰہی کے درجات اور قبولِ خطاب میں ان کا باہمی تفاوت

مخاطبین کے تین درجات ہیں پہلے درجے میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے خطاب الٰہی کو سنا اُسے قبول کیا اور اس کا اقرار کیا مگر عمل کرتے وقت دنیوی مفادات، اتباعِ نفس اور غفلت ان کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوگئی۔ وہ دشمن (شیطان) کے جھانسے میں آگئے اور خواہشاتِ دنیا پر مر مٹے۔ انہی لوگوں کے بارے میں قرآن کریم کی مختلف آیات یوں گویا ہیں :

"اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ" (۱) — بھلا دیکھو تو وہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرا لیا۔ اور اللہ نے باوصف علم کے گمراہ کیا۔

"وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰهُ" (۲) — اور اس کا کہا نہ مانو جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا۔

"خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ" (۳) — اے محبوب! معاف کرنا اختیار کرو۔ اور بھلائی کا حکم دو۔

"زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ مِنَ — لوگوں کے لیے آراستہ کی گئی ان خواہشوں

---

(۱) الجاثیۃ : ۲۳ (۲) الکہف : ۲۸

(۳) الاعراف : ۱۹۹

الِنّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ
مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ
الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ(۱)
"قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ
لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ
مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ"(۲)

کی محبت عورتیں اور بیٹے اور تلے اوپر سونے
چاندی کے ڈھیر اور نشان کئے ہوئے گھوڑے
اور چوپائے اور کھیتی۔
تم فرماؤ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتا دوں
پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے پاس
جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہمیشہ
ان میں رہیں گے اور ستھری بیبیاں اور اللہ
کی خوشنودی اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے خطاب الٰہی کو سنا، قبول کیا، تائب ہوئے۔ اللہ کی جانب رجوع کیا، عملی اطاعت اختیار کی احوال و منازل کی حقیقت کو جانا، معاملات میں سچے ثابت ہوئے اور مقامات میں خالص نکلے۔ ایسے ہی لوگوں کا ذکر قرآن نے انعامات و اکرامات کی نوید لیے یوں کیا ہے:

"اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ
يُوْقِنُوْنَ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى
مِّنْ رَّبِّهِمْ"(۳)

وہ جو نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیں اور
آخرت پر یقین لائیں وہی اپنے رب کی
ہدایت پر ہیں۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ
نُزُلًا"(۴)

بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام
کئے، فردوس کے باغ ان کی مہمانی
ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى

جو اچھا کام کرے مرد ہو یا عورت اور

---

(۱) آل عمران : ۱۴ پ ۳ — (۲) آل عمران : ۱۵ پ ۳
(۳) لقمٰن : ۴-۵ — (۴) الکہف : ۱۰۷

وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ"(۱)	ہو مسلمان تو ضرور ہم اسے اچھی زندگی جلائیں گے۔ اور ضرور انھیں ان کا نیک دیں گے

آیت مذکورہ میں اکابر صوفیہ نے حیات طیبہ کا مفہوم قناعت اور رضا بیان کیا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ"(۲)	بے شک مراد کو پہنچے ایمان والے جو اپنی نماز میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ جو کسی بے ہودہ بات کی طرف التفات نہیں کرتے۔

عمرو مکی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ماسوا اللہ، دلوں میں موجود ہر شئے لغو و بے معنی ہے۔ آپ نے بتایا کہ اللہ کو ایک جاننے والے، اللہ کے سوا ہر شئے سے منہ موڑے ہوتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ"(۳)	یہی لوگ وارث ہیں کہ فردوس کی میراث پائیں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اوپر کی آیت کریمہ میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے بارے میں اور بھی کئی آیات قرآن کریم میں موجود ہیں۔ اور یہی وہ خوش بخت بندے ہیں جن کو خداوند قدوس نے باقی لوگوں پر فضیلت بخشی اور انھیں ثواب بے حساب عطا کرنے کا وعدہ فرمایا:

مخاطبین کلام الٰہی کے تیسرے درجے میں وہ لوگ شامل ہیں جن کے ذکر کو اللہ نے علم اور خشیت جیسے اوصاف سے مزین فرمایا:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا"(۴)	اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

---

(۱) النحل: ۹۷ ۱۶ (۲) المومنون: ۱-۳ ۲۳

(۳) المومنون: ۱۰-۱۱ ۲۳ (۴) فاطر: ۲۸ ۳۵

"شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ"(۱)	اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف کے ساتھ قائم ہو کر۔
"هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ"(۲)	کیا برابر ہیں جاننے والے اور انجان۔

اور تیسرے درجے پر فائز بندوں کی بھی مزید تخصیص فرمائی تو یوں ارشاد فرمایا:

"وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا"(۳)	اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے۔

اور اس آیت کے ذریعے ان تیسرے درجے کے بندوں کو مزید عنایات سے نوازتے ہوئے ان کی فضیلت میں ایک اور خصوصیت کا اضافہ فرما دیا:

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ نے فرمایا: والرسخون فی العلم سے مراد وہ لوگ ہیں جو غیب الغیب کی انتہاء گہرائیوں میں اپنی روحوں کے ساتھ اتر گئے اور سر السر کو جان لیا۔ گویا ان کے رب کریم نے جو چاہا انہیں بتا دیا۔ اور آیت کریمہ کا جو مفہوم و معنی انہیں عطا کیا وہ دوسروں کو نہیں دیا۔ اس طرح یہ بندگان خاص مزید کچھ حاصل کرنے کی غرض سے فہم کی روشنی سے کہ بحر علم میں غوطہ زن ہو گئے، جس کے نتیجے میں ان پر بے بہا خزائن معرفت کے منہ کھول دیئے گئے۔ اور کلام اللہ کے ہر حرف و آیت میں پنہاں، متلاطم بحر معانی نے ان کا رخ کیا۔ اور انھوں نے اس مقام پر پہنچ کر نص قرآنی سے بیش قیمت مطالب اخذ کئے اور نادرۂ روزگار حکمتوں کا پتہ دینے لگے۔ بعض تو ان بندگان خدا میں سے ایسے بھی ہیں جن کے علمی مبلغ کے سامنے سمندروں کی حیثیت ایک قطرہ کے برابر ہے۔ بلاشبہ علم کی یہی وہ نادر قسم ہے جس سے خدائے علیم و خبیر نے انبیاء علیہم السلام، مقرب اولیا کرام اور اصفیا کو نوازا۔ اور یہی وہ مقرب بندے ہیں جنھوں نے اپنے باطن کی صفائی ذکر خالص اور حضور قلب کے ساتھ بحر ادراک کی

---

(۱) آل عمران: ۱۸ (۲) الزمر: ۹ (۳) آل عمران: ۷

۳ ۳۹ ۳

پنہائیاں سرکیں تو ایک جوہر نایاب کو پالیا۔ اور انھیں یہ بھی علم ہو گیا کہ خود مصادرِ کلام کا سرچشمہ کہاں ہے۔ عرفان وآگہی کے اسی پُرمعنی سفر میں وہ ایک ایسے منبع تک پہنچ گئے جس نے انھیں بحث، تجسس اور غور وفکر کے ذریعے مطالب ومعانی کے حصول سے آزاد کر دیا۔

اب پیش ہے ابوبکر واسطی کی مذکورہ بالا گفتگو کی شرح، ابوسعید خراز علیہ الرحمہ کی زبانی:

آپ نے فرمایا: قرآن حکیم کا ابتدائی فہم، اس پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ عمل ہی کے دائرے میں علم فہم اور استنباط موجود ہے جیسا کہ قرآن کریم گویا ہے:

"اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ"(۱)	بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جو دل رکھتا ہو یا کان لگائے اور متوجہ ہو۔
"فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ"(۲)	تو خوشی سناؤ میرے ان بندوں کو جو کان لگا کر بات سنیں پھر اس کے بہتر پر چلیں۔

مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں جہاں اتباعِ احسن کے لیے کہا گیا ہے تو اس کی شرح یہ ہے کہ قرآن کریم سارا احسن ہے، مگر اتباعِ احسن سے مراد وہ مفہوم ہے جو قلبِ مومن پر قرآن کی سماعت سے منکشف ہو اور اسی آیت سے ماقبل کی آیت میں القاءِ سمع سے مراد، سمجھنے اور احکام اخذ کرنے کی نیت سے اپنی سماعت کو قرآن کریم کی طرف مبذول کرنا ہے۔

---

(۱) ق: ۳۷ (۲) الزمر: ۱۸

۵۰ ۳۹

۱۵

سماعت قرآن حکیم کے ذریعے اخذ اسرار و معانی

سماعت قرآن کے تین طریقے

یہ ذہن نشین رہے کہ پوری توجہ سے قرآن مجید کو سننے کے تین طریقے ہیں جو مجھ تک ابوسعید خراز علیہ الرحمہ سے پہنچے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو اس طرح سنا جائے کہ گویا خود حضور رسالت مآب علیہ التحیۃ والسلام تلاوت فرما رہے ہیں اور بندہ سن رہا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے اس طرح سنا جائے کہ گویا جبریل علیہ السلام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو تلاوت کر رہے ہیں جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

"وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ" (۱)	اور بے شک یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اسے روح الامین لے کر اترا تمھارے دل پر۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ تو اس طرح سنے کہ گویا خود ذات حق تعالیٰ سے براہ راست سن رہا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

"وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ" (۲)	اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔
تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (۳)	کتاب اتارنا ہے اللہ عزت وحکمت والے کی طرف سے۔

(۱) الشعرآ: ۱۹۲ - ۱۹۴ (۲) بنی اسرائیل: ۸۲ (۳) الزمر: ۱

۲۶ ۱۳ ۲۹

حٰمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ (۱) | یہ کتاب اُترنا ہے اللہ کی طرف سے جو عزت والا علم والا ہے)۔

جب بندہ اس مقام پر پہنچ جائے کہ براہ راست حق تعالیٰ سے قرآن کریم کی سماعت کرے تو اس وقت فہم انسانی سے ماسوا اللہ ہر شئے خارج ہو جاتی ہے اور وہ اپنی قوتِ مشاہدہ، ذکرِ خالص پوری قوتِ ارادی، حسنِ آدب اور صفاءِ باطن کے ساتھ اللہ کے حضور حاضر ہوتا ہے اور اس غیب تک پوری سرعت کے ساتھ پہنچتا ہے جس کے بارے میں قرآن ناطق ہے۔

"اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" (۲) وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں۔

ابوسعید ابن اعرابی علیہ الرحمہ کہتے ہیں: کہ (اس تیسرے طریق پر عامل صوفیہ) اللہ کے غیب میں غائب ہوتے ہیں۔ اور وہ کاملاً غیب پر ایمان رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور باوجودیکہ اللہ کی ذات غیب ہے، ان کا ایمانِ کامل بالغیب انھیں کبھی ذاتِ حق تعالیٰ کے بارے میں کسی شک میں مبتلا نہیں ہونے دیتا۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ أَفَمَنْ يَّهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى" (۳) | تم فرماؤ کہ اللہ حق کی راہ دکھاتا ہے۔ تو کیا جو حق کی راہ دکھائے اس کے حکم پر چلنا چاہیئے یا اس کے جو خود ہی راہ نہ پائے جب تک راہ نہ دکھایا جائے۔

"فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ" (۴) | پھر حق کے بعد کیا ہے مگر گمراہی۔ پھر کہاں پھرے جاتے ہو۔

ابوسعید خراز علیہ الرحمہ نے فرمایا: جب بھی کسی بندے نے رب سے کوئی چیز پائی تو گویا اس نے اس غیب کو پا لیا جو کہ صفاتِ حقائق میں سے خارج ہے۔۔۔ اور یہ غیب وہی ہے جس کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں۔

---

(۱) المومن: ۱ ۲ ؟ (۲) البقرۃ: ۳ ۲

(۳) یونس: ۳۵ (۴) یونس: ۳۲ (۵) البقرۃ: ۳

۱۰ ۱۰ ۲

غیب کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قلوب کو اپنی مجملہ صفات واسمائے کے اثبات کا مشاہدہ کرایا اور انہیں کچھ معاملات بھی عطا فرمائے، انہی صفات، اسمار اور معلومات کو قلوب نے قبول کر لیا اور ان کا مشاہدہ کیا۔ یہی غیب ہے۔ جن بندوں نے اس مقام کو پایا انھوں نے بھی کاملاً اس غیب کو پانے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس ضمن میں یہ آیت مبارکہ ملاحظہ ہو۔

"وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ"[1]

اور اگر زمین میں جتنے پیڑ ہیں سب قلمیں بن جائیں اور سمندر اس کی سیاہی ہو اس کے پیچھے سات سمندر اور تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

جب اللہ کے کلام کی تعریف و توصیف اور اس کا فہم حاصل کرنے تک کوئی نہیں پہنچ سکتا تو اس کی صفات کی حقیقت اور اس کی اصلیتِ ذات تک کیونکر رسائی ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ اہلِ بصیرت وفہم نے بالاتفاق اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ہر چیز جس کی طرف محققین، واجدین، عارفین اور موحدین نے اشارہ کیا یا اسے کسی بھی چیز سے تعبیر یا اسے کسی شئے سے بھی عبارت نہیں کیا جا سکا یا اس کی طرف دلیل کے ساتھ کوئی اشارہ کنایہ نہ ہو سکا یا صوفیہ کرام نے اپنی دانست کے مطابق اسے جس طرح سے بھی بیان کیا وہ تمام سوائے اس غیب کے کچھ نہیں جس کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا: "الذین یومنون بالغیب"

[1] لقمان: ۲۷

۱۶

صوفیہ کرام اور قرآن فہمی

اللہ تعالیٰ نے جملہ صوفیہ کرام، اہلِ حقیقت، مریدین، عارفین، صاحبانِ ریاضات و مجاہدات کے بارے میں قرآن کریم کے ذریعے بہت کچھ بیان فرمایا ہے۔

ملائکہ کا ذکر اس طرح فرمایا:

"اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ إِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ"(۱)

وہ مقبول بندے جنہیں یہ کافر پوجتے ہیں وہ آپ ہی اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، کہ ان میں کون زیادہ مقرب ہے۔

ذکرِ مومنین:

"يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا إِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ"(۲)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو، اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔

مذکورہ آیت مبارکہ میں اللہ نے غیب پر ایمان لانے والوں کو اپنی طرف وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا پھر ایک اور مقام پر مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے مومنین کو بھلائی کی طرف تیزی سے بڑھنے کا حکم فرمایا:

أَيَحْسَبُوْنَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي

کیا یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ جو ہم ان کی مدد کر رہے ہیں مال اور بیٹوں سے۔ یہ جلد جلد

---

(۱) بنی اسرائیل ۱۷ : ۵۷ (۲) المائدہ ۵ : ۳۵

الْخَيْرَاتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (۱)" — ان کو بھلائیاں دیتے ہیں بلکہ انھیں خبر نہیں۔

اہلِ دانش و بینش نے اس آیت سے یہ مفہوم اخذ کیا کہ بھلائی کی طرف بڑھنے کی سب سے پہلی کوشش یہ ہے کہ دنیا کے مال و دولت میں قلت پسندی برتی جائے فقط حصولِ رزق کے پیچھے پڑ جانے کو ترک کیا جائے، جمع و منع سے دوری اختیار کی جائے، کثرت پر قلت اور دنیوی رغبت پر دنیا سے کم لگاؤ کو ترجیح دی جائے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا جن کو بھلائی کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (۲)" — بے شک وہ جو اپنے رب کے ڈر سے سہمے ہوئے ہیں۔

آیت گذشتہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کا ذکر خشیت (ڈر) اور اشفاق (سہم جانا) کے ساتھ کیا۔ خشیت اور اشفاق فقط خوف کرنے کے معنی میں نہیں بلکہ یہ دونوں باطنی اسما ہیں جن کا تعلق اعمالِ قلب سے ہے۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ خشیت، خوف کی وہ صورت ہے جو دل کی گہرائیوں میں ایک سربستہ راز ہے۔

اور اشفاق خوف کی وہ صورت ہے جو خشیت سے پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ قلب کے پوشیدہ ترین رازوں میں سے ایک ہے۔

جیسا کہ فرمایا:

"فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى (۳)" — تو وہ بھید کو جانتا ہے اور اسے جو اس سے بھی زیادہ چھپا ہے۔

خشیت کے بارے میں مزید یہ کہا گیا ہے کہ خشیت انکسارِ قلب کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حضور دائمی حضوری سے حاصل ہوتا ہے۔ خشیت و اشفاق کے مقام بلند کا ذکر کرنے کے بعد کی آیت ملاحظہ ہو۔

"وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ (۴)" — اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں

---

(۱) المومنون: ۵۵ ۲۳ — (۲) المومنون: ۵۷ ۲۳

(۳) طٰہٰ: ۷ — (۴) المومنون: ۵۸ ۲۳

۲۰

مذکورہ دونوں آیات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو خشیت و اشفاق کا ذکر فرمایا ہے اور دوسری آیت میں ایمان کا ذکر ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ خشیت و اشفاق کی کیفیت ایمان سے پہلے تھی بلکہ اس کیفیت سے پہلے وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے اور ان کے دلوں میں یہ خیال موجود تھا کہ اللہ تعالیٰ خشیت و اشفاق کی کیفیت سے نواز کر انھیں ایمان میں اور پختہ کرنا چاہتا ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کے ذکر کے بعد ان کے ایمان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهِ" (۱)	تو ایمان اللہ کے رسول اور بے پڑھے غیب بتانے والے پر کہ (جو) اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

اہلِ دانش (صوفیہ کرام) نے مذکورہ آیت کریمہ سے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ ایمان کے بڑھنے کی کوئی حد نہیں اور اہلِ حق اپنے آغاز سے انجام تک ایمان کی حقیقتوں کو پاتے رہتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی اس کی آخری حد تک نہیں پہنچا کیونکہ اس کی کوئی آخری حد ہی نہیں۔

پھر فرمایا:

"وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ" (۲)	اور وہ جو اپنے رب کا کوئی شریک نہیں کرتے۔

اللہ نے اپنے بندوں کو خشیت، اشفاق اور ایمان سے متصف کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ وہ اپنے رب کے ساتھ کبھی کوئی شریک نہیں ٹھہراتے۔

شرکِ خفی

مذکورہ بالا آیت میں شرک سے مراد شرکِ خفی ہے۔ اور یہ وہ شرک ہے جو بندے کے دل میں اپنی عبادات اور ریاضات کی طرف متوجہ ہو جانے اور ان کا عوض پانے کے خیال کے جگہ پکڑنے سے پیدا ہوتا ہے، اور اگر بندہ ایمان کی واضح صورت کا حامل ہونے اور یہ جانتے ہوئے کہ اللہ کے سوا کوئی نفع و ضرر پہنچانے والا

---

(۱) الاعراف ۱۵۸ (۲) المومنون ۵۹

۲۳ ۷

نہیں، کے بعد بھی خیالِ مذکورہ کو دل میں جگہ دے تو وہ شرکِ خفی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مختصراً آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ایسی صورت میں اس کے خاص بندے ہر وقت اپنے رب سے اخلاص کی دولت عطا ہونے کے طلب گار رہتے ہیں۔ کیونکہ اخلاص ہی ایک ایسی دوا ہے جو اس مرضِ خفی کا مداوا ہو سکتی ہے جاننا چاہیئے کہ شرکِ خفی، گھٹا ٹوپ تاریک رات میں ایک سیاہ پتھر پر چھوٹے سے رینگنے والے کیڑے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے یعنی اس کا سراغ بہت مشکل سے لگایا جا سکتا ہے۔

جہالت علم اور عمل کی اچھوتی تشریح

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ نے فرمایا: لا الہ الا اللہ کہنے والے تو لاکھوں ہیں مگر مخلص مؤحد کم ہوتے ہیں یہ ساری دنیا جہالت کی تاریکی سے مشابہ ہے جس میں کچھ حصہ علم کا بھی ہے۔ اور علم فقط استدلال و دلائل کی صورت باقی رہ جاتا ہے اگر اس پر عمل نہ ہو۔ پھر یہ عمل بھی گرد و غبار کے اڑتے ہوئے منتشر ذرات ہیں اگر اس میں اخلاص شامل نہ ہو جب کہ اہلِ اخلاص ہمہ وقت ایک نازک موڑ پر کھڑے ہوتے ہیں کہ ذرا سی لغزش بھی انہیں دولتِ اخلاص سے محروم کر سکتی ہے۔

ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

"وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ"[1]	اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ دیں اور ان کے دل ڈر رہے ہیں یوں کہ ان کو اپنے رب کی طرف پھرنا ہے۔

اس آیت سے صوفیہ کرام نے یہ مفہوم لیا ہے کہ صاحبِ اخلاص بندوں کے دل خوفزدہ ہوں گے باوجودیکہ وہ ان احوالِ بلند پر فائز ہوں گے جن کا ہم صفحاتِ گذشتہ میں ذکر کر آئے ہیں۔ اور یہ خوف جس کا ذکر آیت مذکورہ میں آیا ہے ایک ایسا خوف ہے کہ جس پر سے پردہ نہیں اٹھایا جا سکتا کیونکہ اس معاملے کا تعلق عاقبت سے ہے جس کا علم سوائے ذاتِ علیم و خبیر کے کسی کو نہیں۔ اور یہ صاحبِ اخلاص نیکوکار خوفزدہ ہیں کہ خدا جانے ان کی عاقبت کیسی ہوگی۔ اور ان کے اعمال قبولیت پائیں گے یا نہیں۔ اسی کیفیت کو قرآن نے لفظ وجلۃ یعنی ایک انجانے خوف سے تعبیر کیا ہے۔ اسی وجہ سے ایسے بندے ہر وقت اللہ کے حضور عاقبت بالخیر ہونے کے ملتجی ہوتے ہیں مزید یہ کہ آیت کریمہ نیکوکاروں سے متعلق

---

(۱) المومنون: ۶۰

مسہ ۲ م

ہے نہ بدکاروں سے۔ اس کے ثبوت میں ہم جناب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ کیا والذین یؤتون ما آتوا میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان سے مراد وہ اشخاص ہیں جو زنا، چوری اور شراب نوشی کے مرتکب ہوں۔ آپ نے جواباً فرمایا: نہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نماز، روزہ اور صدقہ و خیرات کرنے میں پابندی کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ انھیں یہ فکر بھی لاحق ہوتی ہے کہ ان کے اعمال قبولیت پائیں یا نہ پائیں۔

پھر رب العزت نے اپنے نیکوکار بندوں کو نیک اعمال کی جانب سبقت کرنے پر انھیں سابقین کے درجے سے نوازتے ہوئے فرمایا:

"اُولٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ"۔[1]

یہ لوگ بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں۔ اور یہی سب سے پہلے انھیں پہنچے۔

○

---

(۱) المؤمنون: ۶۱ س ۲

۱۷

مقامِ سابقین مقربین اور ابرار قرآنی آیات کے آئینے میں

ارشادِ باری تعالیٰ:

"وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ"(۱) اور جو سبقت لے گئے وہ تو سبقت ہی لے گئے وہی مقربِ بارگاہ ہیں۔

ایک اور آیت میں ابرار و سابقین پر مقربین کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّيُّوْنَ"(۲) ہاں ہاں بے شک نیکوں کی لکھت سب اونچی محل علیین میں ہے۔ اور تو کیا جانے علیین کیسی ہے۔

اور فرمایا:

"اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ"(۳) بے شک نیکوکار ضرور چین میں ہیں تختوں پر دیکھتے ہیں۔

ابرار سے متعلق اللہ نے قرآن حکیم میں وہ تمام شرف اور نعمتیں بیان فرمائی ہیں جن کے لیے انھیں مستحق گردانا۔ اس کے علاوہ مقامِ علیین میں ان کے درجات کا بیان بھی فرمایا۔ انہی کی پہچان کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

---

(۱) الواقعۃ: ۱۰-۱۱ ۵۶ (۲) التطفیف: ۱۸-۱۹

(۳) التطفیف: ۲۲-۲۳

تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ "(۱) — تو ان کے چہروں میں چین کی تازگی پہچانے

یعنی اہلِ جنت میں سے ابرار اپنی پیشانیوں پر ایک تازگی و شگفتگی لئے ہوئے ہوں گے جس کے ذریعے وہ باقی اہلِ جنت سے ممتاز نظر آئیں گے ۔

اور فرمایا :

"یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ (۲) — نتھری شراب پلائیں گے جو مہر کی ہوئی رکھی ہے ۔

واضح رہے کہ باقی اہلِ جنت کو رحیق مختوم نوش کرائے جانے کا کہیں ذکر نہیں فرمایا :

پھر فرمایا :

"وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ "(۳) — اور اس کی ملونی تسنیم سے ہے وہ چشمہ جس سے مقربانِ بارگاہ پیتے ہیں ۔

آیاتِ گذشتہ سے واضح ہوا کہ ابرار کو اللہ نے رحیق مختوم سے نوازا اور باقی اہلِ جنت کی شراب پر ان کی شراب کو چشمۂ تسنیم کی شراب ملائے جانے کے ساتھ فضیلت بخشی ۔ اور یہ تسنیم ایک چشمہ ہے ، جنت میں جس سے مقربین پئیں گے ۔ الغرض ابرار کی شراب جس کے ذریعے انھیں باقی اہلِ جنت کی شراب پر فضیلت دی گئی خود اس لحاظ سے علت سے خالی نہیں کہ اس میں مقربین کے چشمے تسنیم کی شراب ملائی گئی ہے جب کہ مقربین کی شراب خالصتاً تسنیم سے آتی ہے جس کی ملاوٹ ہی سے ابرار کی شراب باقی اہلِ جنت کی شراب پر فوقیت رکھتی ہے ۔(۴)

---

(۱) : التطفیف : ۲۴   (۲) التطفیف : ۲۵   (۳) التطفیف : ۲۷-۲۸

(۴) : یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی شراب میں دوسری شراب اس لیے ملائی جاتی ہے کہ اس کے نشے کو دوبالا اور اس کے لطف کو دوچند کیا جائے گویا پہلی شراب میں ایک طرح کی کمی باقی رہ گئی ہوتی ہے جسے دوسری کی ملاوٹ سے پورا کر دیا جاتا ہے ۔ مگر کیا کہنے اس شرابِ ناب کے کہ جس میں خود اس قدر لطف و مستی ہو کہ دوسری کی ملانے کی ضرورت ہی نہ رہے بعینہٖ یہی کیفیت ابرار و مقربین کی شراب کی کہ ابرار ملاوٹ والی پیتے ہیں جب کہ مقربین خالص ۔ (مترجم)

یہاں پر یہ نکتہ پیشِ نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ بہت خوبصورت انداز میں فرماتا ہے کہ ابرار اپنی چمکتی پیشانی اور اپنی شراب میں چشمۂ تسنیم جیسے مبارک ترین چشمے کی شراب کی ملاوٹ کے باعث باقی اہلِ جنت سے تو ممتاز ہیں مگر وہ مقربین کے مقام سے آگے نہیں کیونکہ وہ اسی تسنیم سے سدا پیتے رہیں گے۔

اسی ذکر کو اور آیات میں بیان کرتے ہوئے فرمایا :

"اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُھَا کَافُوْرًا"(۱) — بے شک نیک پئیں گے اس جام میں سے جس کی ملونی کافور ہے۔

اور فرمایا :

"وَیُسْقَوْنَ فِیْھَا کَاْسًا کَانَ مِزَاجُھَا زَنْجَبِیْلًا عَیْنًا فِیْھَا تُسَمّٰی سَلْسَبِیْلًا"(۲) — اور اس میں وہ جام پلائے جائیں گے جس کی ملونی ادرک ہوگی وہ ادرک کیا ہے جنت میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کہتے ہیں۔

انعاماتِ اہلِ جنت کے باب میں فرمایا :

"وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّمُلْکًا کَبِیْرًا"(۳) — اور جب تو ادھر نظر اٹھائے ایک چین دیکھے اور بڑی سلطنت۔

آیت مذکورہ میں انعاماتِ جنت کا ذکر فرماتے ہوئے ان کا وصف بیان نہیں کیا گویا وہ ایسی نعمتیں ہیں جن کی کوئی صفت بیان ہی نہیں کی جا سکتی۔ اور مزید فرمایا :

"وَسَقٰھُمْ رَبُّھُمْ شَرَابًا طَھُوْرًا"(۴) — اور انہیں ان کے رب نے ستھری شراب پلائی

یعنی جہاں کہیں بھی ابرار کے پینے کا ذکر آیا تو ملاوٹ والی شراب پینے کے ساتھ انہیں مخصوص کیا مگر جب بھی مقربین کے پینے کا ذکر فرمایا تو اس میں ملاوٹ کا تذکرہ نہیں کیا۔

ادراکِ حقائق اور استطاعت مومنین

فرمایا : "وَلَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا"(۵) — اور ہم کسی جان پر بوجھ نہیں رکھتے مگر اس کی طاقت بھر۔

---

(۱) الدھر : ۵ (۲) الدھر : ۱۷-۱۸ (۳) الدھر : ۲۰
(۴) الدھر : ۲۱ (۵) المؤمنون : ۶۲

اس آیت سے واضح ہوا کہ مومنین کو ان کی طاقت کے مطابق یہ استطاعت عطا کر دی گئی ہے کہ وہ حقائق، منازل اور احوال تک رسائی حاصل کر سکیں کیونکہ جس قدر حقائق انبیاء علیہم السلام یا ان کے علاوہ مومنین کو عطا کئے گئے ہیں وہ تمام اللہ کے اس قول سے باہر نہیں۔

فرمایا:

"فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ"[1] تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔

---

(۱) التغابن: ۱۶ ۴ ۹

۱۸

قرآن اور تاکید اعمال

یہ امر ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول "فاتقوا اللہ ما استطعتم"[1] (تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے) میں یہ بات ظاہر فرما دی ہے کہ اگر کوئی بندہ تمام فرشتوں، انبیاء کرام اور صدیقین کے اعمال کے برابر اعمال لے کر بھی اس کے حضور میں پیش کرے تو بہت ممکن ہے کہ یہ اس مقدار سے کہیں کم ہو جس کے انجام دینے کا حق تھا کیا آپ نہیں دیکھتے کہ فرشتے جن کی فطرت میں عبادت ودیعت کی گئی ہے وہ بھی اس کی بارگاہ میں یہی عرض کرتے ہیں

"سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا"[2] پاکی ہے تجھے ہمیں علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا۔

گویا ملائکہ نے مشاہدۂ حقیقت کے بعد اپنے علم و عبادات سے برأت ظاہر کی۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان "اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ"[3] (اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے) کا مفہوم اس کے قول "فاتقوا اللہ ما استطعتم" سے متعلق ہے کیونکہ تقویٰ ہی تمام احوال کے آغاز و انجام کی اصل ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اسی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ گذشتہ سطور میں قرآن کریم کی دونوں آیات میں مفہوم کے اعتبار سے باہمی ربط ہے اور یہاں "فاتقوا اللہ ما استطعتم" میں تاکید اعمال موجود ہے کیونکہ اگر آپ نے ایک ہزار رکعت نفل ادا کئے اور ابھی ایک رکعت اور

---

(۱) التغابن : ۱۶ (۲) البقرۃ : ۳۲
(۳) آل عمران : ۱۰۲

ادا کرنے کی استطاعت موجود تھی جس کی ادائیگی آپ نے دوسرے وقت پر اٹھا رکھی تو اس طرح آپ نے استطاعت کو چھوڑ دیا۔ اسی طرح اگر آپ نے ہزار بار اللہ کا ذکر کیا مگر ایک بار اور بھی ذکر کرنے کی استطاعت باقی تھی، مگر آپ نے اسے دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیا تو آپ نے اپنی استطاعت کو چھوڑ دیا۔

اگر آپ نے کسی سائل کو ایک درہم بطور خیرات دیا اور ایک درہم مزید خیرات کرنے کی گنجائش تھی جو آپ نے خیرات نہ کیا تو اسے استطاعت سے روگردانی کہا جائے گا۔ اسی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قول "ما استطعتم" میں تاکیدِ عمل موجود ہے۔

تاکیدِ عمل سے متعلق کچھ مزید آیات یہ ہیں:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا "(۱)	تو اے محبوب! تمھارے رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہوں گے جب تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمہیں حاکم نہ بنائیں پھر جو کچھ تم حکم فرماؤ اپنے دلوں میں اس سے روکاوٹ نہ پائیں اور جی سے مان لیں۔

آیت گذشتہ میں محل تاکید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسمیہ یہ فرمایا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حَکَم بنائے بغیر مومن ہو ہی نہیں سکتے۔ اور اگر ان کے دلوں یا ذہنوں میں کسی طرح کی کوئی کجی ناپسندیدگی یا عدمِ تسلیم کی کیفیت باقی رہی تو وہ دائرہ ایمان سے خارج ہیں۔ چاہے وہ حکم ان کو قتل کرنے کا ہی کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان سے خارج ہو جانے کی قسم کھائی۔

الغرض اگر سطور گذشتہ میں مذکور تمام احوال کو پیشِ نظر رکھ کر ان پر اس حکم کو قیاس کریں جس کے مطابق ہم سب پابند ہیں کہ اللہ کے فیصلوں پر صبر کریں اور جو عادات، خصائل، رزق، اجل اور اعمال اس نے ہمارے لیے مقدر فرمائے انھیں بجان و دل تسلیم کریں، تو ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی

---

(۱) النسا: ۶۵

کجی یا کمی ضرور باقی رہے گی اور اس لحاظ سے ہم اور ہمارے ساتھ بے شمار لوگوں کے پاس ایمان کا ایک ذرہ بھی باقی نہ رہے اور ایسی صورت میں اگر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں کا سہارا نہ رہے تو وہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں۔

۱۹

مطالب حروف و اسماء

وہ تمام افکار و نتائج جن تک علوم و اذہان نے رسائی حاصل کی ہے قرآن کریم کے دو جملوں بسم اللہ اور الحمد للہ سے نکلے ہیں۔ اور ان دونوں جملوں کا مفہوم بالترتیب " اللہ کے ذریعے " اور " اللہ کے لیے " ہے اس مفہوم میں یہ اشارہ موجود ہے کہ جو کچھ ذہن انسانی کے دائرے میں ہے وہ خود سے قائم نہیں بلکہ اللہ ہی سے اور اسی کے لیے ہے۔

بار بسم اللہ کی صوفیانہ تشریح

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ سے کسی نے پوچھا کہ بسم اللہ کی با میں کس طرف اشارہ ہے۔ تو فرمایا:

تمام ارواح و اجسام اور حرکات خود اپنی ذات میں قائم نہیں بلکہ اللہ کے ساتھ قائم ہیں۔

ابو العباس بن عطار علیہ الرحمہ سے دریافت کیا گیا کہ عارفین کے دلوں کو کس چیز سے سکون ملتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ کی کتاب کے پہلے حرف بار بسم اللہ سے۔ کیونکہ اس بار کا معنی ہے کہ اللہ ہی کے ذریعے اشیار کا ظہور ہوتا ہے اور اسی سے وہ فنا ہوتی ہیں۔ اس کے جلوے سے آراستہ اور اسی کے عدمِ تجلی سے قبیح ہو جاتی ہیں۔

اس کے نام اللہ میں ہیبت و کبریائی الرحمٰن میں محبت و مودت اور الرحیم میں اس کی مدد اور فتح ہے بے شک اس کی ذات اعلیٰ صفات پاک ہے جس نے اپنے اسمار میں جدا جدا لطیف نکات پوشیدہ رکھے ہیں۔

نیکی و بدی کیا ہے؟

ابو العباس ابن عطا علیہ الرحمہ کے قول " اسی کے جلوے سے آراستہ " کا مطلب یہ ہے کہ کسی

عمل کا نیکی میں شمار ہونا صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ عمل عنداللہ مقبول ہوا۔ گویا اسی کی قبولیت سے نیکی نیکی کہلاتی ہے۔ اور ابن عطاء کے قول "اسی کے عدم تجلی سے قبیح" کا مفہوم یہ ہے کہ اس عمل کو اللہ نے پسند نہیں فرمایا۔ اور اس سے منہ پھیر لیا۔ اسی بنیاد پر برائی کو برائی کہا جاتا ہے ورنہ برائی بذاتِ خود برائی نہیں صرف قبولیتِ خداتعالیٰ سے محرومی ہی اس کو گناہ یا برائی کا نام دیتی ہے۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ کہتے ہیں: اللہ کے تمام اسماء کی خصوصیات سے اپنے کردار کو سنوارا جا سکتا ہے مگر دو نام اللہ اور الرحمٰن ایسے ہیں کہ جو فقط اس لئے ہیں کہ بندہ ان سے فقط تعلق قائم رکھے اور اسی طرح اس کی صفت صمدیت بھی ادراک کی رسائی سے باہر ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

"وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا"[1] اور ان کا علم اسے نہیں گھیر سکتا۔

اسم ذات اللہ ہر صورت میں با معنی ہے

خالق ارض وسماء کا ذاتی نام اللہ ہے۔ جو کہ تمام اسماء الٰہیہ میں سب سے بڑا ہے۔ اس اسم کی خصوصیت ہے کہ اگر اس سے پہلا حرف الف ہٹا دیا جائے تو لِلّٰہ (اللہ کے لیے) باقی رہ جاتا ہے۔ دوسرا حرف لام دور کر دیا جائے تو لَہٗ (اس کے لیے) رہ جاتا ہے۔ اور اگر تیسرا حرف یعنی دوسرا لام حذف کر دیا جائے تو صرف ھا رہ جاتا ہے اور جملہ اسرار و رموز اسی ھا میں پوشیدہ ہیں کیونکہ اسی ھا کا معنی ھُوَ یعنی 'وہ' ہے جب کہ باقی اسماء کی صورت یہ ہے کہ اگر ایک حرف بھی ان سے حذف کر دیا جائے تو وہ بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسم اعظم یعنی اسم اللہ سے کسی اور کو موسوم نہیں کیا جا سکتا۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: الف تمام حروف میں سے پہلا حرف ہے۔ اور جملہ حروف سے بڑا بھی۔ اس حرف سے اشارہ ہے کہ اللہ کی طرف جو کہ تمام اشیاء کا جامع ہے اور ان سے جدا بھی۔

ابوسعید خراز علیہ الرحمہ کا قول ہے: کہ جب بندہ اللہ کے ساتھ کامل تعلق قائم کر لیتا ہے تو تلاوتِ کلام اللہ کے دوران اسے ان مفاہیم و مطالب سے آگہی حاصل ہوتی رہتی ہے جن سے عام لوگ بے خبر رہتے ہیں، یہی وہ بندگانِ خاص ہیں جنہیں کوئی شے اللہ سے دور نہیں لے جا سکتی۔ اور آپ نے مزید فرمایا: ہر حرفِ قرآن میں ایک جہانِ معانی پنہاں ہوتا ہے جو بندے کے مقام کے مطابق اس پر آشکار ہوتے رہتے ہیں۔ الٓمٓ کے پہلے حرف الف میں جو علوم پوشیدہ ہیں وہ دوسرے حرف لام میں پوشیدہ علوم سے بالکل

---

(۱) طٰہٰ: ۱۱۰

مختلف ہیں۔ اور سمجھنے والے ان سے جو مفہوم اخذ کرتے ہیں وہ ان کے حضورِ قلب اور صفائے ذکر کے اعتبار سے باہمی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔

ابو سلیمان دارانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: میں نے اکثر ایک ہی آیت پر مسلسل پانچ راتیں صرف کیں مگر کوئی مفہوم اخذ نہ کر سکا اور اگر یہی غور و خوض جاری رکھتا تو شاید ساری زندگی اسی طرح نہ سمجھنے میں کٹ جاتی۔ مگر کئی بار ایسا ہوا کہ ادھر میں نے تلاوت شروع کی اور میرا ذہن نہایت تیزی کے ساتھ مطالب اخذ کرتا رہا اور میرے ذہن کی پرواز بدستور اس قدر تیز ہوتی گئی کہ اللہ ہی نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اسے لوٹایا۔

وہیب بن ورد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ہم نے بہت باتیں، اقوال اور کتابیں پڑھیں مگر قرآن حکیم کی تلاوت اور اس کے معنی کو سمجھنے سے بڑھ کر دلوں پہ رقت طاری کر دینے اور سوزِ قلب عطا کرنے والی کوئی چیز نہیں پائی۔

○

قرآن کریم سے استنباط کرنے اور سمجھنے کے غلط اور صحیح اصول

قرآن کریم سے صحیح استنباط کرنے اور اس کے پوشیدہ لطیف اشارات و رموز سمجھنے کا پہلا صحیح اصول یہ ہے کہ اس چیز کو مقدم نہ کیا جائے جسے اللہ نے مؤخر کیا ہو اور اس چیز کو مؤخر نہ کیا جائے جسے اس نے مقدم کیا ہو۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ ان حدود کو پامال کرنے کی کوشش نہ کی جائے جن کی ایک اطاعت گذار بندہ پابندی کرتا ہے تاکہ کہیں اس طرح کا عمل بندے کے لیے دائرۂ بندگی سے خارج ہونے کا سبب نہ بن جائے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ شارح، قرآن کریم میں تحریف کا مرتکب نہ ہو جیساکہ ایک شخص سے کسی نے اس قول کی وضاحت چاہی:

وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ (۱) — اور ایوب کو (یاد کرو) جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تکلیف پہنچی۔

تو اس شخص نے تحریف کرتے ہوئے کہا کہ مسنی الضر (مجھے تکلیف پہنچی) کا مفہوم ہے ماسائی الضر (مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی)

اسی طرح ایک شخص نے قول باری تعالیٰ:

"اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى" (۲) — کیا اس نے تمہیں یتیم نہ پایا، پھر جگہ دی۔

---

(۱) الانبیاء: ۸۳ ۲۱ (۲) الضحیٰ: ۶ ۹۳

کی تشریح اس طرح کی کہ یتیم سے مراد دُرِ یتیم یعنی بے مثال موتی ہے۔

اور کسی نے قولِ خداوندی :

"قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ"(۱) تم فرماؤ ظاہری صورت بشری میں تو میں تم جیسا ہوں۔

کی وضاحت یوں کی کہ انا بشر مثلکم عندکم ہے۔ (یعنی میں تمھارے نزدیک تم جیسا بشر ہوں) الغرض مذکورہ تمام مثالیں اور اس طرح کی دیگر تشریحات بلا شک وشبہ غلط اور اللہ پر بہتان باندھنے کے مترادف ہیں۔

اب ہم قرآنی آیات کی چند ایک ایسی صوفیانہ تشریحات پیش کرتے ہیں جو صحیح ہیں۔

ابوبکر کتانی علیہ الرحمہ نے قولِ خداوندی :

"اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ"(۲) مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر۔

کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا؛ قلب سلیم تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس طرح اللہ سے واصل ہو کر اس میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک موجود نہ ہو۔ دوسرے وہ جس میں اللہ کے ساتھ مشغولیت کا احساس تک بھی نہ ہو اور اس کے سوا کسی اور کا ارادہ بھی نہ ہو۔

تیسرے اس شخص کا دل جو اللہ سے واصل ہو مگر اس میں سوائے اللہ کے کوئی اور شے موجود نہ ہو اور اللہ سے اللہ کے ساتھ فنا ہو چکا ہو اور اللہ سے اللہ کے ساتھ فنا ہو جانے سے مراد بندوں کے دل سے اطاعت، ذکر الٰہی اور ذکر خدا سے محبت تک کا احساس ختم ہو چکا ہو۔ اور اس کے دل میں موجود محبت الٰہی، اللہ کی جانب سے اس کو یاد کرنے میں فنا ہو جائے اور بندوں سے اللہ کی یہ محبت عالم خلق سے پہلے کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اللہ کا ذکر اس لیے کیا کہ خود اللہ نے انھیں پہلے یاد کیا۔ اور اگر انھوں نے اللہ سے محبت کی تو اس لیے کہ پہلے اللہ نے ان سے محبت کی۔ اور اگر انھوں نے اطاعت کی تو اس لیے کہ پہلے اللہ نے ان پر عنایت کی۔

---

(۱) الکہف : ۱۱۰ (۲) الشعرآء : ۸۹

ارشاد فرمایا :

"اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ وَ الَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ" (۱)

وہ جس نے مجھے پیدا کیا وہ مجھے راہ دے گا۔ اور وہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے شاہ کرمانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ آیت میں یہ فرمایا گیا کہ جس نے مجھے پیدا فرمایا وہی میری اپنی جانب رہنمائی کرتا ہے اور غیر کی طرف نہیں جانے دیتا۔ اور وہی ذات وحدہ لاشریک ہے جو مجھے اپنی رضا سے کھلاتا اور اپنی الفت کا جام پلاتا ہے۔ اور جب میں اپنے مشاہدۂ نفس کے نتیجے میں بیمار پڑجاتا ہوں تو وہ مجھے اپنے مشاہدے کے ذریعے شفا عطا فرماتا ہے۔ وہی ہے جو مجھے میرے نفس سے مارتا اور اپنی ذات کے ساتھ زندہ کرتا ہے۔ گویا میں اسی کے ساتھ قائم ہوں نہ اپنی ذات کے ساتھ اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ مجھے اس روز شرمندہ نہیں فرمائے گا جب میں اس کے حضور اس حال میں کھڑا ہوں گا کہ میری نظر اپنے اعمال پر ہوگی اور پوری طرح اسی کا محتاج ہوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حقیقت منکشف تھی کہ انھوں نے جو کچھ پایا وہ فقط اپنے رب کے فضل سے پایا۔ اور وہ جو کچھ بھی تمنا کریں گے صرف اسی کی رحمت بے پایاں ہی سے پائیں گے اسی کیفیت میں آپ نے یہ دعا فرمائی تھی۔

"رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ" (۲)

یارب مجھے حکم (حکمت وعلم) عطا کر اور مجھے ان سے ملا دے جو تیرے قربِ خاص کے سزاوار ہیں۔

قولِ باری تعالیٰ ہے :

"اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ" (۳)

وہ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں۔

---

(۱) الشعرآء : ۷۸ - ۸۰ ۲۶ (۲) الشعرآء : ۸۳ ۲۶

(۳) الرعد : ۲۸ ۱۳

مذکورہ آیت کی تفسیر میں ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ نے فرمایا: قلبِ مومن اللہ کے ذکر سے مطمئن ہو جاتا ہے مگر قلبِ عارف سوائے اس کے کسی اور شے سے مطمئن نہیں ہوتا۔

قولِ باری تعالیٰ ہے:

"قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ" [1] — مسلمان مردوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ مذکورہ آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں: ابصارہم سے ظاہری و باطنی دونوں آنکھیں مراد ہیں۔ یعنی سر میں لگی ہوئی آنکھیں اللہ کی حرام اور ممنوع کی ہوئی چیزوں کو نہ دیکھیں۔ اور دل کی آنکھوں سے اللہ کے سوا کسی اور شے کو نہ دیکھے۔

ارشادِ ربانی ہے:

"اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ" [2] — بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جو دل رکھتا ہو یا کان لگائے اور متوجہ ہو۔

ابوبکر شبلی آیت مذکورہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں لمن کان لہ قلب سے مراد وہ بندہ ہے کہ اللہ ہی اس کا قلب ہو پھر آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

لیس منی الیک قلب معنّی

کل عضو منی الیک قلوب

(ترجمہ: میرے جسم میں تیرے لئے کوئی ایک متعین دل نہیں بلکہ میرا ہر ہر عضو دل ہے اور یہ سارے دل فقط تیرے لئے ہیں)

مذکورہ بالا تمام تفصیلات کا تعلق قرآن کریم کو براہِ راست فہم و ادراک کے حوالے سے سمجھنے سے متعلق تھیں اور۔ اب ہم ان اشارات کا ذکر کرتے ہیں جن کے ذریعے بالواسطہ آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر ہوتی ہے جیسا کہ ابو العباس بن عطا علیہ الرحمہ نے اپنے اس قول کہ لغزشوں کے ساتھ اللہ کا کوئی تعلق نہیں کے ذریعے اس آیت کی طرف اشارہ کیا اور اس سے استدلال کیا۔

---

(۱) النور: ۳۰ (۲) ق: ۳۷

۲۴

مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ (۱)	اور اگر اس کے بعد بھی بچو (پھسلو) کہ تمھارے پاس روشن حکم آچکے تو جان لو کہ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

اسی طرح ابن عطاء علیہ الرحمہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ محب سے اس کے صفات بشری سمیت عذاب اور رنج کی کیفیت ساقط کر دی جاتی ہے اور اس آیت مبارکہ سے استدلال کرتے تھے۔

"وَ قَالَتِ الۡيَهُوۡدُ وَ النَّصٰرٰى نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلۡ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمۡ بِذُنُوۡبِكُمۡ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ مِّمَّنۡ خَلَقَ ، (۲)	اور یہودی اور نصرانی بولے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ تم فرما دو پھر تمھیں کیوں تمھارے گناہوں پر عذاب فرماتا ہے۔ بلکہ تم آدمی ہو اس کی مخلوقات سے۔

ابو یزید بسطامی علیہ الرحمہ سے معرفت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ کیا۔

"اِنَّ الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡيَةً اَفۡسَدُوۡهَا وَجَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفۡعَلُوۡنَ " (۳)	بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں اسے تباہ کر دیتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل (کر دیتے ہیں) اور ایسا ہی کرتے ہیں۔

آپ نے آیت مذکورہ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا؛ کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ وہاں کے رہنے والوں کو غلام بنالیں اور انھیں ذلیل و خوار بنا کر رکھیں۔ اور وہ ان کے حکم سے سرِ مو انحراف نہ کریں اسی طرح معرفت جب کسی کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے تو دیگر تمام چیزوں کو نکال باہر کرتی ہے اور اس میں ہر متحرک شے کو جلا ڈالتی ہے۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ نے سماع کے دوران اپنے سکون اور قلتِ اضطراب کے بارے میں پوچھے

---

(۱) البقرۃ : ۲۰۹ ۲ (۲) المائدہ : ۱۸ ۵
(۳) النمل : ۳۴ ۲۷

جلنے کے بعد اس آیت کی طرف اشارہ فرمایا:

"وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ"[1]

اور تو دیکھے گا پہاڑوں کو خیال کرے گا کہ وہ جمے ہوئے ہیں۔ اور وہ چلتے ہوں گے بادلوں کی چال۔ یہ کام ہے اللہ کا جس نے حکمت سے بنائی ہر چیز۔

ابوعلی رودباری علیہ الرحمہ جب اپنے رفقا کو اکٹھا دیکھتے تو یہ آیت تلاوت کیا کرتے تھے۔

وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ"[2]

اور وہ ان کے اکٹھا کرنے پر جب چاہے قادر ہے

زہری علیہ الرحمہ نے اپنے قول کہ "انسان وہ جو بولے تو ایک لمحے کے لیے اور خاموش رہے تو سارا دن" پر اس آیت کو دلیل بنایا:

"وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ"[3]

اور اگر ہم چاہیں تو تمھیں ان کو دکھا دیں کہ تم ان کی صورت سے پہچان لو اور ضرور تم انھیں بات کے اسلوب میں پہچان لو گے۔

مذکورہ اقوال اور ان کی طرح کی دیگر امثال قرآن کریم کی صحیح تشریحات ہیں مزید اللہ ہی بہتر جانتا ہے قارئین اگر قرآن حکیم کی تفسیر سے متعلق کوئی اشارات یا اقوال کہیں بھی مطالعہ کریں تو انھیں چاہیے کہ سطور گذشتہ میں بیان کردہ معیارات پر انھیں ضرور پرکھ لیں تا کہ غلط اور صحیح کا اندازہ ہو سکے۔

○

---

(۱) النمل: ۸۸ (۲) الشوریٰ: ۲۹ (۳) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم): ۳۰

۲۷ ۴۲ ۴۷

۲۱

اتباعِ اسوۂ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

صوفیہ کی قرآن فہمی اور اتباعِ اسوۂ حسنہ

اللہ جل جلالہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا" (۱)

تم فرماؤ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں۔

آیت مبارکہ میں ہمیں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سکھایا کہ انہیں تمام مخلوقاتِ عالم کے لیے جامع بنا کر بھیجا گیا۔

اور فرمایا:

"وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ" (۲)

اور بے شک تم ضرور سیدھی راہ بتاتے ہو اللہ کی راہ کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں۔

آیت مبارکہ میں اللہ نے اس بات کی تصدیق فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقط سیدھے راستے ہی کی جانب رہنمائی فرماتے ہیں۔

اور فرمایا:

"وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ" (۳)

اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے۔

---

(۱) اعراف: ۱۵۸ (۲) الشوریٰ: ۵۲-۵۳ (۳) النجم: ۳

یعنی ہم ان کے ہر قول کو خواہشات سے پاک سمجھیں اور مزید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کی تشریح میں فرمایا:

"هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" [1]

وہی ہے جس نے اَن پڑھوں انہی میں ایک رسول بھیجا کہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتے ہیں اور انھیں پاک کرتے ہیں اور انھیں کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتے ہیں۔

اس آیت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ قرآن ہم تک پہنچا انھیں سے ہم نے قرآن اور حکمت سیکھی۔ یہاں حکمت سے مراد ان کی سنت آداب، اخلاق، افعال حقائق اور احوال ہیں۔ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ پہنچایا جو آپ پر نازل ہوا اور جس کے پہنچانے پر آپ کو مامور کیا گیا۔

جیسا کہ قرآن حکیم گویا ہے:

"يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ" [2]

اے رسول پہنچا دو جو کچھ اتارا تمہیں تمہارے رب کی طرف سے۔

اور اللہ نے تمام خلق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ" [3]

تم فرماؤ حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا۔

اسی ضمن میں ایک اور مقام پر فرمایا:

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ" [4]

جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ کا حکم مانا۔

امت کے ہر فرد کو چاہیئے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمائیں وہ بلا چون و چرا قبول

---

(۱) الجمعہ : ۲ ۶۲ (۲) المائدہ : ۶۷ ۵

(۳) النور : ۵۴ (۴) النساء : ۸۰

۲۴ ۴

کرلیں اور جس سے وہ منع فرمائیں اس سے باز رہیں۔ اسی مفہوم کی ایک آیت مبارکہ:

"وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا"[1] — اور جو کچھ تمھیں رسول عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو۔

قرآن کریم نے آپ کی پیروی کو شرطِ ہدایت ٹھہراتے ہوئے کہا:

"وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ"[2] — اور ان کی غلامی کرو کہ تم راہ پاؤ۔

اور فرمایا:

"وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا"[3] — اور اگر رسول کی فرمانبرداری کروگے راہ پاؤ گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کرنے پر فتنہ و عذاب میں مبتلا ہو جانے سے متعلق فرمایا:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ"[4] — تو ڈریں وہ جو رسول کے حکم کے خلاف کرتے ہیں کہ انھیں کوئی فتنہ پہنچے یا ان پر دردناک عذاب پڑے۔

اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایک اور جگہ پر اللہ نے فرمایا کہ مومنوں کے لیے اللہ اور اللہ کے لیے مومنوں کی محبت صرف اسی امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو لازمۂ حیات بنائیں۔

فرمایا:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ"[5] — اے محبوب تم فرما دو لوگو! اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ۔ اللہ تمھیں دوست رکھے گا۔

---

(۱) الحشر : ۵۹ : ۷

(۲) الاعراف : ۷ : ۱۵۸

(۳) النور : ۲۴ : ۵۴

(۴) النور : ۶۳

(۵) آل عمران : ۳ : ۳۱

مومنین کی توجہ کو اسوۂ حسنہ اپنانے کی جانب مبذول کراتے ہوئے فرمایا:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (۱)	بے شک تمھیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے۔

آیات بیان ہو چکیں اب اسی ضمن میں وہ احادیث بیان کی جاتی ہیں جو ثقہ راویوں نے ثقہ راویوں سے روایت کیں اور نہایت احتیاط و حفاظت کے ساتھ ہم تک پہنچائیں لہٰذا ان کو جاننا اور ان پر عمل کرنا ہم سب مومنین کا فرض ہے جیسا کہ قولِ باری تعالیٰ سے ظاہر ہے:

"وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" (۲)	اور نماز برپا رکھو اور زکوٰۃ دو اور رسول کی فرمانبرداری کرو۔

اور فرمایا:

"اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" (۳)	بے شک تم سیدھی راہ پر ہو۔

الغرض آپ کی ذات گرامی علیہ التحیۃ والسلام ہی جملہ خلق کے لیے نمونہ اور ان کی اطاعت روز قیامت تک لازم ہے۔ البتہ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جن کا شمار مرفوع القلم لوگوں کے زمرے میں ہوتا ہے۔

جس نے قرآن سے موافقت اور سنتِ رسول کی مخالفت کی وہ بلاشبہ قرآن کا مخالف ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قدر اخلاق، افعال، احوال، اوامر، نواہی، مباحات، ترغیبات اور ترہیبات احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ ان کو اپنانا اور آپ کی اطاعت کرنا ہی سب سے بہترین اتباع ہے۔ ہاں جس مسئلے کے خلاف باقاعدہ کوئی دلیل موجود ہو اس پر عمل کو روک دینا درست ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ" (۴)	.... یہ خالص تمھارے لیے ہے امت کے لیے نہیں۔

اور جیسا کہ آپ نے ملے کے روزے رکھنے کے بارے میں فرمایا "میں تم میں سے کسی کی طرح نہیں

---

(۱) الاحزاب: ۲۱ ۳۳ (۲) النور: ۵۶ ۲۴

(۳) الزخرف: ۴۳ ۴۳ (۴) الاحزاب: ۵۰ ۳۳

ہوں۔ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بعض افعال و احوال میں ہم سے مختلف ہے لہٰذا ایسے افعال و احوال کی اتباع ہم پر لازم نہیں)۔

اور قربانی سے متعلق حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بردہ بینار سے فرمایا: قربانی کرو اور تیرے بعد ایسا کرنا کسی کے لیے جائز نہ ہوگا۔

اور اسی طرح کی کئی صورتیں ایسی ہیں جن میں استثنار کا پہلو موجود ہے مگر شرط یہ ہے کہ دلیل نص قرآنی اور احادیث سے لائی جائے۔

جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئیں حدود، احکام، عبادات، فرائض سنن، امر و نہی، مباحات، رخصت اور توسیع کا تعلق ہے تو یہ جملہ علمائے و فقہار نے مدون کر چھوڑے ہیں۔ اور ان کے ہاں باقاعدہ مشہور و مروّج ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو ائمہ دین کہلاتے ہیں یہ اللہ کی حدود کے محافظ، سنتِ رسول سے تمسک کرنے والے، دینِ الٰہی کی تائید کرنے والے، لوگوں کے لیے دین کو محفوظ رکھنے والے۔ اور ان کے لیے حلال و حرام اور حق و باطل کو الگ الگ دکھانے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خلق کے لیے اللہ کی حجت ہیں اور حق کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں۔ بلاشبہ یہی لوگ خواص ہیں جنہیں عوام میں سے انتخاب کیا گیا۔ پھر ان میں سے بھی خاص افراد چنے جاتے ہیں جو اصولِ دین کے استحکام حدود اللہ کی حفاظت اور سنتِ رسول سے تمسک کرنے کے بعد بیٹھے نہیں رہتے بلکہ طاعات، آداب، عبادات، بلند اخلاق اور احوال سعیدہ کی تمام اقسام کے بارے میں احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مزید غور و خوض کرتے ہیں اور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند ترین کردار کے مثالی نمونے کو ہمہ وقت اپنے عمل کا محور سمجھتے ہیں۔ جس چیز کو سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑا جانا اُسے بڑا سمجھا اور جسے انھوں نے چھوٹا سمجھا اسے چھوٹا جانا۔ جو شے انھوں نے گھٹائی اسے گھٹا دیا اور جو انھوں نے بڑھائی اسے بڑھا دیا جسے انھوں نے ناپسند فرمایا اسے ناپسند کیا اور جو کچھ انھوں نے اختیار کیا اسے اپنا لیا جو چیز آپ نے ترک فرمائی اسے چھوڑ دیا۔ جن آزمائشوں پر آپ نے صبر فرمایا ان پر صبر اختیار کیا۔ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن جانا اسے اپنا دشمن جانا جس سے انھوں نے دوستی کی اسے دوست ٹھہرایا جسے انھوں نے فضیلت بخشی اسے افضل جانا جس چیز سے انھوں نے رغبت ظاہر فرمائی اس کی طرف مائل ہوئے اور جس سے وہ دور رہے اس کے

قریب نہ گئے۔

اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے خُلقِ رسول کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا ان کا خلق قرآن تھا یعنی ان میں قرآن سے پوری طرح موافقت موجود تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: مجھے اعلیٰ اخلاق دے کر بھیجا گیا۔

۲۲

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خداداد بلند اخلاق و عادات

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میری تربیت اللہ نے فرمائی اور کیا خوب تربیت کی۔

فرمایا: مَیں تم میں سب سے بڑھ کر اللہ کو جاننے والا اور اس کا خوف رکھنے والا ہوں۔

فرمایا: مجھے اس بات کا اختیار دیا گیا تھا کہ جنس فرشتہ یا جنس انسان سے نبی بن کر آؤں۔ جبریل نے مجھے اشارۃً کہا: عاجزی اختیار کر لو۔ اس پر میں نے کہا: میں انسانی جنس میں سے نبی بننا چاہتا ہوں کہ مجھے بھوک بھی لگے اور سیری بھی حاصل ہو۔

فرمایا: میرے سامنے پوری کائنات کو پیش کیا گیا مگر میں نے انکار کر دیا۔

فرمایا: اگر میرے پاس کوہِ اُحد کے برابر سونا بھی ہوتا تو سارے کا سارا راہ خدا میں خرچ کر ڈالتا صرف اس قدر باقی رکھتا کہ قرضہ چکا لیتا۔

ایک روایت ہے کہ آپ نے کبھی اگلے روز کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھا۔ صرف ایک بار زندگی میں سارے سال کے لیے خرچ اکٹھا کر دیا تاکہ عیال اور باہر سے آنے والے وفود کی مہمانداری پر خرچ کیا جا سکے۔

روایت ہے کہ آپ کے پاس کبھی ایک ہی وقت میں دو قمیضیں نہیں ہوتی تھیں۔ اور کبھی آپ کے لیے خصوصی طور پر کھانا نہیں چنا گیا۔ اور آپ دنیا سے اس حالت میں رخصت ہوئے کہ کبھی گندم کی روٹی سیر ہو کر نہیں کھائی اور آپ نے یہ طرز عمل اختیار رکھتے ہوئے اپنایا کوئی اضطراری کیفیت نہ

تھی کیونکہ اگر وہ اپنے رب جل جلالہ سے پہاڑوں کو سونا بنا دینے کو کہتے اور بلا شرکت غیرے ان کی ملکیت بھی مانگتے تو ان کے لیے یہ سب کچھ کر دیا جاتا اسی طرح کی اور بھی کئی روایات و اخبار موجود ہیں۔

روایت ہے کہ آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: بلال! خرچ کر اور عرش والے کے ہوتے ہوئے کمی سے نہ گھبرا۔

حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا نے آپ کی خدمتِ اقدس میں کھانا پیش کیا۔ آپ نے کچھ تناول فرمایا اور باقی جو بچ رہا وہ بریرۃ نے رکھ چھوڑا۔ اور دوسری رات آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: کیا تجھے یہ خوف نہ تھا کہ روزِ قیامت اس کھانے کے بدلے آگ ہوگی کبھی اگلے روز کے لیے کوئی چیز جمع نہ رکھنا کیونکہ اللہ ہر روز کا رزق علیحدہ علیحدہ عطا فرماتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ اگر بھوک ہوتی تو کھا لیتے ورنہ چھوڑ دیتے۔ اور جب بھی دو کام پیش آئے تو آسان کو اختیار کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہل چلانے والے تھے اور نہ ہی تاجر۔ آپ کی انکساری کا یہ عالم تھا کہ اون کا لباس زیبِ تن فرماتے۔ اپنا جوتا خود مرمت فرما لیتے، گدھے پر سواری کرتے بکری کا دودھ دوہ لیتے کپڑوں میں پیوند لگا لیتے اور سواری کرتے ہوئے اپنے ساتھ کسی کو بٹھا لینے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

روایت ہے کہ آپ امیری کو پسند نہیں فرماتے تھے اور افلاس سے ڈرتے نہ تھے۔ آپ اور آپ کی ازواجِ مطہرات پر سالہا ایک ایک اور دو دو ماہ اس طرح گذر جاتے کہ گھر میں کھانا پکانے کے لیے آگ تک روشن نہ ہوتی اور ایسے میں دو ہی چیزوں کھجور اور پانی پر آپ اور آپ کے اہل و عیال کا گذارہ ہوتا۔

روایت ہے کہ آپ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو جب یہ اختیار دیا گیا کہ اپنے لیے جو چاہیں چن لیں تو انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کو چن لیا۔ اور اسی ضمن میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ	اے غیب بتانے والے (نبی) اپنی بیویوں
كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا	سے فرما دے اگر تم دنیا کی زندگی اور آرائش
فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ	چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں مال دوں اور اچھی طرح
سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ (۱)	چھوڑ دوں۔

(۱) الاحزاب: ۲۸

آپ کی ایک دعا یہ تھی :

"اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنَ " اے میرے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ، مجھے مسکینی ہی کی حالت میں موت عطا کر اور قیامت کے روز مساکین ہی کے زمرے میں اٹھا)

ایک اور دعا : " اَللّٰھُمَّ اَرْزُقْ آلِ مُحَمَّدٍ قُوْتَ یَوْمٍ بِیَوْمٍ "

"اے میرے رب! آلِ محمد کو ایک ایک دن کا الگ الگ رزق عطا فرما)

ابو سعید خدری رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اونٹ کی ٹانگ کو ران سے باندھتے تھے (اونٹ کو بیٹھا ہوا ہی رکھنا ہو تو ایسا کرتے ہیں) پانی ڈھونے والے اونٹ کو پانی پلا دیتے، گھر کی مرمت کرتے، جوتا مرمت کر لیتے، کپڑوں میں پیوند لگا لیتے، بکریاں دوہ لیتے خادم کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے اور اگر خادم آٹا پیستے پیستے تھک جاتی تو اس کے ساتھ آٹا پیستے۔ آپ بازار سے اپنا سودا اٹھا کر گھر تک لانے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ امیر و غریب دونوں سے ایک سا مصافحہ کرتے، سلام کرنے میں ابتداء کرتے، جو آپ کی دعوت کرتا قبول کر لیتے اور جس قسم کا طعام بھی دعوت میں پیش کیا جاتا اسے حقیر نہ جانتے چاہے ردی کھجور ہی سامنے رکھ دی جاتی۔ آپ نرم خو، شریف الطبع حسن معاشرت والے، شگفتہ رو متبسم لب، چہرے پر حزن مگر ترش روئی سے پاک، عجز پسند ایسے کہ ذلت قریب نہ پھٹکے، فیاض مگر فضول خرچی سے دور، رقیق القلب، ہمیشہ متوجہ رہنے والے اور ہر مسلمان پر مہربان تھے۔ سیر ہو جانے کے بعد کبھی ڈکار نہیں لیتے تھے اور نہ کبھی لالچ کی طرف ہاتھ بڑھاتے۔

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: آپ چلتی ہوا سے بھی بڑھ کر فیاض تھے۔ آپ نے ایک شخص کو دو پہاڑوں کے مابین ایک پوری وادی بھیڑ بکریوں سے بھری ہوئی عطا کر دی۔ یہ شخص جب اپنے قبیلے میں پہنچا تو کہنے لگا کہ رسول اللہ ایک ایسے شخص کی طرح عطا کرتے ہیں جسے کبھی افلاس کا ڈر نہیں ہوتا۔ آپ میں فحاشی، بد کلامی، اور بیگانہ حرکات ہرگز نہ تھیں۔ آپ زمین پر بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے اور زمین پر ہی نشست فرماتے، عبا پہنے مسکینوں کے ساتھ مل کر بیٹھتے، بازار تشریف لے جاتے، اپنے ہاتھ کو تکیہ بنا لیتے، اور کسر نفسی سے کام لیتے، آپ کو کبھی کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ کبھی تنہا کھانا نہیں کھایا کبھی اپنے غلام کو مارا نہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کو مارا، مگر صرف اللہ کی راہ میں مارا۔ آپ کبھی چار زانو ہو کر

نہیں بیٹھے اور نہ ہی کبھی تکیہ لگا کر کھانا کھایا۔ فرمایا کرتے : میں اللہ کے بندے کی طرح بیٹھتا ہوں اور ایک حقیقی بندے کی طرح کھاتا ہوں۔

روایت ہے کہ آپ نے بھوک سے اپنے بطن مبارک پر پتھر باندھے حالانکہ اگر آپ اللہ تعالیٰ سے کوہ ابو قبیس کو سونے میں تبدیل کر دینے کے لیے بھی کہتے تو وہ آپ کی دعا قبول کر لیتا۔ آپ ایک بار مع اپنے صحابہ کے ابو الہیثم ابن التیہان کے ہاں بلا دعوت کے تشریف لے گئے۔ ان کے کھانے میں سے تناول فرمایا۔ اور ان کے پانی میں سے نوش فرمایا۔ پھر فرمایا کہ یہی وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا۔

ایک روایت ہے کہ کسی شخص نے آپ کو پانچ اصحاب سمیت مدعو کیا۔ اور چھٹا صحابی اس وقت داخل ہوا جب دعوت دینے والے نے اس کے شامل ہونے کی اجازت دے دی۔

ایک حدیث میں روایت کیا گیا کہ آپ ایک رومال اوڑھتے تھے جس پر کچھ نقش و نگار تھے۔ اسے آپ نے یہ کہہ کر پھینک دیا کہ کہیں اس کے نقش و نگار مجھے اپنی جانب متوجہ نہ کر لیں۔ اور فرمایا : مجھے ابوجہم کا جبّہ لا کر دو۔

آپ سے ایک ہی کپڑے میں نماز ادا کرنے کے بارے میں عرض کیا گیا تو فرمایا : کیا تم سب کے پاس دو دو کپڑے ہیں؟ پھر فرمایا : میں ایک ایسی خاتون کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت کے ٹکڑے کھاتی تھی۔ مجھے تم یونس بن متّیٰ علیہ السلام پر فضیلت مت دو۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا : میں اولادِ آدم کا سردار ہوں مگر مجھے کوئی فخر نہیں۔ آپ نے فرمایا : میں نے بعض کو عطا و بخشش سے نوازا اور بعض کو محروم رکھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جسے میں نے عطا کیا وہ مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے جسے میں نے نہیں دیا۔

فرمایا : سب سے پہلے فقراءِ انصار جنت میں داخل ہوں گے۔ ان کی حالت یہ ہوگی کہ سر کے بال گرد آلود، کپڑے میلے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو ناز و نعم میں رہنے والی عورتوں سے نکاح نہیں کرتے تھے اور جن پر بند دروازوں کو نہیں کھولا جاتا تھا۔ (یعنی وہ مشکلات میں مبتلا رہتے تھے)

فرمایا : میرا اور دنیا کا کیا تعلق۔ تم میں سے ہر ایک کا گذارے کا سرمایہ اتنا ہونا چاہئے جتنا کہ سوار کا زادِ راہ۔

فرمایا: میری امت کے فقرا امرا سے نصف یوم، جو کہ پانچسو برس کے برابر ہوگا، پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ فرمایا: ہم پیغمبروں کا طائفہ سب سے بڑھ کر آزمائشوں میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ افضل ہوں پھر ان سے کم درجے کے افضل۔ اور بندے کو اس کے دین کے معیار پر آزمایا جاتا ہے۔ اگر اس کا دین و ایمان پختہ ہو تو ایسا شخص بہت بڑی آزمائش میں سے گذرنے والا ہوتا ہے۔

آپ سے ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ مجھے آپ سے محبت ہے آپ نے فرمایا پھر آزمائش کے لیے تیار ہو جاؤ۔

روایت ہے کہ آپ نے فرمایا تمہاری دنیا میں سے مجھے تین چیزیں عزیز ہیں (خوشبو، نماز، خواتین) آپ نے یہ فرما کر کہ "تم اپنی دنیا کو بہتر جانتے ہو" خود کو اس سے علیحدہ کر کے اسے لوگوں کے لیے چھوڑ دیا۔

آپ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو ایک اینٹ پر اینٹ بھی نہیں رکھی تھی۔ آپ نے اس حالت میں دنیا سے سفر فرمایا کہ آپ کی ایک زرہ ایک یہودی کے پاس ایک صاع جو کے بدلے رہن پڑی تھی۔ آپ نے اپنے پیچھے درہم چھوڑے نہ دینار نہ آپ کی میراث تقسیم ہوئی اور نہ ہی آپ کے گھر سے کوئی اثاثہ ملا۔ آپ فرماتے تھے ہم انبیا کوئی میراث چھوڑ کر نہیں جاتے صرف صدقہ چھوڑ جاتے ہیں۔ (یعنی جو مال و متاع اگر نبی چھوڑ جائے تو وہ مفادِ مؤمنین کے لیے بطور صدقہ کے صرف کر دیا جائے)

آپ ہدیہ و عطیہ قبول فرماتے تھے۔ صدقہ کبھی نہ کھاتے البتہ صدقہ دینے والوں سے لے کر تقسیم فرما دیتے۔ آپ فرماتے کہ اللہ تعالٰے نے مجھے یہ وحی نہیں بھیجی کہ میں مال جمع کروں اور تاجر بن جاؤں بلکہ مجھے تو یہ وحی کی گئی:

"فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ" [۱]	تو اپنے رب کو سراہتے ہوئے اس کی پاکی بولو اور سجدہ والوں میں ہو۔ اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت میں رہو۔

---

(۱) الحجر: ۹۸ - ۹۹

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں :

ہم نے ایک بکری ذبح کی اور صدقہ کر دی حتیٰ کہ صرف اس کے شانے باقی رہ گئے تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ساری بکری اللہ کی راہ میں صدقہ کر دی صرف شانے رہ گئے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا ساری بکری تو باقی رہ گئی صرف شانے ہی گئے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۱)	قلم اور ان کے لکھے کی قسم تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں اور ضرور تمہارے لیے بے انتہا ثواب ہے۔ اور بے شک تمہاری خو بو بڑی شان کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

بلاشبہ اللہ جل وجلالہ عمدہ اخلاق کو پسند فرماتا ہے۔ اور برے اخلاق کو ناپسند۔

آپ نے مزید فرمایا :

مجھے اچھے اخلاق سکھانے کے لیے بھیجا گیا۔

آپ کا خلق جن صفات پر مشتمل تھا وہ یہ ہیں :

حیا، سخاوت، توکل، رضا، ذکر، شکر، حلم، صبر، عفو، صلح، نرمی، رحمت، مدارات، نصیحت، تمکین، وقار، تواضع، فقر، منشی، جود وسخا، خضوع، قوت، شجاعت، اخلاص، صدق، زہد، قناعت، خشوع، خشیت، تعظیم، ہیبت، دعا، گریہ، خوف، رجا، پناہ ڈھونڈنا، شب بیداری، عبادت، جہاد اور مجاہدہ۔

روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنیادی طور پر ہمیشہ متفکر اور مغموم سے رہتے تھے۔ اور آپ کے سینے میں اس طرح کا جوش ہوتا تھا جیسے آگ پر رکھی دیگچی میں جوش پیدا ہوتا ہے۔

---

(۱) القلم : ۱-۴

آپ اس قدر نماز پڑھتے کہ آپ کے پاؤں مبارک کو ورم آ گئے تو آپ سے کہا گیا یا رسول اللہ! کیا آپ کے رب نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش نہیں دیئے (جو اس قدر عبادت کرتے ہیں)، آپ نے جواباً فرمایا: کیا میں شکر گذار بندہ نہ بنوں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے عطا کرتے جو آپ کو محروم رکھتا اور اس سے تعلق جوڑتے جو آپ سے ناطہ کاٹ لیتا اور اسے معاف فرما دیتے جو آپ پر زیادتی کرتا۔ آپ نے کبھی اپنی ذات کی خاطر کسی سے انتقام لیا اور نہ ہی اپنے لیے کسی پر ناراض ہوئے صرف اس حالت میں غضب ناک ہوتے جب اللہ کی قائم کردہ حدود سے کوئی تجاوز کرتا یا ان کی بے حرمتی کرتا۔ بیواؤں کے لیے آپ ایک شفیق خاوند اور یتیموں کے لیے رحیم باپ کی طرح تھے۔ آپ فرمایا کرتے: جس نے اپنے پیچھے مال چھوڑا تو وہ اس کے وارثوں کا اور جس نے اپنے پیچھے یتیم یا کوئی ایسی چیز چھوڑ دی جو کسی کام کی نہ ہو وہ میری ہے۔

آپ نے فرمایا: اے میرے رب! میں بشر ہوں اور ہر بشر ہی کی طرح غصے میں آتا ہوں۔ اگر میں نے کسی شخص کو غصے کی حالت میں جھڑکا ہو تو یہ اس کے لیے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دس برس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی مگر اس عرصے میں وہ کبھی مجھ پر نہ تو غصے ہوئے اور نہ ہی کبھی مجھے جھڑکا۔ اگر میں نے کوئی کام کیا تو یہ نہ کہا کہ ایسا کیوں کیا؟ اور اگر کوئی کام نہ کیا تو یہ نہ کہا کہ ایسا کیوں نہیں کیا؟

آپ کے باکمال اخلاق، اور عفو و حلم کے ثبوت کے لیے صرف فتح مکہ ہی کے دن کا سلوک کافی ہے۔ آپ مکہ میں صلح اور امن کے ساتھ داخل ہوئے جب کہ کفار مکہ نے آپ کے عزیزوں، دوستوں کو شہید کیا تھا، شعب ابی طالب میں آپ اور آپ کے اصحاب کو محصور کر کے ہر طرح کا عذاب پہنچایا، انھیں ان کے گھروں سے نکالا، آپ پر آلودگی پھینکی، آپ کو اور آپ کے صحابہ کو اذیتیں دیں آپ کا تمسخر اڑایا آپ کو دھوکہ و فریب دینے میں اکٹھے رہوئے۔ جب آپ مکہ میں اس حالت میں داخل ہوئے کہ کفار مکہ کی مرضی نہ تھی اور آپ غالب تھے اور وہ بہت حقیر و ذلیل، تو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا: اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور یوں گویا ہوئے: میں وہی قول دہراتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کہا تھا کہ آج تم کو حقیر اور برا نہیں سمجھا جائے گا۔ اللہ تمھیں معاف کرے۔ پھر آپ نے فرمایا: جو ابوسفیان کے گھر داخل ہوا وہ امن میں ہے۔

آپ کے اخلاقِ کریمانہ اور اسوۂ حسنہ کے بارے میں اسی طرح کی بے شمار باتیں کئی دیگر روایات و اخبارِ صحیحہ میں موجود ہیں۔ ہم نے صرف اس قدر ذکر کر دیا ہے کہ آپ کے خصائل پر مبنی وہ روایات بھی ثابت ہو جائیں جن کا ذکر ہم نے نہیں کیا۔

۲۰۳

مومنین کو اللہ کی عطا کردہ سہولتوں اور رعایتوں سے متعلق احادیث

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو قریظہ، بنو نضیر، فدک اور خیبر کے اموال عطا فرمائے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس لباس تھا جو انھیں تحفۃً دیا گیا تھا۔ ڈھال اور تلوار تھی جس کے دستے میں چاندی کا کام کیا گیا تھا، پردے تھے جو گھر میں موجود تھے۔ ایک علم تھا، ایک گھوڑا، ایک خچر، ایک اونٹنی، ایک گدھا، چادر، عمامہ، موزے جو شاہ نجاشی نے آپ کو ہدیۃً بھیجے تھے اور دیگر چیزیں۔

مزید یہ کہ آپ ٹھنڈی میٹھی چیز پسند فرماتے تھے اور خبیص[1] شوق سے تناول فرماتے تھے۔ آپ نے ایک مرتبہ صحابہ سے فرمایا: خوب کھاؤ پیو۔ مذکورہ اور اس طرح کی کئی دوسری روایات صحیحہ ہیں جن کا تعلق امت کو دین میں آسائش، سہولت اور وسعت و رخصت دینے سے ہے۔

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے خلق کے امام و رہنما ہیں۔ آپ نے فرمایا: مجھے ایک سچا اور آسان دین دے کر مبعوث کیا گیا اور آپ نے فرمایا کہ میں بھولتا ہوں تاکہ یہ میری سنت بن جائے، اور اگر اللہ تعالیٰ بندوں کو مال کمانے، مختلف پیشے اختیار کرنے، چیزیں جمع کرنے کی رعایت، ان کی مجبوریوں کو جاننے کے باوصف، نہ دیتا تو وہ ہلاک ہو چکے ہوتے۔ کیونکہ اللہ نے تو بندوں کو مال جمع کرنے، مختلف صنعتیں اور تجارتیں اختیار کرنے کی دعوت نہیں دی بلکہ ان کے لیے یہ سب کچھ اس لیے جائز کر دیا کہ اسے بندوں کی کمزوریوں کا علم ہے اور وہ ان کی مجبوریوں سے باخبر ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ اسی کی اطاعت و عبادت کی جائے اور تمام مومنوں کو اپنے ذکر، شکر اور

---

(۱) کھجور، [illegible] اور میدہ سے تیار کی گئی مٹھائی کو خبیص کہتے ہیں۔ (مترجم)

توکل کی راہ سجھائی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا"[1]

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کرو۔

اور فرمایا:

"وَعَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ"[2] — اور اللہ ہی پر بھروسہ کرو اگر تمہیں ایمان ہے۔

"وَاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْنِ"[3] — اور میں تمہارا رب ہوں تو میری عبادت کرو۔

"وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ"[4] — اور خالص میرا ہی ڈر رکھو۔

"وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ" — اور مجھی سے ڈرو۔

مذکورہ مباحات اور کئی امور میں رخصتوں کے سلسلے میں انبیاء علیہم السلام عام لوگوں سے مختلف ہیں کیونکہ اگر لوگوں کو ان کی اجازت دی گئی ہے تو اس لیے کہ وہ ضعیف اور مجبور ہیں، وہ صبر و قناعت کی تلخیوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کے نفوس حظ دنیوی کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ میلانِ نفس ہے جو بعض اوقات انہیں گمراہی کی جانب لے جاتا ہے۔ مگر انبیاء کا معاملہ اس سے بالکل ہٹ کر ہے۔ وہ تائیدِ نبوت، قوتِ رسالت اور انوارِ وحی سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ دنیوی حظ میں شرکت کرتے ہیں یا دیگر امورِ دنیوی میں حصہ لیتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ وہ خود لطف اٹھائیں بلکہ اس لیے کہ لوگوں کے لیے قائم کردہ حدود کی نشاندہی وہ اپنے عمل سے پختہ کر دیں وہ حظ اٹھانے کے لیے ان میں حصہ نہیں لیتے بلکہ اپنے فرائض پورے کرتے ہیں۔ کیا آپ کی نظر سے یہ آیت مبارکہ نہیں گذری

"مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ"

جو غنیمت دلائی اللہ نے اپنے رسول کو شہر والوں سے وہ اللہ اور رسول کی ہے۔ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے۔

---

(۱) الاحزاب: ۴۱ ۳۳ — (۲) المائدہ: ۲۳ ۵

(۳) الانبیاء: ۹۲ ۲۱ — (۴) البقرۃ: ۴۰ ۲

(۵) البقرۃ: ۴۱ ۲

آیت مذکورہ میں یہ خبر دی گئی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مال غنیمت عطا فرمایا وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے کہ وہ اسے مناسب طریق پر تقسیم کر دیں۔ اور خمس الخمس جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں عطا فرمائیں؛

قرآن پر عمل پیرا ہونے والوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والوں کے تین طبقے ہیں۔

ایک وہ جن کا تعلق دین میں دی گئی سہولتوں، رخصتوں اور مباحات وتاویلات سے ہے۔

دوسرے وہ جن کا تعلق دینی قوانین کے علم سے ہے۔

تیسرے وہ جن کا تعلق جہاں دینی قوانین کے علم سے ہے وہاں وہ اس سے آگے بھی نظر رکھتے ہیں اور ایسے احوال، اعمال، اخلاق اور حقائق تک خود کو پہنچاتے ہیں جن سے بندے کے ایمان میں انتہائی پختگی اور کمال پیدا ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ حارثہ نے عرض کیا: میں نے نفس کو دنیا سے کنارہ کش کر لیا، راتوں کو جاگا اور دن کو روزہ سے رہا آپ نے فرمایا تو نے حقیقت کو پالیا۔ اور اب اس پر ثابت قدم رہ۔ یا آپ نے یہ فرمایا کہ ایک بندہ جس کا قلب اللہ نے منور فرما دیا۔

کہا جاتا ہے کہ تصوف سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کی بنیاد چار حدیثیں ہیں ایک حدیث جبریل علیہ السلام جب انھوں نے آپ سے ایمان واحسان کے بارے میں سوال کیا اور آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تو اس طرح اللہ کی عبادت کرے کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔

دوسری حدیث عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر فرمایا: اے لڑکے تو حقوق اللہ کی حفاظت کر وہ تیری حفاظت کرے گا۔[1]

---

(۱) یہاں اللہ کی حفاظت کرنے سے مراد اس کو نہاں خانۂ دل میں بسا کر ہمہ وقت اس کے تصور کی حفاظت کرنا اور اس کے علاوہ جملہ تصورات کو مٹانا ہے۔ یعنی اگر بندہ اپنے مالک حقیقی کو اپنا مقصود ومطلوب بنائے تو وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ (مترجم)

تیسری حدیث حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ وہ ہے جو تیرے سینے میں کھٹکے اور نیکی وہ ہے جس سے تیرا دل مطمئن ہو جائے۔ چوتھی حدیث بشر بن نعمان سے مروی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

اب حرام وحلال دونوں الگ الگ واضح ہیں۔

ایک اور روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام میں ضرر ہے اور نہ ضرر پہنچانے کی کوئی صورت"۔

○

صوفیہ اور اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

میں نے ابو عمرو عبدالواحد بن علوان علیہ الرحمہ سے اور انھوں نے حضرت جنید علیہ الرحمہ کو یہ کہتے سنا کہ علم تصوف کا احادیثِ رسول سے گہرا ربط ہے۔

میں نے ابو عمرو اسماعیل بن نجید علیہ الرحمہ سے اور انھوں نے ابو عثمان سعید بن عثمان الحیری کو یہ کہتے سنا کہ جس نے سنت رسول کو اپنے اوپر قولاً و فعلاً جاری کر لیا اور اس کی زبان سے حکمت ہی کی بات نکلی۔ اور جس نے اپنے اوپر خواہشاتِ نفس کو قولاً و عملاً حاکم بنا لیا اس کی زبان سے بدعت کی بات نکلی۔

ارشاد خداوندی ہے:

"وَاِنْ تُطِیْعُوْہُ تَهْتَدُوْا"(۱) اور اگر رسول کی فرماں برداری کرو گے راہ پاؤ گے۔

میں نے طیفور بسطامی سے انھوں نے موسیٰ بن عیسیٰ المعروف بہ عُمّی سے انھوں نے اپنے والد سے اور ان سے ابو یزید بسطامی نے یہ کہا کہ ہمارے ساتھ چلو کہ اس زاہد سے ملاقات کریں جو خود کو ولی اللہ کہلواتا ہے۔ یہ زاہد اپنے زہد و عبادت کے لیے مشہور تھا اور مجھ سے طیفور نے اس کا نام و نسب بھی بیان کیا تھا موسیٰ بن عیسیٰ کے والد کہتے ہیں، کہ ہم اس سے ملنے گئے تو وہ زاہد گھر سے نکل کر مسجد کی طرف جا رہا تھا اور جب مسجد میں داخل ہوا تو قبلہ کی جانب تھوک دیا یہ دیکھ کر ابو یزید بسطامی علیہ الرحمہ

---

(۱) النور: ۵۴

۲۶

نے کہا آؤ واپس چلیں کیونکہ جس شخص کا آداب رسول پر عمل نہیں وہ ولی کیسے ہو سکتا ہے۔

ابو یزید بسطامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں :

میں نے ارادہ کیا کہ اللہ سے کھانے کی طرف رغبت اور عورتوں کی جانب خواہش کو ختم کرنے کا سوال کروں۔ مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہ کیا تو میں کیوں خلافتِ سنت کروں۔ لیکن اللہ نے میرے دل کی بات پوری کر دی اور اب یہ حالت ہے کہ عورت سامنے آئے تو اتنی پرواہ بھی نہیں کرتا کہ یہ دیوار ہے یا عورت۔

میں نے ابوطیب احمد بن مقاتل عکی بغدادی علیہ الرحمہ سے سنا وہ کہتے تھے کہ حضرت شبلی کی وفات کے روز میں جعفر خلدی کے ہاں بیٹھا تھا کہ بندار دینوری آگئے جو کہ شبلی علیہ الرحمۃ کے خادم تھے۔ اور ان کی وفات کے وقت پاس موجود تھے۔ ان سے جعفر خلدی علیہ الرحمہ نے پوچھا: آپ نے شبلی کی موت کے وقت کیا دیکھا۔ بندار نے کہا : جب ان کی زبان بند ہو گئی اور ماتھے پر پسینہ آگیا تو اشارے سے مجھے وضو کرانے کو کہا۔ میں نے وضو کرا دیا۔ مگر ڈاڑھی کا خلال بھول گیا۔ اس پر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر میری انگلیاں اپنی ڈاڑھی میں داخل کر کے خلال کیا۔ یہ سن کر جعفر رو پڑے اور کہنے لگے ایسے شخص کا کیا کہنا کہ جس سے عالم نزع میں جب کہ زبان بند تھی اور جبیں عرق آلود، وضو میں خلال تک نہ چھوٹا۔

میں نے احمد بن علی وجیہی سے اور انھوں نے ابوعلی رودباری کو یہ کہتے سنا کہ تصوف میں میرے استاذ حضرت جنید، فقہ میں ابوالعباس، سریج، نحو و لغت میں ثعلب اور حدیث میں ابراہیم حربی استاذ تھے۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ سے پوچھا گیا : آپ نے اللہ کو کیسے پہچانا ؟ جواب ملا: میں نے اللہ کو اللہ ہی کے ذریعے پہچانا۔ اور اللہ کے سوا باقی تمام چیزوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پہچانا۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ کہتے ہیں : ہر ایسا وجد باطل ہے جس کی سند قرآن و سنت سے نہ ملتی ہو۔

ابوسلیمان دارانی کہتے ہیں: اکثر یوں ہوتا ہے کہ کوئی حقیقت میرے دل کو چالیس روز مسلسل کریدتی رہتی ہے مگر میں اسے اس وقت تک قلب میں جگہ نہیں دیتا جب تک وہ حقیقت اپنے ہمراہ قرآن وسنت سے دو گواہ لے کر نہ آئے۔

اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق میرے حافظے میں سردست اسی قدر معلومات تھیں جو میں نے سپرد قلم کر دیں اور یہی کافی بھی ہے کہ زیادہ سے قاری کے لیے تحریر کے بوجھل ہونے کا اندیشہ ہے۔

بے شک اللہ ہی توفیق بخشنے والا ہے۔

۲۵

صوفیانہ تشریحات

صوفیائے نزدیک مفہوماتِ قرآن وحدیث

مستنبطات کسے کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں صوفیہ بیان کرتے ہیں کہ جو کچھ مفہوم اہل فہم اور محققین قرآن کو سنت سے اخذ کرتے ہیں اسے متنبسطات کہتے ہیں۔ یہ اہل فہم و محققین امت کے بالغ نظر افراد ہوتے ہیں جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول سے ظاہری و باطنی طور پر موافقت رکھتے ہیں اور ان کی اتباع کو کسی وقت بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ قرآن وسنت کے ظاہری و باطنی احکامات پر پوری طرح عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور جب انھیں قرآن وسنت کی اتباع کا یہ کمال حاصل ہوتا ہے تو اللہ کی جانب سے انھیں ایسا علم عطا کیا جاتا ہے جو وہ پہلے نہیں جانتے۔ یہ علم اشارہ کہلاتا ہے۔ پھر مزید یہ کہ انھیں ان کے درجاتِ عبودیت کے مطابق سربستہ حقائق واسرار سے باخبر کیا جاتا ہے۔

الغرض مذکورہ تمام درجات واحوال سے گذرنے کے بعد یہ اہل دانش وبینش قرآن وسنت سے جو کچھ اخذ کرتے ہیں اسے مستنبطات کہتے ہیں۔

قولِ خداوندی ہے:

"اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا" (۱)	تو کیا وہ قرآن کو سوچتے نہیں یا بعضے دلوں پر ان کے قفل لگے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس نے جو کچھ جانا اس پر عمل کیا اس کے بدلے اللہ کی طرف

---

(۱) محمد صلی اللہ علیہ وسلم: ۲۴

سے اسے ایک ایسا علم عطا ہوتا ہے جس کا اسے پہلے علم ہی نہیں ہوتا اور یہ علم دوسرے اہل علم کو حاصل نہیں ہوتا۔ اور اقفال القلوب (دل کے تالے) سے دلوں پر، خواہشات نفس کی اتباع، کثرت نگاہ، حب دنیا، طویل غفلت، حرص، آرام طلبی، خیانت اور خود نمائی کی وجہ سے زنگ لگ جانا مراد ہے۔ جب اللہ تعالیٰ سچی توبہ کے ذریعے اس زنگ کو دور کر دیتا ہے۔ تو یہ تالے کھل جاتے ہیں، اور قلوب پردۂ غیب سے پانے والے اسرار و حقائق اور جملہ فوائد سے معمور ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ لوگ اپنی زبان جو ان حقائق کی ترجمانی ہوتی ہے کے ذریعے انھیں سالکین و طالبین کے گوش گزار کرتے ہیں تو انھیں خاطر خواہ فائدہ پہنچتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا" (۱)

تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں۔ اور اگر وہ غیر خدا کے پاس سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے۔

مذکورہ آیت مبارکہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں غور و فکر کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی جانب سے ہوتا ہے تو اس میں لوگوں کو بہت اختلاف ملتا۔

اور فرمایا:

"وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ" (۲)

اور جب ان کے پاس کوئی بات اطمینان یا ڈر کی آتی ہے تو اس کا چرچا کر بیٹھتے ہیں اور اگر اس رسول اور اپنے ذی اختیار لوگوں کی طرف رجوع لاتے تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے یہ بعد میں کاوش کرتے ہیں۔

آیت کریمہ میں منہم کی ضمیر کا مفہوم اہل علم ہے اور صوفیہ کہتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد اہل علم ہیں۔ گویا اہل علم اور ان میں سے اہل استنباط کی خصوصیت بیان کی گئی ہے۔

---

(۱) النساء: ۸۲ (۲) النساء: ۸۳

ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا : یا رسول اللہ! مجھے علم غرائب سکھائیں۔ آپ نے فرمایا: پہلے علم پر کہاں تک عمل کیا ہے ؟ اولاً اسے محکم کرو پھر آنا اور علم غرائب بھی سیکھ لینا۔

ہر دور میں مختلف علاقوں کے علماء و فقہاء کے قرآن و سنت سے متعلق ان کے مشہور و معروف مستنبطات ہوتے ہیں۔ اور ان میں ان کے ہاں باہمی اختلافات اور دلائل بھی جاری رہتے ہیں۔ جیسا کہ ان میں سے کسی نے کہا کہ حدیث انما الاعمال بالنیات اور ولکل امرءٍ ما نوی فمن کان ہجرتہ الی اللہ و رسولہ۔ الخ میں علم کے تئیس ابواب مذکور ہیں۔ اور یہ بات انھوں نے صرف طریق استنباط سے اخذ کی۔

مزید برآں اہل کلام اور علماء کے تمام عقلی استدلال مستنبطات ہی ہیں۔ اور یہ بہتر ہیں بشرطیکہ ان سے باطل کی تردید اور حق کی تائید مقصود ہو۔

اور بہترین مستنبطات وہ ہیں جو صوفیہ کرام اخذ کرتے ہیں۔

۲۶

علوم و احوالِ تصوّف سے متعلق صوفیہ کی تشریحات کا باہمی اختلاف

تجھے خدا فہم سے نوازے اور وہم کو تجھ سے دور فرمائے یہ ذہن نشین کرے کہ صاحبانِ احوال وارباب قلوب (صوفیہ) کے احوال، علوم اور حقائق کے مفاہیم سے متعلق، اپنے اپنے مستنبطات ہیں۔ انھوں نے قرآن کے ظاہری متن سے بھی لطیف و پراسرار نکات نکالے ہیں، جن کا ذکر ہم عنقریب کریں گے۔ ان کے ہاں بھی مستنبطات میں اختلاف پایا جاتا ہے جیسا کہ اہلِ ظاہر کے ہاں موجود ہوتا ہے لیکن اہلِ ظاہر کا اختلاف غلطی و سہو کی جانب رہنمائی کر سکتا ہے جب کہ اہلِ باطن (صوفیہ کرام) کا اختلاف ایسے نتیجے سے دور ہی رہتا ہے کیونکہ یہ اختلاف فضائل، محاسن، مکارم، احوال، اخلاق، مقامات اور درجات پر مبنی ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ علماء کا اختلاف رحمت ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ علمائے ظاہر کے ہاں اختلاف من جانب اللہ رحمت ہوتا ہے کیونکہ جو درست بات پر ہوتا ہے وہ غلطی کرنے والے کی تردید کرتا ہے۔ اور لوگوں کے لیے خطا کرنے والے کی خطا کو واضح کرتا ہے۔ تاکہ وہ دین میں غلطی کرنے سے بچے رہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ لوگ ہلاکت کا شکار ہو کر دین سے جاتے رہیں۔

اہلِ حقائق کا اختلاف بھی اللہ کی طرف سے رحمت ہوتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے

وقت کے مطابق گفتگو کرتا ہے، اپنے حال کے مطابق جواب دیتا ہے، اپنے وجد کے مطابق اشارہ کرتا ہے۔ گویا ان کے اختلاف میں اہل طاعت، ارباب قلوب اور مریدین اور محققین کے لیے استفادے کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے درجات کے مطابق فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

ہم نے صوفیہ کے اختلاف کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی مزید وضاحت ذوالنون رحمہ اللہ کی اس حکایت سے ہوتی ہے کہ ان سے فقیر صادق کے بارے میں سوال کیا گیا۔ تو کہنے لگے: فقیر صادق وہ ہوتا ہے جو خود کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ سب چیزیں اس سے اطمینان پاتی ہیں۔

ابوعبداللہ سے فقیر صادق کی تعریف پوچھی گئی تو کہا: فقیر وہ ہے کہ ہر چیز اس کی ملکیت میں ہو مگر وہ کسی چیز کی ملکیت نہ ہو سکے۔

ابو الحارث اَوْلاسی نے فقیر صادق کے بارے میں کہا، فقیر صادق خود کسی شے سے انس نہیں رکھتا مگر جملہ اشیا اس سے انس رکھتی ہیں۔

یوسف بن الحسین کہتے ہیں: فقیر صادق اپنے وقت[1] کا احترام کرے اور اس کو ترجیح دے جس نے اپنے وقت سے دوسرے وقت کی طرف توجہ کی اس پر فقیر صادق کا نام صادق نہیں آتا۔

حسین بن منصور نے کہا: فقیر صادق کے سامنے اگر اسباب پیش ہوں تو کامل رضا سے انہیں اختیار نہیں کرتا۔

شیخ نوری کہتے ہیں: کہ اسباب کے ذریعے اگر کوئی مصیبت وغیرہ فقیر صادق پر آن پڑے تو اس کے لیے وہ خدا سے کوئی شکوہ نہیں کرتا بلکہ ہر حالت میں اس کی جانب سے مطمئن رہتا ہے۔

سمنون علیہ الرحمہ کہتے ہیں: فقیر صادق مفقود سے انس کرتا ہے جب کہ جاہل موجود سے شغف رکھتا ہے، اور وہ موجود سے نفرت کرتا ہے جب کہ جاہل مفقود سے نفرت کرتا ہے۔

ابوحفص نیشاپوری نے کہا: فقیر صادق ہر وقت اپنی کیفیات کی دنیا میں مگن ہوتا ہے۔ اور جو اس کی دنیا میں خلل انداز ہو وہ اسے اپنی دنیا سے نکال کر اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

---

(۱) وقت: تصوف میں وقت سے مراد وہ حالت ہے جو سالک پر طاری ہو۔ گویا اس کا تعلق حال سے ہے اگر سالک اپنے حال سے ہٹ جائے اور کسی دوسرے وقت یعنی ماضی وغیرہ کی طرف متوجہ ہو جائے تو اس سے اس کے مراتب میں نزول واقع ہو جاتا ہے۔ (مترجم)

جنید بغدادی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ فقیر صادق کسی شے سے غنا طلب نہیں کرتا بلکہ ہر شے اس سے غنا طلب کرتی ہے۔

مرتعش نیشاپوری علیہ الرحمہ کہتے ہیں ، فقیر صادق کو مصائب و آلام روزگار ستاتے ہیں مگر اسے ان کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔

الغرض صوفیہ کرام کے مفہومات میں ان کے احوال و مراتب کے لحاظ سے فرق بھی پایا جاتا ہے اور سالکین اپنے اپنے مقام و مرتبے کے مطابق ان سے مستفید ہوتے ہیں۔

۲۷

خصائصِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی روشنی میں

جہاں تک قرآنِ کریم سے صوفیہ کے اخذ کردہ مفہومات یا مستنبطات کا تعلق ہے تو ان میں سے کچھ تو ہم صوفیہ کے اتباعِ قرآن سے متعلق باب میں بیان کر آئے ہیں۔ یہاں اس باب میں ہم نے ان مفہومات کا ذکر کرنا ہے جن کا تعلق آپ کے شرف اور دیگر انبیاء پر آپ کی فضیلت سے ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" (۱)

تم فرماؤ یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جو میرے قدموں پر چلیں دل کی آنکھیں رکھتے ہیں۔ اور اللہ کو پاکی ہے اور میں شریک کرنے والا نہیں۔

ابوبکر واسطی کہتے ہیں کہ ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ کا معنی یہ ہے کہ میں اپنی ذات کو درمیان میں نہیں لاتا بلکہ انہیں اپنے دلائل کی طرف بلاتا ہوں۔ اور ایک دوسرا معنی علی بصیرۃ کا یہ ہے کہ مجھے یقین ہے کہ یہ بصیرت میرے لیے ہدایت سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ فقط مجھ سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک اور مفہوم علی بصیرۃ کا یہ ہے کہ نفع و نقصان میرے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان دونوں کا تعلق اللہ سے ہے، وہ چاہے تو ان میں سے کوئی بھی بندے کو پہنچا سکتا ہے۔ اور اللہ کے ارشاد انا ومن اتبعنی کا معنی یہ ہے کہ جس نے اس بصیرت پر میرا اتباع کیا اور سبحان اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ جس چیز کو بھی اہم جانیں

---

(۱) یوسف : ۱۰۸

یا جو بھی ارادہ کریں اس کا تعلق اللہ کی ذات پاک سے ہو۔ اور وما انا من المشرکین کی تفسیر یہ ہے یعنی میں مشرکوں میں سے نہیں کہ لوگوں کے لیے ہدایت کو اپنی طرف سے خیال کروں یا فقط اپنی طرف سے اس کی جانب دعوت دینے کے ذریعے اس کی جانب سے ہدایت ملنے کا خیال بھی کروں۔

اور فرمایا:

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (۱)	تم فرماؤ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔ اور اپنے منہ سیدھے کرو ہر نماز کے وقت اور اس کی عبادت کرو نرے اس کے بندے ہو کر جیسے اس نے تمھارا آغاز کیا ویسے ہی پلٹو گے۔

صوفیہ کے نزدیک اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ اے نبی! کہہ دو کہ میرے رب نے میرے اور خلق کے معاملے میں اور اللہ اور میرے معاملے میں انصاف کے ساتھ حکم دیا۔

اور واقیموا وجوھکم عند کل مسجد کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے منہ کو سیدھا کرو ہر سیدھے راستے کا ارادہ کرتے وقت۔ وادعوہ مخلصین لہ الدین یعنی اسے ریاکاری و غرور کے بغیر پکارو۔ اور اپنے اس عمل پر نازاں بھی نہ ہو جانا۔ کما بدأکم تعودون یعنی جس طرح پہلے اس نے تمھیں پیدا کیا تو اسی طرح تم نتائج تک بھی پہنچ جاؤ گے۔ اور فرمایا:

"سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ" (۲)	ابھی ہم انھیں دکھائیں گے اپنی آیتیں دنیا بھر میں اور خود ان کے آپے میں یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ بے شک وہ حق ہے۔

مذکورہ آیت کی تشریح میں صوفیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عنقریب ہم عالم ملکوت میں انھیں اپنی صفات دکھائیں گے۔ حتیٰ کہ ان لوگوں پر جن کے لیے ہم وضاحت کرتے ہیں یہ حقیقت

---

(۱) الاعراف: ۲۹ (۲) حٰم السجدہ: ۵۳

آشکار ہو جائے گی کہ وہ حق ہے اور اس کے سوا سب باطل۔ اسی ضمن میں سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عربوں نے سب سے بڑھ کر جو سچ بات کہی ہے وہ لبید کا یہ مصرع ہے ؎

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہِ بَاطِلٌ

جان لو کہ اللہ کے سوا سب کچھ باطل ہے۔

خصوصیاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

محمد عربی علیہ التحیۃ والسلام کی ذاتِ اقدس سے متعلق چند خصوصیات جو صوفیہ بیان کرتے چلے آئے ہیں پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ والصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور شرح صدر کی درخواست کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ أَمْرِیْ" (۱) — اے میرے رب میرے لیے میرا سینہ کھول دے اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے۔

جب کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر درخواست کے انشراح صدر کی نوید سنائی گئی قرآن گویا ہے:

"اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ" (۲) — کیا ہم نے تمھارا سینہ کشادہ نہ کیا۔

اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہِ ایزدی میں التجا کی:

"وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ" (۳) — اور مجھے رسوا نہ کرنا جس دن سب اٹھائے جائیں گے۔

مگر اللہ نے حبیب کو خلیل پر فضیلت عطا کی اور ان کے سوال کئے بغیر ہی فرمایا:

یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَ — جس دن اللہ رسوا نہ کرے گا نبی اور ان کے

---

(۱) طٰہٰ: ۲۵-۲۶ ۲۰ (۲) الانشراح: ۱ ۹۴

(۳) الشعراء: ۸۷

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ "(۱)	ساتھ کے ایمان والوں کو ۔

اور آپ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

"اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا "(۲)	کیا ہم نے تمھارا سینہ کشادہ نہ کیا اور تم پر سے تمھارا بوجھ اتار لیا جس نے تمھاری پیٹھ توڑی تھی اور ہم نے تمھارے لیے تمھارا ذکر بلند کر دیا ۔ بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہے ۔

اندازِ خطاب

اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جملہ مخلوق کو اپنی جانب راہ دکھاتے ہوئے عالمِ ملکوت اور دیگر چیزوں کے ساتھ خطاب کیا ہے جیسا کہ فرمایا :

"وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "(۳)	اور اسی طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے ہیں ساری بادشاہی زمینوں اور آسمانوں کی ۔

اور فرمایا :

"اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ "(۴)	کیا انھوں نے نگاہ نہ کی آسمانوں اور زمین کی سلطنت میں اور جو چیز اللہ نے بنائی ۔

اور فرمایا :

"اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ "(۵)	کیا انھوں نے اپنے جی میں نہ سوچا ۔

اور فرمایا :

---

(۱) التحریم : ۸
(۲) الانشراح : ۱ - ۵
(۳) الانعام : ۷۵
(۴) الاعراف : ۱۸۵
(۵) الروم : ۸

آفَلَا یَنظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ"(۱) — تو کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کیسا بنایا گیا۔

لیکن جہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا تو براہِ راست انہی کے ذکر سے خطاب کو شروع کیا۔

جیسا کہ فرمایا:

"اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ"(۲) — اے محبوب کیا تم نے اپنے رب کو نہ دیکھا کہ کیسا پھیلایا سایہ۔

حبیب و خلیل

قولِ باری تعالیٰ ہے:

وَ اتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلًا"(۳) — اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا گہرا دوست بنایا۔

اس آیت کی تفسیر میں صوفیہ کہتے ہیں کہ خلیل، خُلّت سے ماخوذ ہے اور خُلّت کا معنی ہے وہ چیز جو دل کو چھیڑے اور اس میں سوراخ کرے جب کہ محبت کا مطلب ہے ایسی شے جو دل کے وسط میں جگہ کرے اور دل کے سوا دل میں جو کچھ ہو اُسے مٹا دے یہیں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حبیب کو خلیل پر کس قدر فضیلت حاصل ہے۔

خلیل سے یوں خطاب فرمایا:

"اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ"(۴) — کیجئے جس بات کا آپ کو حکم ہوتا ہے۔

اور حبیب سے خطاب ہوا تو یوں:

"وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی"(۵) — اور بے شک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے

---

(۱) الغاشیۃ : ۱۷ ۸۸ (۲) الفرقان : ۴۵ ۲۵

(۳) النساء : ۱۲۵ ۴ (۴) الصّٰفّٰت : ۱۰۲ ۳۷

(۵) الضحیٰ : ۵ ۹۳

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کا ذکر فرمایا تو اس طرح:

"وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی" (۱)	اور آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی تو جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ نہ پائی۔

گویا ان کی خطا کا ذکر ان کی توبہ سے پہلے کیا اور پھر فرمایا:

"ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰی" (۲)	پھر اسے اس کے رب نے چن لیا تو اس پر اپنی رحمت سے رجوع فرمائی اور اپنے قرب خاص کی راہ دکھائی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی خطا کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

"فَغَفَرْنَا لَهٗ" (۳)	تو ہم نے اسے معاف کر دیا۔

اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

"وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰی كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ" (۴)	اور بے شک ہم نے سلیمان کو جانچا اور اس کے تخت پر ایک بے جان بدن ڈال دیا، پھر رجوع لایا عرض کی اے میرے رب مجھے بخش دے۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

"عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ" (۵)	اللہ تمھیں معاف کرے تم نے انھیں کیوں اذن دے دیا۔

اور معاف کرنے کا ذکر عتاب سے پہلے کیا تاکہ کہیں ذکرِ عتاب آپ پر ناگوار نہ گذرے اور

---

(۱) طٰہٰ : ۱۲۱ ۲۰ (۲) طٰہٰ : ۱۲۲
(۳) صٓ : ۲۵ ۳۸ (۴) صٓ : ۳۴-۳۵
(۵) التوبۃ : ۴۳ ۹

ایک جگہ آپ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ"(۱)

تاکہ اللہ تمھارے سبب سے گناہ بخشے۔ تمھارے اگلوں کے اور تمھارے پچھلوں کے۔

مذکورہ آیت میں بخش دینے کا ذکر گناہ سے پہلے کیا۔ اور گناہ کو گناہ کے ارتکاب سے پہلے ہی معاف فرما دیا مزید فضیلت یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر انبیاء کرام کی طرح تمام معجزات عطا کرنے کے بعد کئی اور معجزے بھی عطا فرمائے مثلاً شق القمر، انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہونا اور معجزۂ معراج۔ پھر مزید یہ کہ دیگر انبیاء کرام کو جو کچھ عطا ہوا اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کو خلّت یعنی دوستی، موسیٰ علیہ السلام کو کلام اور سلیمان علیہ السلام کو حکومت اور ایوب علیہ السلام کو صبر سے مختص فرمایا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ مجد و شرف عطا فرمایا اسے ان کی طرف منسوب کہیں بھی نہیں فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آپ کی زندگی کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا:

"لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ"(۲)

اے محبوب تمھاری جان کی قسم بے شک وہ اپنے نشہ میں بھٹک رہے ہیں۔

اور فرمایا:

"فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ"(۳)

تو اے محبوب تمھارے رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہوں گے جب تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمھیں حاکم نہ بنائیں۔

اور فرمایا:

"إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ"(۴)

وہ جو تمھاری بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔

---

(۱) الفتح : ۲ ، ۴۸ (۲) الحجر : ۷۲ ، ۱۵

(۳) النساء : ۶۵ ، ۴ (۴) الفتح : ۱۰ ، ۴۸

اور فرمایا:

"فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى"(۱)

تو تم نے انہیں قتل نہ کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا۔ اور اے محبوب وہ خاک جو تم نے پھینکی۔ تم نے نہ پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس انداز سے تربیت فرمائی تھی کہ آپ پکار اٹھے: اے اللہ! میں حملہ نہیں کرتا بلکہ تو کرتا ہے۔ میں میدان جنگ میں حرکت نہیں کرتا بلکہ تو کرتا ہے۔ اور میں ارادہ نہیں کرتا بلکہ تو کرتا ہے۔

فرمایا:

"لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا"(۲)

اے سننے والے اگر تو انہیں جھانک کر دیکھے تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگے اور ان سے ہیبت میں بھر جائے۔

اس آیت کی تفسیر میں ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر تو ہمارے سوا کسی بھی چیز کو اوپر سے جھانک کر دیکھے تو اسے چھوڑ کر تم ہماری طرف ڈور کر لوٹ آؤ گے۔

معراج جسمانی

فرمایا:

"سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ"(۳)

پاکی ہے اسے جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرداگرد ہم نے برکت رکھی۔

اس آیت کی تفسیر میں صوفیہ کرام کہتے ہیں کہ اگر مذکورہ آیت میں معراج سے معراج روحانی مراد

---

(۱) الانفال: ۱۷ ۸ (۲) الکہف: ۱۸ ۱۴

(۳) بنی اسرائیل: ۱ ۱۷

ہوتی جیسا کہ مخالفین کہتے ہیں تو یہاں کبھی عبد کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا کیونکہ عبد کا اطلاق روح اور جسم دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا" (۱) — اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔

اس آیت کی تشریح میں صوفیہ کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتا ہے کہ میں نے تجھ پر اس لحاظ سے بہت بڑا فضل کیا ہے کہ تجھے چن لیا کیونکہ نبوت و رسالت عبادات و ریاضات کی بنیاد پر بطور استحقاق کے نہیں ملتی اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہمارے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی دیگر انبیاء علیہم السلام پر فضیلت عطا نہ فرماتا کیونکہ اس طرح تو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی عمریں آپ کی عمر سے طویل تھیں اور اس لحاظ سے ان کی عبادات بھی آپ سے بڑھ کر تھیں لہٰذا فضیلت بھی ان کو ملتی اللہ نے آپ کو مکمل اور مخصوص اندازِ تخاطب سے یوں خطاب فرمایا:

"وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا" (۲) — اور اے محبوب! تم اپنے رب کے حکم پر ٹھہرے رہو کہ بے شک تم ہماری نگہداشت میں ہو۔

اور آپ کے علاوہ دوسروں سے یوں خطاب فرمایا:

"اَصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا" (۳) — صبر کرو اور صبر میں دشمنوں سے آگے رہو۔

اور فرمایا:

"اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (۴) — صابروں ہی کو ان کا ثواب بھرپور دیا جائے بے گنتی۔

---

(۱) النساء: ۱۱۳ ۴ — (۲) الطور: ۴۸ ۵۲

(۳) آل عمران: ۲۰۰ ۳ — (۴) الزمر: ۱۰ ۳۹

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صبر بالمراقبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ [1] اور اے محبوب تم صبر کرو اور تمھارا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے ۔

یہاں آپ کے لیے صبر کی جزا کا ذکر تک نہیں کیا کیونکہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اس قدر خاص ہے کہ آپ کے ساتھ معاوضہ وغیرہ کی بات ہی نہیں فرمائی ۔

---

(۱) النحل ۱۲۷ : ۱۶

۲۰۸

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خصائص

احادیث کی روشنی میں

اس باب میں صوفیہ کے ان مستنبطات و مفہومات کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا تعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص سے ہے۔ ایک حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے کی حالت میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

"تیری ناراضگی سے تیری رضا میں پناہ ڈھونڈتا ہوں اور تیری سزا سے تیری صفتِ عفو میں پناہ تلاش کرتا ہوں اور تجھ سے تیری ہی پناہ طلب کرتا ہوں۔ میں ویسی ثنا ہرگز نہیں کرسکتا جیسا کہ تو خود اپنی ثنا کا حق ادا کرسکتا ہے"۔

اہل معرفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سجدہ اس آیت کا مصداق ہے۔

"وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ"(۱) اور سجدہ کرو اور ہم سے قریب ہو جاؤ۔

چونکہ وہ قرب حاصل کرچکے اسی لیے انھوں نے اللہ کی صفات سے اس کی دیگر صفات کی پناہ مانگی پھر ان پر قرب کا ایک اور معنی کھلا تو فرمایا: "اللھم اعوذبك منك" (اے اللہ میں تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں)، اور قرب کی ایک اور منزل پائی تو پناہ مانگنے کی کیفیت بھی ختم ہوگئی اور فرمایا: "لا احصی ثناء علیك" (میں تیری ثنا کا احاطہ نہیں کرسکتا)۔ پس وہ محل قرب میں پناہ مانگنے سے مرعوب ہوگئے تو ثنا کی طرف پناہ لی اور جو بندہ پناہ بھی نہ مانگ سکے جو کہ عبودیت کی حد ہے۔

---

(۱) العلق: ۱۹

وہ ثنار الٰہی کیسے ادا کر سکتا ہے جو کہ اللہ کی صفت ہے۔ اسی لیے آپ نے فرمایا "لا احصی ثناء علیك" پھر جب انتہائی قرب کے عالم میں ثنا سے بھی گھبرا اُٹھے تو یہ جان کر خود کو ثنا کے دائرے سے بھی خارج کر لیا کہ خلق سے پہلے اللہ نے خود اپنی ثنا کی تھی اور خلق کی حمد بیان کرنے سے پہلے خود اپنی حمد بیان کی تھی، اور اپنی وحدانیت پر خلق کی گواہی سے پہلے خود ہی شاہد بنا تھا۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انت کما اثنیت علی نفسك" اور یہ آپ کا وہ مقام ہے جہاں نہایت تجرید و تقریب کی حقیقت سامنے آجاتی ہے اور بندہ ہر شے کی ایسی نفی کرتا ہے کہ خود جیسے تھا ہی نہیں اور اللہ ہی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا حدیث میں جس حقیقت کی جانب اشارہ فرمایا ہے اگر تمام واجدین، عارفین اور توحید کے متحققین کے جملہ اشارات کو جمع کر لیا جائے تو بھی اس حقیقت کا عشر عشیر سامنے نہیں آسکتا جسے آپ نے ایک اشارے سے واضح فرما دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول: "اگر تمھیں وہ کچھ معلوم ہو جائے جس کا مجھے علم ہے تو روؤ زیادہ اور ہنسو کم۔ بلکہ تم پہاڑیوں کی جانب نکل جاؤ اور بچھونوں پر آرام نہ کر سکو۔"

کہتے ہیں کہ اگر وہ علم جو آپ جانتے تھے اور بتاتے نہ تھے، آپ پر نازل کئے گئے علوم میں سے ہوتا اور اس کے پہنچانے کا حکم آپ کو ہوتا تو آپ ضرور اسے لوگوں تک پہنچاتے۔ اور آپ نے لو تعلمون اس لیے فرمایا کہ لوگ اسے نہیں جانتے تھے۔ اور چونکہ اس علم کا تعلق عام رائج علوم سے نہیں تھا۔ اس لیے امت میں سے کسی نے آپ سے سکھانے کا مطالبہ نہیں کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قدر حقائق علوم اللہ نے ودیعت کئے اگر پہاڑوں پر رکھے جاتے تو وہ پگھل جاتے۔ مگر آپ ان علوم میں سے اسی قدر لوگوں کو سکھاتے تھے جس قدر انھیں ان کی ضرورت ہوتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"[1] تو جان لو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔

---

(۱) محمد: ۱۹ ۴۷

اور فرمایا:

"وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا"(۱) اور عرض کرو کہ اے میرے رب مجھے علم زیادہ دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "و تعلمون ما اعلم" سے یہ بات واضح کی کہ میں تم میں سے اللہ کو بہت زیادہ جانتا ہوں۔

آپ کا ایک قول ہے: "میں تم میں سے کسی کی طرح نہیں، میں اپنے رب کے پاس رہتا ہوں وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔"

اس حدیث میں جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اس کو سمجھنے کی کسی کی عقل و فہم کو طاقت نہیں۔ اور یہ کسی کے بس میں نہیں کہ وہ بتا سکے کہ اللہ نے آپ کو کیا کھلایا اور پلایا اور یہ سب معاملہ کیا ہے، کیونکہ آپ نے اس سلسلے میں کچھ وضاحت نہیں فرمائی۔

آپ کی ایک دعا ہے: اے میرے رب! بچے کی طرح میری کفالت کر۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے سے جدا نہ کر۔ اور تیرے سوا میرا کوئی ٹھکانہ اور کوئی نجات کی جگہ نہیں۔

مذکورہ دعا میں آپ نے سچے دل سے پناہ چاہی ہے۔ اور اللہ کے حضور عاجزی کا اظہار کیا ہے اور اپنی ذات اور اس کے متعلقات کو یکسر ایک جانب چھوڑ دیا ہے۔

ابوبکر واسطی کا قول ہے: صدق دل سے اللہ کی پناہ مانگنے، اظہارِ فقر، اور پورے خلوص و توجہ سے اپنی محتاجی ظاہر کرنے سے باطن آراستہ ہوتا ہے۔

دنیا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر اختیار کرنے کے وقت آپ کے قول (ہائے میرے دکھ) کی وضاحت میں صوفیہ نے کہا: کہ آپ نے غم و دکھ کی صدا اس لیے بلند کی کہ موت کے وقت آپ کو جو مقامات و مراتبِ بلند دکھائے گئے اور جن تک آپ پہنچنے ہی والے تھے۔ تو ایسے میں آپ کو ان سے تھوڑی دیر کی جدائی میں بھی دکھ محسوس ہو رہا تھا اور ایسا دکھ لازماً شوقِ لقا میں پیش آیا کرتا ہے۔

---

(۱) طٰہٰ: ۱۱۴

میں نے محمد بن داؤد دینوری سے اور انھوں نے جریری کو یہ کہتے سنا کہ حضرت جنید علیہ الرحمہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول "میں اولادِ آدم کا سردار ہوں مگر مجھے اس پر کوئی فخر نہیں" کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا: کہو تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟ میں نے جواباً کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ نے یہ فرمایا کہ یہ فضیلت تو میرے رب کی عطا ہے اور مجھے عطا پر کوئی فخر نہیں کیونکہ مجھے اپنے عطا کرنے والے پر فخر ہے۔ یہ سن کر جنید علیہ الرحمہ نے کہا:

اے ابا محمد! تو نے بہترین تشریح بیان کی۔

جنید علیہ الرحمہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زوجۂ زید (جو آپ کا متبنیٰ تھا) یعنی زینب سے نکاح کرنے کی وضاحت اور اس میں پوشیدہ حکمت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: حضرت زید کو ابن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پکارا جاتا تھا جب کہ وہ آپ کے منہ بولے بیٹے تھے حقیقی بیٹے نہ تھے اسی لیے اللہ نے چاہا کہ آپ زید کی منکوحہ سے نکاح کر لیں تاکہ متبنیٰ اور حقیقی بیٹے میں فرق واضح ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اللہ سے بخشش طلب کرو اور اس کے حضور توبہ کرو کیونکہ میں ہر روز سو مرتبہ اس کی بخشش طلب کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں" اس قول کا مفہوم واضح کرتے ہوئے صوفیہ کہتے ہیں کہ آپ اس لیے توبہ و بخشش کی طرف مائل رہتے تھے کہ آپ ہر سانس کے ساتھ ایک اعلیٰ مقام پر فائز ہو جاتے تھے۔ اسی لیے جب ان کی اگلی سانس کی کیفیت گذشتہ سانس سے برتر ہوتی تھی اور قرب کی ایک اور سیڑھی طے کر لیتے تھے تو وہ پچھلی سانس کی حالت سے اللہ کی بخشش طلب کرتے اور توبہ کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے بھائی عیسیٰ علیہ السلام پر اللہ رحمت فرمائے اگر ان کا یقین بڑھ جاتا تو وہ ہوا پر اڑتے۔"

جنید علیہ الرحمہ کہتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ علیہ السلام کے مقام کی خبر دی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنے یقین کے بل بوتے پر پانی پر چلتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یقین چونکہ ان کے یقین سے بڑھ کر تھا اسی لیے وہ معراج کی رات ہوا پر چلے۔ آپ نے یہ خبر دی

ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کا یقین بھی میرے یقین کی طرح زیادہ ہوتا تو انھیں بھی ہوا پر چلنے کی قوت عطا کی جاتی۔

میں (شیخ ابونصر) نے حصری علیہ الرحمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول: "مجھے اللہ کے ہاں ایک ایسا وقت بھی حاصل ہے جس میں میرے ساتھ سوائے اس کے کوئی شریک نہیں ہوتا" کی یہ وضاحت کرتے ہوئے سنا کہ چاہے یہ صحیح ہو یا غلط کہ آپ نے ہی یہ بات کی۔ پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ آپ کے جملہ اوقات میں کیفیت ایسی ہی رہتی تھی کہ ان کے ساتھ سوائے اللہ کے کوئی اور شریک نہ ہوتا۔ ہاں جس وقت انھیں خلق کو سکھانے اور تربیت دینے کا امر کیا جاتا تو وہ ایسی حالت میں لوٹ آتے کہ ان کی صفات پر احکام کی عملی کیفیت جاری کر دی جاتی تاکہ لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ پھر جب ان کی صفات پر انوار باطن کی تجلی ہوتی تو وہ خلق سے جدا ہو کر خالق سے جا ملتے۔ جیسا کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ایک رات کو اچانک بیدار ہوئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر اطہر میں موجود نہیں ہیں انھیں ڈھونڈنے اٹھ کھڑی ہوئی تو میرے ہاتھ ان کے پاؤں پر جا پڑے، جب کہ وہ سجدے میں محو تھے میں نے اس وقت آپ کو یہ دعا پڑھتے سنا: "اللھم اعوذ برضالت عن سخطك الخ" یہی وہ وقت ہوتا تھا جب کہ آپ خلق سے کٹ کر اپنے رب کے قریب ہوتے اور ایسے میں آپ کے رب کے سوا کوئی اور نہ ہوتا تھا۔

احادیث نبوی اور صوفیہ کے اخذ کردہ مفہومات

ابوالحسن احمد بن محمد بن سالم سے بصرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بارے میں سوال کیا گیا: "سب سے پاکیزہ اور اچھی خوراک وہ ہے جو بندہ اپنے ہاتھوں سے کما لائے" سائل نے پوچھا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم کمانے کے غلام بن کر رہ جائیں گے، آپ نے جواب دیا: "کمانا سنت رسول ہے۔ اور توکل رسول اللہ کا حال ہے۔ آپ نے امت کے لیے کسب کو اس لیے سنت ٹھہرایا کہ وہ ان کی کمزوری سے واقف تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ توکل جو کہ آپ کا حال ہے اگر اس سے لوگ عاجز ہوں اور وہ اس مقام و مرتبے سے گر جائیں جو آپ کو توکل میں حاصل تھا تو انھیں کسب تھام لے جو کہ آپ کی سنت ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہوتی تو وہ ہلاکت کا شکار ہو جاتے۔

مذکورہ بالا حدیث کی ایک شرح یہ بھی کی گئی ہے کہ اگر بندہ اپنے رب کے حضور دعا کے لیے

ہاتھ اٹھائے اور وہ اس کی دعا کو قبول فرمائے تو یہی اس کے لیے ہاتھ کی کمائی (کسب) ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے "میرا رزق میری تلوار کے سائے تلے مقرر ہے" اس قول کی تشریح میں شبلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں، کہ آپ کی تلوار سے مراد آپ کا اللہ پر توکل ہے۔ اور جو ذو الفقار ہے وہ لوہے کا وہ ٹکڑا ہے جسے تلوار کہتے ہیں۔ اسی ضمن میں دیگر کئی مستنبطاتِ صوفیہ بھی ہیں مگر طوالت کے پیش نظر انہیں قلم انداز کیا جاتا ہے۔

ارشادِ رسالت مآب ہے: "اگر تم اللہ کامل توکل رکھو تو وہ تمہیں ایسے غذا پہنچائے جس طرح پرندے کو عطا فرماتا ہے کہ صبح خالی پیٹ اڑ جاتا ہے اور شام ڈھلے سیر ہو کر واپس آجاتا ہے"، اس قول پر کسی نے جناب جنید بغدادی سے سوال کیا کہ: پرندہ بھی تو اڑتا، حرکت کرتا اور طلب رزق میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے اس میں بغیر کوشش کئے بیٹھے بٹھائے رزق ملنے کی تو کوئی صورت نہیں۔ جواباً حضرت جنید نے فرمایا، اللہ کا ارشاد ہے:

"انا جعلنا ما علی الارض زینۃ"[۱] بے شک ہم نے زمین کا سنگار کیا جو کچھ اس پر ہے۔

لہٰذا پرندوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑ کر جانا اور نقل مکانی کرنا فقط اس زینتِ دنیا کی خاطر ہے جس کا ذکر اللہ نے گذشتہ آیت میں فرمایا ہے۔ گویا ان کا اڑنا اور حرکت کرنا، اس زمین کی زینت و آرائش کے لیے ہے نہ کہ طلبِ رزق کے لیے۔

عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اقوال نقل کر کے ان کی تفسیر بیان کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے فرمایا: اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تو اسے نہ دیکھے تو یہ سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کے سوال: احسان کیا ہے؟ کے جواب میں بھی وہی قول دہرایا جو آپ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا تھا۔

---

(۱) الکہف: ۷

عمرو بن عثمان مکی کہتے ہیں ، کہ گویا تو اسے دیکھتا ہے" کا مفہوم یہ ہے کہ تو اسے اس طرح دیکھتا ہے جیسے رؤیت اور یقین کے درمیان کوئی چیز ۔ آپ نے اس دیکھنے کی کیفیت کو نہ تو عیاں کیا ہے اور نہ ہی خالصتاً یقین ٹھہرایا ہے ۔ بلکہ ایک مثال دے کر آپ نے ایسی وضاحت فرمائی جو حقائق ایمان کی آخری حد کی نشاندہی کرتی ہے ۔ اور یہی وہ مقام و کیفیت ہے جس کا مطالبہ آپ نے حارثہؓ سے کیا تھا بشرطیکہ حارثہ والی خبر صحیح ہو ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ولی اللہ کی فطرت میں سخاوت اور حسن اخلاق کی خوبی ودیعت ہوتی ہے "

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے ابوبکر واسطی کہتے ہیں : ولی اللہ کی سخاوت یہ ہے کہ اپنا قلب و نفس اللہ کو ہبہ کر دے اور حسن خلق یہ ہے کہ ولی اللہ اللہ کی مختلف تدبیروں پر اپنی طبیعت کو خم کر دے ۔

شبلی علیہ الرحمہ سے حدیث : "جب نفس اپنے لیے روزینہ اکٹھا کر لے تو مطمئن ہو جاتا ہے" کی تشریح پوچھی گئی تو فرمایا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب نفس کو روزینہ دینے والے کا علم ہو جائے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے ۔

جیسا کہ اللہ نے فرمایا :

"وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا"[1] اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔

قول نبوی ہے "کسی شے سے تیری محبت تجھے اندھا بہرا کر دے گی" اس کی تشریح میں جنید بغدادی کہتے ہیں کہ دنیا سے تیری محبت آخرت کے بارے میں اندھا بہرا کر دے گی ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : "جب تم اہل غم کو دیکھو تو اللہ سے عافیت کی دعا کرو"

شبلی علیہ الرحمہ کہتے ہیں ، اہل غم سے مراد اہل غفلت ہیں ۔

ایک اور قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے : "جس قلب پر دنیا کی حکمرانی ہو ۔ وہ حلاوت

---

(۱) النساء : ۸۵ ؟

آخرت سے محروم رہے گا۔"شبلی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجا فرمایا۔ اور اس کی تشریح میں اس طرح کرتا ہوں کہ جس قلب پر آخرت کی حکمرانی ہو وہ حلاوت توحید سے محروم رہتا ہے۔

محمد بن فرغانی علیہ الرحمہ ابوجُحیفہؓ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد "اے ابا جحیفہؓ! سوال علماء سے کرو، دوستی دانش مندوں کی اپناؤ اور محفل بزرگوں کی اختیار کرو۔" کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: علماء سے حلال وحرام کے بارے میں پوچھو، دانشمندوں سے دوستی اختیار کرو جو اپنی دانش وبینش کی روشنی میں صدق وصفا اور اخلاص کے راستے پر چلتے ہیں اور بزرگانِ دین کے ساتھ بیٹھو جو ہمہ وقت اللہ ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ اور اسی کی ربوبیت کی طرف ہدایت کرتے ہیں اور اللہ کی قربت کے نور سے دیکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مومن وہ ہے جو اپنی نیکی سے خوش ہو اور اپنی بدی سے رنجیدہ"

اس کی تشریح میں سہل بن عبداللہ نے فرمایا: مومن کی نیکی سے مراد اللہ کی نعمتیں اور اس کا فضل وکرم ہے۔ جب کہ بدی سے مراد اس کا اپنا نفس ہے جو برائی میں پڑ جائے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "دنیا ملعون ہے جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے۔ سوائے اللہ کے ذکر کے"

اس کی تشریح سہل بن عبداللہؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں ذکر اللہ سے مراد حرام سے کنارہ کرنا ہے یعنی جب بھی حرام بندے کے سامنے ہو وہ ذکر اللہ میں مصروف ہو جائے اور یہ بات ذہن میں رکھے کہ اللہ اس سے باخبر ہے۔ اس طرح وہ ارتکاب حرام سے بچ جاتا ہے۔

یہ تھیں وہ تشریحات جن کا تعلق براہ راست صوفیہ کے قرآن وحدیث سے مستنبط نکات سے ہے اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ کیا قرآن وحدیث سے صوفیانہ استنباط کی کوئی اصل ملتی ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ہاں: جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کہ وہ اپنے اصحاب میں بیٹھے ہوئے تھے اور عبداللہ بن عمرؓ جو سب سے کم عمر تھے بھی موجود تھے: "کہ کون درخت انسان سے مشابہ ہے؟" ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ لوگ جنگل کے درختوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے مگر میرے دل میں یہ بات آئی کہ بے شک وہ درخت کھجور ہی کا ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جواب دیتے ہو

شرم دامن گیر ہوئی اور خاموش رہا یہاں تک کہ آپ نے خود ہی فرمادیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔ عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں میں نے اپنے والد عمرؓ سے کہا کہ میں حضورؐ کے سوال کے جواب میں "کھجور" کہنے والا ہی تھا اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "اگر تم یہ بات اس وقت کہہ دیتے تو میرے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ پسندیدہ ہوتی"۔
اس ساری بات سے ہمارا استدلال یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کم سن ابن عمر کے علاوہ کسی کا ذہن اس بات کی طرف نہیں گیا، اسی طرح ان معانی سے استنباط و استدلال قلوب پر فیضان الٰہی کے اپنے اصول کے مطابق ہوتا ہے۔

(۲۹) صحابۂ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین

ذکر و محاسنِ صحابہ

ارشاد خداوندی ہے :

"وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ	اور سب میں اگلے پہلے مہاجر و انصار اور
وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ	جو بھلائی کے ساتھ ان کے پیرو ہوئے
بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ	اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔
رَضُوْا عَنْهُ" (۱)	

آیت کے ظاہر سے تو سابقون کا اطلاق تمام صحابہ کرام پر ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ سے راضی ہیں مگر ایک اور آیت سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ یہی سابقین دراصل مقربین ہیں جیسا کہ فرمایا :

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ	اور جو سبقت لے گئے وہ سبقت ہی لے
الْمُقَرَّبُوْنَ " (۲)	گئے کہ یہی بارگاہ میں مقرب ہیں۔

مقربین کی خصوصیات اور وجہ تخصیص ہم صفحات گذشتہ میں بیان کر آئے ہیں۔

اور فرمایا :

"وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" (۳)	اور اللہ کی رضا سب سے بڑی ہے۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اکبر سے مراد اقدم یعنی بہت قدیم ہے گویا اللہ تعالیٰ نے رضی اللہ عنہم اپنے قدیم علم کی بنا پر کہا۔ اس طرح مفہوم یہ ہوا کہ اللہ نے چاہا کہ وہ اس سے رضا طلب کریں اور پھر انہیں راضی کر دیا حتیٰ کہ وہ راضی ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے صحابی ستارے ہیں ان میں سے تم نے جس کی پیروی کی تم نے ہدایت پالی" اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں نجوم (بڑے ستاروں) کی قسم کھائی ہے جن سے ان کی زیادہ روشنی کی وجہ سے بحر و بر میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نجوم سے تشبیہ دی ہے نہ کہ کواکب سے کیونکہ کواکب چھوٹے ستارے ہوتے ہیں جن سے رہنمائی

---

(۱) التوبۃ : ۱۰۰ (۲) الواقعہ : ۱۰ - ۱۱ (۳) التوبۃ : ۷۲

حاصل نہیں کی جا سکتی اور ہدایت کو پیروئ صحابہ سے جملہ ظاہر و باطنی معانی میں مشروط فرمایا ہے ۔ جہاں تک ظاہری معانی کا تعلق ہے ۔ تو وہ، حدود، احکام اور حلال و حرام میں علماء و فقہاء کے ہاں رائج ہیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے : میری امت پر سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ابوبکر صدیق رضؓ، سب سے زیادہ قوی عمر رضؓ، سب سے زیادہ باحیا عثمان رضؓ، سب سے بڑھ کر علم فرائض کا جاننے والا زید رضؓ، سب سے بڑھ کر حلال و حرام کا علم جاننے والا معاذ بن جبل رضؓ، سب سے بڑا قاری ابی بن کعب رضؓ، اور سب سے زیادہ انصاف کرنے والا علی رضؓ ہے جب کہ اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذر غفاری رضؓ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ۔

ہدایت کے پیروی صحابہ کے ساتھ مشروط ہونے کے باطنی مفاہیم کا آغاز ہم رسول اللہ کے اس قول سے کرتے ہیں جب انھوں نے فرمایا : "میرے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرنا" لہٰذا ہم بھی پہلے ابوبکر اور پھر عمر کے تذکرے سے ابتدا کرتے ہیں ۔

ابوعتبہ حلوانی کہتے ہیں : کیا میں تمھیں ان احوال سے مطلع نہ کروں جن پر صحابہ رسولؐ قائم تھے ۔

پہلا حال یہ تھا کہ وہ اللہ کے دیدار کو زندگی سے بڑھ کر عزیز جانتے تھے ۔

دوسرا حال : زیادہ ہوں یا تھوڑے کبھی دشمن سے نہ ڈرتے تھے ۔

تیسرا حال : دنیا میں تنگی و عسرت سے کسی طرح خوف نہیں کھاتے تھے ۔ اللہ کی جانب سے رزق ملنے پر بھروسہ رکھتے تھے ۔

چوتھا حال : اگر ان میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑتی تو نقل مکانی نہ کرتے تا آنکہ اللہ اُن کے لیے کوئی فیصلہ صادر نہ فرماتا ۔

محمد بن علی کتانی کہتے ہیں : ابتدائے اسلام کے زمانے میں لوگ آپس میں دین کے مطابق معاملات طے کرتے تھے یہاں تک کہ یہ حالت بھی نہ رہی ۔ پھر دوسرے قرن کے لوگوں نے ایک دوسرے سے وفاداری برتی، تا آنکہ یہ بھی نہ رہی پھر تیسرا زمانہ آیا ، اور لوگ ایک دوسرے سے مروت کے ساتھ پیش آتے تھے پھر مروت بھی ختم ہوگئی پھر چوتھے قرن میں حیا موجود رہی ۔ کچھ عرصہ بعد حیا بھی نہ رہی اور اس کے بعد لوگ صرف رہبت و رغبت ہی ایک دوسرے سے برتنے لگے ۔

(۲۹)

سیدنا حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ

ذکر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام پر ان کی ان احوال کے لحاظ سے فضیلت جو صوفیہ کے لیے رہنما اصول ہیں

مطرف بن عبد اللہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر پکارنے والا یہ پکارے کہ جنت میں صرف ایک ہی شخص داخل ہوگا۔ تو مجھے یہ امید ہے کہ وہ شخص میں ہی ہوں گا۔ اور اگر کوئی یہ صدا بلند کرنے کہ دوزخ میں ایک ہی شخص جائے گا تو مجھے خوف ہوتا ہے کہیں وہ شخص میں نہ ہوں"۔ مطرف بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ یہی رجا اور خوف کی سب سے بڑی کیفیت ہے جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل تھی۔

ابو العباس ابن عطا سے قول خداوندی "کونوا ربانیین الخ" کی تشریح کے لیے کہا گیا تو فرمایا: کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم ابوبکر صدیق کی طرح ہو جاؤ۔ کیونکہ جب سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو تمام مسلمانوں کے دل پریشان ہوگئے مگر ایک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دل حوصلے میں رہا۔ اور آپ نے باہر نکل کر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "اے لوگو! جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتا تھا تو بلاشبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے، تو بے شک وہ زندہ ہے کبھی اس کو موت نہیں آئے گی۔

الغرض یہ کہ ربانی کی تعریف یہ ہے کہ حوادث اس کے قلب پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتے چاہے انقلاب شرق و غرب بھی کیوں نہ برپا ہو جائے۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ تصوف پر مبنی پہلا بیان امت میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

کی زبان سے ادا ہوا جس سے صوفیہ نے وہ لطیف مطالب اخذ کئے جس میں عقلاً الجھے رہے۔ اور یہ بیان وہ تھا جو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ادا فرمایا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا۔ اے ابوبکر تو نے اپنے اہل و عیال کے لیے کیا باقی چھوڑا؟ تو ابوبکر صدیق نے جواب دیا، اللہ اور اس کا رسول۔

مجھے اپنی زندگی کی قسم کہ حقائق تفرید میں اہل توحید کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی بلند اشارہ نہیں۔ اور اس کے علاوہ بھی ان کے کئی اقوال ہیں جو صوفیہ کے لیے معانی و لطائف کا منبع ہیں جیسا کہ آپ کا وہ قول جو آپ نے اس وقت ارشاد فرمایا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما چکے تھے اور صحابہ اس صدمے سے بری طرح متاثر تھے۔ آپ نے فرمایا تھا: جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتا تھا سو وہ تو اس جہان سے رخصت ہو گئے، اور جو اللہ کی پرستش کرتا ہے سو وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔" اس قول سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ثباتِ توحید کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہی وہ قول ہے جس سے آپ نے دیگر صحابہ کے قلوب میں بھی ثباتِ توحید کو جاگزین فرمایا۔

اور غزوۂ بدر کے موقع پر جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

"اے میرے رب! اگر تو نے اس گروہ (مومنین) کو آج ہلاک کر دیا تو اس کے بعد روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔"

تو اس موقع پر حضرت ابوبکر کا یہ ارشاد بہت اہمیت رکھتا ہے:

"یارسول اللہ! آپ فکر نہ کریں خدا کی قسم کہ وہ آپ سے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کرنے والا ہے۔ اور اللہ نے جو وعدہ فرمایا تھا اس کا ذکر اس آیت میں ہے:

"إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ" (۱)

جب اے محبوب تمہارا رب فرشتوں کو وحی بھیجتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مسلمانوں کو ثابت رکھو۔ عنقریب میں کافروں کے دلوں میں ہیبت ڈالوں گا۔

---

(۱) الانفال: ۱۲

اس آیت کے ذریعے اس وعدے کی تصدیق کی گئی جس میں اللہ کی جانب سے مدد پہنچنے کا وعدہ کیا گیا تھا کیونکہ اس وقت تمام صحابہ کے قلوب اس سلسلے میں مضطرب تھے۔ اور اسی آیت سے حضرت ابوبکر صدیق کی خصوصیت اور ان کے ایمان کی حقیقت کو بھی واضح کیا گیا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا وجہ ہے باوجود احوال میں مکمل ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر کے روز متغیر ہو گئے تھے جب کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مطمئن رہے۔ اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر کی نسبت اللہ کو بہت بڑھ کر جانتے تھے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باقی صحابہ کے مقابلے میں بہت قوی ایمان کے حامل تھے۔ اس لحاظ سے یہ واضح ہو گیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طمانیت کا باعث وعدۂ حق تعالیٰ پر مضبوط ایقان و ایمان تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا متغیر ہونا اس وجہ سے تھا کہ آپ اللہ کو بہت زیادہ جانتے تھے۔ اور وہ اللہ کی جانب سے وہ علوم و معارف رکھتے تھے جو نہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جانتے تھے اور نہ ہی صحابہ میں سے کوئی اور ان سے بہرہ ور تھا۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جب بھی تیز ہوائیں چلنے لگتیں تو آپ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا جب کہ آپ کے اصحاب میں سے کسی کا رنگ بھی متغیر نہ ہوتا۔ اور آپ کا قول ہے، "اگر تم وہ کچھ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم روتے زیادہ اور ہنستے کم۔ اور تم پہاڑیوں کی جانب نکل جاتے۔ اور تم بستروں پر آرام سے نہ سو سکتے"۔ (مذکورہ حدیث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کا متغیر ہونا یا پریشان ہونا اللہ سے بہت زیادہ قریب ہونے اور علوم و اسرار سے انتہائی واقفیت کی بنا پر تھا)

حضرت ابوبکر صدیق کو بصیرت اور الہام دونوں عطیے عطا کئے گئے تھے۔ جن کا استعمال آپ نے تین بار کیا پہلی بار اس وقت جب تمام صحابہ کرام نے زکوٰۃ کا انکار کرنے والے مرتدین کے خلاف جہاد نہ کرنے پر اتفاق کر لیا تھا مگر حضرت ابوبکر صدیق ان کے خلاف جہاد کرنے پر ڈٹے رہے۔ اور کہا کہ اگر انہوں نے رسی کا ایک ٹکڑا بھی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زکوٰۃ میں ادا کرتے تھے، ادا نہ کیا تو میں ان سے مقابلہ کروں گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر آپ ہی کی رائے درست ثابت ہوئی اور باوجود اختلاف کرنے کے آخر کار تمام نے آپ ہی کے فیصلے پر صاد کیا۔

دوسری بار آپ نے اپنی فراست و الہامی بصیرت سے اس وقت کام لیا جب تمام صحابہ نے جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کو واپس بلانے کا فیصلہ کیا مگر آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم میں اس گرہ کو

بھی نہیں کھولوں گا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا ہو۔

اور تیسری مرتبہ اس وقت جب آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! میں نے تجھے ایک تحفہ دیا اور وہ ہے تیرے دو بھائی اور دو بہنیں۔ جب کہ عائشہ صدیقہ کو صرف یہی معلوم تھا کہ ان کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی امید سے تھیں جب آپ نے فرمایا: کہ میرے وجدان میں یہ بات ڈال دی گئی ہے کہ وہ بچی کو جنم دے گی اور اس نے بچی ہی جنی۔ اور یہ آپ کے فراست والہام جیسی خوبیوں سے مزین ہونے کی ایک بہت بڑی مثال تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مومن کی فراست سے بچو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عظمت کردار اور شخصیت کی بزرگی سے متعلق اور بھی بے شمار واقعات وروایاتِ صحیحہ موجود ہیں مگر طوالت سے بچنے کی خاطر اختصار ہی کو کافی سمجھا گیا۔

بکر بن عبداللہ الحزنی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت وفوقیت باقی صحابہ پر کثرتِ صوم وصلوٰۃ کی وجہ سے نہیں بلکہ وجۂ فضیلت وہ ایک چیز تھی جو آپ کے دل میں موجود تھی۔ بعض صوفیہ کا خیال ہے کہ وہ چیز، اللہ سے محبت اور اخلاص تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جب نماز کا وقت آن پہنچا تو ابوبکر صدیقؓ فرمایا کرتے: "اے آدم علیہ السلام کی اولاد! اٹھو اور اس آگ کو بجھا ڈالو جسے تم نے جلا رکھا ہے"

ایک روایت ہے کہ اگر کبھی آپ نے کوئی چیز کھائی اور بعد میں شبہ پڑ گیا تو اسی وقت اُسے قے کر کے اگل دیتے۔ اور فرماتے: "خدا کی قسم! اگر اس مشتبہ کھائی ہوئی چیز کے ساتھ میری روح بھی نکل جائے تو میں اسے خارج کرنے میں تامل نہ کروں گا۔ کیونکہ میں نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے یہ سنا ہے کہ جس جسم کو حرام کی غذا ملی ہو وہ آگ کی بہت زیادہ مستحق ہو گی"

اور آپ فرمایا کرتے: چاہتا ہوں کہ میں سبزہ ہوتا اور مجھے چرندے کھاتے اور خوفِ عذاب ودہشت یوم الحساب کا سوچ کر خیال کرتا ہوں کہ مجھے تو پیدا ہی نہ کیا جاتا"

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: قرآن کریم کی تین آیات

ایسی ہیں جن نے مجھے باقی ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے پہلی آیت یہ ہے :

"وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗٓ اِلَّا ھُوَ وَاِنْ یُّرِدْکَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِہٖ"(۱)	اور اگر تجھے اللہ کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کا کوئی ٹالنے والا نہیں اس کے سوا اور اگر تیرا بھلا چاہے تو اس کے فضل کا رد کرنے والا کوئی نہیں ۔

اس آیت سے میں نے یہ جان لیا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے بھلائی عطا کرنا چاہے تو سوائے اس کے اسے کوئی ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا ۔ اور دوسری آیت یہ ہے :

"فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ"(۲)	تو میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کروں گا ۔

اسی لیے میں نے اللہ کے سوا سب کچھ بھلا کر صرف اسی کے ذکر ہی کو حرزِ جان بنا لیا ۔ اور تیسری آیت یہ ہے :

"وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا"(۳)	اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو ۔

خدا کی قسم میں نے اس آیت کی تلاوت کے بعد پھر کبھی اپنے لیے رزق کا غم ہی نہیں کیا ۔

مدحِ صدیقؓ میں ابوالعتاہیہ کے چند اشعار

یا من ترفع بالدنیا و زینتھا	لیس الترفع رفع الطین بالطین
اذا اردت شریف الناس کلھم	فانظر الی ملک فی زی مسکین

ذاک الذی عظمت فی الناس رأفتہ

و ذاک یصلح للدنیا و للدین

ترجمہ اشعار : (۱) اے وہ شخص ! کہ تو دنیا و آرائش دنیا پر نازاں ہے یہ غرورِ دنیا کچھ بھی نہیں صرف مٹی پر مٹی رکھنے کے مترادف ہے ۔

۲ - جب تو تمام لوگوں میں سے شریف ترین شخص کو دیکھنا چاہے تو اس بادشاہ پر نظر کر جو درویشوں کے

---

(۱) یونس : ۱۰۷ (۲) البقرۃ : ۱۵۲ (۳) ہود : ۶

لباس میں ملبوس ہے ۔

۳ ۔ یہی وہ شخص ہے کہ جس کی مہربانی کا لوگوں پر سکہ جما ہوا ہے اور یہی وہ شخص ہے جو دین و دنیا دونوں میں ٹھیک ٹھیک چلتا ہے ۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں : توحید کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بڑھ کر کوئی بہتر قول نہیں کہا گیا۔ آپ نے فرمایا : پاک ہے وہ اللہ کہ جس نے خلق کے لیے اپنی معرفت سے خلق کے عاجز ہونے کے سوا کوئی راستہ نہیں بنایا۔

۳۰

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امتوں میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں۔ جن سے اللہ تعالیٰ بذریعۂ الہام کلام فرماتا ہے۔ اور اگر اس امت میں ایسا شخص ہے تو وہ عمر ہے۔

کسی شیخ سے حضرت عمر کے اللہ سے بذریعۂ الہام ہم کلام ہوتے یعنی ان کے محدث ہونے کے بارے میں وضاحت کے لیے کہا گیا تو فرمانے لگے۔ درجۂ صدیقین میں سے اعلیٰ درجہ پر فائز بندے کو محدث کہتے ہیں۔ اور اس کے آثار حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں نمایاں تھے جیسا کہ بیان کیا گیا کہ جب وہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو عین خطبے کے درمیان انھوں نے باآواز بلند پکارا: "یا ساریۃ الجبل" (اے ساریہ پہاڑ کی جانب ہو جاؤ۔) حالانکہ حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ قلعۂ نہاوند کے دروازے پر کھڑے تھے انھوں نے اتنی دور سے آپ کی آواز سن لی اور پہاڑ کی جانب ہو گئے جس کے نتیجے میں انھیں دشمن پر فتح نصیب ہوئی۔ بعد میں جب ساریہ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو کیسے علم ہو گیا تھا تو کہنے لگے میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صدا خود سنی کہ وہ فرما رہے تھے: اے ساریہ پہاڑ کی جانب ہو جاؤ۔

ابو عثمان نہدی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر کو خطبہ دیتے ہوئے ایک ایسی قمیص پہنے دیکھا جس میں بارہ پیوند لگے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت نازل فرمائے جو مجھے میرے عیبوں سے باخبر کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان عمر کے سائے سے ڈرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جو اللہ سے ڈرا اس نے اللہ تعالیٰ کے غضب کو ٹھنڈا

نہیں کیا اور نہ ہی اس نے وہ کچھ کیا جو اللہ چاہتا تھا۔ اور اگر قیامت نہ ہوتی تو تم وہ کچھ دیکھتے جو تمھارے گمان سے بالکل مختلف ہوتا۔ اس کے بعد آپ نے ایک کچی اینٹ اٹھا کر فرمایا کاش کہ میں یہی اینٹ ہوتا کاش میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا۔ کاش کہ میں کچھ بھی نہ ہوتا۔

آپ نے ایک اور روایت کے مطابق فرمایا: مجھے فقط اسی آزمائش میں مبتلا کیا گیا جو اللہ کے لیے اور اسی کی جانب سے تھی۔ اور اس طرح کی آزمائش میں میرے لیے چار نعمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی آزمائش میری قدرت سے باہر ہوتی ہے۔ اور دوسری یہ کہ مجھے اس سے وحشت نہیں ہوتی۔ تیسری یہ کہ اس میں رضا سے مجھے محروم نہیں کیا جاتا۔ اور چوتھی یہ کہ میں اس پر اللہ سے ثواب پانے کی امید کرتا ہوں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اگر صبر و شکر دو اونٹ ہوتے تو مجھے اس بات کی پرواہ نہ ہوتی کہ ان میں سے کس پر سوار ہو جاؤں۔

ایک شخص آپ کے پاس آیا اور اپنے افلاس کی شکایت کی آپ نے فرمایا: کیا تیرے ہاں آج رات کا کھانا موجود ہے اس نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا پھر تو مفلس نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: مجھے روئے زمین پر کوئی شخص بھی اس قدر عزیز نہیں کہ اس کے چہرے جیسا چہرہ لے کر اللہ کی بارگاہ میں شرف باریابی پاؤں سوائے ایک شخص کے اور وہ ہے یہ چادر اوڑھے ہوئے عمر[1] (رضی اللہ عنہ) ایک روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ کو دوپہر کے وقت کسی کے تعاقب میں دوڑتے ہوئے دیکھا تو ان سے دشمن کے بارے میں پوچھا حضرت عمرؓ نے فرمایا: صدقہ کے اونٹ لوٹ لئے گئے ہیں ان کی بازیافت کے لیے دوڑا جا رہا ہوں۔ حضرت علی نے فرمایا: یا امیر المومنین آپ نے اپنے بعد کے خلفاء کو آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

صوفیہ حضرت عمر کی خصوصیات کو اپنے لئے نمونہ اور نشانِ راہ سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ وہ پیوند لگے کھردرے کپڑے پہنتے، ترک شہوات فرماتے، مشکوک چیزوں سے اجتناب فرماتے اور ہر معاملے میں وقار و شرافت کا اظہار فرماتے حق کے واضح و ثابت ہونے کے بعد لوگوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرتے۔ باطل کو مٹانے

---

(۱) یہ الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وقت کہے تھے جب ان کو نیزہ لگ چکا تھا اور وہ چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ (مترجم)

والے تھے حقوق کے اعتبار سے اپنوں اور بیگانوں کے ساتھ یکساں سلوک فرماتے طاعات کو اختیار کرنے میں شدت برتتے۔ اور ممنوعہ چیزوں سے اجتناب میں سختی سے کاربند تھے۔ آپ کی اس قسم کی باتیں بہت طویل ہیں جن سے چند ہم نے بیان کی ہیں۔

یہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک جماعت کو مسجد میں بیٹھا دیکھا تو انہیں کام کر کے کمانے کا حکم دیا۔ اور جس کے بارے میں انھوں نے حضرت سلمان کو بھی لکھا، تو یہ اس لیے کہ آپ کو اس جماعت کے مسجد میں بیٹھنے میں کوئی کمزوری یا لوگوں سے طمع رکھنے جیسی برائی نظر آئی ہو گی یا کوئی اور کمزوری۔ اسی بنا پر آپ نے انہیں ہاتھ سے کمانے کا حکم دیا، ورنہ مسجد میں صرف للہ فی اللہ بیٹھا جائے اور کوئی کمزوری قلب و نظر میں نہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر و ابوبکر رضی اللہ عنہما نے اصحاب صفہ کو دیکھا ہی تھا جب کہ ان کی تعداد تین سو دس یا اس سے زیادہ تھی مگر رسول اللہ، حضرت عمر اور حضرت ابوبکر نے اسے برا نہیں منایا اور نہ ہی اصحابِ صفہ کو مسجد سے نکل کر کسبِ معاش کا حکم دیا۔

ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غزوہ احد کے روز اپنے بھائی زید بن الخطاب سے فرمایا: اگر تو پسند کرے تو میں اپنی زرہ اتار کر تجھے دے دیتا ہوں۔ جواباً زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جیسے آپ شہید ہونا چاہتے ہیں ویسے ہی مجھے بھی شہادت عزیز ہے۔" مذکورہ روایت میں حضرت عمر کا بغیر زرہ کے میدان جہاد میں جانے کی خواہش سے ہمیں حقیقتِ توکل کے بارے میں ایک بہت بڑا اشارہ ملتا ہے۔

روایت ہے حضرت عمر نے فرمایا: میں نے چار چیزوں میں عبادت کو موجود پایا ہے:

پہلی: اللہ کے فرائض کی ادائیگی۔

دوسری: اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے اجتناب۔

تیسری: فقط اللہ سے ثواب پانے کی خاطر امر بالمعروف کرنا۔

چوتھی: اللہ کے غضب سے بچنے کے لیے برائیوں سے لوگوں کو روکنا۔"

۳۱

امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تمکین سے نوازا گیا تھا جو کہ محققین (صوفیہ) کے اعلیٰ مراتب میں سے ایک ہے۔ اور حضرت عثمان کی جن خصوصیات سے صوفیہ کا تعلق ہے۔ وہ متقدمین کی زبانی ہم تک پہنچی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب ان سے تونگری اپنانے کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: کہ یہ مقام صرف انبیاء و صدیقین ہی کے لیے درست ہوتا ہے۔ اور تونگری جو صدیقین کے احوال میں سے ہے اختیار کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اشیاء کو استعمال میں لاکر ان سے دور رہے اور دوسری صورت یہ کہ اشیاء کے ساتھ برائے نام رہتے ہوئے ان سے کاملاً جدا ہو، جیسا کہ یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ سے عارف کی تعریف پوچھی گئی تو فرمایا: ایک ایسا شخص کہ اشیاء کے ساتھ رہنے والا بھی اور ان سے جدا بھی ہو۔

ابن الجلاء فقیر صادق کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس کا اشیاء میں دخول غیر کے لیے ہوتا ہے، اپنے لیے نہیں۔

اور حضرت عثمان کا معاملہ بالکل ایسا ہی ہے کہ انھوں نے دنیا کے مال و متاع کو اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے خرچ کیا۔ جیسا کہ ایک روایت کے مطابق وہ خود فرماتے ہیں: اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ اسلام میں ایک شگاف ایسا ہے جسے میں نے اپنے مال سے بھرنا ہے تو میں نے یہ مال کبھی جمع نہ کیا ہوتا۔ جس شخص کی یہ حالت ہو اس کی علامت یہ ہے کہ ہمیشہ مال کو جمع رکھنے سے خرچ میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے جیش العسرۃ کی تیاری اور بئر رومۃ (کنواں) کی خرید میں کیا۔ جسے دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کے (یعنی خرید بئر رومہ اور تجہیز جیش

عسرت : کے بعد حضرت عثمانؓ کچھ بھی کریں انھیں اس کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔"

روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے پاس اپنے غلام کو ایک ہزار درہم کی تھیلی دے کر روانہ کیا۔ اور غلام سے یہ کہا اگر انھوں نے یہ رقم قبول کرلی تو تو اللہ کی راہ میں آزاد ہے۔

مذکورہ مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ کے اموال اس طرح کی مدات میں صرف کرنے کے لیے بروقت تیار رکھے جاتے تھے۔ اور ایسی سخاوت صرف کامل معرفت والے ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

میں نے ابن سالم سے اور انھوں نے سہل بن عبداللہ کو یہ کہتے سنا : سعۃ (تونگری) کا مقام صرف اس شخص کو مل سکتا ہے۔ جو اذن (اجازت من جانب اللہ) سے نوازا گیا ہو۔ ایسے بندے کو جس قدر اس کا رب تعالیٰ اجازت دیتا ہے اسی قدر اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اور اسی قدر مال روک رکھتا ہے جتنے کی اللہ اسے اجازت دے۔ اور ایسا بندہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ اموال کو اس لحاظ سے اپنے پاس رکھے ہوئے ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق اس کے ذریعے پورے کرتا ہے نہ کہ اپنی آسائش کے لیے اسے جمع رکھتا ہے۔ ایسے شخص کی مثال اس وکیل کی سی ہے جو اپنے مالک کے مال میں اس کی اجازت سے مالکانہ تصرف کرتا ہے۔ بلاشبہ ایسا مقام ایک مشکل مقام ہے جس میں کئی لوگوں نے غلطی کی بنا پر خود کو اس پر فائز سمجھا ہوا ہے حالانکہ وہ دنیا کے غلام ہیں۔ چہ جائیکہ ایسے مقام پر فائز ہوں۔

سہل بن عبداللہ نے فرمایا : بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص دنیوی مال و متاع کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کا سب سے بڑا تارک الدنیا بھی ہوتا ہے۔ سہل بن عبداللہ سے کہا گیا کہ کس طرح؟ فرمایا : عمرو بن عبدالعزیز کی طرح کہ وہ اپنے دورِ خلافت میں اپنے لیے جلائے جانے والے تیل اور قوم کے لیے جلائے جانے والے تیل میں بھی فرق قائم رکھتے رہے۔ وہ اپنا چراغ تین سرکنڈوں پر رکھتے تھے۔ اور زمین کے خزانوں کے مالک تھے۔

یہاں کچھ لوگ غلط فہمی کی بنیاد پر غنا کو فقر پر ترجیح دے بیٹھتے ہیں حالانکہ وہ یکسر غلطی پر ہوتے ہیں اور ایسے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیوی مال و اسباب کی کثرت کی بنا پر مذکورہ

لوگ غنی نہ تھے اور نہ ہی کوئی دنیوی مال و متاع نہ رکھنے کے باعث فقیر کہلایا جا سکتا ہے بلکہ ان کا غنی ہونا اس لیے ہے کہ وہ اللہ کو پا چکے تھے اور فقیر اس لیے کہ وہ اللہ ہی کے حاجت مند اور اسی کی چاہت کے پیاسے تھے۔

روایت ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے باغ سے لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر لا رہے تھے جب کہ ان کے کئی غلام تھے۔ کسی نے عرض کیا: آپ نے یہ گٹھا کسی غلام سے کیوں نہ اٹھوا لیا؟ آپ نے فرمایا: میں یہ اپنے کسی غلام سے اٹھوا سکتا تھا مگر میری مرضی یہ تھی کہ اپنے نفس کو آزماؤں کہ وہ اس سے عاجز آتا ہے اور اسے ناپسند کرتا ہے کہ نہیں۔ یہاں یہ بات واضح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ اپنے نفس کو نہیں بلکہ ریاضتِ نفس کو تلاش کر رہے تھے تاکہ مبادا وہ اپنے مال و منال سے مطمئن ہو جائیں کیونکہ آپ کا معاملہ اس طرح کے حالات میں دوسرے لوگوں سے مختلف تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہر رکعت میں قیام کے بعد سبع طوال پڑھتے تھے اور رات کو بیدار رہتے۔

روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کسی کی بدگوئی نہیں کی اور نہ کبھی اپنی شرمگاہ کو دائیں ہاتھ سے چھوا ہے۔

آپ کی تمکین اور ثبات و استقامت کی دلیل وہ واقعہ ہے جب آپ کو شہید کر دیا گیا مگر آپ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نہ ہی کسی کو جنگ و جدل کی اجازت دی اور نہ ہی گود سے قرآن مجید کو ہٹایا اور اسی حالت میں آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ خون مصحف پر بہہ نکلا آپ خون میں لتھڑ گئے اور خون اس آیت پر گرا۔

"فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ"[1]	تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمھیں کفایت کرے گا۔

میں نے ابو عمرو بن علوان سے اور انھوں نے حضرت جنید کو ایک شب یہ مناجات کرتے ہوئے

---

(۱) البقرۃ: ۱۳۷

سنا میرے اللہ! کیا تو مجھے اپنے قرب کے قریب میں رکھے گا یا مجھے اپنے وصل کے ذریعے خود سے جدا کر دے گا، یہ ہیہات ہے، میں نے ابو عمرو سے پوچھا ہیہات سے کیا مراد ہے تو کہا تمکین۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے بھلائی کو چار چیزوں میں جمع پایا۔

۱۔ نوافل کے ذریعے اللہ سے محبت کے اظہار میں۔

۲۔ احکام خداوندی پر صبر میں۔

۳۔ اللہ کی مقرر کردہ تقدیر پر راضی رہنے میں۔

۴۔ اللہ کی نگاہ سے حیا کرنے میں۔

۳۲

امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ

احمد بن علی وجیہی نے ابو علی رودباری سے اور انھوں نے جنید بغدادی کو یہ کہتے سنا: اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگوں میں شریک نہ ہوتے تو ہمیں اپنے علم سے بہت مستفیض فرماتے آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم لدنی عطا فرمایا تھا۔ اور یہ علم لدنی ایسا علم ہے جس سے حضرت خضر علیہ السلام کو بھی نوازا گیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔" (۱) اور اسے اپنا علم لدنی عطا کیا۔

آپ نے موسیٰ و خضر علیہما الصلوٰۃ والسلام کا قصہ ضرور سنا ہو گا کہ جب خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

"اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا" (۲) آپ میرے ساتھ ہرگز نہ ٹھہر سکیں گے۔

یہاں پر بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا کہ ولایت کو نبوت پر فضیلت دی گئی۔ انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ہم اس طرح کا خیال رکھنے والوں کی تردید کریں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آپ کو اللہ نے گہرے مطالب و معانی لطیف اشارات، علم ایمان اور معرفتِ توحید سے متعلق خوبصورت و دلنشین عبارات و اقوال سے نوازا۔ اس کے ساتھ آپ کے اخلاق اور عادات بھی ارفع تھیں۔ جملہ صوفیہ کرام آپ کی مذکورہ خصوصیات کو اپنے لیے ایک نمونہ سمجھتے رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق روایات و اخبار کافی ہیں

---

(۱) الکہف: ۶۵ (۲) الکہف: ۶۷

مگر طوالت سے پرہیز کرتے ہوئے ہم کچھ مختصراً پیش کرتے ہیں۔

حضرت علی سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اپنے رب کو کس طرح جانا؟ آپ نے فرمایا: جس طرح اللہ نے مجھے اپنی ذات کا علم عطا کیا ہے اس کے مطابق وہ اس طرح ہے کہ اس سے کوئی صورت مشابہ ہے۔ نہ ہی حواس کے ذریعے اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی لوگ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ دوری میں قریب اور قرب میں بعید ہے۔ وہ ہر چیز کے اوپر ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی شے اس کے نیچے ہے۔ ہر شے کے تحت موجود ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی شے اس سے اوپر ہے۔ ہر شے کے سامنے ہے مگر کوئی شے اس کے سامنے نہیں۔ وہ ہر شے میں اس طرح موجود ہے کہ کسی شے کی طرح کسی شے سے اور کسی شے میں نہیں، پاک ہے اس کی ذات والاصفات جو مذکورہ تعریف کے مطابق ہے اور اس کے علاوہ کسی اور طرح سے نہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے: اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو پہلے سے موجود کسی شے سے نہیں بنایا اور نہ کسی پہلے سے موجود شے سے اپنی صفت میں مشابہت پیدا کی جب کہ دیگر سارے صانع کسی شے سے ہی ایک اور شے بناتے ہیں۔ اور اس جہان میں جس قدر عالم لوگ ہیں وہ پہلے جاہل تھے اور جہالت سے علم کی جانب آئے جب کہ اللہ تعالیٰ ایسا عالم ہے کہ اس پر کبھی عرصۂ جہالت نہیں گذرا بلکہ وہ ہمیشہ سے عالم ہی ہے۔

عمرو بن ہند ایمان کے بارے میں حضرت علی کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ایمان قلب میں ایک سفید نقطے کی مانند ہے جوں ہی ایمان میں اضافہ ہوتا ہے قلب بھی مزید سفید ہوتا جاتا ہے اور جب ایمان مکمل ہو جاتا ہے تو قلب بھی پوری طرح سفید ہو جاتا ہے اور منافقت جب دل میں سیاہ نقطے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور جوں جوں دل میں گھر کرتی جاتی ہے یہ سیاہی بھی بڑھتی چلی جاتی ہے جب منافقت مکمل طور سے دل پر چھا جاتی ہے تو سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے

اوّلیں شارحِ احوال و مقامات

ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایمان کے بارے میں استفسار کیا تو فرمایا: ایمان کے چار ستون ہیں، صبر، یقین، عدل اور جہاد۔ پھر آپ نے ان چاروں احوال کے دس دس درجے بیان فرمائے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص ہوں گے جنھوں

نے احوال و مقامات پر گفتگو کی۔

کسی نے آپ سے سوال کیا کہ سب سے بڑھ کر بے عیب کون ہے؟ آپ نے فرمایا: جس نے عقل کو اپنا امیر بنایا اور اسے کسی وزیر سے بچائے رکھا جس نے موعظت کو اپنی زمام، صبر کو اپنا قائد، تقویٰ کو اپنا نگہبان خوف خدا کو اپنا جلیس اور موت و مصیبت کو اپنا دوست بنایا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "اس میں ایک علم ہے کاش کہ کوئی اس امانت کا اٹھانے والا مل جاتا"

آپ باقی صحابہ کرام سے بایں لحاظ ممتاز تھے کہ آپ کو توحید و معرفت کو بیان کرنے پر کامل عبور تھا۔

بیان ایک ایسا ملکہ ہے کہ جس کا شمار اعلیٰ احوال و معانی میں ہوتا ہے۔

قولِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (۱)	اور یاد کرو جب اللہ نے عہد لیا ان سے جنھیں کتاب عطا ہوئی کہ تم ضرور اسے لوگوں سے بیان کر دینا۔

اور فرمایا:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲)	یہ لوگوں کو بتانا اور راہ دکھانا اور پرہیزگاروں کو نصیحت ہے۔

کوئی بندہ اس وقت تک کمال کو نہیں پہنچتا جب تک اسے ملکۂ بیان حاصل نہ ہو کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ جو عقل رکھتا ہو وہ علم سے بھی بہرہ ور ہو اور نہ ہر علم رکھنے والا حسن بیان کی دولت سے مالامال ہوتا ہے، ہاں جب کسی کو بیک وقت عقل، علم اور بیان کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہوں تو وہ منصب کمال کو پہنچا۔

ایک مشہور روایت ہے کہ جب صحابہ کرام دین کے بارے میں کسی مشکل مسئلے سے دوچار ہوتے

---

(۱) آلِ عمران ۰ (۲)
۳

تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھتے اور وہ ان کی مشکل کو فوراً حل کر دیتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اپنے دوست سے محبت میں میانہ روی برتو کہ کل کہیں وہی تیرا دشمن نہ ہو جائے۔ اور اپنے دشمن سے بحدِ اعتدال دشمنی کرو کہ کل وہی تیرا دوست نہ بن جائے۔

آپ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے خزانے کے دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا: اے سونا چاندی! جا میرے سوا کسی اور کو دھوکہ دے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ نے ایک قمیص پہنی تھی جو آپ نے تین درہم میں خریدی تھی اور جسے بعد میں آپ نے ہاتھ کی انگلیوں کے سروں کے برابر پھاڑ دیا (یعنی لمبی آستینوں کو انگلیوں کے برابر کاٹ دیا۔

ایک روز آپ نے دن بھر مزدوری کی۔ شام کو ایک مُد (۲ دو رطل کے برابر ایک پیمانہ) کھجور معاوضہ ملا جو آپ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیئے اور انھوں نے تناول فرما کر تقویت پائی۔

آپ نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اگر تو چاہے کہ اپنے دوست سے ملاقات کرے تو قمیص اور جوتے کو پیوند لگا، اپنی خواہشات کم کر، اور سیر ہو کر مت کھا۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے انھوں نے فرمایا کہ اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

کہا جاتا ہے کہ جب آپ کو شہید کیا گیا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا اے کوفہ کے لوگو! تمھاری آنکھوں کے سامنے امیر المومنین شہید کر دیئے گئے۔ انھوں نے دنیا میں اپنے پیچھے صرف چار سو درہم چھوڑے جو انھوں نے اس لیے الگ رکھ چھوڑے تھے کہ اس سے ایک خادم خریدیں گے جو ان کی خدمت کرے گا۔

کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ کا رنگ نماز کا وقت داخل ہوتے ہی متغیر ہو جاتا اور کانپنے لگتے اور ایسی حالت میں جب آپ سے اس کا سبب پوچھا جاتا تو فرماتے اس امانت کو لوٹانے کا وقت آن پہنچا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ — بے شک ہم نے امانت پیش فرمائی آسمانوں

الْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ	اور زمین پر اور پہاڑوں پر تو انھوں نے اس
یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے
الْاِنْسَانُ (۱)	ڈر گئے اور آدمی نے اٹھالی۔

اسی لیے مجھے خدشہ ہے کہ اس امانت کو بہتر طور پر ادا کر سکوں گا یا نہیں۔

آپ نے ایک موقع پر فرمایا: "میرے اور میرے نفس کی مثال چرواہے اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی سی ہے کہ چرواہا جب اپنے ریوڑ کو ایک جانب سے اکٹھا کرتا ہے تو دوسری طرف سے بکھر جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے احوال، اخلاق اور افعال سے متعلق بہت سے اقوال اور روایات ہیں جو صوفیہ کرام میں سے اربابِ قلوب اور اہل اشارات کے لیے ہمیشہ رہنما اصولوں کا کام دیتی چلی آئی ہیں۔

الغرض دنیا کو ترک کرنے والوں، اپنی تمامتر ملکیتوں کو خیرباد کہنے والوں اور فقر و تجرید کی بساط پر بیٹھنے والوں کے امام ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جنھوں نے دنیوی مال و متاع میں سے کچھ تو راہ خدا میں قربان کر دیا اور کچھ حصہ اپنے اہل و عیال، صلہ رحمی اور دیگر حقوق کی ادائیگی کے لیے باقی چھوڑا ان کے امام سیدنا عمر الخطاب رضی اللہ عنہ اور جنھوں نے اپنے تمام اموال اللہ کے لیے جمع کئے، اسی کے لیے روکے رکھے، لوگوں کو اس میں سے عطا کیا اور خرچ کیا، ان کے امام سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور دنیا کا طواف نہ کرنے والوں چاہے وہ انھیں بغیر مانگے بھی کیوں نہ ملے اور اسی طرح دنیوی مال و متاع سے دور رہنے والوں کے امام سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔

آپ کا قول ہے کہ بھلائی چار چیزوں میں ہے، خاموشی، قوتِ گویائی، بینائی اور حرکت۔ ہر ایسی گفتگو جو ذکرِ خدا سے خالی ہو لغو ہے، ہر وہ خاموشی جو فکر کے لیے اختیار نہ کی گئی ہو، سہو ہے، ہر وہ نگاہ جس میں عبرت نہ ہو وہ غفلت ہے اور ہر وہ حرکت جو اللہ کی عبادت

---

(۱) الاحزاب: ۷۲

کے لیے نہ ہو سستی و کمزوری ہے ۔ اللہ تعالے اس بندے پر رحم کرے جس نے اپنی قوتِ گویائی کو ذکرِ خداوندی، خاموشی کو فکر، نظر کو عبرت اور حرکت کو اللہ کی بندگی کے لیے وقف کر دیا ہو۔ اور لوگ اس کی زبان اور ہاتھوں سے محفوظ ہوں ۔

(۳۳)

اصحابِ صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین

احادیث کے مطابق اصحابِ صفہ کی تعداد کم و بیش تین سو دس[1] تھی یہ حضرات نہ کاشتکاری کرتے تھے۔ نہ گھوڑوں کو سدھاتے تھے اور نہ ہی تجارت کرتے تھے۔ مسجد میں سوتے اور مسجد ہی میں کھانا کھاتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے انس رکھتے ان کی مجلس میں بیٹھا کرتے ان کے ساتھ کھاتے پیتے اور لوگوں کو ان کی عزت کرنے اور ان کی فضیلت جاننے کی تلقین فرماتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اصحاب صفہ کا ذکر ذیل کی آیات مبارکہ میں فرمایا ہے:

"لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"[1] — ان فقیروں کے لیے جو راہِ خدا میں رہ کے گئے۔

"وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ"[2] — اور دور نہ کرو انھیں جو اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

اور فرمایا:

"وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ"[3] — اور اپنی جان ان سے مانوس رکھو جو اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

ایک اور مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا ذکر اس طرح فرمایا:

---

(۱) البقرۃ : ۲۷۳ (۲) الانعام : ۵۲ (۳) الکہف : ۲۸

"عَبَسَ وَتَوَلّٰیٓ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی"(۱) تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اس پر کر اس کے پاس وہ نابینا حاضر ہوا۔

آخر الذکر آیت کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ ابن ام مکتوم کے بارے میں نازل کی گئی جن کا تعلق اصحابِ صفہ سے تھا۔ یہ وہ شخص تھے جنہیں دیکھ کر آپ فرماتے: اے وہ شخص کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے عتاب کیا۔

کہا جاتا ہے کہ جب تک اصحابِ صفہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے رہتے آپ کبھی ان کی مجلس سے از خود نہ اٹھتے اور ان سے مصافحہ کرتے وقت جب تک وہ ہاتھ نہ کھینچ لیتے آپ اپنا ہاتھ کھینچنے میں پہل نہ فرماتے۔

اکثر یوں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحابِ صفہ کو صاحب استطاعت صحابہ میں تقسیم فرما دیتے کسی کے ساتھ تین تو کسی کے ساتھ چار پانچ بھیج دیتے تاکہ وہ ان کے خورد و نوش کا بندوبست کرے۔ بعض اوقات اکیلے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اسّی اصحابِ صفہ کو ساتھ لے جاتے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستّر اصحابِ صفہ کو دیکھا جو ایسے کپڑے پہن کر نماز پڑھ رہے تھے جو ان کے گھٹنوں تک نہیں پہنچتے تھے اور جب ان میں سے کوئی رکوع میں جاتا تو کپڑے کو کھینچ کر رکھتا کہ مبادا ستر پوشی نہ رہے۔

ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اُون کی عبائیں پہن پہن کر ہمارے جسموں سے بھیڑ بکریوں کی بو آنے لگی۔

عبداللہ بن طلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم نے اصحابِ صفہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! خشک کھجوریں کھا کھا کر ہمارے پیٹ جل گئے آپ نے ہم پر مردار کا کھانا بھی حرام کر دیا ہے۔ یہ سن کر آپ نے منبر پر چڑھ کر فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ صبح صبح آکر یہ کہتے ہیں کہ خشک کھجور نے ہمارے پیٹ جلا دیئے ہیں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہی خشک کھجور اہلِ مدینہ کی خوراک ہے۔ اور جو چیز انھوں

---

(۱) عبس: ۱-۲

نے ہمیں مہیا کی وہی ہم نے آپ کو بھی فراہم کی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے کہ اللہ کے رسول کے گھر سے تو ایک یا دو دو ماہ تک گندم کی روٹی پکنے کے لیے دھواں تک نہیں اٹھتا اور اس کا گذارہ سوائے کھجور اور پانی کے کسی اور چیز پر نہیں۔

مذکورہ حدیث میں قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اصحابِ صفہ سے معذرت کرتے ہوئے ان کی شکایت کو رَد نہیں فرمایا۔ اور نہ ہی انہیں کوئی پیشہ اختیار کر کے کمانے کا حکم دیا۔

ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابِ صفہ کی ایک جماعت کو اس حال میں دیکھا کہ وہ (مختصر اور نامکمل کپڑوں کے باعث) برہنگی سے بچنے کے لیے ایک دوسرے میں خود کو چھپا رہے تھے۔ ایک قاری انہیں قرآن کریم کی آیات سنا رہا تھا اور وہ رو رہے تھے۔

اصحابِ صفہ کے علاوہ دیگر صحابہ بھی بلند احوال، پاکیزہ اعمال اور اخلاقِ فاضلہ سے آراستہ تھے اور ان کی یہ خصوصیات بلاشبہ صوفیہ کے لیے نورِ ہدایت کا درجہ رکھتی ہیں۔

○

فضائلِ صحابہ رضی اللہ عنہم

زیاد بن حُدیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ انھوں نے طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہما کو ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں اپنی چادر کا کنارہ خود سیتے ہوئے دیکھا۔

حارث بن عمیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نزع کے وقت یہ کہتے سنا: "اپنے چاہنے والے کی جس طرح چاہے جان لے لے مگر مجھے تیری عزت وجلال کی قسم میں پھر بھی تجھ سے محبت کئے جاؤں گا۔"

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے عذابِ الٰہی کے خوف سے کہا: کاش میں خاک ہوتا اور ہوائیں مجھے اڑاتی پھرتیں۔ کاش! میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔

ثابت بنانی رحمہ بیان کرتے ہیں کہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ تنتیس ۳۳ برس تک پیٹ کی بیماری میں مبتلا رہے ایک روز دوست ان کی عیادت کرنے کو گئے تو ان سے کہا: آپ کی بیماری کی طوالت ہمارے آپ کے پاس آنے سے مانع رہتی ہے۔ انھوں نے جواب دیا: آپ ایسا نہ کریں۔ میرے رب کو اگر میری یہ تکلیف پسند ہے تو مجھے بھی یہی پسند ہے۔

سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ[1] — اور بے شک جہنم ان سب کا وعدہ ہے۔

تو چیخ ماری اور ماتھے کو پیٹ کر رہ گئے پھر وہ باہر کی جانب نکل کھڑے ہوئے اور تین

---

(۱) الحجر: ۴۳

روز باہر ہی رہے ۔

روایت ہے کہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ایک بار ابو درداء رضی اللہ عنہ سے اس حال میں ملاقات کی کہ وہ عراق سے شام کی طرف پیدل جا رہے تھے انھوں نے موٹے کپڑے کا جبّہ پہنا ہوا تھا اور چہرے کا رنگ متغیر تھا ان کی یہ حالت دیکھ کر کسی نے کہا کہ آپ نے خود کو ذلیل کر دیا ہے۔ حضرت سلمان نے فرمایا: آخرت کا سنور جانا ہی اصل بھلائی ہے اب تو میں غلام ہوں اور اسی لیے غلاموں جیسا لباس پہنتا ہوں جب مجھے آزاد کر دیا جائے گا تو پھر خوبصورت لباس پہنوں گا۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں دورِ جاہلیت میں تاجر تھا اسلام قبول کیا تو چاہا کہ تجارت اور عبادت کو یکجا کر لوں مگر ایسا نہ ہو سکا اور بالآخر میں نے عبادت کو تجارت پر ترجیح دی ۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ سے ان کی افضل عبادت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: تفکر اور توکل ۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا حق پر قائم رہنا فقط اللہ کے لیے ہے، اور اللہ سے میرے اسی تعلق نے میرے لیے کوئی دوست نہ چھوڑا۔ روزِ حساب کے خوف سے میرے جسم پر گوشت باقی نہ رہا۔ اور اللہ کی جانب سے ملنے والے ثواب پر پختہ یقین نے میرے گھر میں کچھ نہ رہنے دیا۔ مجھے اس ایک دن کا غم کھائے جا رہا ہے جو ابھی آیا بھی نہیں۔ کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا: میری امید میری اجل سے بھی آگے نکل گئی ہیں چاہتا ہوں کہ اللہ نے مجھے درخت پیدا کیا ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ کسی دعوتِ ولیمہ میں تشریف لے گئے مگر وہاں آپ نے کوئی ایسی بات سنی کہ یہ کہتے ہوئے، وہاں سے لوٹ آئے کہ جس نے لوگوں کے گناہوں میں اضافہ کیا وہ بھی انہی میں سے ہے اور جو ان کے اچھے عمل سے خوش ہوا وہ ان کے نیک کاموں میں شریک ہے ۔

حبیب بن مسلمہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہم کے پاس ایک ہزار درہم لے کر گئے مگر انھوں نے

یہ کہہ کر وہ درہم لوٹا دیئے کہ ہماری بکری ہے جس سے ہمیں دودھ مل جاتا ہے۔ اور سواری بھی ہے جس کی پیٹھ پر سوار ہو کر سفر کر لیتے ہیں اس کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ جب طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی تو انہی دنوں حضرت ابو عبیدہ بن جرّاح کی ہتھیلی پر طاعون کا پھوڑا نکل آیا اور صحابۂ کرام بھی اس وبا سے گھبر گئے۔ اس پر ابو عبیدہ نے فرمایا: مجھے اللہ کی قسم ہے! کہ اگر اس طاعون کے پھوڑے کے بدلے مجھے سُرخ اونٹ بھی دیئے جائیں تو میں انھیں قبول نہ کروں۔

ایک شخص نے ابو عبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ سے کچھ مانگنے کے لیے سوال کیا مگر آپ نے اسے کچھ نہ دیا وہ دوسری مرتبہ آیا تو آپ نے اس کو کچھ عطا کیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ جس نے تجھے خالی ہاتھ لوٹایا اور جس نے تجھے عطا کیا وہ میں نہیں اللہ تعالیٰ ہے۔

آپ نے ایک اور موقعہ پر فرمایا: بہتر تھا کہ مینڈھا پیدا کیا گیا ہوتا اور اللہ کے نام پر قربان کر دیا جاتا، میری ہڈیوں سے سارا گوشت کھا لیا جاتا یا کاش کہ مجھے پیدا ہی نہ کیا گیا ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: خوش آمدید! اے ناپسندیدہ چیزو! یعنی موت اور تنگ دستی، مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی مجھ پر آجائے۔

کہتے ہیں کہ آپ کے گھر میں ابابیل کے گھونسلے تھے، اور انھوں نے بچے دے رکھے تھے کسی نے کہا کہ آپ ان ابابیل کے گھونسلوں کو گرا کیوں نہیں دیتے۔ اس پر آپ نے فرمایا: میں یہ زیادہ پسند کروں گا کہ میرے ہاتھ میری اولاد کی قبریں کھودتے ہوئے ٹوٹ جائیں بجائے اس کے کہ میں اپنے ہاتھوں سے ان پرندوں کے گھونسلوں میں سے ایک انڈہ بھی لے کر توڑوں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں براء بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو دیوار پر بیٹھے پاؤں لٹکائے اشعار گنگنا رہے تھے میں نے کہا اے میرے بھائی! کیا اسلام اور قرآن سے بہرہ ور ہونے کے بعد یہ حالت ہے تو انھوں نے جواب دیا: میرے بھائی شعر تو عرب کا دیوان ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں نے تنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ننانوے ۹۹ کافر مبارز (جنگ کے آغاز میں مقابلے کے لیے للکارنے والے) جہنم رسید

سکے اور اب یہ حالت ہے کہ بستر پر مروں گا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے تستر کے شاہ شہر کے سے ایک جنگ کے موقع پر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ کتنے ہی ایسے مفلس و نادار لوگ ہیں کہ جن کے کسی سوال کو اللہ تعالیٰ رد نہیں فرماتا، اور اگر یہ لوگ اللہ پر کوئی قسم کھائیں تو وہ ان کی قسم کو پورا فرما دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک براء بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں۔

براء بن مالک رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ عرض کرتے تھے کہ اے میرے رب! میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ میرے ساتھیوں کو فتح نصیب کر اور مجھے شہادت عطا فرما۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کی یہ دعا قبول کی انھیں شہادت اور ان کے ساتھیوں کو فتح عطا کی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے، کہ بیٹھنے کی جگہ تمھارے اپنے گھر ہیں کہ جہاں بیٹھ کر نہ تم کسی کو دیکھتے ہو اور نہ کوئی تمھیں دیکھتا ہے۔

اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو فقر و فاقہ کی آزمائش میں اس لیے ڈالتا ہے کہ بندہ محتاج ہو کر اس کے پاس آئے اور اسی کو پکارے۔

کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے رخسار کثرت گریہ سے جوتے کے تسمے کی مانند ہو گئے تھے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ میں کپڑے کو پیوند لگا کر پہنتا ہوں تو ایسا لباس میرے اللہ کی نظروں میں بلند ہونے کا باعث بنتا ہے۔ اور ایسا پیوند لگا لباس مجھے اس لباس سے زیادہ عزیز ہے۔ جو مجھے خالق اور مخلوق دونوں کی نظروں میں گرا دے۔

کعب بن احبار رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لوگ آخرت کو عزت نہیں پا سکتے اگر وہ اپنی تعریف و ثناء کو ترک نہ کر دیں۔ اور اللہ کی محبت میں ان کو ملامت نہ کیا جائے۔

اور فرمایا کہ بندے کو حج اور جہاد کا اجر پوری طرح نہیں مل سکتا جب تک کہ وہ مصیبت و اذیت پر صبر کرنا نہ سیکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر کوئی ایسے شخص سے ملنا چاہے جس کے دل کو اللہ نے نورِ ایمان سے منور فرمایا ہو تو وہ حارثہ رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے۔

ثعلبہ بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ لکڑیوں کا گٹھا

اٹھائے آرہے تھے اور اس روز وہ مروان بن الحکم کے نائب بھی تھے۔ اس موقع پر انھوں نے مجھ سے کہا اے ابن مالک! امیر کے لیے راستہ کشادہ کرو میں نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کا بھلا کرے اتنا ہی راستہ آپ کے لیے کافی ہے۔ اتنے میں انھوں نے پھر کہا کہ امیر کے لیے راستہ کشادہ کرو۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کا وقت قریب آیا تو رونے لگے کسی نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمانے لگے: اس لیے روتا ہوں کہ منزلِ نجات دور ہے اور زادِ راہ کم یقین کمزور ہے اور ایک گہرا گڑھا سامنے ہے خدا جانے اس گڑھے سے جنت کی جانب جانا ہوگا یا دوزخ کی جانب۔

ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رات کو تین حصوں میں منقسم کر رکھا ہے۔ پہلا حصہ نماز کے لیے دوسرا حصہ سونے کے لیے اور تیسرا حصہ احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یاد کرنے کے لیے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز سب سے پہلے جو لوگ حوضِ کوثر کے پاس پہنچیں گے وہ لاغر و دبلے لوگ ہوں گے کہ اگر ان کو رات آلے تو غم کے ساتھ اس کا استقبال کریں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم میں سے کچھ لوگ غیر شادی شدہ تھے اور ہم مسجد میں سو رہتے تھے کیونکہ ہمارا اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اسی کو عزیز جانو جس کے دین کا تمھیں اعتبار ہو۔ اور فرمایا: متقی اور صاف باطن شخص کو کھانا کھلایا کرو اور ایسے شخص ہی سے کھایا کرو۔ اور فرمایا: ابنِ آدم پر وہی کچھ مسلط کیا جاتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہو اگر وہ صرف اللہ سے ڈرتا رہے تو وہ اس پر کوئی چیز مسلط نہیں فرماتا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کتنی ہی ایسی لمحاتی لذتیں ہیں جو انسان کو طویل غموں میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ وہ دن میری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک کا باعث

بنتا ہے جب میرے گھر والے مجھ سے کسی چیز کے نہ ہونے کا شکوہ کریں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو کہیں دعوت پر مدعو کیا گیا وہاں آپ نے کچھ لوگوں کو اہلِ عجم[1] جیسا لباس پہنے دیکھا۔ تو یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے کہ جس نے کسی قوم سے مشابہت پیدا کی وہ انہی میں سے ہو گیا۔

سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے غزوۂ احد کے روز فرمایا: اے اللہ میں تجھ پر قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں دشمن کے مقابل اتروں وہ مجھے قتل کر دیں پھر میرا پیٹ چاک کر دیں پھر مجھے مسخ کر دیں اور اس حالت میں تجھ سے ملوں تو تو مجھ سے سوال کرے کہ کس کے لیے قتل ہوئے ہو؟ اور میں جواب دوں تیرے لیے! سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن جحش کی یہ دعا قبول ہوئی اور ویسا ہی ہوا جیسے انھوں نے چاہا تھا۔

صفوان بن محرز مازنی فرمایا کرتے تھے جتنی دیر میں گھر آکر بیوی کے پاس بیٹھوں اور ایک چپاتی لے کر کھالوں بس اتنی سی مدت کے لیے اس دنیا میں کسی بندے کو برائی کا موقع ملتا ہے اور اس سے مدت بڑھنے نہیں پاتی کہ وہ یہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔

ابو فروہ رضی اللہ عنہ صحابیٔ رسول ؐ تھے اور بنی سلیم کے غلام تھے۔ ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اللہ کا ذکر کیے بغیر ایک میل چلے تو پھر سے واپس ہو کر آغازِ سفر کیا اور ذکرِ الٰہی بھی کرتے گئے۔ جب منزل پر پہنچے تو اللہ کے حضور عرض کی۔ یا اللہ! ابو فروہ کو نہ بھلانا کہ اس نے تجھے نہیں بھلایا۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ پر ایک قبر کے پاس بے ہوشی طاری ہو گئی لوگ ان پر رونے دھونے لگے جب ہوش میں آئے تو کہا ہر نکلنے والی جان اور ہر رینگنے والے جانور کی جان مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہے۔

کسی نے پوچھا ایسا کیوں ہے تو جواب دیا: اس لیے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی ایسا لمحہ نہ آجائے کہ جس میں مجھ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہ ہو سکے۔

---

(۱) واضح رہے کہ یہاں عجم کے لوگوں سے مراد عجم کے وہ لوگ ہیں جو مسلمان نہ تھے۔ (مترجم)

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ابو رواحہ رضی اللہ عنہ اچانک رو پڑے۔ انہیں دیکھ کر ان کی اہلیہ بھی رو پڑیں آپ نے پوچھا رونے کا سبب کیا ہے اہلیہ نے کہا اس لیے کہ آپ رو رہے ہیں۔ اس پر آپ نے کہا میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ دوزخ میں داخل کیا جاؤں گا اور نکالے جانے کی خبر نہیں دی گئی۔

تمیم داری رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ساری رات اس طرح گزاری کہ کھڑے رہے اور یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے ہوئے روتے رہے:

"اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"[۱]	"کیا جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں ان جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چیونٹیوں کو کھلاتے تھے۔

ابو رافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! افضل کون ہے؟ آپ نے فرمایا: پاکیزہ دل اور راست گو پاکیزہ دل شخص کی وضاحت کے لیے عرض کیا گیا تو مزید فرمایا: پاکیزہ دل سے مراد ایسا متقی اور صاف باطن بندہ جس کے دل میں کدورت وحسد نہ ہو، اور جو دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت کرتا ہو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے اندر ایسا بندہ سوائے ابو رافع کے اور کوئی نظر نہیں آیا۔

محمد بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو بھلائی عطا کرنا چاہتا ہے تو اس کی طبیعت میں تین خوبیاں پیدا فرما دیتا ہے: پہلی یہ کہ اسے دین فہمی عطا کرتا ہے۔ دوسری یہ کہ اسے دنیا سے کنارہ کش فرما دیتا ہے۔ اور تیسری یہ کہ اسے عیوبِ نفس دیکھنے کی صلاحیت سے نواز دیتا ہے۔

زرارہ بن اوفیٰ رضی اللہ عنہ بنو قشیر کی مسجد میں نماز پڑھا رہے تھے آپ نے جب یہ آیت تلاوت کی تو گر کر جاں بحق ہو گئے۔

---

(۱) الجاثیۃ: ۲۱

"فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ فَذٰلِکَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ"[۱] — پھر جب صور پھونکا جائے گا تو وہ دن کڑا دن ہے۔

حنظلہ کاتب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر تھے آپ نے ہمیں جنت اور دوزخ یاد دلائی اور اس طرح سے یاد دلائی کہ گویا جنت و دوزخ کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ آپ کی مجلس سے اٹھ کر گھر آیا تو ہنسا اور لوگوں سے ملا اس پر میں نے یہ کہا کہ حنظلہ نے منافقت کی۔

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حنظلہ! تجھے کیا ہو گیا؟ میں نے انھیں سارا قصہ سنایا تو فرمایا: بلا شبہ ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ پھر حنظلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں اپنی حالت سے باخبر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے حنظلہ! اگر تم گھروں میں بھی ویسے ہی رہو جیسا کہ میرے سامنے ہوتے ہو تو فرشتے تمھارے بچھونوں پر آکر تم سے مصافحہ کریں۔ (راوی کہتے ہیں) یا آپ نے یہ فرمایا: اے حنظلہ! قیامت، قیامت (یعنی قیامت کو یاد رکھو)

لجلاج رضی اللہ عنہ جن کی کنیت جیسا کہ ابو داؤد سجستانی نے اپنی کتاب میں درج کی ہے، ابو کثیر ہے۔ یہ صحابیٔ رسول تھے، ان کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر تقریباً پچاس برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ایک سو بیس[۱۲۰] برس تھی۔ لجلاج کہتے ہیں کہ میں جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہوں، کبھی پیٹ کو طعام سے نہیں بھرا۔ اور اسی قدر طعام میرے لیے کافی رہتا ہے۔ (زیادہ کی ضرورت سے بے نیاز ہوں)

روایت ہے کہ ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے تیس[۳۰] درہم چھپا کر گھر میں رکھے ہوئے تھے جنھیں وہ بھول گئی۔ ایک سال گذرا تو اسے یاد آئے۔ اور ابو جحیفہ نے اس سے کہا: اے ہذیل کی بہن! تو گھر کے لیے بڑا اثاثہ تیار کرتی رہ اور جب میں مروں گا تو میرا اشمار ذخیرہ اندوزوں کی صف

---

(۱) المدثر: ۸-۹

میں کیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس دنیائے فانی سے رخصت فرما گئے مگر ان کا عہد ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ انھوں نے دینار، درہم، گندم کا آٹا یا جو کچھ بھی اپنے پیچھے نہیں چھوڑا۔

حضرت حکیم ابن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کوئی صبح ایسی مجھ پر طلوع نہیں ہوئی جس میں میرے پاس کوئی حاجت مند یا کسی مسئلے میں مدد طلب کرنے والا نہ آیا ہو۔ مگر میں نے اس طرح کے معاملات کو ایسے مصائب سمجھا کہ جن پر میں اپنے رب سے اجر کی درخواست کرتا ہوں۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے ایک گھوڑا خریدا صرف دو ماہ کی مدت کے لیے۔ جب ان کے اس فعل کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو فرمایا: اسامہ لمبی امید باندھنے والا ہے۔

حضرت بلال و صہیب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ دونوں عرب کے ایک قبیلے میں گئے اور ان سے رشتہ مانگا۔ قبیلہ والوں نے پوچھا: آپ دونوں کون ہیں؟ کہا: بلال و صہیب۔ ہم گمراہ تھے، اللہ نے ہمیں ہدایت فرمائی، ہم غلام تھے اللہ نے ہمیں آزاد فرمایا۔ ہم مفلس تھے ہمیں اللہ نے خوش حالی عطا کی۔ اگر آپ لوگ ہماری شادیاں کردیں تو ہم اللہ کی حمد کرتے ہیں اور اگر ہماری اس اپیل کو مسترد کرتے ہیں تو بھی اللہ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ اہل قبیلہ نے کہا کہ تمھاری شادیاں ہو جائیں گی۔ اس کے بعد خلوت میں حضرت صہیب نے حضرت بلال سے کہا آپ نے قبیلہ والوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلقات کا تو ذکر ہی نہیں کیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ خاموش رہیں، آپ نے سچ بولا اور سچ ہی نے آپ کے نکاح کا بندوبست کردیا۔

حضرت عبداللہ بن ربیعہ اور حضرت مصعب بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں رشتہ مواخاۃ (بھائی چارہ) میں بندھے ہوئے تھے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب میں حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کو دیکھتا تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے حالانکہ یہی مصعب تھے کہ جنھیں مکہ میں میں نے خوشحال زندگی بسر کرتے اور قیمتی اونی شال اوڑھے ہوئے دیکھا تھا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مواخاۃ کے بعد میں مدینہ کی ایک دوکان پر رہٹ سے پانی ڈھونے کا کام کرتا

شام کو ایک مُد کھجور بطور اجرت ملتے تو سیدھا مصعب رضی اللہ عنہ کے پاس لے جاتا۔ اور ایک روز حضرت مصعب بن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے تو ان کے پاس سوائے حیس[1] کے ایک ٹکڑے کے اور کچھ نہ تھا۔ آدھا ٹکڑا حضرت مصعب بن عمر نے خود تناول فرمالیا اور آدھا حضرت عبد اللہ بن ربیعہ کے لیے لے گئے

ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد الرحمٰن بن عوف اور سعد بن ربیع رضی اللہ عنہما کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی دو بیویاں تھیں انھوں نے عبد الرحمٰن بن عوف سے کہا میں اپنا نصف تمھیں دیتا ہوں اور میں ایک بیوی کو طلاق دے دیتا ہوں تاکہ تو اس سے نکاح کرے۔ مگر حضرت عبد الرحمٰن نے ایسا نہ کیا اور کہا، سعد مجھے بازار کا راستہ بتا دو۔ وہ آپ کو بازار لے گئے اور چند ہی دنوں میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے کھجور گھی اور پنیر کی اچھی خاصی مقدار کما لی۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایک مہمان آیا۔ آپ گھر تشریف لے گئے مگر وہاں کھانے کی کوئی چیز نہ ملی۔ اسی وقت انصار کا ایک شخص آیا جو مہمان کو اپنے گھر لے گیا۔ اس نے مہمان کے سامنے کھانا رکھ دیا اور بیوی سے کہہ دیا کہ چراغ بجھا دے۔ اندھیرے میں وہ بھی مہمان کے ساتھ اس طرح ہاتھ چلاتا رہا کہ جیسے کھانا کھا رہا ہو۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے اس شخص سے کہا: اللہ کو تمھاری مہمان نوازی کا یہ عجیب انداز پسند آیا اور اسی بارے میں یہ آیت نازل فرمائی:

"وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ"[2]	اور اپنی جانوں پر ان کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں شدید محتاجی ہو۔

عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک صحابی کو کسی شخص نے بکری کا سر تحفۃً دیا جسے انھوں نے یہ کہہ کر دوسرے صحابی کو بھجوا دیا کہ میرے بھائی کو اس کی مجھ سے زیادہ

---

(۱) حیس: کھجور، ستو اور گھی سے تیار کیا گیا طعام۔ (مترجم)

(۲) الحشر ۹:

ضرورت ہے۔ اسی طرح یہ صحابہ کرام کے سات مختلف گھروں میں گھومتا رہا اور آخر اسی
شخص کے پاس پہنچا جس نے اسے تحفۃً پہلے صحابی کو پیش کیا تھا۔ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ مذکورہ
بالا آیت مبارکہ انہی صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

مختصراً یہ کہ سطور مذکورہ میں تمام وہ احوال و اخبار جو ہم نے صحابہ کرام سے متعلق ہدیۂ قارئین
کیے وہ اپنی جگہ مختلف لطیف اشارات و نکات کے حامل ہونے کے باعث ہر دور میں صوفیائے کرام
اور سالکین و طالبین کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے رہے ہیں۔

۳۵

آدابِ صوفیہ

ارشادِ خداوندی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (۱) — اے ایمان والو! اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ....

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفسوں کو ادب سکھاؤ اور انھیں علم سے آراستہ کرو کہ اس طرح تم انھیں جہنم کی آگ سے محفوظ کر لو گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کسی والد نے کوئی ایسا بچہ نہیں جنا جو اچھے آداب سے بہتر ہو۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کا ایک اور فرمان ہے: اللہ نے مجھے ادب سکھایا اور بہترین ادب سکھایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہترین ادب سکھائے جانے میں دوسرے انبیائے علیہم السلام سے اس طرح ممتاز ہیں کہ انھیں ادب سکھایا گیا یعنی بہترین ادب کا امتیاز آپ ہی کی ذات گرامی کو حاصل ہے۔

محمد بن سیرین سے دریافت کیا گیا کہ کون سے آداب اللہ سے قریب تر اور اس کے حضور

بندے کی قربت کا باعث بنتے ہیں۔ آپ نے کہا : اس کی ربوبیت کی معرفت، اطاعت شعاری، خوشحالی پر شکر اور مصیبت پر صبر کرنا ایسے آداب ہیں جو اللہ سے قریب تر اور بندے کے لیے اس کی قربت پانے کا باعث ہیں۔

حضرت حسن بصری علیہ الرحمہ سے پوچھا گیا کہ وہ کون سے آداب ہیں جن کے ذریعے بندہ اس دنیا میں فائدہ اٹھا سکے اور آخرت کے روز اللہ سے قریب تر ہو سکے؟ آپ نے کہا: دین کی سمجھ حاصل کرنا کیونکہ یہ سیکھنے والوں کو اللہ کے طرف لے جاتا ہے۔ اور دنیا سے کنارہ کشی کرنا کہ یہ بندے کو اپنے رب سے قریب کر دیتی ہے اور ایمان کامل سے اللہ کی معرفت حاصل کرنا۔

سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ کے اس پر کیا حقوق ہیں اور نہ ہی اس نے اوامر و نواہی کی پابندی کی ہو تو بلاشبہ ایسا شخص آدب سے خالی ہے۔

کلثوم غسانی کہتے ہیں : آداب دو طرح کے ہیں ایک قولی دوسرے فعلی، جس نے ادب کو صرف قول تک محدود رکھا وہ عملی ادب کے ثواب سے محروم رہا اور جس نے عملی ادب کو ذریعۂ قرب خدا بنایا اسے اللہ دلوں کی محبت عطا فرماتا ہے، اس کے عیوب دور فرما دیتا ہے اور اسے معلمین کے لیے مخصوص کئے گئے ثواب میں شامل کر دیتا ہے۔

ابن مبارک نے کہا : ہمیں زیادہ علم حاصل کرنے سے بڑھ کر تھوڑے سے آداب سیکھنے کی بہت ضرورت ہے

آپ ہی کا ایک اور قول ہے : آدب سیکھنا ایک عارف کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک مبتدی کے لیے توبہ کی ہے۔

ادب فقراء کے لیے سند اور اغنیاء کے لیے زینت ہے۔ اور لوگ ادب رکھنے کے لحاظ سے مختلف ہیں اور انھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اہلِ دنیا، اہلِ دین اور اہلِ دین میں سے بھی خصوصی لوگ۔ اہل دنیا کے آداب تو زیادہ تر فصاحت، بلاغت، علوم بادشاہوں کے قصوں۔ اشعارِ عرب اور مختلف صنعتوں سے باخبر ہونے پر مشتمل ہوتا ہے۔

اہل دین کے آداب ، ریاضتِ نفس ، تادیبِ اعضاء ، صاف باطنی ، پابندی حدود ، ترکِ خواہشات ، مشکوک چیزوں سے پرہیز ، اور نیک کاموں کی طرف سبقت کرنے پر مشتمل ہوتے ہیں۔

سہل بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا : جس نے اپنے نفس کو ادب کے ذریعے مغلوب کیا وہ اللہ کی عبادت اخلاص کے ساتھ کرتا ہے ۔ اور آپ ہی کا قول ہے کہ یہ اہل دین اللہ کی طرف سے واقع ہر امر پر اللہ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ کی طرف سے ان پر واقع ہو اسی پر صابر رہتے ہیں ۔

آداب میں سے عمدہ ترین آداب توبہ ، اور نفس کو خواہشات سے باز رکھنا ہے ۔

ایک صوفی سے پوچھا گیا نفس کا ادب کیا ہے ۔ انھوں نے فرمایا : نفس کا ادب یہ ہے کہ تو اسے بھلائی سے آگاہ کرے اور بھلائی کے کاموں پر ہی اسے ابھارتا رہے ۔ اسی طرح اسے برائی سے بھی مطلع کرے اور اسے شر سے دور رکھے۔

ادب ہی سے اشیاء کا کمال ہے ۔ اور یہ انبیاء وصدیقین کی خصوصیات میں سے ہے۔

تیسرا طبقہ اہل ادب میں سے خواص اہل ادب ہیں ۔ ان کے آداب میں خلوصِ قلب ، حفاظت اسرار ، ایفائے عہد ، حفظِ وقت ، خیالات واسباب کی جانب بے توجہی ، ظاہر وباطن میں ہم آہنگی اور اوقات ومقاماتِ قرب وحضور اور وصل میں حسن ادب کو پیش نظر رکھنا شامل ہے ۔

میں نے احمد بن محمد بصری سے اور انھوں نے جلاجلی بصری کو یہ کہتے ہوئے سنا : توحید ایمان کا موجب ہے ۔ لہٰذا جس کے پاس ایمان نہیں وہ توحید سے بھی محروم ہے ۔ پھر ایمان موجب شریعت ہے اس لیے جس کی کوئی شریعت نہیں اس کا ایمان بھی گیا اور توحید بھی جاتی رہی ۔ اسی طرح شریعت باعث ادب ہے ۔ گویا جس کا دامن جوہر ادب سے خالی ہے اس کے پاس شریعت ، ایمان اور توحید تینوں نہ رہے ۔

ابو العباس ابن عطا سے پوچھا گیا کہ ادب کی ماہیت کیا ہے ۔ آپ نے فرمایا : پسندیدہ امور پر قائم رہنا ، پوچھا گیا پسندیدہ امور پر قائم رہنا کیا ہے ؟ جواب دیا : تو ظاہری اور باطنی طور پر اللہ کے ساتھ جو معاملہ بھی کرے اسے ادب کے ساتھ انجام دے ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو ادیب کہلاؤ

گے چاہے تم عجمی بھی کیوں نہ ہو۔ پھر آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

اذا انطقت جاءت بکلّ ملاحتٍ

و ان سکتتْ جأَتْ بکلّ جمیلٍ

(جب محبوبہ گویا ہو تو حسن بکھیرتی ہے اور خاموش ہو تو پیکر جمال بن جاتی ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ صوفیہ کے سفر، حضر، اوقات، عادات، اخلاق اور سکون و حرکت کے اپنے مخصوص آداب ہیں جن کی بنا پر وہ دیگر لوگوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

۳۰۶

صوفیہ کے آدابِ طہارت و وضو

سب سے پہلا قرینہ جو وضو کے باب میں درکار ہے وہ علم کا حاصل کرنا یعنی وضو کے فرائض سنن، مستحبات، مکروہات اور ان تمام باتوں کا جاننا نہایت ضروری ہے جن کا حکم دیا گیا ہو اور جن میں فضیلت حاصل کرنے کی طرف رغبت دلائی گئی ہو۔ مذکورہ تمام امور کی تفصیل سے باخبر ہونے کے لیے انھیں سیکھنا، ان کے بارے میں سوال کرنا، ان پر بحث کرنا اور ان کے انجام دینے کے لیے اہتمام کرنا بے حد ضروری ہے۔ تاکہ اس طرح قرآن وسنت میں موافقت پیدا کی جاسکے، بہترین اتباع کا فریضہ انجام دیا جاسکے۔ اور ان لوگوں پر الزام رکھنے یا انھیں ملامت کرنے سے احتراز کیا جاسکے جو اس سلسلے میں انتہائی حزم واحتیاط اختیار نہ کرسکے ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح یہ بات پسند ہے کہ اس کے لازم کردہ امور کو انجام دیا جائے اسی طرح وہ یہ بھی پسند فرماتا ہے کہ اس کی دی ہوئی آسانیوں سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔

عامۃ المسلمین کے لیے یوں تو ضروری ہے کہ وہ اللہ کے عائد کردہ اشغال وافعال پوری تندہی سے پوری کریں تاہم انھیں جہاں جہاں اللہ کی طرف سے سہولت ورخصت دی گئی ہو وہ اس سے فائدہ حاصل کریں۔ اور اس میں ان پر کوئی گرفت نہ ہوگی۔

مگر صوفیہ کرام کہ جنھوں نے اسباب کو ترک کیا، دنیوی مصروفیات سے کنارہ کش ہوئے خود کو صرف عبادت کے لیے فارغ کیا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ پرہیزگاری، پاکیزگی، وضو کے لیے اہتمام اور نظافت وطہارت کے معاملے میں احتیاط کو کسی طرح بھی ہاتھ سے جانے دیں۔ الغرض وہ لوگ جن کو مذکورہ اشغال کے سوا کوئی اور مصروفیت نہ ہو ان کو چاہیے کہ ان اشغال میں اپنی

تمام تر کوششیں صرف کردیں۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

"فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ"[1] تو اللہ سے ڈور جہاں تک ہو سکے۔

میں نے ایک جماعت کو دیکھا جس کے افراد ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرتے اور نماز کا وقت شروع ہونے سے پہلے وضو کرنا شروع کر دیتے اور جوں ہی وضو سے فارغ ہوتے متصلاً نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے اور ہر وقت سفر ہو کہ حضر ہر جگہ با وضو ہی رہتے کیونکہ وہ یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ نہ جانے کب موت آجائے۔

جیسا کہ فرمان رب العزت ہے :

"فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ"[2] تو جب، ان کا وعدہ آئے گا۔ ایک گھڑی نہ پیچھے ہو نہ آگے۔

اسی لیے وہ ہر وقت باوضو رہتے تھے کہ اگر اچانک انھیں کہیں بھی موت آجائے تو وہ اس دینا سے پاکیزہ حالت میں رخصت ہوں۔

میں نے حصری علیہ الرحمہ کو کہتے سنا کہ بسا اوقات جب میں رات کو جاگ رہا ہوتا ہوں تو مجھے نیند نے کبھی نہیں ستایا مگر جوں ہی میں اٹھ کر وضو تازہ کرتا ہوں تو نیند اپنا حملہ شروع کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حصری علیہ الرحمہ باوضو سوتے، اور وہ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوتے جب وضو ٹوٹ چکا ہوتا تو وہ اسے تازہ کر لیتے ہیں۔ گویا انھوں نے اپنے نفس کو ایسی تربیت دی تھی کہ اگر ان کا وضو جاتا رہتا تو انھیں نیند ہی نہ آتی۔

ایک جلیل القدر صوفی کو وضو کی تکمیل میں وسوسہ لاحق رہتا تھا وہ وضو کرتے وقت بہت زیادہ پانی استعمال کرتے تھے ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ میں ایک رات نماز عشار کے لیے وضو کرنے بیٹھا اور اعضار پر پانی ڈالتا رہا حتیٰ کہ ایک پہر رات ڈھل گئی یہ میں مطمئن ہوا اور نہ ہی میرا وسوسہ ختم ہوا، میں رو پڑا اور اللہ کے حضور عرض کیا۔ اے میرے اللہ! میں تجھ سے عفو کا خواستگار ہوں۔ اسی

---

(۱) التغابن : ۱۶ (۲) الاعراف : ۳۴

وقت ہاتف نے ندا دی کہ اے فلاں! عفو علم میں پوشیدہ ہے یعنی علم پر عمل کرنے میں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بزرگ ابو علی رودباری تھے۔

شیطان انسان کے ہر عمل میں سے اپنا حصہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ اللہ کی جانب سے دیئے گئے احکامات پر زیادہ عمل کرتے ہیں یا کم۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ کے استاد ابن الکرینی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شب وہ ایک موٹی بھاری بھرکم چادر اوڑھ کر سو رہے تھے کہ انھیں جنابت لاحق ہو گئی اٹھ کر دجلہ کے کنارے آئے۔ رات کا وقت تھا، سردی زوروں پر تھی، سردی کی وجہ سے ان کے نفس نے پانی میں بھیگنے سے انکار کر دیا۔ ایسے میں انھوں نے اس بھاری چادر سمیت دریا میں چھلانگ لگا دی اور خوب غوطے کھائے۔ پھر پانی سے نکلے تو فرمایا، میں نے یہ عزم کیا ہے کہ اس وقت تک اس چادر کو نہیں اتاروں گا جب تک یہ میرے بدن پر ہی خشک نہ ہو جائے کہتے ہیں کہ اس کے سوکھنے میں پورا ایک ماہ گذرا انھوں نے سردی میں اپنے نفس کے ساتھ یہ عمل صرف تادیباً کیا تھا کیونکہ نفس نے جنابت کے وقت غسل کے واجب ہونے پر غسل کرنے میں ہچکچاہٹ کی تھی۔

سہل بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو زیادہ پانی پینے پر ابھارتے رہتے تھے۔ اور زمین پر پانی کم پھینکنے کے لیے کہا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے۔ کہ پانی زندہ ہوتا ہے اور اس کی موت اس کو زمین پر گرا دینے میں ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ بکثرت پانی پینے سے نفس کمزور پڑ جاتا ہے۔ اور شہوات مر جاتے ہیں۔

ابو عمر زجاجی کئی برس تک مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے مجاور رہے آپ قضائے حاجت کے لیے حرم سے ایک فرسنگ باہر نکل جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ پورے تیس برس میں ایک بار بھی آپ نے حدودِ حرم میں قضائے حاجت نہیں کی۔

ابراہیم خواص علیہ الرحمہ جب بھی جنگل یا صحرا کی طرف جاتے تو اپنے ساتھ پانی کی ایک چھاگل ضرور رکھتے، بسا اوقات ایسا ہوتا کہ وہ پانی تھوڑا سا پی لیتے اور زیادہ پانی وضو کے لیے بچا رکھتے۔ اور اکثر و بیشتر انھوں نے شدید پیاس پر وضو کو ترجیح دی۔

میں نے ایک جماعت کو دیکھا جو ہمیشہ نہروں اور دریاؤں کے کنارے کنارے سفر کرتی رہتی۔ اور ان کے پاس ہر وقت ان کے کوزے یا چھاگل میں پانی موجود رہتا۔ وہ دریاؤں کے کنارے بھی ہر وقت کوزے میں پانی اسی لیے موجود رکھتے تھے کہ بعض اوقات رفع حاجت کی شدید ضرورت پڑتی تو وہ دریا کے کنارے لوگوں کے سامنے بے پردہ ہونے سے گھبراتے تھے۔ ایسے میں وہ اپنا کوزہ لے کر ایک طرف چلے جاتے اور استنجاء وغیرہ کر لیتے۔ اور وہ رفع حاجت کے بعد شرمگاہ کو دھوتے وقت زیادہ ملنے سے اجتناب کرتے اور اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ایسا کرنے سے رگیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور پیشاب کے قطرے کو نہیں روکا جاسکتا۔ اور پیشاب کو روکنے میں شدت کرنے سے صوفیہ اجتناب کرتے ہیں ہاں اس صورت میں اجازت ہے کہ حالتِ اضطراری ہو یا پانی کی تنگی ہو۔

میرے نزدیک چادر کے مقابلے میں طہارت کے بعد شلوار کا پہننا زیادہ پسندیدہ عمل ہے۔ اور رفع حاجت کے وقت چادر اتارنے میں آسانی رہتی ہے۔

ہر اس چیز کے استعمال سے پرہیز کیا جائے جس میں خشک یا گیلے اور زیادہ یا کم، خنزیر کے بالوں کو استعمال کیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ چمڑے کے جوتے استعمال کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب تو کسی صوفی کو بغیر کوزے یا چھاگل کے دیکھے تو جان لے کہ اس صوفی نے بے پردگیٔ شرمگاہ اور نماز نہ پڑھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

میں نے ایک مقام پر جمع زہاد کی جماعت میں ایک شخص کو دیکھا کہ جسے کسی نے بیت الخلاء کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور نہ وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس کی وجہ تھی کہ اس نے خود کو ایک مقررہ وقت تک کے لیے اٹھا رکھنے کی عادت ڈالی ہوئی تھی جب بیت الخلاء خالی ہوتا تو وہ دن میں ایک ہی بار اپنے مقررہ وقت پر جاتا اور رفع حاجت کے بعد وہاں سے نکلتا۔

میں نے ایک ایسے شخص کو بھی دیکھا جس نے کبھی ویرانے میں کسی تنہا جگہ کے علاوہ کہیں رفع حاجت کے بغیر ریح خارج نہیں کی۔

کہتے ہیں کہ ابراہیم خواص علیہ الرحمہ مکہ سے تنہا کوفہ کی طرف نکلتے اور انھیں تمام راستے میں تیمم کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ ان کے پاس وہ پانی وضو کے لیے محفوظ پڑا ہوتا تھا جسے

وہ پینے کے لیے ساتھ لے کر چلتے تھے۔

کہتے ہیں کہ شیوخ کی ایک جماعت حماموں میں جانے سے نفرت کرتی تھی، صرف اس وقت حمام میں جاتے جب جانا ضروری ہوتا اور اضطراری کیفیت ہوتی تھی۔ وہ کبھی بھرے حمام میں داخل نہ ہوتے۔ اگر داخل ہوتے تو اس وقت تک کپڑے نہ اتارتے جب تک حمام کے تمام لوگ باہر نہ نکل جاتے۔ وہ ملازمین حمام کو کبھی اپنا جسم چھونے نہ دیتے تھے۔ اور قبل اس کے کہ وہ ان پر پانی ڈالنے کیلئے آگے بڑھتے وہ انھیں ان کے معاوضے ادا کر کے رخصت کر دیتے۔ اور اگر صوفیہ جماعت کی صورت میں ہوتے تو وہ خود ایک دوسرے کا جسم مَل کر صاف کر دیتے۔ اور اگر حمام میں کبھی کوئی ان کے علاوہ بھی موجود ہوتا تو وہ دیوار کی طرف منہ کر کے غسل کرتے تاکہ مبادا ان کی نظریں لوگوں کے ننگے جسموں پر پڑ جائیں۔

اسی طرح صوفیہ کی ایک اور جماعت تھی جو حمام میں داخل ہوتے تو کسی کو بغیر چادر باندھے نہانے کی اجازت نہ دیتے۔

بغلیں صاف کرنا اور زیرِ ناف بالوں کا مونڈنا مستحب ہے۔ اور جو اچھی طرح نہ مونڈ سکے وہ خلوت میں بال صاف کرنے والا سفوف استعمال کر کے بالوں کو اچھی طرح صاف کرے۔

کہتے ہیں کہ سہل بن عبداللہ کے ساتھی آپس میں ایک دوسرے کے سر کے بال مونڈ لیتے تھے۔ میں نے عیسٰی قصار دینوری سے سنا۔ انھوں نے کہا کہ سب سے پہلے جنھوں نے میری مونچھوں کے لٹکے ہوئے بالوں کو تراشا وہ حضرت شبلی علیہ الرحمہ تھے جب کہ ان دنوں میں ان کی خدمت کیا کرتا تھا۔

سر میں مانگ نکالنے کو جماعتِ شیوخ نے سنت قرار دیا ہے۔ مگر اسے نوجوانوں کے لیے مکروہ اور بوڑھوں کے لیے مستحسن ٹھہرایا ہے۔ بشرطیکہ بوڑھے لوگ اسے سنت جان کر اختیار کریں۔

ایک شیخ کا قول ہے: مان لیا کہ فقر اللہ کی جانب سے ہے مگر اس میلے کچیلے رہنے کا کیا مطلب؟ صوفیہ کے ہاں عزیز ترین چیز، صفائی، پاکیزگی، کپڑوں کا دھونا، پابندیٔ مسواک، بہتے پانی کے کنارے فروکش ہونا۔ کھلی فضا، ایک طرف کو الگ تھلگ مساجد، گرمیوں سردیوں ہر جمعہ کے روز غسل،

اور خوشبو ہے بلاشبہ صاف ترین پانی، جاری پانی ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ غسل کرنے میں پابندی تجدید وضو اور وضو کرتے ہوئے پانی کا اعضاء پر اچھی طرح بہانا صوفیہ کا مرغوب عمل ہے۔ اگر کوئی شخص جاری پانی تلاش کرے، بدلی ہوئی رنگت والے پانی کو استعمال نہ کرے۔ پاکیزہ جگہوں کی جستجو کرے، اعضائے ظاہری کو اچھی طرح مل کر صاف کرے، اندرونی اعضاء کو پوری طرح دھوئے، ناک کی جڑ تک پانی پہنچائے اور تمام اعضاء پر سے پانی گذارے تو یہ کوئی وہم یا وسوسہ نہیں۔ بلاشبہ پرہیزگاری اور صفائی پسندی اس وسوسے میں شامل نہیں جسے اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ جو کچھ بیان کیا گیا وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق ہے۔

"فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ"[1] تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔

ممنوعہ وسوسہ وہ ہے جو علم شریعت کی حد سے باہر لے جائے یا فضائل کی تلاش میں تحصیل و فرائض کی انجام دہی سے غافل کر دے یا تو ایسے لوگوں کی نماز باطل قرار دے دے جو ایک صاع یا ایک مد پانی سے وضو کر کے نماز ادا کریں۔ صحیح یہ ہے کہ بندہ وہ کچھ کرے جو موقع و وقت کے لحاظ سے اُولیٰ ہو۔ اگر پانی دستیاب ہو تو احتیاط کے ساتھ وضو پر اس قدر پانی صرف کرے کہ دل مطمئن ہو جائے۔ اگر زیادہ پانی نہ مل سکے تو بہتر یہی ہے کہ جس قدر میسر ہو اسی سے وضو کو تازہ کر کے نماز ادا کر لی جائے جیسا کہ حدیث نبوی میں بیان کیا گیا کہ صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو کرتے تو اس سے مٹی بھی اچھی طرح گیلی نہ ہو پاتی تھی۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کے چہرے پر زخم تھا جو عرصہ بارہ برس گذرنے کے بعد بھی ہرا تھا اس کی وجہ یہ تھی وہ شخص ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرتا اور پانی مسلسل زخم کو پہنچتا رہا۔

میں نے ابوعبداللہ رازی مقری کو دیکھا جن کی آنکھوں میں پانی اتر گیا تھا۔ لوگوں نے بہت سے دینار خرچ کر کے ان کے لیے ایک طبیب کا بندوبست کیا۔ طبیب آیا تو یہ ہدایات دیں کہ مریض کو کچھ دنوں تک پانی چھونے نہ دیا جائے اور وہ پیٹ کے بل اوندھا لیٹا رہے مگر انھوں نے ان ہدایات پر عمل نہ کیا اور ترکِ وضو پر بینائی کھو دینے کو ترجیح دی۔

---

(۱) التغابن : ۱۶

ابراہیم بن ادہمؒ نے ایک رات اس طرح حالتِ قیام میں گذاردی کہ ستر بار وضو تازہ کیا
• اور ہر بار دو رکعت نفل بھی ادا کرتے رہے۔

ابراہیم خوّاص علیہ الرحمہ کا جامع رے میں پانی کے اندر غسل کرتے ہوئے انتقال ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ انہیں پیٹ کی بیماری لاحق تھی مگر وہ اس کے باوجود جب بھی موقع پاتے غسل کرنے کے لیے پانی میں داخل ہو جاتے ایک مرتبہ وہ حسبِ معمول پانی میں داخل ہوئے تو وہیں ان کی روح پرواز کر گئی۔

○

۳۷

صوفیہ اور آدابِ نماز

صوفیہ کرام کے آداب نماز میں سے پہلا قرینہ یہ ہے کہ وہ نماز سے متعلق جملہ مسائل مثلاً فرائض سنن آداب، فضائل اور نوافل کا علم رکھتے ہوں۔ اس کے علاوہ انھیں علمار کے مابین اختلافی مباحث سے متعلق معلومات بھی ہونی چاہئیں۔ کیونکہ نماز دین کا ستون، عارفین کی آنکھوں کی ٹھنڈک، صدیقین کے لیے زینت، اور مقربین کے سر کا تاج ہے۔ وقتِ نماز ہی وہ مبارک گھڑی ہوتی ہے جب کہ قرب، وصل، ہیبت، خشوع، خشیت، تعظیم، وقار، مشاہدہ، مراقبہ قلوب کا اللہ سے سرگرشیاں کرنا بارگاہ ایزدی میں حضوری اور ترکِ ماسوا اللہ جیسی اعلیٰ کیفیات طاری ہوتی ہیں۔

عامۃ الناس کو چاہئے کہ وہ اپنے علمار کی تقلید کریں، فقہار سے مسائل پوچھیں اور اللہ کی جانب سے امورِ دین میں جس قدر رخصتیں عطا کی گئی ہوں ان کے بارے میں اپنے علمار و فقہار کے اقوال پر اعتماد کریں۔

جہاں تک اہل تصوف کا تعلق ہے تو انھیں نماز کے آداب، تکلفات، اہتمام فرائض، سنن نوافل اور دیگر تمام قرینوں کا پورا پورا خیال رکھنا چاہئے کیونکہ انھیں اِن آداب کی بجا آوری کے سوا اور کوئی مصروفیت نہیں ہوتی اور وہ باقی سب کچھ ترک کر چکے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ انھیں کسی اور کام کی اہمیت نماز کی اہمیت سے زیادہ معلوم ہونے لگے۔

صوفیہ کے لیے آداب نماز یہ ہیں کہ وہ سب سے پہلے نماز کا وقت شروع ہونے سے قبل اٹھ کھڑے ہوں اور تیاری میں مصروف ہو جائیں تاکہ نماز کا اولین وقت ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ جو کہ پسندیدہ وقت نماز ہوتا ہے۔ مقررہ وقت کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ صوفی کو کسی قدر سائے کے

گھٹنے بڑھنے کے علم سے واقفیت ہوتا کہ وہ ہر موسم کے لحاظ سے وقت کا تعین صحیح طور پر کر سکے اس کے ساتھ اسے علمِ فلکیات سے واقفیت رکھنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ جان سکے کہ نجوم منازل قمر اور طلوع و غروب کیا ہیں۔

اسی طرح اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ منازل قمر میں سے ہر ستارے کے طلوع کا کیا وقت ہوتا ہے؟ تاکہ وہ رات کو ستاروں کی جانب دیکھے تو اسے معلوم ہو سکے کہ کتنی رات گذر چکی اور کس قدر وقت صبح میں باقی ہے۔

اس کے علاوہ صوفی کو علم القطب والکواکب سے بھی واقفیت ہونی چاہئے۔ جس کے ذریعے قبلہ کا تعین کیا جا سکے اور اسے قبلہ کے صحیح رُخ کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ کعبہ سے ہر شہر کی سَمتِ وقوع کو نہ جانتا ہو اور کعبہ سے کسی شہر کی سَمتِ وقوع کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی تلاش کعبہ سے لے کر اس شہر تک کرے اور پھر یہ بھی معلوم کرے کہ کعبہ سے اس شہر کے وقوعِ سمت کے ساتھ وہ ایک معینہ وقت میں قطب، جدی فرقدین کے مقابل ہوتا ہے۔

سیّار ستاروں کے ذریعے بھی رات کے وقت رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور سمندر میں کشتیوں پر سواری کے دوران بھی ان سیّار ستاروں کا علم ہونا چاہئے۔

سہل بن عبداللہ کہا کرتے تھے کہ ایک سچے صوفی کی علامت یہ ہے کہ اس کے تابع ایک جن ہوتا ہے جو نماز کے وقت اسے بیدار کرتا ہے۔

صوفیہ میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو رات دن اوراد، عبادت، ذکر اور تلاوت کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ عبادت کرنا اس کی عادت بن جاتی ہے۔ اور وہ ہر عبادت کو مقررہ وقت پر ادا کرنے میں بالکل غلطی نہیں کرتے۔

نماز شروع کرنے کے آداب میں سے ہے کہ تکبیر تحریمہ اور نیت دونوں کو اس طرح ایک ساتھ ادا کیا جائے کہ نیت تکبیر سے پہلے نہ ہو بلکہ بیک وقت نیت اور تکبیر واقع ہوں۔

حضرت جنید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہر چیز میں ایک مستحب حصہ ہوتا ہے۔ نماز میں سے جو چیز سرفہرست ہے وہ تکبیر اولیٰ ہے۔ اس لیے کہ تکبیر اولیٰ نیت سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اور

نیت اس قدر اہم ہے جس کے بغیر نماز جائز نہیں ہوتی۔ نیت ایک طرح کا عہد ہوتا ہے کہ بندے کی نماز صرف اللہ کے لیے ہے۔ جب یہ عہد صحیح ہو اور اس کے بعد نماز میں اگر آفات و وساوس داخل ہوں تو اگرچہ ان سے نماز فاسد نہیں ہوتی مگر فضائل میں کمی ہو جاتی ہے اور نمازی کے لیے صرف نیت اور عہد ہی باقی رہ جاتا ہے۔

میں نے ابن سالمؒ سے سنا انھوں نے فرمایا کہ نیت اللہ کے لیے اسی کے ذریعے اور اسی سے ہوتی ہے اور وہ آفات و وساوس جو نیت کے بعد بندے کی نماز میں دشمن کی جانب سے داخل ہوتے ہیں اس کا وبال دشمن ہی کے سر ہوتا ہے۔ اور اگر دشمن کی جانب سے یہ وسوسے زیادہ بھی ہوں تو اس نیت کے برابر نہیں ہو سکتے جو اللہ کے ساتھ اللہ کے لیے اور اللہ کی جانب سے ہو چکی ہے یہ نیت ان وساوس سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

ابو سعید خرازؒ سے پوچھا گیا کہ نماز کو کس طرح ادا کیا جائے؟ انھوں نے فرمایا: نماز کو اس طرح شروع کرو گویا کہ تم اللہ کے سامنے روز قیامت کی حاضری کی طرح حاضر ہو۔ اور تم اس طرح اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کہ تمھارے اور اللہ کے درمیان کوئی ترجمان نہیں وہ تمھاری بات کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔ اور تمھیں یہ بھی علم ہو کہ کس عظیم حاکم کے حضور میں تم حاضر ہو۔

کسی عارف سے تکبیر اولیٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: جب تو اللہ اکبر کہے تو چاہیے کہ اللہ کے الف کے ساتھ تعظیم، لام کے ساتھ ہیبت اور ہا کے ساتھ مراقبہ و قرب کی کیفیات کا تعلق قائم ہو۔

ایک اور بزرگ نے فرمایا: جب تکبیر اولیٰ کہے تو یہ سمجھ کہ اللہ تجھے دیکھ رہا ہے، تیرے ضمیر سے واقف ہے اور اپنے دائیں طرف یہ تصور کر کہ جنت ہے اور بائیں طرف یہ خیال کر کہ دوزخ ہے۔

آداب نماز میں سے ایک یہ ہے کہ نماز ادا کرتے وقت بندے کے دل میں ماسوا اللہ نہ ہو۔ اور گویا وہ اس کے سامنے ہے اس کی جملہ گفتگو کو سن رہا ہے۔ اور ہر آیت کے ہر ہر لفظ سے ذوق معنی و فہم پاتا ہے۔

ابو سعید خرازؒ نے اپنی ایک کتاب "ادب الصلوٰۃ" میں لکھا ہے کہ جب تو تکبیر کے لیے اپنے ہاتھ بلند کرے تو اس وقت تیرے دل میں بجز اللہ کی کبریائی کے اور کچھ نہ ہو۔ اور اس کی عظمت

تیرے اوپر اس قدر چھائی ہو کہ تجھے دنیا و مافیہا بھول جائے۔

میرے نزدیک شیخ مذکور کے قول میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ اگر بندے کے دل میں اس وقت جب کہ وہ اللہ کی عظمت بیان کر رہا ہو کچھ موجود ہوگا تو وہ یہ کہنے میں سچا نہیں کہ اللہ اکبر یعنی اللہ سب سے بڑا ہے۔ پھر اس کے بعد جب آیات الٰہی کو تلاوت کرے تو اس طرح کہ گویا اللہ کے سامنے تلاوت کر رہا ہے یا اللہ سے وہ خود سن رہا ہے۔

ابو سعید خرازؒ ہی کا قول ہے: کہ رکوع کے آداب میں سے ہے کہ بندہ اس طرح جھکا ہو کہ گویا وہ عرش کی جانب رکوع کی حالت میں اللہ کی عظمت بیان (سبحان ربی العظیم) کر رہا ہے۔ اور ایسے میں اس کے دل کی ہر چیز اللہ کی عظمت کے سامنے چھوٹی ہوتی جائے تا آنکہ اس کا اپنا نفس بھی محض ایک غبار یا اس سے بھی کمتر ہو جائے۔ پھر رکوع سے اٹھ کر اللہ کی تحمید (سمع اللہ لمن حمدہ) بیان کرے تو اس طرح کہ اللہ سن رہا ہے۔ اور سجدے میں اس کے دل میں سوائے اللہ کے کوئی شے اس سے قریب تر نہ ہو۔ کیونکہ بندہ اپنے رب سے انتہائی قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اسے اپنی زبان اور دل دونوں سے اضداد کو دور کر دینا چاہیئے۔ پھر اپنی نماز کو اس طرح ختم کرے کہ اس پر خشیت اور اس قدر ہیبت طاری ہو کہ گویا اسے پگھلا دے گی۔ اور نماز کے دوران نماز سے بڑھ کر اس کی کوئی مصروفیت نہ ہو چاہے کوئی چیز اس کے سامنے ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح جب تشہد پڑھ لے، دعا سے فارغ ہو جائے اور سلام پھیرے تو اس طرح کہ یہ یہ جانتا ہو کہ کس سے مخاطب ہے۔ حتیٰ کہ وہ نماز کو اسی نیت و دلجمعی کے ساتھ ختم کرے جس کے ساتھ شروع کی ہو۔

میں نے صوفیہ کی ایک جماعت دیکھی جو نماز میں جلدی کرتی تھی تاکہ وسوسوں سے ان کی نماز پاک رہے اور وہ جلدی سے اسی نیت و ارادے کے ساتھ نماز ختم کر سکیں۔ جس کے ساتھ آغاز کیا تھا۔

نماز کے کچھ اور آداب

جب کوئی بندہ نماز کے وقت سے پہلے جملہ آداب نماز کو اپنے اوپر طاری کیے ہوئے ہو تو اس کی کیفیت بھی نماز ہی شمار کی جائے گی گویا اس کے لیے قیام صلوٰۃ کی حالت نماز سے پہلے کی

حالت سے مختلف نہیں۔

صوفیہ کو چاہئے کہ نماز سے پہلے مراقبہ، حضورِ قلب اور قلب کو عوارض و خواطر سے بچائے رکھنے کی کیفیت میں رہیں تاکہ نماز میں جب نیت کر کے داخل ہوں اور پھر خارج ہوں تو یوں معلوم ہو کہ ایک نماز سے دوسری نماز کی جانب لوٹے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ جتنی دیر نماز کے لیے انتظار کرتا ہے وہ بھی نماز میں شامل ہے۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا جو نماز کے لیے کھڑا ہوتا اور تکبیر اولی کہتا تو ہیبت الٰہی سے اس کا چہرہ کبھی سرخ اور کبھی زرد پڑ جاتا۔ ایک اور شخص کی کیفیت دیکھی کہ نماز کے دوران نیت کو دل سے خارج نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی حفاظت میں اس قدر محو ہو جاتا کہ رکعتوں کی گنتی بھول جاتا اس غرض کے لیے وہ ایک اور شخص کو اپنے پاس بٹھا لیتا جو اس کی رکعتوں کو گنتا رہتا۔

سہل بن عبداللہؒ کا واقعہ ہے کہ وہ اس قدر کمزور تھے کہ اپنی جگہ سے اٹھ نہ سکتے تھے مگر جونہی نماز کا وقت ہو جاتا تو ان کی طاقت مجتمع ہو جاتی اور وہ میخ کی طرح محراب میں سیدھے کھڑے ہو کر نہایت چستی کے ساتھ نماز ادا کرتے اور فارغ ہو جاتے تو پھر وہی کمزوری عود کر آتی۔

میں نے ایک شخص الساوی دیکھا جو جنگل اور بیابانوں میں بھی اپنے جملہ اوراد و وظائف اور عبادات اسی طرح ادا کرتا رہتا تھا جیسے وہ اپنے گھر پر ادا کیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ صوفیہ کی جماعت کو چاہئے کہ سفر و حضر میں اپنے معمولات یکساں طور پر انجام دے۔

صوفیہ میں سے میرا ایک بھائی خلوت نشین تھا۔ اس کی عادت تھی کہ کوئی چیز کھانے پینے پہننے، مسجد میں داخل ہونے، مسجد سے باہر نکلنے، خوش ہونے، مغموم ہونے اور غصے ہونے کے بعد دو رکعت نفل ادا کرتا۔

ہمارے دوستوں کی ایک جماعت نے، جو ابوعبداللہ بن جابانؒ کے ہمراہ سفر کر رہی تھی، مجھے بتایا کہ ہر ایک میل کے فاصلے پر ابوعبداللہؒ پڑاؤ کرتے اور دو رکعت پڑھ کر پھر سے سفر شروع کر دیتے۔

صوفیہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ امامت کریں، مکہ مکرمہ میں اگلی صف میں کھڑے ہوں اور نماز کو طویل کریں۔

امامت سے ناگواری کا اظہار اس لیے کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "امام (مقتدیوں) کا ضامن ہوتا ہے" اسی ذمہ داری کے خوف سے کہ امام مقتدیوں کی جملہ غلطیوں کی تصحیح کے لیے ذمہ دار ہوگا۔ لہٰذا ان میں سے وہ شخص بھی جو حافظِ قرآن ہوتا کسی ایسے کو امامت کے لیے کھڑا کر دیتا جو صرف سورۂ فاتحہ اور ایک اور سورت پڑھنا جانتا۔

اور صوفیہ اگلی صف میں نماز اس لیے ترک کرتے ہیں کہ لوگوں کے لیے رکاوٹ یا تنگی کا باعث نہ بن جائیں، چونکہ لوگ حدیث میں اگلی صف میں نماز پڑھنے کی فضیلت کے پیشِ نظر کوشش کرتے ہیں اور اگلی صف کی طرف بھیڑ کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ لہٰذا صوفیہ ان کے لیے قربانی کرتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ہاں اگر لوگوں کے جگہ لے لینے کے بعد بھی اگلی صف میں کوئی جگہ خالی ہو تو وہ اس فضیلت کو حاصل کرنا غنیمت سمجھتے ہیں۔

صوفیہ نماز کو طویل نہیں کرتے کیونکہ جب نماز لمبی ہو تو شیطانی وسوسے اور برے خیالات انسانی ذہن میں در آتے ہیں۔ اسی لیے صوفیہ کا قول ہے، کہ صحتِ اعمال، طوالت و کثرتِ اعمال سے کہیں بہتر ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے بڑھ کر جلد نماز مکمل کرنے والے تھے۔

میں نے ابن علوان کو یہ کہتے سنا کہ جنید علیہ الرحمہ باوجود ضعف اور کبر سنی کے اپنے اوراد و وظائف کو ترک نہیں کرتے تھے۔ ان سے اس سلسلے میں سوال کیا گیا تو فرمایا، جس طرح میں نے آغازِ عمر میں اللہ کی عبادت کی اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اواخرِ عمر میں وہی حالت قائم نہ رکھوں۔

صوفیہ کے ہاں نماز کی چار خصوصیات ہیں:

۱:۔ حضورِ قلب محراب میں۔

۲:۔ شہودِ عقل وہاب کے پاس۔

۳:۔ خشوعِ قلبی جو شک و ریب سے مبرا ہو۔

۴:۔ اور ارکان میں متواتر خشوع و خضوع۔

کیونکہ حضورِ قلب ہو تو حجابات اٹھ جاتے ہیں، شہودِ عقل میسر ہو تو عتاب سے نجات مل جاتی ہے۔ خشوعِ قلب حاصل ہو تو دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور ارکان نماز کی ادائیگی میں خضوع ہو تو تحفۂ اجر عطا ہوتا ہے۔ گویا جس نے حضورِ قلب کے بغیر نماز ادا کی اس کی نماز رائیگاں گئی، جس نے بلا شہودِ عقل نماز پڑھی اس نے نماز میں غلطی کی، جس نے خشوع کے بغیر فریضۂ صلوٰۃ کا ارادہ کیا وہ خطا کار ٹھہرا، جس نے دورانِ نماز ادائیگی ارکان میں خضوع نہ کیا اس کی نماز کھوکھلی رہی۔ اور جس نے ان چاروں خوبیوں کو نماز میں یکجا کر دیا وہ ایک مکمل ترین نمازی ہے۔

۳۸

صوفیہ اور آدابِ زکوٰۃ وصدقات

زکوٰۃ وصدقات کے سلسلے میں یہ بات آدابِ صوفیہ میں سے ہے کہ ان پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا فریضہ لاگو نہیں کیونکہ زکوٰۃ کی فرضیت دنیوی مال ومتاع پر ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صوفیہ سے اللہ تعالیٰ نے دنیوی اموال کو بالکل دور فرمادیا ہے۔ لہٰذا ان کے لیے زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی کا حکم نہیں۔

مطرف بن عبداللہ علیہ الرحمہ کہتے ہیں: میرے لیے دنیوی ساز وسامان سے محرومی ہی مجھے کچھ عطا کرنے سے بڑی نعمت ہے۔

وجوبِ زکوٰۃ سے متعلق کسی دنیادار کا شعر ہے ؎

وما وجبت علیّ زکوٰۃ مالٍ

وھل تجب الزکوٰۃ علی کریم

(مجھ پر مال کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں۔ اور کیا کسی سخی پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟)

اور یہ دنیادار شخص اس بات پر فخر کرتا تھا کہ اس پر زکوٰۃ بالکل فرض نہیں۔ اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ اس نے اپنے پاس اتنا مال کبھی جمع نہیں رکھا کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو۔

مجھے ابراہیم بن شیبانؒ نے بتایا کہ میں ابوبکر شبلیؒ سے ملا حالانکہ وہ خود شبلیؒ سے لوگوں کو نہیں ملنے دیتے تھے اور نہ ہی ان کی بات کسی کو سننے دیتے۔ ایک روز ابراہیم بن شیبان نے بطور امتحان کے شبلیؒ سے سوال کیا کہ پانچ اونٹوں پر کس قدر زکوٰۃ دینی واجب ہے۔ شبلیؒ نے جواب دیا: ہمارے دین کے اصولوں کے مطابق تو پانچ اونٹوں پر ایک بکری زکوٰۃ کے طور پر ادا کی

جاتی ہے۔ مگر ہمارے لیے پانچ کے پانچ اونٹ ہی ادا کرنا لازم ہے۔ اس پر ابراہیم بن شیبان نے کہا آپ کے سامنے اس کی کوئی مثال بھی ہے۔ شبلی نے کہا: ہاں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مثال میرے سامنے ہے جب انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اپنا سب کچھ پیش کر دیا تھا۔ اس کے بعد ابراہیم بن شیبانؒ نے کبھی ابو بکر شبلی علیہ الرحمہ کے ہاں لوگوں کو جانے سے نہیں روکا۔

صوفیہ کا زکوٰۃ کے بارے میں ایک مؤقف یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ وصول کرتے ہیں اور نہ ہی کسی سے طلب کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے زکوٰۃ میں سے کھانا حلال قرار دیا ہے۔ مگر وہ خود ایسا نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے زکوٰۃ وصول کرنے سے کہیں غریبوں اور مستحقوں کا حق نہ مارا جائے یا ضعیفوں کو کوئی تکلیف لاحق نہ ہو جائے۔

کہا جاتا ہے کہ ایوبؒ کے ساتھی محمد بن منصورؒ کے پاس جب بھی مال زکوٰۃ یا صدقہ وخیرات لے جایا جاتا اور انھیں علم ہو جاتا تو اُسے قبول کرتے اور نہ ہی اپنے ساتھیوں میں تقسیم کرتے۔ کہا کرتے کہ جو چیز میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا اسے اپنے ساتھیوں کے لیے بھی پسند نہیں کرتا۔ اس پر ان کے دیگر ساتھی بھی خاموش رہتے اور کبھی مال زکوٰۃ میں سے بغیر مانگے ملتا تو بھی قبول نہ کرتے۔

میں نے ایک صوفی کو بچشم خود دیکھا کہ وہ ہر سال ایک ہزار دینار اپنے باقی ساتھیوں پر خرچ کرتے تھے اور وہ خلفیہ کہتے تھے کہ کبھی انھوں نے اپنی زکوٰۃ میں سے اپنے ساتھیوں پر خرچ نہیں کیا۔

ابو علی المشتولی کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ صوفیہ پر اس قدر صرف کرتے تھے جس سے مصر کے تاجر بھی حیران تھے۔ اور کہا کرتے تھے جو کچھ وہ ایک بار خرچ کرتا ہے وہ ہمارے مال سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس صوفی پر زکوٰۃ واجب نہ تھی۔

ایک جلیل القدر صوفی کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا: کہ میرے اور ایک امیر آدمی کے درمیان بڑی دوستی تھی، میرے دل میں بھی اس کے لیے محبت و عزت تھی۔ مگر جب وہ زکوٰۃ یا صدقہ تقسیم کرتے وقت مجھے یاد کرتا تو میرے دل میں اس کے لیے محبت اور احترام باقی نہ رہتا۔

میں نے ایک معروف امام کا خط پڑھا جو اس نے ایک مفلس صوفی کے نام لکھا تھا۔ خط کا

مضمون یہ تھا: اے میرے بھائی! میں کچھ مال آپ کی نذر کر رہا ہوں جو زکوٰۃ ہے اور نہ صدقہ و خیرات۔ اور نہ ہی یہ اللہ کے سوا کسی اور کا مال ہے کہ آپ اس کے ممنونِ احسان رہیں گے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسے قبول فرما کر مجھے مسرور فرمائیں۔

اگر صوفیہ کو ایسے لوگوں کی طرف سے جنھیں وہ نہ جانتے ہوں اور ان سے کوئی میل ملاقات بھی نہ ہو بغیر مانگے کچھ ملے تو قبول کر لینا چاہئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھے مال میں سے بغیر مانگے اور کسی کا حق تلف کئے عطا فرمائے اسے قبول کر لے۔ کیونکہ رد کرے گا تو یہ اللہ کی عطاء کو ٹھکرانے کے مترادف ہو گا۔ جب کوئی ایسی چیز قبول کرے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے سے زیادہ مستحق کے حوالے کر دے اور وہ خود کھائے تو بھی اس کے لیے حلال ہے۔

میں نے ابوبکر محمد بن داؤد دینوری دقیؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابوبکر فرغانیؒ کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہوتا تھا جس میں رمضان المبارک کے دوران وظیفہ پانے والے مساکین کے نام درج ہوتے تھے۔ وہ ہر رات کو ماہِ رمضان میں اپنا روزینہ وصول کرتے اور سیدھے اپنے پڑوس میں ایک بڑھیا کو دے آتے جس کا نام اس فہرست میں شامل نہ تھا جس میں وظیفہ پانے والوں کے نام لکھے جاتے تھے۔

صوفیہ کا خیال ہے کہ جس نے اللہ سے کچھ لیا، عزت کے ساتھ لیا اور جس نے لوگوں سے کچھ وصول کیا ذلت کے ساتھ وصول کیا۔ جس نے اللہ کے لیے چھوڑ دیا اس نے عزت سے چھوڑ دیا اور جس نے غیر اللہ کے لیے ترک کیا اس نے ذلت کے ساتھ ترک کیا۔ جس نے اپنے لینے اور دینے کے معاملے کو للہ فی اللہ قائم نہ رکھا اس نے غلطی کا ارتکاب کیا اور اللہ ہر خطا کار کو جاننے والا ہے۔ اور اس بات کی تصدیق کہ کوئی شخص اللہ کے لیے لے اسی کی خاطر دے اور اسی کے لیے چھوڑ دے، یہ ہے کہ اس کے نزدیک منع و عطاء اور تنگی و کشادگی یکساں ہوتی ہے۔

صوفیہ کا ایک اور طبقہ ہے جو زکوٰۃ، صدقات، تحائف، بخشش، اور لوگوں کے ایثار و مواساۃ کو قبول کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اغنیاء کے اموال میں سے فقراء کے لیے حق مقرر کیا ہے۔ اگر ہم ان سے کچھ وصول کرتے ہیں تو اپنا حق ہی لیتے ہیں جسے ترک کر دینے کا کیا معنی؟

اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے ہمارے لیے منتخب کیا وہ ہم کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ انھوں نے مزید فرمایا: کہ صدقہ و زکوٰۃ لینے سے انکار اپنے نفس کو زیادہ وقعت دینے اور افلاس و فقر سے نفرت کے مترادف ہے۔

شوقِ فقری

اس ضمن میں ابو محمد مرتعش کا ایک واقعہ ہے کہ وہ اپنے تاجر اور امیر ترین دوستوں کی ایک محفل میں تشریف فرما تھے کہ دفعتہً ان کی نظر محفل سے باہر ایک شخص پر پڑی جو روٹیوں کی خیرات تقسیم کر رہا تھا۔ اٹھے اور فوراً مانگنے والوں کی صف میں گھس کر اپنے لئے روٹی کا ٹکڑا حاصل کر لیا۔ واپس محفل میں تشریف لائے۔ تو دوستوں نے وجہ پوچھی، فرمایا: اگر میں ان مانگنے والوں میں داخل ہو کر خیرات نہ حاصل کرتا تو مجھے خدشہ تھا کہ مبادا میرا نام فقراء کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امراء اور تندرست افراد پر صدقہ و خیرات نہیں ہوتا۔

جو لوگ صوفیہ کے لیے صدقہ و خیرات کو ناجائز بتاتے ہیں۔ وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امیری کثرت مال و متاع کا نام نہیں بلکہ دل کی امیری ہی اصل امارت ہے۔

سہل بن عبد اللہ علیہ الرحمہ اسی ضمن میں کہتے ہیں کہ جو لوگ ہمارے ساتھیوں یعنی صوفیہ کو کچھ دیتے ہیں ان کے لیے ایسا کرنا حرام ہے کیونکہ صوفیہ تو اللہ کی مخلوق میں سب سے بڑھ کر امیر ہیں۔

قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ 'امراء اور تندرست افراد کو صدقہ دینا جائز نہیں' کا مفہوم یہ ہے کہ بنیادی طور پر صدقہ، اپاہج، بیمار اور آفت رسیدہ لوگوں کے لیے ہے۔ اور اس کی تائید اس قولِ خداوندی سے بھی ہوتی ہے جس میں فقیر ہونے کو صدقہ زکوٰۃ کے مستحق ہونے کی مشروط ٹھہرایا:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ"[1] زکوٰۃ تو انہی لوگوں کے لیے ہے (جو) محتاج اور نرے نادار (ہوں)

جہاں تک لفظ فقیر کی لغوی تحقیق کا تعلق ہے تو اس کا مفہوم ہے ایسا شخص جو محروم اور حاجتمند ہو۔ اس کے علاوہ بھی اس لفظ کی تشریحات کی گئی ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ لفظ فقیر فقار الظہر (پیٹھ کی ہڈی) سے ہے۔ فقار ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں اس پر پیٹھ کی ساری قوت کا دارمدار ہوتا ہے۔ اگر یہ ٹوٹ جائے تو ضعف و حاجت مندی لاحق ہو جاتی ہے۔ اور سہارے کے لیے دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقیر بھی اس شخص کو کہتے ہیں جس کی حالت پیچھے بیان کی گئی حالت سے مشابہ ہو۔

بعض لوگ صدقہ وخیرات سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر یہ قول ہوتا ہے کہ صدقہ لوگوں کا میل ہے۔ حالانکہ اس کا معنی یہ ہے کہ صدقے لوگوں کے گناہوں کے بوجھ کو ان مستحق لوگوں کی خاطر دور کر دیا جاتا ہے جنھیں وہ عطا کیا جائے۔ اگر صدقہ فقراء کے لیے نقصان کا باعث ہوتا یا لوگوں کا میل ہوتا یا بے عزتی کا باعث ہوتا تو یہ نیکو کاروں، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لیے بھی ہتک عزت کا موجب ہوتا۔

جس کے پاس دنیوی مال و متاع نہ ہو اور وہ صدقہ وزکوٰۃ کے اجر سے محروم رہ جائے تو ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اقوال و افعال کا صدقہ برقرار رکھا ہے اور اس کا اجر کسی طرح بھی مال و متاع صدقہ کرنے کے اجر سے کم نہیں۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کے لیے آپس میں حسن سلوک اور مدارات کرنا بھی صدقہ ہے۔ اور اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔ اسی طرح اگر تو اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے پیش آئے تو یہ بھی تیرے لیے صدقہ ہے۔ اور اگر تو اپنے مسلمان بھائی کے برتن میں اپنے برتن سے کچھ ڈال دے تو یہ بھی تیرے لیے صدقہ ہے۔

احادیث کی زکوٰۃ

بشر بن حارث کہتے ہیں: اے احادیث رسول اللہ علیہ وسلم جمع کرنے والو! تم بھی احادیث کی زکوٰۃ ادا کیا کرو۔ کسی نے پوچھا کہ حدیثوں کی زکوٰۃ سے آپ کی مراد کیا ہے۔ آپ نے کہا: احادیث کی زکوٰۃ اس طرح ادا کی جا سکتی ہے کہ احادیث جمع کرنے والے ہر سو احادیث کے مجموعے میں سے پانچ احادیث نبوی پر عمل کر لیا کریں۔

جس شخص پر زکوٰۃ واجب ہو اسے چار باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے والا بن سکے۔

۱۔ مالِ زکوٰۃ حلال کی کمائی میں سے ادا کرے۔

۲۔ فخر و غرور یا کسی کو نیچا دکھانے کے لیے مال جمع نہ کیا ہو۔

۳۔ اہل و عیال کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرے۔

۴۔ جسے زکوٰۃ دے اس پر احسان نہ جتلائے۔

حقیقتِ غناء

الغرض زکوٰۃ، اللہ کی جانب سے امراء کے اموال میں غریبوں کا وہ مقررہ حق ہے جسے ادا کر کے گویا امراء غریبوں کو ان کی اپنی ہی دولت لوٹا رہے ہوتے ہیں۔ ادائیگی زکوٰۃ سے رضاءِ الٰہی عطا ہوتی اور حسابِ اعمال سے نجات مل جاتی ہے۔

۳۹

آدابِ صوم اور صوفیہ کرام

سیدالرسل علیہ التحیتہ والسلام نے فرمایا: ارشادِ خداوندی ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ تمام اعمال نیک اللہ ہی کے لیے ہوتے ہیں پھر روزہ کو یہ خصوصیت کیوں دی کہ اس کے بارے میں فرمایا: "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا"

اس کا جواب یہ ہے کہ روزہ سے متعلق مذکورہ قول خداوندی کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا تعلق ظاہری اعضاء کی حرکت سے نہیں جب کہ دیگر فرض عبادات کی ادائیگی کا تعلق اعضاء کی حرکت سے ہے اور اس کا لوگوں کو علم بھی ہو جاتا ہے۔ جب کہ روزہ کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے بندوں کو نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا کہ "روزہ میرے لیے ہے"۔ دوسرا معنی اس قول کا یہ ہے کہ "روزہ میرے لیے ہے" سے مراد ہے صمدیت یعنی بے نیازی میرے لیے ہے۔ (گویا صوم بمعنی صمدیت یعنی بے نیازی ہے) کیونکہ صمد اسے کہتے ہیں جو کھانے پینے سے بے نیاز ہو یعنی اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ جو شخص میری صفات کو اپنا لے اسے میں خود ہی اجر عطا کروں گا۔

قول خداوندی کہ "میں ہی اس کا اجر دوں گا" کا ایک اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اعمالِ حسنہ پر ثواب کی شرح کا ذکر فرمایا ہے مثلاً ایک کے بدلے دس اور دس کے بدلے سات سو نیکیوں کا اجر مگر روزہ داروں کے بارے میں کسی ایسی شرح کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ روزہ دار در اصل صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور صبر کرنے والوں کے اجر کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں کیا ہے:۔

"إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ"(۱) — صابروں ہی کو ان کا ثواب بھر پور دیا جائے گا۔ بے گنتی۔

مذکورہ آیت مبارکہ کے مطابق روزہ ایسے اعمال سے آگے ہے جن کے عوض محدود گنے چنے ثواب ملتے ہیں۔ روزہ، نفس کا اپنی تمام مرغوبات اور تمام اعضاء و جوارح کا تمام شہوات و لذات سے رک جانے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ داروں کو صبر کرنے والوں کا نام دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تو روزہ رکھے تو چاہیئے کہ تیری سماعت، تیری بصارت، تیری زبان اور تیرے ہاتھ بھی روزہ رکھیں۔

اور فرمایا: جب تم میں سے کوئی روزہ رکھے تو نہ عورتوں سے رفث کرے اور نہ فسق اگر کوئی اسے گالی دے تو جواباً کہے کہ میں روزے سے ہوں۔

روزہ کی صحت اور روزے دار کے حسن ادب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روزہ دار کے مقاصد درست رہتے ہیں، شہوات سے جدا رہتا ہے، جوارح محفوظ رہتے ہیں، کھانا پینا صاف ستھرا رہتا ہے، اللہ کا ذکر ہر وقت زبان پر جاری رہتا ہے، رزق کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ اپنے روزہ پر اس کی نظر نہیں ہوتی، اپنی تقصیر پر شرمندگی محسوس کرتا ہے اور ادائیگی صوم میں اللہ سے اعانت طلب کرتا ہے۔

سہل بن عبداللہ تستریؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہر پندرواڑے میں ایک بار کھانا تناول کرتے تھے۔ اور جب ماہ رمضان المبارک کا آغاز ہو جاتا تو صرف ایک لقمہ کھاتے، میں نے ان کے طعام کے بارے میں ایک شیخ سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا، کہ سہل بن عبداللہؒ صرف پانی سے روزہ افطار کرتے تھے۔

ابو علید بسری، ماہ رمضان کے شروع ہوتے ہی ایک کمرے میں خود کو بند کر دیتے اور اپنی بیوی سے کہہ دیتے کہ ہر رات روشندان سے ایک روٹی اندر ڈال دیا کرے۔ اور اس وقت تک کمرے سے باہر نہ نکلتے جب تک کہ رمضان نہ ختم ہو جاتا۔ ماہِ صیام کے ختم ہونے پر آپ کی بیوی اندر کمرے میں جاتی تو تیس کی تیس روٹیاں کمرے کے ایک کونے میں پڑی ہوتیں۔

---

(۱) الزمر: ۱۹

جہاں تک نفلی روزہ رکھنے کا تعلق ہے تو صوفیہ کرام کا معمول یہ ہے کہ سفر ہو یا گھر ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ وہ روزے کے بارے میں اس حدیث کہ "اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ" (روزہ ڈھال ہے) کی توضیح کرتے ہوئے روزہ سے متعلق بہت کچھ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ الصوم جنۃ میں نہیں کہا گیا کہ روزہ کس چیز سے بچنے کے لیے ڈھال ثابت ہوتا ہے، وہ اس چیز کا تعین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ روزہ آخرت میں آتش دوزخ سے بچنے کے لیے ڈھال کا کام دے گا کیونکہ روزہ اس دنیا میں اس دشمن کے تیروں سے بچنے کے لیے ڈھال ہے جو لوگوں کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ اور انسان کے یہ دشمن اس کا نفس اس کی خواہشات، دنیا اور شہوات و لذات ہیں۔

جس نے روزہ رکھنے پر ہمیشگی اختیار کر لی اس نے گویا خود کو اپنے دشمنوں کے مکر و فریب سے روزے کی ڈھال کے ساتھ بچا لیا اور دوزخ میں پھینکے جانے سے محفوظ رہا۔

میں نے احمد بن محمد بن سعید قاضی دینور سے اور انھوں نے رُویم علیہ الرحمۃ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک تپتی ہوئی دوپہر کو میں بغداد کی ایک گلی سے گذر رہا تھا کہ مجھے سخت پیاس نے ستایا۔ ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ ایک لڑکی باہر نکلی میں نے پانی مانگا اور وہ آبِ سرد کا بھرا ہوا ایک نیا کوزہ اٹھا لائی جب میں نے کوزہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ لڑکی بولی تجھ پر افسوس ہے کہ صوفی ہو کر دن کے وقت پانی پیتے ہو یہ کہہ کر اس نے کوزہ پھینک دیا اور اندر چلی گئی۔ رویم کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے مجھے اس قدر شرمندہ کیا کہ اس روز سے میں نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی قسم کھا لی۔

صومِ داؤدی

صوفیہ کی ایک جماعت نے صومِ داؤدی اختیار کیا ہوا تھا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والے روزے میرے بھائی داؤد علیہ السلام کے روزے تھے۔ وہ ایک روز چھوڑ کر دوسرے روز روزہ رکھتے تھے۔

شیوخ کہتے ہیں کہ قولِ رسول میں صومِ داؤد علیہ السلام کو اس لیے سب سے زیادہ فضیلت کا حامل بتایا گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے شدید ترین روزے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنا مسلسل روزہ سے کہیں مشکل ہے کیونکہ جب کوئی شخص مسلسل

روزہ رکھنے سے مانوس ہو جائے تو اسے روزہ رکھنے کی بجائے روزہ نہ رکھنے میں زیادہ دشواری پیش آتی ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا اس کی عادت کے خلاف واقع ہوتا ہے اور جو شخص ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتا رہے اس کو روزہ رکھنے کی عادت نہیں ہو پاتی اس لحاظ سے اس پر ایک دن بغیر روزہ کے گذار کر دوسرے دن روزہ رکھنا سخت دشوار گذرتا ہے۔

سہل بن عبداللہ کہتے ہیں: جب تم سیر ہو جاؤ تو سیری بخشنے والے سے بھوک طلب کرو اور بھوک لگے تو اس کے حضور سیری کی درخواست کرو اگر ایسا نہ کیا تو اس قدر سستی چھا جائے گی کہ سرکش ہو جاؤ گے۔

ابو عبداللہ احمد بن جابان علیہ الرحمۃ نے پچاس برس تک روزے رکھے، سفر ہو کہ حضر وہ ہمیشہ روزے سے رہتے۔ ایک مرتبہ ان کے ساتھیوں نے انھیں روزہ نہ رکھنے پر مجبور کر لیا مگر اس کے نتیجے میں وہ کئی روز تک اس قدر بیمار رہے کہ فرائض کے چھوٹ جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔

روحِ عبادت

جو صوفیہ مسلسل روزے رکھنے کو پسند نہیں کرتے اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب نفس ایک عمل کا عادی ہو جائے تو پھر وہ حصولِ ثواب کی خاطر نہیں بلکہ اپنی لذت کے حصول کے لیے وہ عمل انجام دیتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے عبادات و طاعات میں کبھی نفس اور اس کی مرغوب لذات کو یکجا نہ ہونے دیا جائے کیونکہ نفس کی تو خصوصیت و جبلت ہی نیکی سے فرار اور برائی کی طرف میلان ہے۔ اور جب نفس کسی ایک عبادت سے مانوس ہو جائے تو اہلِ معرفت و بصیرت اس کو بھی فریبِ نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔

ابراہیم بن ادھمؒ کہتے ہیں کہ میرے ہاں ایک شخص رہتا تھا جو نماز روزہ کی بہت پابندی کیا کرتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ ایک ایسی جگہ سے کھانا کھاتا جہاں حلال کا کھانا ہوتا ہی نہیں تھا۔ ایک دفعہ میں اسے اپنے ساتھ سفر پر لے گیا اور اسے پاک صاف حلال غذا دینے لگا اس طرح وہ ایک ماہ تک میرے پاس رہا اور اس دوران مجھے ضرورت پڑتی تھی کہ اسے کوڑے مار کر ادائیگی فرض کے لیے اٹھاؤں۔

وہ صوفیہ اور درویش جو مجردانہ اور دنیا سے لاتعلقی اور تجرد کی زندگی گذارتے ہیں۔ جو کچھ اللہ کی جانب سے ملے اسی پر قانع رہتے ہیں۔ انھیں یہ تک خبر نہ ہوتی کہ کس وقت، کس کے ذریعے اور کس طرح رزق ان کو ملے گا۔ ایسے درویشوں کے احوال ان روزہ داروں سے کہیں بہتر ہیں جو افطار کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ تیار کھانا ملے گا۔ اسی طرح ایسے درویشوں کے روزے بھی ان روزے داروں سے افضل ہیں جو یہ جانتے رہتے ہیں کہ افطار پر تیار کھانا ملے گا۔

درویش صوفیہ کے بھی اپنے آداب روزہ ہیں، جیسے یہ کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے ساتھی کی اجازت کے بغیر روزہ نہیں رکھتا کیونکہ اگر اس نے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر روزہ رکھ لیا تو ان کے دلوں کو وہ اسی طرف مشغول کرے گا کہ گویا وہ روزہ سے نہیں اور اس طرح وہ اس کے روزہ سے بے خبر رہیں گے۔

اگر ان میں سے ایک اپنے ساتھیوں کی اجازت سے روزہ رکھ لے اور دوسروں کے سامنے کوئی کھانے کی چیز موجود ہو تو انھیں اس وقت افطار کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ جماعت میں سے کوئی اس وقت کھانے کی ضرورت محسوس کرتا ہو یا ممکن ہے کہ افطار کے وقت تک انتظار کرنے سے اس کے ساتھیوں سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جائے کہ اس سے روزہ رکھنا چھوٹ جائے ہاں اس صورت میں اس کے ساتھیوں کو انتظار کرنا ہوگا کہ روزہ رکھنے والا ان کا شیخ ہو یا جسمانی طور پر ضعیف ہو۔ اسی طرح اس کو چاہیئے کہ روزے کی حالت میں اپنا حصہ لے کر افطار کے لیے جمع نہ رکھے کیونکہ ایسا کرنا اس کے حال کی کمزوری کی علامت ہوتی ہے اگر جسمانی ضعف ہو تو ایسا کر سکتا ہے۔

اگر صوفیہ کی جماعت میں کچھ روزہ رکھنے کے عادی ہوں اور اور کچھ نہ رکھنے کے تو ایسی صورت میں روزہ رکھنے والوں کو اپنے دوسرے ساتھیوں کو اپنی سی حالت اپنانے کی دعوت نہیں دینی چاہیئے الا یہ کہ وہ خود روزہ رکھنے پر آمادہ ہوں۔

روزہ دار کا غیر روزہ دار کا ساتھ دینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ غیر روزہ دار، روزہ دار کا ساتھ دینے کے لیے روزہ رکھ لے۔ اگر دونوں روزہ رکھنے پر از خود مائل ہوں تو کوئی ہرج نہیں۔

جنید علیہ الرحمہ دائم الصوم تھے، جب ان کے پاس ان کے ساتھی آئے تو وہ ان کے ہمراہ

روزہ توڑ دیتے۔ اور یہ فرماتے کہ ساتھیوں کا ساتھ دینا ایک نفلی روزہ رکھنے سے کہیں افضل ہے
کہتے ہیں کہ اگر کسی صوفی کو نفلی روزے سے پاؤ تو یہی سمجھو کہ ضرور کوئی دنیوی شے اس کو لاحق ہو گئی۔

اگر صوفیہ کی کوئی صائم جماعت ایسی ہو جس کے جملہ افراد آپس میں ہم مزاج و ہم خیال ہوں اور ان میں ایک مبتدی بھی ہو تو وہ اسے روزہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اگر وہ ترک صوم میں ان کا ساتھ نہ دے سکے تو پھر اس کے لیے روزہ نہ رکھنے کے دوران کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آتے ہیں اور اس کی حالت کو اپنی حالت پر محمول نہیں کرتے۔ اور اگر صوفیہ کی جماعت میں ان کا شیخ بھی ہو تو وہ اس کے روزہ رکھنے کی پیروی میں روزہ رکھتے ہیں اور اگر وہ روزے سے نہ ہوں تو ان کی بھی وہی کیفیت ہوتی ہے جو ان کے شیخ کی ہوتی ہے۔ صرف ایسی صورت میں وہ موافقتِ شیخ کو ترک کرتے ہیں جب شیخ اس کے چھوڑنے کا حکم دے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ شیخ ان کی بہتری کو جانتا ہے۔

ایک جلیل القدر شیخ نے کہا کہ میں نے فلاں فلاں برس غیر اللہ کے لیے روزے رکھے اور وہ اس طرح کہ ایک مرید ان کی صحبت میں تربیت حاصل کرتا تھا۔ اور شیخ نے صرف اس لیے روزے رکھے کہ مرید ان کو بھی صائم دیکھ کر روزے رکھتا رہے۔

میں نے ابوالحسن مکی کو بصرہ میں دیکھا کہ وہ ساری عمر روزے رکھتے تھے اور صرف جمعہ کی رات کو روٹی کھاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے ایک ماہ کا خرچ صرف دانق (۱/۲ درہم) تھا۔

وہ اپنے ہاتھ سے کھجور کے پتوں کی رسیاں بٹتے اور انھیں بیچتے۔ ابن سالم نے ان سے ترکِ ملاقات کر رکھی تھی اور کہتے تھے میں ان کو اس وقت سلام کرنے آؤں گا جب یہ روزہ سے نہیں ہوں گے اور روٹی کھا رہے ہوں گے۔ اس زمانہ میں ابوالحسن مکیؒ ترک طعام کے لیے مشہور تھے۔

واسط کے ایک صوفی کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ برس ہا برس تک روزے سے رہے کہتے ہیں کہ وہ رمضان المبارک کے علاوہ ہر روز وقتِ مغرب سے پہلے افطار کر لیتے تھے۔ کچھ لوگ ان کے اس عمل کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ ان کا عمل علم دین کی مخالفت پر مبنی تھا اگر وہ چاہتے تو مغرب کے وقت افطار کر کے نفلی روزے کا ثواب حاصل کر سکتے

تھے۔ اور ایک گروہ وہ تھا جو ان کے اس عمل کو پسند کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ وہ صوفی روزہ رکھ کر صرف نفس کو بھوک برداشت کرنے کی تربیت دے رہے تھے۔ اور روزے کے ثواب و اجر میں مشغول ہونے سے بچنے کے لیے انھوں نے اسے بظاہر روزہ کی شکل نہ دی۔

میرا یہ خیال ہے کہ جنھوں نے اس کے اس عمل کو پسند نہیں کیا وہ حق پر ہیں کیونکہ جب اس نے روزے کی نیت کی تو پھر لازم تھا کہ اسے مکمل کرتا اور اگر روزہ کی نیت نہ تھی تو پھر اس کا طریق فاقہ کرنے والوں کا ہے اسے روزدار نہیں کہا جاسکتا۔

یک روزہ زندگی

ابوبکر شبلی نے ایک شخص سے کہا اچھا ہے کہ تو ہمیشہ روزہ سے رہے اس شخص نے پوچھا ہمیشہ کے لیے کیسے؟ آپ نے کہا جس قدر زندگی تیری باقی ہے اسے ایک دن سمجھ کر اس کا روزہ رکھ لے۔

صوفیہ کے آدابِ حج

صوفیہ کے آدابِ حج کی پہلی کڑی یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے یہ کوشش کریں کہ حج کا فریضہ انجام دے سکیں اور اس سلسلے میں وہ کسی طرح کی گنجائش یا رخصت کے بارے میں نہ سوچیں اور نہ ہی زادِ راہ یا سواری کے عدمِ حصول کی صورت میں وہ حج کرنے سے رکے رہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی فرضِ لازم درمیان میں آن پڑے۔

حج کے بارے میں قولِ خداوندی ہے:

"وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا"(۱) — اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو اس تک چل سکے۔

اور فرمایا: "وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ"(۲) — اور لوگوں میں حج کی عام ندا کر دے۔ وہ تیرے پاس حاضر ہوں گے پیادہ اور ہر دُبلی اونٹنی پر کہ ہر دور کی راہ سے آتی ہیں۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں پیدل چلنے والے حجاج سے آغازِ کلام کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو حج کیے بغیر اس جہاں سے رخصت ہو گیا اس کی مرضی ہے کہ یہودی ہو کر مرے چاہے نصرانی ہو کر!"

مذکورہ حدیث کے مطابق، صوفیہ کا یہ شعار ہے کہ وہ زادِ راہ اور سواری کا بندوبست نہ ہوتے ہوئے بھی فریضہ حج کو ساقط نہیں سمجھتے، کیونکہ ان کا طریق ہے کہ وہ احکامِ شریعت اور فرائض پر عمل

---

(۱) آل عمران: ۹۷ (۲) الحج: ۲۷

کرنے کے سلسلے میں کسی انداز سے رخصت کے قائل نہیں ہوتے بلکہ وہ بتمامہٖ ہر حکم اور ہر فرض پر عمل کرتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امورِ دین میں رخصت یا چھوٹ کو روا رکھنا عوام الناس کا وطیرہ ہے اور ان میں تاویلات اور گنجائش پیدا کرنے کی کوشش، کمزور لوگوں کا شعار ہے، جبکہ صوفیہ ہر حکم اور فرض کی بجا آوری کو اپنے لیے رحمتِ خداوندی گردانتے ہیں، جہاں تک عوام کا تعلق ہے تو وہ حج کا ارادہ کرتے ہیں ان معلومات کے مطابق جو فقہاء کے ہاں حج کی بابت موجود ہوتی ہیں، اور اس میں علماء عوام اور خواص سبھی برابر ہیں، کہ ان سب کو حج کے سلسلے میں مناسکِ حج، فرائضِ حج، سنن حج اور احکامُ حدودِ حج کے جاننے کی ضرورت بہرحال پڑتی ہے، مگر یہاں آدابِ حج کے بیان سے ہماری مراد ان خواص صوفیہ کے آدابِ حج ہیں جن کے تین طبقے ہیں پہلا طبقہ ان صوفیاء پر مشتمل ہے جو ایک ہی حج کرتے ہیں اور اس کے بعد حفظِ اوقات و احوال میں ہمہ تن لگ جاتے ہیں۔ ادائیگی حج میں جس قسم کی مصیبتیں اور مشقتیں ان کے راستے میں پیش آئیں ہوں ان کی پرواہ نہیں کرتے اور مطمئن رہتے ہیں۔

میں نے ابن سالم سے سنا کہ سہل بن عبداللہؒ نے سولہ برس کی عمر میں پہلا حج کیا۔ ان زادِ راہ صرف بھنی ہوئی کلیجی تھی ، بھوک لگتی تو اسے سونگھ لیتے۔

ابو یزید بسطامیؒ اور جنید بغدادیؒ نے ایک ایک حج کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی حج کیا۔

دوسرا طبقہ مشائخ صوفیہ کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب حجِ بیت اللہ اور زیارتِ روضۂ رسول کا ارادہ کیا تو پہلے جملہ دنیوی تعلقات، وطن اور بھائیوں عزیزوں کو خیرباد کہہ کر وادیوں، جنگلوں اور لق و دق صحراؤں میں زادِ راہ اٹھائے بغیر انجانے راستوں پر راستہ دکھانے والوں کی مدد لیے بغیر چل پڑے۔ انھوں نے میل گنے اور نہ راستے میں واقع ڈاک خانوں کو شمار کیا، انھوں نے منازل کی جستجو کی اور نہ پانی کے گھاٹ تلاش کیے، کسی سبب کا سہارا ڈھونڈا اور نہ ہی راہ کی دشواریوں سے ان کے عزم میں کوئی کمی پیدا ہوئی اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ — اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں

وَ اَمۡنًا ؕ[۱] کے لیے مرجع اور امان بنایا۔

حج صوفیہ سے متعلق چند واقعات

صوفیہ کرام کے آدابِ حج اور احوال وصفات کی بلندی کا اندازہ ان واقعات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے جن کا تعلق ان کی ادائیگیٔ حج سے ہے۔

احمد بن علی وجہیؒ نے مجھے بتایا کہ حسن القزّاز دینوریؒ نے بارہ مرتبہ برہنہ پا و برہنہ سر فریضۂ حج ادا کیا، اگر پاؤں میں کانٹا لگ جاتا تو پاؤں کو زمین پہ رگڑ رگڑ کر آگے چل دیتے۔ توکل اس قدر پختہ تھا کہ راستے پر نظر نہیں ڈالتے تھے۔

ابو تراب نخشبیؒ حج کو روانہ ہوتے تو ایک لقمہ بصرہ دوسرا نباج اور تیسرا لقمہ مدینہ منورہ میں تناول فرماتے۔ اور جب مکہ میں داخل ہوتے تو فربہی سے ان کے پیٹ پر بل پڑے ہوتے

ابراہیم بن شیبانؒ کہتے ہیں کہ ابو عبداللہ المغربیؒ ویرانے میں داخل ہوتے تو ایک سفید چادر اور تہ بند پہنتے اور پاؤں میں ایک جوتا ہوتا اور یوں لگتا جیسے بازار سے گذر رہے ہوں اور جب مکہ میں داخل ہو کر حج سے فارغ ہو جاتے تو میزابِ رحمت کے نیچے پھر سے احرام باندھ لیتے اور اس وقت تک احرام باندھے رہتے جب تک پھر مکہ میں اگلے سال حج کے لیے داخل نہ ہو جاتے۔

جعفر خلدیؒ کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ حج کو جاتے ہوئے ایک صحرا سے گذر رہا تھا میں نے سفید قمیص پہنی تھی اور میرے ہاتھ میں پانی کا کوزہ تھا کہ اسی دوران میں نے ٹیلوں کے درمیان دو کانیں اور تاجر دیکھے جن کے پاس بصرہ کے قافلے آکر پڑاؤ کرتے تھے۔

ابراہیم خواص بیان کرتے ہیں کہ مجھے صحرا میں انیس ۱۹ راستوں کا علم ہے۔ اور یہ راستے

۱؎ البقرہ : ۱۲۵

ان راستوں کے علاوہ میں جن پر لوگوں کے قافلے چلتے ہیں۔ اور ان میں سے دو راستے ایسے ہیں جن میں سونا اور چاندی پایا جاتا ہے۔

جعفرؒ نے ابراہیم خواصؒ کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے کہا: میں صحرا میں ایک جگہ مغموم بیٹھا تھا، اور کئی وقتوں کا کھانا نہیں کھایا تھا، اسی حالت میں مجھے فضا میں حضرت خضر علیہ السلام گذرتے دکھائی دیئے، میں نے فوراً سر جھکا لیا اور آنکھیں دوسری جانب کر لیں مگر وہ آئے اور میرے پہلو میں بیٹھ گئے، تب میں نے ان کی طرف دیکھا تو فرمانے لگے: اے ابراہیم اگر تو نے مجھے دیکھا نہ ہوتا تو میں تیرے پاس نہ آتا۔

ابراہیم خواصؒ ہی کا ایک اور واقعہ ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں: میں ایک سال مکہ مکرمہ سے نکلا تو یہ عہد کر لیا کہ قادسیہ پہنچنے سے پہلے کوئی شے نہیں کھاؤں گا۔ جب میں نے صحرا عبور کر لیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اعرابی پیچھے سے مجھے پکار رہا ہے، میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی حتیٰ کہ وہ مجھے آن ملا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں دودھ کا پیالہ تھا، اس نے کہا: یہ دودھ پی لے ورنہ تیری گردن اڑا دوں گا، میں ششدر رہ گیا اور اس کے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ لے کر دودھ پی لیا۔ وہ واپس چلا گیا اور اس کے بعد قادسیہ پہنچنے تک میرے ساتھ کوئی اور واقعہ پیش نہیں آیا۔

الغرض حج کی ادائیگی کے سلسلے میں صوفیہ کے دوسرے طبقے سے متعلق مختصراً ہم نے چند باتیں عرض کی ہیں جو ہر ذی عقل کے لیے کافی ہیں۔

تیسرا طبقہ ان مشائخ صوفیہ کا ہے جنھوں نے مکہ مکرمہ ہی کو اپنا مقام ٹھہرایا اور اس کی مجاورت اختیار کر لی۔ ان کے اس خطۂ مقدس میں قیام کی وجہ اس جگہ کا تقدس، فضیلت اور شرف ہوتا ہے یا اس مقام کی بنجر زمین سے ان کا نفس چونکہ متنفر تھا لہٰذا انھوں نے تادیبِ نفس کی خاطر یہاں قیام کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالٰے نے فرمایا کہ وادیٔ حجاز ایک ایسی وادی ہے جو شہوات و لذات سے روکتی ہے۔ اور خصوصاً ایسا شخص جسے رزق غیب سے ملتا ہو اس کی روزی

مقرر کی جا چکی ہو۔ اور وہ کسی مدد یا رفاقت سے محروم ہو، اس کے لیے وادیٔ حجاز میں قیام سود مند رہتا ہے۔ اور جب نفس اپنی فطرت کے موجب اپنی خواہشات کی عدمِ تکمیل پر مضطرب ہو اور بندہ احکامِ الٰہی کی پابندی میں سکون تلاش کرنے کی آرزو کرتا ہو تو یہی وہ حالت ہے جس میں بندوں کے مقامات کا پتہ چلتا ہے۔

وادیٔ حجاز میں رہنے کے آداب

وادیٔ حجاز کے جوار میں رہنے سے متعلق صوفیہ کے آداب پر مبنی چند واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

ابوبکر محمد بن داؤد دینوری دُقیؒ نے کہا کہ ابوعبداللہ بن جلاءؒ اٹھارہ برس تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے مگر اس تمام عرصے میں کبھی شہر سے مکہ لایا جانے والا طعام نہیں کھایا کیونکہ شہر حکومت وقت کی زمینوں میں سے ہوتا ہے۔ اور متقدمین ایسی زمینوں کا طعام یا وہاں لائی جانے والی کسی بھی شے سے احتراز کرتے تھے۔ وہ صرف آبِ زم زم پیتے اور چاہِ زم زم سے اپنی رسی اور ڈول ڈال کر پانی نکالتے کیونکہ چاہِ زم زم پر موجود ڈول اور رسی مال سلاطین میں سے ہوتا ہے۔

ابوبکر کتانی علیہ الرحمہ نے طوافِ کعبہ کے دوران اپنی زندگی میں بارہ ہزار بار قرآن کریم ختم کیا۔

ابو عمرو زجاجیؒ نے مکہ میں تیس برس قیام کیا جب قضائے حاجت کی ضرورت پیش آتی تو حدودِ حرم سے باہر چلے جاتے۔ ایک دن میں تین بار زیارتِ کعبہ کرتے اور تین روز میں ایک لقمہ طعام کا کھاتے۔ ستّر برس سے زائد عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

دُقی علیہ الرحمہ نے کہا کہ میں نو برس مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہا۔ حالانکہ میں ایک جگہ پر دو[۲] نمازیں بھی ادا نہ کرتا تھا۔ اور اس دوران میں مجھ پر فاقے سے یہ حالت بھی آجاتی کہ جنازہ دیکھتا تو حسرت سے کہتا کہ کاش! مرنے والا میں ہی ہوتا مگر اس کے ساتھ ہی میرے دل میں

یہ خیال پیدا ہوتا کہ کیا ایسا نہیں کہ تیرے فاقے کو سوائے تیرے رب کے کوئی اور نہیں جانتا اور میں اسی خیال میں اس قدر محو ہو جاتا کہ فاقے کا احساس ہی مٹ جاتا۔

کہتے ہیں جو شخص مکہ مکرمہ میں رہ کر ایک دن اور رات بھوک برداشت کرے وہ مکہ سے باہر تین روز کچھ کھائے بغیر گذار سکتا ہے۔

صوفیہ بیان کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں قیام سے اخلاق و عادات بدل جاتے ہیں اور وہاں پر تمام آداب کے ساتھ صرف وہی لوگ رہ سکتے ہیں جو خاصانِ خدا کی صف میں سے ہوں۔

ابراہیم خواصؒ کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ میں فقرأ کے طبقے میں سے ایک نوجوان کئی برس مقیم رہا جس کے حسن نشست، کثرتِ طواف اور حفاظتِ فقر کو دیکھ کر ہم حیران ہوتے تھے۔ ایک روز میں نے سوچا کہ کیوں نہ کچھ درہم اس کے پاس لے جا کر اسے آزمایا جائے۔ یہ سوچ کر میں اس کے پاس بہت سے درہم لے کر پہنچا اور وہ درہم اس کے خرقہ کے پلو پر رکھ دیئے۔ اس نے میری طرف دیکھا، خرقہ کا پلو اٹھا کر درہم زمین پر پھینک دیئے اور مسجد سے باہر نکل گیا۔ اس وقت میں نے اس نوجوان سے بڑھ کر کوئی باعزت شخص نہیں دیکھا جب کہ اس نے درہم زمین پر پھینک دیئے تھے اور مجھ سے بڑھ کر ذلیل کوئی نہ تھا کہ زمین پر بیٹھ کر کنکریوں میں سے چن چن کر درہم اکٹھے کر رہا تھا۔

صوفیہ کرام مکہ مکرمہ کی جانب سفر کے دوران میں جو تکالیف اٹھاتے ہیں انہیں بخوشی برداشت کرنے کی ان کے ہاں دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"صرف تین مساجد کی طرف سفر اختیار کیا جائے ایک مسجدِ حرام دوسری یہ میری مسجد (مسجد نبوی) اور تیسری مسجد اقصیٰ"

دوسری وجہ یہ ہے کہ وطن میں نفس مختلف احوال کا دعویٰ کرتا ہے مگر وطن سے دور

ہو تو احوال میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح نفس کا وہ دعوے باطل ہو جاتا ہے جس پر اُسے فخر ہو۔

صوفیہ سفر کو سفر اسی لیے کہتے ہیں کہ اس میں سالکین و طالبین کے احوال ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف سفر کرتے ہیں۔

صوفیہ کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ جب انھیں یہ احساس ہونے لگے کہ ان کے نفسوں میں کجی، ضعف یا گمراہی کے پیدا ہونے کے آثار ہیں تو وہ بیت اللہ کی جانب سفر اختیار کرتے ہیں تاکہ نفس کے احوال میں تغیر پیدا ہو، نفس کے دعوؤں کو جھٹلایا جائے اور اس کے کسی مکر یا فریب کا یقین نہ ہونے پائے۔

صوفیہ کی ایک جماعت مکہ مکرمہ میں مقیم تھی، جب ان میں کوئی ایک دن کے وقت طواف کرنے کے لیے اٹھتا تو وہ سب اسے بُرا جانتے کیونکہ ان کا یہ خیال ہوتا تھا کہ ان کا ساتھی طواف کے دوران میں دن کے وقت خیرات بانٹنے والے سے خیرات وصول کرتا ہے۔ الغرض اسی طرح یہ سب ایک دوسرے کے احوال پر تنقید کیا کرتے تھے۔

صوفیہ کے آداب حج میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جب وہ ایک بار حج کا ارادہ کرلیں تو وہ اُسے پورا کرکے دم لیتے ہیں چاہیں اس میں ان کی جان بھی کیوں نہ چلی جائے۔

وہ جب ایک بار کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہو پڑیں تو پھر کسی طرح بھی نہیں رکتے سردی ہو کہ گرمی اور زادِ راہ کم بھی ہو تو وہ اپنے ارادے سے نہیں پھرتے۔

احمد بن دلویہؒ کہتے ہیں کہ میں نے شام سے مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ کیا۔ ان دنوں شدید سردی تھی میرا ارادہ کچھ ڈانواڈول ہو گیا تو میں نے ابو عمران طبرستانیؒ سے اس معاملے میں کوئی علمی صورت یا گنجائش دریافت کی انھوں نے کہا: جب تو اس پر اتنا ڈرتا ہے تو اسے دریا میں پھینک دے میں ان کے اشارے کو سمجھ گیا اور اسی وقت عازم مکہ مکرمہ ہوا۔ تمام رستے میں مجھے کسی طرح کی تکلیف پیش نہیں آئی اور اس طرح میں نے حج کا فریضہ ادا کر لیا۔

صوفیۂ کرام کا شعار ہے کہ جب وہ صحراؤں اور ویرانوں میں سفر کرتے ہیں تو فرائض کو پوری طرح ادا کرتے ہیں۔ سفر کے لیے دی گئی رعایتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے نہ ہی وہ قصر کرتے ہیں اور نہ تیمم پر اکتفا کرتے ہیں چاہے ان کے لیے یہ روا بھی کیوں نہ ہو۔ وہ سفر میں بھی اپنے ان معمولات کو پوری طرح بجالاتے ہیں جن پر وہ گھر میں رہتے ہوئے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے لیے سفر ہو کہ حضر دونوں برابر ہیں۔ ان کے سفر کا کوئی معین وقت نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ نشاناتِ میل، چوکیوں اور منازل سے ہو کر جاتے ہیں۔ جب انھیں ان کا رب ٹھہرا دے تو ٹھہر جاتے ہیں، جب وہ چلانا چاہے تو چل پڑتے ہیں اور جب پڑاو کا حکم دیتا ہے تو فروکش ہو جاتے ہیں۔ میقات پر پہنچتے ہیں تو جسم پانی اور دل توبہ سے دھو لیتے ہیں۔ جونہی کپڑے اتار کر احرام باندھتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ان کے باطن سے حسد، دھوکہ، فریب، خواہشات اور حبِ دنیا بھی دُور ہو جاتی ہے۔ جب وہ لبیك اللھم لبیك لا شریك لك پکارتے ہیں تو اس کے بعد کبھی شیطان، نفس امارہ اور خواہشات کی صدا پر کان نہیں دھرتے کیونکہ وہ تلبیہ میں اقرار کر چکے ہوتے ہیں کہ تیرے لیے کوئی شریک نہیں۔

ان کی ظاہری آنکھیں اللہ کے گھر پر جمی ہوتی ہیں اور دل کی آنکھوں سے گھر بلانے والے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

طواف کرتے ہیں تو اس آیت کا ورد کرتے جاتے ہیں:

"وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ"[1]	اور تم فرشتوں کو دیکھو گے عرش کے آس پاس حلقہ کیے۔

مذکورہ آیتِ مبارکہ کے ورد کرنے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے طواف میں مشغول فرشتوں کو بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ کعبۃ اللہ کی طرف رخ کیے نماز

---

[1] : الزمر: ۷۵

ادا کر رہے ہوتے ہیں تو انھیں علم ہوتا ہے کہ یہ اس بندے کا مقام ہے جس نے اللہ تعالےٰ سے کیا ہوا عہد پورا کیا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے اولین وآخرین کو اس کے نقشِ قدم پر چلنے اور اس کے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے مقام کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔

صوفیہ جب حجرِ اسود کو ہاتھ سے چھوتے اور بوسہ دیتے ہیں تو یہ جانتے ہوئے کہ گویا وہ اللہ تعالےٰ کی بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اب تقاضائے ادب یہی ہے کہ اس کے بعد خواہشات وشہواتِ دنیوی کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ صفا کی طرف جاتے ہیں تو یہ نیت ہوتی ہے کہ اب دل کو ہر طرح کی کدورتوں سے صاف رکھنا ہے اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں اور تیز تیز دوڑتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ شیطان اور مکرِ نفس سے فرار ہو رہے ہیں۔ منیٰ پہنچتے ہیں تو ان کے آداب میں سے ہے کہ وصلِ محبوب کی تیاریاں شروع کر دی جائیں ممکن ہے کہ آرزو بر آئے۔

میدانِ عرفات میں پہنچتے ہیں تو اپنی نیکیوں کو جانچتے ہیں، حشر و نشر اور قبروں سے اٹھائے جانے کو یاد کرتے ہیں۔ جب وقوف کرتے ہیں تو یوں جانتے ہیں کہ اپنے مالک کے حضور میں کھڑے ہیں اور اب اس سے منہ نہ پھیریں گے۔

امام کے ساتھ مزدلفہ لوٹتے ہیں تو اللہ جل ذکرہ کی عظمت و کبریائی سے دلوں کو معمور رکھتے ہیں۔ اور دنیا و آخرت کو پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ رمی کے لیے پتھر توڑتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی جملہ خواہشات شہوات۔ اور نفس کے ارادوں کو بھی پارہ پارہ کر ڈالتے ہیں۔

مشعرِ حرام کے پاس اللہ تعالےٰ کو یاد کرتے ہیں تو ان کے پیشِ نظر تعظیم ہوتی ہے اور کنکریاں مارتے ہیں تو اپنے اعمال پر نظر رکھتے ہیں۔

سروں کو منڈواتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ان کے باطنوں سے خود ستائی کی خواہش مٹ جاتی ہے۔

قربانی کے جانور ذبح کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی نفسِ امارہ کو بھی ذبح کر ڈالتے ہیں پھر طواف کی طرف لوٹتے ہیں تو کعبہ کے پردوں کو اس نیت کے ساتھ تھامتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا ان کا کوئی اور سہارا نہیں وہ اللہ کے بعد خلق کے دامن میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتے، منیٰ واپس آتے ہیں اور ایّام تشریق کے دوران میں وہاں قیام کے وقت جب کہ ہر چیز ان پر حلال ہوتی ہے اس کے باوجود وہ یہ بات خلافِ ادب سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں کو جنھیں وہ اپنے نفسوں پر حرام کر چکے ہیں انھیں وہ اپنی لذتوں کو پورا کرنے کی خاطر اور مالکِ حقیقی کے ایک بار حرام کئے ہوئے کو پھر سے حلال سمجھیں۔

مناسکِ حج مکمل کرنے کے بعد صوفیہ کرام اپنے احوال کو پاکیزہ کرنے کے بعد انھیں مکدّر کرنے سے احتراز کرتے ہیں وہ فقط اللہ کی وسعتِ رحمت پر بھروسہ رکھتے ہیں کیونکہ انھیں قبولیتِ حج کے بارے میں خدشہ رہتا ہے۔ وہ ظاہراً باطناً اللہ ہی سے مدد مانگتے ہیں، اور اس کی بارگاہ میں گڑگڑا کر اپنی نجات کی دعائیں مانگتے ہیں۔

ابراہیم خواص علیہ الرحمہ فرماتے ہیں میں نے ایک ویرانے میں کسی شیخ کو دیکھا جو لوگوں کو توکل کا درس دے رہا تھا مگر اس کے سترہ[17] دن بعد خود اسباب پر بھروسہ کرنے لگا۔ ایک اور شیخ نے اسے روکا مگر وہ نہ رُکا۔ اس پر صوفیہ نے اسے اپنی صف سے خارج کر دیا۔

دُقی علیہ الرحمہ کہتے ہیں: میں مصر میں داخل ہوا تو زقاق علیہ الرحمہ سے ملنے چلا گیا میں نے سلام کیا۔ انھوں نے پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا کہ حجاز سے۔ کہنے لگے: میں بنی اسرائیل کے ریگستان میں سترہ دن تک کچھ کھائے پیئے بغیر بھٹکتا رہا کہ اتنے میں دور سے کچھ دھندلی دھندلی انسانی شکلیں دکھائی دیں، میرے نفس نے لالچ کی کہ (اب کچھ مل جائے گا)، جب میں ان کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج ہے اور ساتھ میں اس کا امیر بھی۔ یہ فوج بحیرۂ قلزم کی طرف جا رہی تھی، جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ فوجی

ہیں تو میرا نفس ان سے مایوس ہوگیا مگر انھوں نے مجھے کھانا پیش کیا۔ جو میں نے نہیں کھایا پھر پانی دیا جو میں نے نہ پیا۔

امیرِ فوج نے کہا: جس حالت میں تم ہو اس میں تو مردار کا کھانا بھی جائز ہوتا ہے۔ پھر تم ہمارا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ میں نے جواب دیا: جب ہم لوگوں میں رہتے ہوئے آپ کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے تو اس وقت آپ لوگوں کے سامنے کیونکر ہاتھ پھیلاؤں جبکہ سارا وقت حقیقت ہے۔

کہتے ہیں کہ زقاق علیہ الرحمہ کی ایک آنکھ بینائی سے محروم تھی۔ کسی نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا: میں ایک روز صحرا میں بھٹک رہا تھا اور میں نے بالوں سے بنا ہوا کمبل اوڑھا ہوا تھا کہ اچانک میری آنکھ میں کھجلی ہونے لگی: میں نے اس کمبل سے آنکھ کو ملا تو وہ بہہ گئی اور بینائی ضائع ہوگئی۔

۴۱

سفر و حضر میں صوفیا کے آداب اور باہمی روابط

جنید علیہ الرحمہ کہتے ہیں : فقر آزمائشوں کا ایسا سمندر ہے جس کی ہر آزمائش کڑی ہے اور صاحبِ فقر کی علامت یہ ہے کہ جب وہ خود قوی ہوتا ہے اس کی محبت کمزور ہوتی ہے اور جب خود کمزور ہوتا ہے تو اس کی محبت قوی ہوتی ہے ۔ فقیر کو چاہیئے کہ اپنی محبت پر قائم رہے ۔

میں نے دُقّیؒ سے مصر میں اور انھوں نے ابوبکر زقّاقؒ کو مصر میں یہ کہتے سنا کہ چالیس برس سے فقراء کی صحبت میں رہ رہا ہوں مگر میں نے کبھی ان کو کسی سے کوئی مدد طلب کرتے ہوئے نہیں دیکھا اگر وہ ایسا کرتے بھی تھے تو صرف آپس میں ایک دوسرے سے یا پھر اس سے یا پھر اس سے جو اُن کا محب اور دوست ہوتا جس نے فقر میں تقویٰ و پرہیز گاری کو چھوڑا اس نے حرام محض کھایا ۔

ابو عبداللہ ابن الجلاء کہتے ہیں کہ جس نے فقر کو پرہیز گاری کے ساتھ حاصل نہ کیا اس نے گویا انجانے میں حرام محض کھایا ۔

فقیرِ صادق

سہل بن عبداللہ کا قول ہے : فقیرِ صادق تین باتوں پہ کاربند رہتا ہے ایک یہ کہ ضرورتمند ہو تو مانگتا نہیں دوسرے یہ کہ کچھ مل جائے تو رَد نہیں کرتا اور تیسرے یہ کہ جب کوئی چیز

مل جائے تو دوسرے وقت کے لیے بچا نہیں رکھتا۔

ایک صوفی نے کہا کہ فقیر صادق کی تین نشانیاں ہیں :

(۱) کسی سے کچھ مانگتا نہیں ۔
(۲) کسی سے تعرّض نہیں کرتا ۔
(۳) اگر کوئی اس سے الجھے تو خاموش رہتا ہے ۔

سہل بن عبداللہ کہتے ہیں ، تین خوبیاں فقیر کا لازمہ ہیں :

(۱) اپنے راز کی حفاظت ۔
(۲) فرائض کی ادائیگی ۔
(۳) فقر کا تحفظ ۔

انتظارِ وصل

جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ، صاحب فقر ہر معاملے میں صبر کر سکتا ہے مگر وصل کی منزل تک پہنچنے کے لیے جو عرصہ حائل ہوتا ہے اس کے ختم ہونے تک صبر نہیں کر سکتا ۔

مخصوص خصائل فقرا

ابراہیم خواصؒ فرماتے ہیں کہ فقرا کی بارہ خوبیاں ہیں جو سفر و حضر میں ان میں موجود رہتی ہیں :

(۱) وہ اللہ تعالٰی کے ہر وعدے پر مطمئن رہتے ہیں ۔
(۲) خلق سے مایوس رہتے ہیں ۔
(۳) شیاطین سے دشمنی کو برقرار رکھتے ہیں ۔
(۴) اللہ تعالٰی کے حکم کی طرف کان لگائے بیٹھے ہوتے ہیں ۔

⑤ جملہ مخلوقات پر شفقت کرتے ہیں۔

⑥ خلق کی طرف سے پہنچنے والی اذیتوں کو برداشت کرتے ہیں۔

⑦ جملہ مسلمانوں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

⑧ صرف اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتے ہیں۔

⑨ معرفت خدا میں ہمہ وقت مشغول رہتے ہیں۔

⑩ ہمیشہ پاکیزہ رہتے ہیں۔

⑪ ان کا سرمایہ فقر ہوتا ہے۔

⑫ کمی بیشی، پسند ناپسند غرض اللہ کی جانب سے انھیں جو کچھ بھی پیش آئے اس پر شکر بجا لاتے ہیں اور پسندیدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

کسی شیخ کا کہنا ہے جس نے ثواب فقر کے بدلے اللہ تعالیٰ سے فقر مانگا وہ فقیر ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوا اور جب فقیر پہ اس کی عقل چھا گئی اس کی خوشیاں لٹ گئیں۔

صوفیا کا نظریہ ملکیت

فقراء کو اللہ کی جانب سے جو کچھ بغیر مانگے اور بلا طمع عطا ہو وہ اس کے بارے میں کبھی یہ نہیں کہتے کہ یہ میرا یہ تیرا۔ اور نہ ہی کبھی وہ یہ کہتے ہیں کہ میں تو تیرا ہو گیا مگر تو میرا نہ ہوا یا میں اس طرح کرتا ہوں کہ کہیں اس طرح نہ ہو جائے یا میں یوں نہیں کرتا کہ کہیں یہ کام اس طرح نہ ہو جائے۔

ابراہیم بن شیبانؒ کہتے ہیں ہم ایسے شخص کی صحبت میں نہیں بیٹھتے تھے جو یہ کہتا کہ میرا جوتا اور میری چھاگل۔

جنیدؒ کے استاذ ابو عبداللہ احمد قلانسیؒ نے کہا: میں بصرہ میں فقراء کی ایک جماعت سے ملا، وہ میرے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آئے ان کے ساتھ رہتے ہوئے ایک بار میرے

منہ سے اتنا نکلا کہ میرا تہبند کہاں ہے؟ اور میں ان کی نظروں سے گر گیا۔

ابراہیم بن مولد الرقیؒ نے کہا کہ میں طرطوس کے علاقہ میں داخل ہوا تو مجھے بتایا گیا کہ یہاں ایک مکان میں تمھارے بھائیوں کی ایک جماعت رہتی ہے۔ میں ان کے پاس گیا تو وہاں میں نے سترہ فقرا دیکھے اور میں نے انھیں اس حالت میں پایا کہ گویا ان کے سینوں میں بیک وقت ایک ہی دل دھڑک رہا تھا۔ ابو عبداللہ احمد قلانسیؒ سے کہا گیا کہ آپ نے اپنے مسلک کی بنیاد کن چیزوں پر رکھی ہے؟ انھوں نے کہا: تین باتوں پر۔ ایک یہ کہ ہم کسی سے اپنا جائز حق بھی طلب نہیں کرتے، دوسری یہ کہ ہمیں زندگی بھر جو کچھ تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں، انھیں ہم اپنے اوپر ہی اٹھاتے ہیں۔

کسی صوفی نے کہا کہ ہمارے مسلک کی بنیاد تین چیزوں پر ہے:

(۱) متابعتِ امر و نہی۔

(۲) فقر اختیار کرنا۔

(۳) خلق کے ساتھ شفقت سے پیش آنا۔

کسی شیخ کا قول ہے جب تم یہ دیکھو کہ فقیر حقیقت سے محض علم کی جانب آجائے تو سمجھ لو کہ اس نے اپنا عزم توڑ دیا اور اس کی نیت فاسد ہو گئی۔

ابراہیم خواصؒ کہتے ہیں: صوفیہ کے آداب میں یہ بات شامل نہیں کہ ان کا کوئی وسیلہ یا سبب ہو جس کی طرف وہ بوقتِ حاجت مندی رجوع کرتے ہوں یا وہ اپنے ہاتھوں یا زبان کو لوگوں سے مدد طلب کرنے کے لیے استعمال کریں۔

جنید علیہ الرحمہ نے کہا: فقرا سے ملتے وقت نرمی سے پیش آؤ نہ کہ علم کے ساتھ کیونکہ وہ نرمی سے مانوس اور علم سے نامانوس ہوتے ہیں (یعنی صوفیہ کے ساتھ بحث مباحثے سے احتراز کرنا چاہیے)۔

صوفیہ کے آدابِ صحبت

ابراہیم بن شیبان علیہ الرحمہ کہا کرتے تھے: ہم اس شخص کی صحبت اختیار نہیں کرتے جو یہ کہے کہ یہ میرا جوتا اور یہ میری چھاگل ہے۔

سہل بن عبداللہؒ سے کسی نے کہا کہ میں آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں آپ نے کہا: جب ہم دونوں میں سے کوئی ایک مر جائے گا تو دوسرا کس کی صحبت اختیار کرے گا۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ابھی سے اللہ کی صحبت اختیار کرلیں۔

ذوالنون مصریؒ سے کسی نے پوچھا کہ کس کی صحبت اختیار کروں۔ انھوں نے کہا: اس کی صحبت اختیار کرو جو بیماری میں تیری عیادت کرے اور اگر تجھ سے گناہ سرزد ہو تو وہ تجھے معاف کر دے۔

معیارِ دوستی

ایک صوفی کا قول ہے کہ وہ شخص ہرگز تیرا دوست نہیں جسے تو کہے کہ چل۔ اور وہ کہے: کہاں؟

ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ اللہ کی صحبت موافقت کے ساتھ، خلق کی صحبت باہمی خیرخواہی کے ساتھ، نفس کی صحبت مخالفت کے ساتھ اور شیطان کی صحبت عداوت و محاربت کے ساتھ اختیار کرو۔

احمد بن یوسف زجاجیؒ کہتے ہیں کہ دو ساتھیوں کی مثال ایسی ہے کہ جیسے دو نور، جو یکجا ہوئے تو انھیں وہ کچھ نظر آنے لگا جو پہلے الگ الگ ہونے میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بلا شبہ مخالفت ہر بے اتفاقی کی جڑ ہے۔ شیطان کے پاس باہمی مخالفت پیدا کرنا ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعے وہ اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت والنس رکھنے والوں میں پھوٹ ڈالتا ہے۔

ابوسعید خرازؒ نے کہا: میں پچاس برس صوفیہ کی صحبت میں رہا مگر ان کے اور میرے مابین کبھی مخالفت نہیں ہوئی، پوچھا گیا کہ وہ کس طرح ؟ فرمایا: اس طرح کہ میں ہمیشہ اپنے نفس کی مخالفت کرکے ان کی حمایت کرتا رہا۔

جنید علیہ الرحمہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بد اخلاق نیکو کار شخص کے مقابلہ میں مجھے ایک خوش خلق فاسق زیادہ عزیز ہے۔

اور آپ ہی نے مزید کہا: میں نے ابو حفص نیشاپوریؒ کے ساتھ ایک شخص دیکھا جو اسقدر خاموش طبع تھا کہ بولتا نہ تھا۔ میں نے اس کے ساتھیوں سے اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بتایا: یہ شخص ابو حفصؒ کی صحبت میں رہتا ہے اور ہماری خدمت کرتا ہے۔ اس نے ابو حفص پر ایک لاکھ درہم خرچ کئے ہیں اور ایک لاکھ درہم مزید قرض لے کر ان پر خرچ کر چکا ہے، صرف اس لیے کہ وہ اسے ایک لفظ بولنے کی اجازت دیں۔

ابو یزید بسطامیؒ فرماتے ہیں: میں ابو علی سندھیؒ کی صحبت میں رہا۔ وہ مجھے توحید اور علم الحقائق سکھاتے تھے اور میں انھیں ان کے فرائض یاد دلاتا تھا۔

ابو عثمانؒ کہتے ہیں کہ میں نو عمر لڑکا تھا کہ میں نے ابو حفصؒ کی صحبت میں بیٹھنا چاہا مگر انھوں نے مجھے دھتکار کر کہا کہ میرے پاس مت بیٹھو۔ مجھے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی اور ان کی طرف منہ کرکے پشت کی جانب چل پڑا۔ حتیٰ کہ میں باہر آگیا۔ اس روز کے بعد میں نے یہ ارادہ کرلیا کہ ان کے دروازے پر ایک کنواں کھود کر اس میں بیٹھ جاؤں اور ان کی اجازت کے بغیر اس سے نہ نکلوں، جب انھیں اس کا علم ہوا تو قریب بٹھا کر پیار کیا اور اس روز سے مجھے اپنا مرید خاص

بنا لیا۔ ان کی یہ شفقت مجھ پر ان کے انتقال تک برقرار رہی۔

میں نے ابن سالمؒ کو یہ کہتے سنا کہ میں ساٹھ برس تک سہل بن عبداللہؒ کی صحبت میں رہا۔ ایک روز میں نے عرض کیا: میں نے آپ کی خدمت میں ساٹھ برس گذار دیئے مگر آپ نے آج تک مجھے وہ اولیاء و ابدال نہیں دکھائے جو آپ کے پاس آتے رہتے ہیں انھوں نے فرمایا: تم ہی تو ہر روز انھیں میرے پاس اندر لاتے رہتے ہو۔ کیا تو نے وہ شخص میرے پاس نہیں دیکھا جس کی پیٹی بندھی تھی اور مسواک بھی اس کے پاس تھی، اور وہ تم سے باتیں کر رہا تھا، وہ انہی ابدالوں میں سے تھا۔

ابراہیم شیبانیؒ نے کہا کہ ہم ابوعبداللہ مغربیؒ کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے، اس وقت ہم جواں سال تھے، وہ ہمیں اپنے ساتھ دشوار گذار صحراؤں کے سفر پر لے جایا کرتے تھے، ان کے پاس ایک شیخ حسنؒ نامی بھی رہا کرتے تھے۔ اس شیخ نے ستر (۷۰) برس تک ان کی خدمت کی تھی ہم میں سے جس سے بھی کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو اسی حسنؒ نامی شیخ کی سفارش سے وہ ہمیں معاف کر دیا کرتے تھے۔

سہل بن عبداللہؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے ایک بار اپنے ساتھیوں میں سے کسی سے کہا: اگر تم درندوں سے ڈرنے والے ہو تو میری صحبت اختیار مت کرو۔

یوسف بن حسین رازیؒ کا کہنا ہے کہ میں نے ذوالنونؒ سے کہا: میں کس کی صحبت اختیار کروں؟ فرمایا: اس کی جس سے تم وہ تمام باتیں پوشیدہ نہ رکھو جنھیں اللہ جانتا ہے۔

کوئی شخص ابراہیم بن ادھمؒ کی صحبت اختیار کرتا تو وہ ان سے تین شرائط پوری کرنے کو کہتے۔ ایک یہ کہ خدمت وہ خود کریں گے، دوسری یہ کہ اذان بھی وہی دیں گے اور تیسری یہ کہ جو کچھ اللہ ان کو عطا کرے گا اس میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔ ایک روز ان کے ایک ساتھی نے کہا: میں آپ کی ان شرائط کو مکمل نہیں کر سکتا۔ آپ نے کہا: مجھے تیرا یہ سچ بولنا پسند آیا۔

ابراہیم بن ادھمؒ باغوں کی رکھوالی اور فصل کی کٹائی کر کے کماتے اور اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتے۔

ابوبکر کتانیؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص میری صحبت میں بیٹھا، مگر وہ مجھے ناگوار گذرا، میں نے اسے کپڑے وغیرہ تحفۃً دیئے تاکہ میرے دل میں جو بوجھ ہے وہ زائل ہو جائے، مگر ایسا نہ ہو سکا پھر میں ایک روز اسے اپنے گھر لے گیا اور اس سے کہا: اپنا پاؤں میرے رخسار پر رکھ دے، اس نے انکار کیا مگر میں نے کہا کہ ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ اس پر اس نے اپنا پاؤں میرے رخسار پر رکھ دیا۔ اس سے میرے دل میں اس کے لیے جو ناگواری تھی زائل ہو گئی۔

مذکورہ بالا حکایت مجھ سے رُقیؒ نے بیان کی۔ اور انھوں نے کہا کہ میں نے یہ حکایت جاننے کے لیے شام سے حجاز کا سفر کیا تاکہ وہاں ابوبکر کتانیؒ سے اسے سن لوں۔

ابوعلی رباطیؒ کہتے ہیں: میں نے عبداللہؒ مروزی کی صحبت اس وقت اختیار کی جب کہ وہ صحرا میں زادِ راہ کے بغیر سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا: کیا تم امیر بننا پسند کرو گے؛ یا میں امیر بنوں؟ میں نے کہا: آپ امیر ہوں گے۔ انھوں نے کہا: اگر ایسا ہے تو تمھیں میرا ہر حکم ماننا ہو گا۔ میں نے جواب دیا: مجھے منظور ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک تھیلا لیا اور اس میں زادِ راہ بھر کر اسے اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا۔ میں نے کہا: مجھے دیجئے! میں اٹھا لیتا ہوں۔ اس پر انھوں نے مجھے یاد دلایا کہ کیا میں امیر نہیں اور تم پر میرا ہر حکم ماننا لازم نہیں؟ سفر کرتے کرتے رات پڑ گئی اور ہمیں بارش نے آلیا تو وہ ساری رات میرے سر پر چادر تان کر بارش روکے کھڑے رہے اور میں بیٹھا رہا۔ اس وقت میری حالت یہ تھی کہ کاش! میں یہ کہتا ہی نہ کہ وہ میرے امیر بنیں۔ آپ نے مجھ سے اس سفر کے دوران یہ بھی کہا: جب کوئی تیری صحبت اختیار کرے تو اس سے ویسا ہی سلوک کرنا جو میں نے تمھارے ساتھ کیا۔

سہل بن عبداللہؒ کہا کرتے تھے: تین طرح کے لوگوں کی صحبت سے بچو۔ ایک غافل ظالم دوسرے خوشامدی اور تیسرے جاہل صوفیہ۔

۴۳

علمی مذاکرات اور آدابِ صوفیہ

میں نے احمد بن علی وجیہیؒ سے اور انھوں نے اپنے والد ابو محمد جریریؒ سے سنا کہ صرف بحث برائے بحث سے استفادے کے دروازے بند اور باہمی خیر خواہی کی غرض سے بحث کرنے سے استفادے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

ابو یزیدؒ کا قول ہے: جس نے بولنے والے کی خاموشی سے فائدہ حاصل نہ کیا وہ اس کی گفتگو سے کیا فائدہ اٹھائے گا۔

جنید بغدادیؒ کہتے ہیں کہ صوفیہ دل کی بات سے زبان کی تجاوز کو ناپسند کرتے ہیں۔

ابو محمد جریریؒ کہتے ہیں: ادب و انصاف کا تقاضا ہے کہ تصوف سے متعلق کوئی صوفی اس وقت تک کوئی گفتگو نہ کرے جب تک اس سے اس کے بارے میں پوچھا نہ جائے۔

ابو تراب نخشبیؒ کے مرید ابو جعفر بن مَرزَجیؒ نے کہا: میں نے بیس برس تک کبھی کوئی مسئلہ اس وقت تک نہیں پوچھا جب تک کہ پہلے میں عملاً اس کو پوچھنے کے قابل نہ ہوتا۔

ابو حفصؒ کا قول ہے: تصوف پر گفتگو اسی شخص کو کرنی چاہیئے جو اپنی خاموشی پر عذاب سے ڈرتا ہو۔ (یعنی جب اس کے لیے گفتگو کرنی ضروری ہو جائے)۔

ایک شخص ابو عبداللہؒ احمد بن یحییٰ الجلاءؒ کے پاس آیا اور ان سے توکل کے بارے میں پوچھا۔ اس وقت ابن الجلاءؒ کے ہاں اور صوفیہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے سائل

کو جواب نہ دیا اور گھر چلے گئے اور وہاں چار دانق (چھوٹے سکے) جو ان کے پاس تھے لاکر ان حاضرین میں تقسیم کر دیئے، اس کے بعد انھوں نے سائل کو جواب دیا۔ ان سے جب ان کے اس عمل کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ مجھے اللہ سے شرم آتی تھی کہ گھر میں چار دانق رکھ کر توکل پر گفتگو کروں۔

ابو عبد اللہ مصریؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابن بزدانیارؒ سے مسائلِ تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے کہا: مجھے تمام لوگوں کے ہاں فقط غیب کے بارے میں کچھ باتیں ہی سننے کو ملیں ممکن ہے کہ وہ غیب آپ ہوں۔ انھوں نے مجھے کہا: جو کچھ تم نے کہا ایک بار پھر کہو، میں نے کہا: میں ایسا نہیں کروں گا۔

ابراہیم خواصؒ کہتے ہیں کہ علم تصوف کے مسائل پر بحث کرنے کا حق صرف اُسے حاصل ہے جو اس کی تعبیر پر قادر ہو اور تصوف سے متعلق نظریے کو بیان کرے پہلے وہ خود اس کے عملی پہلو سے گذر چکا ہو۔

ابو جعفر صدلانیؒ کہتے ہیں: ایک شخص نے ابو سعید خرازؒ سے کوئی مسئلہ پوچھا اور وہ گفتگو کے دوران میں اللہ کا حوالہ دیتا تو اشارے کرتا۔ اس پر ابو سعید نے اس سے کہا: ہم تمھاری بات کو بلا اشارہ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اکثر لوگ اللہ کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور وہ اللہ سے کتنے ہی دُور ہوتے ہیں۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس آسمان کے نیچے کوئی علم، علم تصوف سے بڑھ کر ہوتا تو میں اس کی اور اس کے جاننے والوں کی طرف دوڑا ہوا جاتا اور سیکھ لیتا، اور اگر یہاں کوئی وقت صوفیہ کے اوقات سے بہتر ہوتا تو میں اس کو حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتا۔

آپ نے مزید فرمایا: میں نے کوئی گروہ علماء کا ایسا نہیں دیکھا جو گروہِ صوفیہ سے زیادہ فضیلت رکھتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ہرگز صوفی علماء کی صحبت اختیار نہ کرتا۔

ابو علی رودباریؒ نے کہا: ہمارا یہ علم اشاراتی ہے جب بھی یہ عبارائی ہوا تو بے معنی ہو ہو گیا۔

ابو سعید خرازؒ کہتے ہیں کہ ابو حاتم عطارؒ بصرہ میں تھے تو مجھ تک ان کی فضیلت کا پتہ چلا پہنچا اور میں مصر سے انھیں ملنے کے لیے بصرہ روانہ ہوا۔

بصرہ پہنچ کر جامع مسجد میں داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ابو حاتم عطارؒ لوگوں کے درمیان بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھنے کے بعد پہلی بات جو ان کی زبان سے نکلی وہ یہ تھی کہ میں ایک شخص کے لیے بیٹھا ہوں وہ کہاں ہے؟ اور میرا اس شخص سے کیا تعلق ہے؟ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: کیا وہ شخص تم ہو؟ پھر فرمایا: اللہ نے صوفیہ کو جس (راز کے) قابل سمجھا تھا اس سے مطلع کر دیا، جو کچھ ان پر لازم کیا اس کی انجام دہی میں ان کی مدد فرمائی، اور جو کچھ ان کے لیے پیش کیا انھیں اس سے بے خبر رکھا، الغرض وہ اسی کے ساتھ اور اسی کے لیے عبادت کرتے ہیں اور اس سے اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

جنیدؒ نے کہا: اگر ہمارا یہ علم (علم تصوف) گندگی کے ڈھیر پر پڑی ہوئی کوئی چیز ہوتی تو صوفیہ اپنی معینہ مقدار کے مطابق اس میں سے اپنا حصہ نہ لیتے (یعنی علم تصوف کوئی ایسی عام شے نہیں کہ ہر کہ دمہ لیے تحاشا اس سے جھولی بھرتا پھرے)۔

شبلیؒ نے ایک روز اہل مجلس سے کہا: تم منتخب لوگ ہو تمھارے لیے جنت میں نور کے منبر بنائے جائیں گے۔ حتیٰ کہ فرشتے بھی تم پر رشک کریں گے۔ کسی نے پوچھا کس عمل کے بدلے یہ مقام ملے گا۔ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ یہ علم تصوف پر آپس میں تبادلہ خیالات کیا کرتے ہیں۔

میں نے جعفر خلدیؒ سے انھوں نے جنیدؒ سے سنا اور انھوں نے کہا کہ سری سقطیؒ نے مجھ سے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ جامع مسجد میں تیرے پاس ایک جماعت بیٹھتی ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں، وہ میرے بھائی ہیں، ہم سب مل کر تصوف سے متعلق باتیں کرتے ہیں اور

اس طرح سے ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا: اے ابوالقاسم! افسوس ہے کہ تو بے کار لوگوں کا مرکز بن گیا ہے۔

جنیدؒ کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے کہا: جب کبھی سری سقطیؒ مجھے فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں تو وہ مجھ سے کوئی مسئلہ پوچھتے ہیں۔ ایک روز انھوں نے مجھ سے پوچھا: اے لڑکے! شکر کسے کہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: شکر یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے بدلے اس کی نافرمانی نہ کی جائے۔ ان کو میری یہ بات بہت پسند آئی اور کہا: شکر کی تعریف کس طرح کی ذرا پھر سے کہو۔

مذکورہ بالا حکایت ہم نے ابوعلی رودباریؒ کے قلم سے جنیدؒ کے متعلق لکھی ہوئی پائی ہے۔

سہل بن عبداللہؒ کے بارے میں مذکور ہے کہ ان سے مسائل تصوف پوچھے جاتے تو کچھ نہ بولتے، ایک عرصے کے بعد انھوں نے اس سلسلے میں گفتگو شروع کی تو پوچھا گیا کہ پہلی خاموشی کا کیا سبب تھا۔ فرمایا: اس وقت ذوالنونؒ زندہ تھے ان کے ہوتے ہوئے میں احتراماً اس موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابوسلیمانی دارانیؒ نے کہا: اگر مجھے یہ علم ہو جاتا کہ مکہ میں کوئی شخص ایسا ہے جو مجھے علم تصوف میں ایک لفظ کا فائدہ پہنچائے تو مجھ پر یہ لازم ہوتا کہ چاہے ہزار فرسنگ پیدل چل کر جانا ہوتا تب بھی میں جاتا اور اس سے وہ ایک لفظ بھی سن کر آتا۔

کلمہ فنا کا خمار

ابوبکر زقاقؒ نے کہا کہ میں نے جنیدؒ سے فنا کے متعلق صرف ایک لفظ سنا جس کا خمار چالیس برس کے بعد بھی نہیں اترا۔

میں نے دُقیؒ کو یہ کہتے سنا کہ مذکورہ بالا حکایت زقاقؒ بیان کیا کرتے تھے۔

میں نے دُقی ؒ سے سنا انھوں نے کہا : ابو عبداللہ ابن الجلاءؒ سے کہا گیا کہ آپ کے والد کا نام "جلاّر" کیوں رکھا گیا ؟ تو فرمایا : وہ لوہے کو صیقل کرنے والے جلاّر (لوہے کو صیقل کرنے والا) نہیں تھے ، بلکہ وہ ایسے جلاّر تھے جو دلوں سے گناہوں کا زنگ اتار کر انہیں صیقل کر دیتے تھے۔

حارث محاسبیؒ کہا کرتے تھے کہ اس دنیا میں معزز ترین وہ عالم ہے جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے، اور وہ صوفی عارف باللہ ہے جو اپنی حقیقت بیان کرتا ہے۔

میں نے ابن علوانؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب کوئی شخص جنیدؒ سے کوئی ایسا سوال کرتا جو پوچھنے والے کے فہم سے بالا ہوتا تو جواباً فرماتے : لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ اور اگر وہ سائل پھر سوال کرتا تو فرماتے ، حسبنا اللہ ونعم الوکیل ۔

ابو عمرو زجاجیؒ بیان کرتے ہیں کہ جب تو کسی شیخ کی مجلس میں بیٹھے اور وہ مسائل تصوف پر گفتگو کر رہے ہوں اور اس دوران میں تجھے قضائے حاجت کی شدید ضرورت پڑے تو بہتر ہے کہ تو وہیں بیٹھے ہوئے ہی فارغ ہو لے کیونکہ گندگی کو تو پانی سے دھویا جاسکتا ہے مگر اٹھ کر باہر جانے سے جو علمی منفعت کا نقصان ہوگا اس کی تلافی زندگی بھر نہیں ہو سکتی۔

جنید کہتے ہیں کہ میں نے ابن کُرَیبیؒ سے کہا کہ ایک شخص جو علم تصوف سے متعلق ایک موضوع پر گفتگو کر رہا ہو مگر عملاً اس سے دور ہو تو کیا آپ پسند فرمائیں گے کہ ایسا شخص خاموش رہے یا چاہیں گے کہ وہ گفتگو کرلے ؟ ابن الکریبی نے کچھ دیر سوچا اور کہا اگر وہ شخص آپ ہیں تو آغازِ کلام کیجئے۔

علمِ علماء

ابو بکر شبلی فرمایا کرتے تھے کہ تمہارا اس علم کے بارے میں کیا خیال ہے جس کے سامنے علماء کا علم فقط تہمت ہے۔

سری سقطی کہتے ہیں : جس شخص نے صرف علم سے اپنی شخصیت کو سجائے رکھا اس نے اپنی نیکیوں کو بدیوں سے بدل لیا۔

۴۴

صوفیہ کے معمولات
مجالس ضیافت اور طعام کے بارے میں

ابوالقاسم جنید بغدادیؒ کہتے ہیں : صوفیہ پر اللہ کی جانب سے تین مواقع پر رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ ایک کھانے کے وقت کیونکہ صوفیہ فاقے کے بعد کھاتے ہیں۔ دوسرے علم تصوف پر گفتگو کرتے وقت کیونکہ ان کی گفتگو کا موضوع اولیاء و صدیقین کے احوال ہوتے ہیں۔ اور تیسرے سماع کے دوران اس لیے کہ وہ جائز طریق سے سماع کرتے ہیں اور وجد ہو تو اٹھتے ہیں۔

محمد بن منصور طوسیؒ نے اپنے ایک مہمان سے کہا : آپ ہمارے ہاں تین دن تو قیام کریں اور اگر اس سے زیادہ قیام کریں تو یہ آپ کی طرف سے ہمارے لیے صدقہ ہوگا۔

سری سقطیؒ کہا کرتے تھے : افسوس! اس لقمۂ طعام پر جس کے کھانے میں مجھ سے اللہ کی نافرمانی ہوتی ہو اور جس میں مجھ پر مخلوق کا احسان نہ ہو۔

ابوعلی نوری باطیؒ نے کہا : جب تمھارے پاس کوئی مسکین آئے تو اسے کھانے کے لیے کچھ پیش کرو۔ جب فقہاء آئیں تو ان سے مسائل پوچھو اور جب تمھارے پاس عبادت گذار لوگ آئیں تو انھیں جائے نماز کی طرف لے جاؤ۔

ابوبکر کتانیؒ کہتے ہیں کہ ابو حمزہؒ نے کہا : میں سری سقطیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ میرے لیے ستو لے آئے اور آدھے ستو میرے لیے پیالے میں ڈالنے لگے میں نے پوچھا : یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں تو یہ سب کے سب ایک بار پی سکتا ہوں وہ ۔۔ اور کہنے لگے کہ اگر ایسا کرو تو یہ تیرے لیے حج سے بھی بڑھ کر ہوگا۔

ابوعلی رودباریؒ جب صوفیہ کو کسی ایک جگہ جمع دیکھتے تو اس آیت سے استشہاد کیا کرتے تھے :

"وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ۝" ¹ — اور وہ ان کے اکٹھا کرنے پر جب چاہے قادر ہے۔

ابوعلی رودباریؒ کہا کرتے تھے کہ جب صوفیہ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن پر بڑا مہربان اور ان کے بارے میں سچا فیصلہ فرماتا ہے۔ پھر آپ یہ آیت اس کی دلیل میں پیش کرتے :

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ² — تم فرماؤ! ہمارا رب ہم سب کو جمع کریگا پھر ہم میں سچا فیصلہ فرمائے گا۔

جعفر خلدیؒ کہتے ہیں یہ جو تم دیکھتے ہو کہ بعض لوگ کھانے کے بعد بھی کھاتے رہتے ہیں یہ عدم سیری کی کیفیت ہوتی ہے۔ آپ نے کہا کہ دیکھو! کوئی صوفی زیادہ مقدار میں کھانا کھاتا ہے تو یہی سمجھو کہ وہ گذرے ہوئے وقت کا کھانا بھی کھا رہا ہوگا یا آنے والے وقت کے لیے کھا رہا ہوگا اور یا موجودہ وقت کا کھانا کھا رہا ہوگا۔

ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں : اگر دنیا کسی بچے کے منہ میں ایک لقمہ کی مانند ہوتی تو پھر بھی میں اس بچے پر رحم کھاتا۔ آپ نے مزید فرمایا : کہ اگر یہ دنیا ایک لقمہ ہوتی تو میں اسے نگل لیتا، اور اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان حائل اس بڑی رکاوٹ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا۔

کہتے ہیں کہ دوستوں اور بھائیوں کے ساتھ کھانے بیٹھو تو اظہار مسرت کرو، دنیا پرستوں کے ساتھ شریک طعام ہو تو ادب سے کام لو اور فقراء کے ساتھ کھانا کھاؤ تو ایثار کا مظاہرہ کرو۔ مذکورہ آداب صوفیہ کے آداب میں سے نہیں بلکہ صوفیہ کے آداب یہ ہیں کہ وہ کھانے

---

¹ الشوریٰ : ۲۹ ² السبا : ۲۶

کے دوران مغموم نفرت کا اظہار کرنے والے اور تکلف سے کام لینے والے نہیں ہوتے، وہ زیادہ مقدار میں گھٹیا کھانے پر کم مقدار میں عمدہ کھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے کھانے کا کوئی مقررہ وقت نہیں ہوتا، کھانا کھانے کے دوران میں وہ ایک دوسرے کو لقمہ لقمہ کرکے نہیں کھلاتے اور اگر کوئی انھیں اس طرح سے کھلائے تو رد بھی نہیں کرتے، کثرت طعام کو پسند نہیں کرتے اور شدید بھوک ہو تو نہایت سلیقے کے ساتھ کھاتے ہیں۔

میں نے ایک جلیل القدر شیخ سے سنا وہ فرماتے تھے: میں دس روز فاقے سے رہا، اور دس روز کے بعد میرے سامنے کھانا لایا گیا تو میں دو انگلیوں سے کھانے لگا میزبان نے کہا: سنت پر عمل کیجیے اور تین انگلیوں سے کھائیے۔

ابراہیم بن شیبانؒ نے کہا: اسّی برس سے میں نے کوئی چیز شوق و اشتہار کے ساتھ نہیں کھائی۔

ابوبکر کتانی دینوریؒ بغداد میں رہتے تھے اور کبھی کوئی چیز ایسی نہ کھاتے جس کے حصول کے لیے انھیں مانگنے یا کسی سے بات کرنے کی نوبت آتی۔

جنید بغدادیؒ کا قول ہے: یہ بڑی خست و کمینگی ہے کہ کوئی شخص دین کو حصولِ طعام کا ذریعہ بنائے۔

ابوترابؒ کہتے ہیں: مجھے کھانا پیش کیا گیا مگر میں نے نہیں کھایا۔ نتیجۃً مجھے چودہ دن کچھ بھی کھانے کو نہ ملا، تو مجھ پر عیاں ہو گیا کہ اللہ نے مجھے اپنے کیے کی سزا دی ہے اور میں اسی وقت اپنے کیے پر تائب ہوا۔

جنید بغدادیؒ فرمایا کرتے تھے: لباس، طعام اور گھر صاف ستھرا ہو تو سب معاملات درست رہتے ہیں۔

سری سقطیؒ کہا کرتے تھے، صوفیہ کا کھانا مریضوں کے کھانے کی طرح اور ان کی نیند اس شخص کی نیند کی مانند ہوتی ہے جسے ڈوبنے کا اندیشہ ہو۔

ابوعبداللہ حُصْرِیؒ کہتے ہیں : برس ہا برس گذر گئے مگر مجھے کبھی بھوک لگنے کی شکایت نہیں ہوئی مگر اس کے ساتھ کبھی یہ نوبت بھی نہیں آئی جو یہ کہوں کہ میں کھانا کھاؤں گا۔

فتح موصلیؒ موصل سے روانہ ہوئے کہ بشر حافیؒ سے ملاقات کریں جب ان کے ہاں پہنچے تو بشر حافیؒ نے ایک درہم نکال کر احمد جلّاؒ کو دیا اور کہا : جاکر بازار سے عمدہ قسم کا کھانا لے آؤ۔ احمد جلّاؒ کہتے ہیں کہ میں نکلا اور بازار سے صاف ستھری روٹیاں خریدیں۔ اسی وقت مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا یہ فرمان یاد آیا کہ انھوں نے فقط دودھ ہی کے بارے میں یہ دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! ہمارے لیے دودھ میں برکت عطا کر اور اسے ہمارے لیے زیادہ فرما۔ اسی فرمانِ رسول کے پیشِ نظر میں نے دودھ خریدا اس کے ساتھ کچھ کھجوریں خریدیں اور یہ سب کچھ لے کر مہمان کو پیش کر دیا۔ انھوں نے کچھ کھا لیا اور باقی ساتھ لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بشر حافی نے اہلِ مجلس سے کہا : یہ فتح الموصلیؒ تھے جو مجھے ملنے آئے تھے، کیا آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے کھانا شروع کرتے وقت مجھے کھانے کو کیوں نہ کہا؟ اس لیے کہ آداب کے مطابق مہمان کھانے کو نہیں کہتا۔ اور کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نے یہ کیوں کہا کہ صاف ستھرا طعام خرید لاؤ۔ اس لیے کہ پاکیزہ طعام کے کھانے سے خالص شکر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور جانتے ہو کہ انھوں نے جاتے ہوئے باقی طعام ساتھ کیوں لے لیا، اس لیے کہ جب توکّل صحیح ہو تو ساتھ لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔

معروف کرخیؒ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ ہر شخص کی دعوت قبول کر لیتے ہیں؟ آپ نے کہا : میں تو اس دنیا میں مہمان ہوں جہاں کوئی لے جائے مہمان بن کر چلا جاتا ہوں، اپنا کوئی گھر نہیں رکھتا۔

ابوبکر کتانیؒ نے کہا : ایک سال ایسا بھی آیا کہ یہاں مکہ مکرمہ میں تین سو فقراء و مشائخ ایک ہی جگہ پر جمع تھے، اور ان کے درمیان علمی مذاکرات کے بجائے ایک دوسرے سے مہربانی اخلاق اور ایثار کا سلوک جاری رہتا۔

ابو سلیمان دارانی فرمایا کرتے تھے کہ جب تمھیں کوئی دینی یا دنیوی حاجت درپیش ہو تو کھانے سے پہلے اسے پورا کرو کیونکہ کھانا دل کو مردہ بنا دیتا ہے۔

رُوَیمؒ نے کہا: میں نے بیس برس سے کھانے کے متعلق کبھی سوچا تک نہیں یہاں تک کہ یہ میرے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔

میں نے احمد بن عطاء ابو عبداللہ رودباریؒ سے سنا وہ کہتے ہیں کہ ابو علی رودباریؒ نے سفید شکر کے لدے ہوئے کچھ اونٹ خریدے، پھر حلوائیوں کی ایک جماعت کو بلا کر انھیں کہا: اس شکر سے دیواریں، ان میں کھڑکیاں، محرابیں اور منقش ستون بنائیں۔ جب یہ سب کچھ بن کر تیار ہو گیا تو انھوں نے صوفیہ کو دعوت دی کہ وہ سفید شکر سے بنی ہوئی اس عمارت کو منہدم کر دیں اور لوٹ لیں۔

ابو عبداللہ رودباریؒ فرمایا کرتے تھے: ایک شخص نے ضیافت کا اہتمام کیا اور ایک ہزار قندیلیں روشن کیں، کسی نے اعتراض کیا کہ یہ فضول خرچی ہے۔ یہ سن کر صاحبِ ضیافت نے کہا: آپ گھر میں داخل ہوں اور جو قندیل بھی اللہ تعالےٰ کے سوا کسی اور کے لیے روشن دکھائی دے اسے بجھا دو۔ وہ شخص اندر گیا تاکہ قندیلوں کو بجھا دے مگر بعد بسیار کوشش کے وہ ایک قندیل بھی نہ بجھا سکا۔ اور بے نیل۔ مرام لوٹ گیا۔

ابو عبداللہ حصریؒ نے احمد بن محمد سُلَمیؒ کو یہ کہتے سنا کہ میں مکہ مکرمہ میں مقیم تھا اور تین روز سے فاقے سے تھا میرے ذہن میں ایک تجویز آئی اور میں نے حرم کے علما، زہاد اور فقراء کو جمع کر کے ان کے لیے گیارہ خیمے کرایہ پر لیے اور انھیں ان میں ٹھہرا دیا۔ فوراً ہر طرف سے کھانے پینے کی چیزیں اور تحائف آنے لگے الغرض گیارہ روز تک اشیاء و تحائف کی یہی ریل پیل رہی مگر اس تمام عرصہ کے دوران خود احمد بن محمد سُلمیؒ نے کچھ بھی نہ کھایا۔

صوفیہ اور آدابِ وجد و سماع

جنید بغدادیؒ کہتے ہیں : سماع کے لیے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے :

① اخوان

② زمان

③ مکان ۔

حارث محاسبیؒ نے کہا : تین چیزیں اگر حاصل ہو جائیں تو کس قدر فائدہ حاصل ہو مگر افسوس! ہم نے انھیں کھو دیا ہے ۔ ایک خوش آوازی کہ جس میں دیانت ہو ، دوسری خوبصورتی جو حسن کردار کی حامل ہو ۔ اور تیسری دوستی کہ جس میں وفا ہو ۔

احمد بن مقاتل مکیؒ کہتے ہیں کہ جب ذوالنون بغداد میں داخل ہوئے تو صوفیہ کی ایک جماعت ان سے ملنے آئی جن کے ہمراہ ایک قوال بھی تھا ۔ انھوں نے ذوالنون سے درخواست کی کہ قوال کو کچھ کہنے کی اجازت عطا فرمائیں ۔ انھوں نے اجازت دے دی اور قوال نے یہ اشعار گائے ؎

صغیر هواك عذّبنی　　　فکیف به اذا احتنکا

و انت جمعت من قلبی　　　هویً قد کان مشترکا

اما ترثی لمکتئب

اذا ضحك الخلیّ بکیٰ

ترجمہ اشعار : (۱) ابھی تو تیری محبت کا آغاز ہے اور میں عذاب میں ہوں جب یہ محبت عنفوان شباب کو پہنچے گی تو میرا کیا عالم ہوگا۔

(۲) میرے محبوب تو نے میرے دل سے وہ ساری محبت جمع کر لی ہے جو سب کے لیے مشترک تھی۔

(۳) کیا تجھے اس غم کے مارے پر ترس نہیں آئے گا کہ محبت سے خالی لوگ تو ہنس کھیل رہے ہیں اور وہ رو رہا ہے۔

یہ اشعار سنتے ہی ذوالنون اٹھے اور منہ کے بل گر گئے، پیشانی سے خون جاری ہو گیا مگر یہ خون زمین پر نہیں گرتا تھا۔ اسی دوران محفل میں سے ایک شخص بتکلف وجد طاری کر کے کھڑا ہو گیا۔ ذوالنون علیہ الرحمہ نے اس سے کہا:

"الذی یراک حین تقوم،[۱] یاد رکھ اس رب کو کہ جب تو کھڑا ہوتا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہوتا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ شخص بیٹھ گیا۔

چاکِ گریباں نہیں چاکِ دل چاہیئے

ابراہیم مارستانی سے کسی نے سماع کے دوران حرکت کرنے اور کپڑے پھاڑنے کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں ایک قصہ بیان کیا۔ تو ایک شخص نے اپنی قمیص پھاڑ ڈالی۔ اسی وقت موسیٰ علیہ السلام کو وحی ہوئی کہ اس شخص کو کہہ دیں کہ میرے لیے قمیص نہ پھاڑے اپنے دل کو چاک کرے۔

جنید علیہ الرحمہ کہا کرتے تھے: اگر علم دین سے کامل آگاہی ہو تو وجد کی کمی کوئی نقصان نہیں

---

[۱] القرآن ۲۶ : ۲۱۸

پہنچاتی مگر علم دین سے واقفیت میں کمی کی صورت میں وجد میں زیادتی موجب نقصان ہوسکتی ہے۔
مذکورہ قول میں نکتہ یہ ہے کہ علم کی زیادتی سماع کے دوران سننے والے کی طاقت کے مطابق جوارح کو قابو میں رکھتی ہے۔ اور آدابِ سماع میں سے یہ ہے کہ بناوٹی قیام اور مصنوعی حال نہیں طاری کرنا چاہیئے۔

وجدِ غیر ارادی

دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کرنے والے درویشوں کے لیے وجد جائز ہے بشرطیکہ یہ غیر ارادی ہو۔ ویسے ان کے لیے اس کا ترک کرنا اولیٰ ہے۔
کسی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ وجد کرنے والوں میں شامل ہونے کے لیے اپنے اوپر وجد طاری کرنے کی کوشش کرے بلکہ مصنوعی وجد سے بہتر یہ ہے کہ حضورِ قلب اور مکمل سکون کے ساتھ سنے اور اگر مصنوعی وجد طاری کرنا عادت بن جائے تو یہ روحانی مدارج کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔
جب تک دل حبِ دنیا میں ملوث ہے سماع و وجد بالکل فضول ہے چاہے اس میں جسم ختم ہو جائے اور روح بھی پرواز کر جائے۔

○

۴۶

صوفیہ کے آدابِ لباس

لباسِ فقر

ایک مرتبہ ابوسلیمان دارانی نے سفید دُھلی ہوئی قمیص پہنی تو احمدؒ نے ان سے کہا: آپ نے کیا خوب اجلی قمیص پہنی ہوئی ہے۔ ابوسلیمان نے فرمایا: کاش! میرا دل بھی دوسرے دلوں میں اسی طرح اجلا ہوتا جیسے کپڑوں میں میری یہ قمیص۔ اور آپ نے ہی فرمایا: تم میں سے کچھ لوگ تین درہم کی قیمت کی عبا زیب تن کرتے ہیں مگر ان کی دلی خواہش پانچ درہم کی عبا پہننے کی ہوتی ہے۔ اور ایسی حالت میں اس طرح کے لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی کہ ان کی خواہش لباس سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ اور مزید کہا کہ کپڑوں کا چھوٹا ہونا تین خوبیوں کا حامل ہے:

① سنت پر عمل۔
② نظافت
③ کثرتِ استعمال۔

بشر بن حارثؒ کے پاس ایک جماعت آئی جس نے پیوند لگے جبے پہنے ہوئے تھے۔ آپ نے ان سے کہا: اے جماعت والو! اللہ سے ڈرو! اور یہ لباس مت ظاہر کرو کیونکہ اسی کی وجہ سے تم پہچان لیے جاتے ہو اور معزز سمجھے جاتے ہو۔ یہ سن کر وہ، تمام خاموش رہے مگر ان میں سے ایک نوجوان نے اٹھ کر کہا: خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں اس طرح کا بنایا ہے کہ اسی کے لیے اور اسی کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ خدا کی قسم ہم یہی لباس

پہنتے رہیں گے تا آنکہ سارا دین ہی اللہ کے لیے ہو جائے۔ بشر بن حارث نے اس نوجوان کی اس بات کی تحسین کی اور کہا: بیٹے تو نے خوب بات کی مگر کون تیری طرح کے جذبے کے ساتھ یہ پیوند لگا جبہ پہنتا ہے۔

میں نے وجیہیؒ سے اور انھوں نے جریریؒ کو یہ کہتے سنا: جامع مسجد بغداد میں ایک فقیر رہتا تھا جو سردی گرمی میں ایک ہی کپڑا پہنے رکھتا۔ اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہا: میں زیادہ کپڑے پہننے کا شوقین تھا مگر ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ میں جنت میں ہوں اور وہاں ایک دسترخوان پر ہمارے ساتھی فقرا کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ بیٹھنا چاہا کہ فرشتوں نے یہ کہتے ہوئے مجھے وہاں سے اٹھا دیا کہ تو ان لوگوں میں نہیں بیٹھ سکتا، کیونکہ یہ لوگ دنیا میں صرف ایک کپڑا رکھتے تھے اور تیرے پاس دو قمیصیں ہیں۔ جب بیدار ہوا تو میں نے یہ قسم کھالی کہ اس وقت تک ایک کپڑے سے زاید نہیں پہنوں گا جب تک کہ میں اپنے رب سے نہ جا ملوں۔

ابو حفص حدادؒ کا قول ہے: جب تو کسی فقیر کو زرق برق کپڑے پہنے دیکھے تو اس کی بھلائی نہ چاہ۔

یحییٰ بن معاذ رازیؒ کے بارے میں کہتے ہیں کہ آغاز میں وہ بوسیدہ اونی کپڑے پہنا کرتے تھے مگر آخر عمر میں نرم ریشم زیبِ تن کرنے لگے۔ یہ بات ابو یزید سے کہی گئی تو کہا: بیچارا یحییٰ گھٹیا چیز پر صبر نہ کر سکا تو بڑھیا چیز پر کیا صبر کرے گا۔

میں نے طیفورؒ سے سنا انھوں نے کہا: جب ابو یزید اس دنیا سے رخصت ہوئے تو انھوں نے ایک قمیص پہنی ہوئی تھی جو کسی سے عاریتاً لی تھی، جسے پسماندگان نے اس کے مالک کو لوٹا دیا۔

جنید بغدادی کے استاد ابن الکرینی کا انتقال ہوا تو انھوں نے پیوند لگا جبہ پہنا ہوا تھا اور ان کی ایک آستین اور کپڑے کے چند ٹکڑے جو لباس کشادہ کرنے کے لیے استعمال کیے

جانتے ہیں ، جعفر خلدی کے ہاں پڑے ہوئے تھے اور اس آستین میں تیرہ رطل بھی بندھے ہوئے تھے ۔

ابوحفص نیشاپوری ریشمی قمیص اور دیگر فاخرہ لباس پہنتے تھے ان کے گھر میں ریت کے فرش بچھے ہوئے تھے ۔

صوفیہ کے آدابِ لباس یہ ہیں کہ وہ وقت کے ساتھ چلتے ہیں اور انھیں ادنی ملدے کا لباس یا پیوند لگا کوئی جبہ وغیرہ جو بھی مل جائے پہن لیتے ہیں ۔

فقیر صادق جو بھی پہن لے اسے سجتا ہے اور ہر طرح کے کپڑوں میں اس کی شخصیت سے رعب و دبدبہ ٹپکتا ہے ۔ وہ لباس کے معاملے میں تکلف برتتا ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں اس کی اپنی کوئی پسند ہوتی ہے ۔

جب اس کا ہاتھ کشادہ ہو تو وہ اپنے ساتھیوں کی مدد کرتا ہے اور اپنے اوپر دوسرے ساتھیوں کو ترجیح دیتا ہے اس جذبہ کے ساتھ کہ اظہار ایثار نہیں کرتا ۔ نئے کپڑوں کے مقابلے میں بوسیدہ اور پرانی اشیاء کو عزیز سمجھتا ہے بہت سارے نئے کپڑوں سے تنگ ہوتا ہے جبکہ کم مگر بوسیدہ پھٹے پرانے کپڑوں کو ترک نہیں کرتا اور وہ صفائی و پاکیزگی کا باقاعدہ اہتمام کرتا ہے ۔

صوفیہ کے آدابِ لباس تو خاصے طویل ہیں مگر یہاں اس کتاب میں گنجائش نہ ہونے کے سبب ہم نے اختصار برتا ہے اللہ تعالٰے اسی اختصار کو لوگوں کے لیے کافی فرمائے ۔

۴۷

صوفیہ کے آدابِ سفر

کہتے ہیں کہ ابو علیؒ رودباری کے پاس ایک شخص جو کہ سفر کا ارادہ رکھتا تھا کچھ نصیحت کی باتیں سننے آیا اور عرض کیا: اے ابو علیؒ! کچھ فرمائیے! آپ نے اس سے کہا: اے نوجوان! صوفیہ وعدے سے پھرتے نہیں اور مشورہ کے وقت منتشر نہیں ہوتے۔

رُویمؒ سے آدابِ مسافر کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: اس کے قدم اس کے ارادے سے آگے نہ بڑھیں اور جہاں اس کا دل ٹھہر جائے وہیں قیام کرے۔

مذکورہ بالا واقعہ میں نے عیسٰی القصّارؒ سے سنا اور انھوں نے کہا کہ میں نے اسے رویمؒ سے پوچھا تھا۔

محمد بن اسماعیلؒ کہتے ہیں: میں، ابو بکر زقاقؒ اور ابو بکر الکتانیؒ بیس برس سے محوِ سفر تھے اس عرصے میں ہمارا معمول یہ تھا کہ کبھی لوگوں سے نہیں ملے اور نہ ہی کسی کے ساتھ وقت گذارا۔ اگر کسی شہر میں کوئی شیخ ہوتا تو اس کی خدمت میں جاتے سلام عرض کرتے، سارا دن بیٹھے رہتے اور رات پڑتی تو جس مسجد میں ہمارا قیام ہوتا اس کی طرف لوٹ جاتے، پھر کتّانیؒ ساری رات نوافل میں قرآن ختم کر لیتے۔ اسی طرح زقّاق قبلہ رو ہو کر شب بھر بیٹھے رہتے اور میں غور و فکر میں ڈوبا رہتا حتیٰ کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوتا اور ہم تینوں عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرتے۔ اور اگر کبھی وہاں ہمارے ساتھ کوئی اور شخص ہوتا اور رات کو سو رہا ہوتا تو ہم اسے اپنے سے افضل سمجھتے۔

ابوالحسن مزینؒ نے فرمایا: فقیر کا شعار یہ ہے کہ ہر روز ایک نئی جگہ پر ہوتا ہے۔ اور مرتا ہے تو دو منزلوں کے درمیان مرتا ہے۔

مزین کبیرؒ کہتے ہیں کہ میں ایک سفر میں ابراہیم خواصؒ کے ہمراہ تھا کہ ان کی ران پر ایک بچھو دوڑتا دکھائی دیا۔ میں اسے مارنے کے لیے اٹھا مگر انھوں نے مجھے یہ کہہ کر روکا کہ اسے چھوڑ دو ہر چیز ہماری محتاج ہے اور ہم کسی چیز کے محتاج نہیں۔

شبلی علیہ الرحمہ جب اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو سفر کا سلسلہ منقطع کرتے دیکھتے تو فرماتے: تم پر افسوس ہے! کیا اس سے چھٹکارا ہو سکتا ہے جس سے کوئی چھٹکارا نہیں۔

ابوعبداللہ نصیبی نے کہا: میں نے تیس برس کے سفر میں کبھی اپنی پیوندگی گدڑی پر کوئی جبّہ نہیں پہنا، نہ کسی ایسی جگہ کا رُخ کیا جہاں سہولت ہوتی، اور نہ کوئی شخص سامان اٹھانے کے لیے ساتھ لیا۔

الغرض صوفیہ کرام کے سفر کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ محض گھومتے پھریں، شہر دیکھیں، رزق تلاش کرتے پھریں، بلکہ ان کا سفر تو صرف، حج، جہاد، ملاقات شیوخ، صلہ رحمی، مظالم کا خاتمہ کرنے، طلب علم، احوال و علوم کے بارے میں استفادہ کرنے اور کسی مبارک جگہ جانے کے لیے سفر اختیار کرتے ہیں۔ اور وہ سفر کے دوران اپنے وہ اوراد و وظائف اور معمولات جو وہ گھر پر کرتے ہیں، انھیں ترک نہیں کرتے، وہ نماز قصر کو غنیمت نہیں سمجھتے اور نہ ہی رمضان المبارک کے دوران سفر کرتے ہوئے وہ روزے کی چھوٹ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جماعت کی صورت میں سفر کرتے ہوں تو پیدل چلتے ہیں اور اگر ایک ضعیف ترین پیدل چل رہا ہو تو باقی اس کی بھرپور خدمت کرتے ہیں۔ جب ان میں سے کوئی ایک قضائے حاجت کے لیے بیٹھتا ہے تو سب اس کے لیے ٹھہر جاتے ہیں اگر کوئی پیچھے رہ جائے تو اس کا انتظار کرتے ہیں اگر کوئی اُن میں سے بیمار پڑ جاتا ہے یا کمزوری کی وجہ سے چل نہیں سکتا تو اس کے لیے ٹھہر جاتے ہیں اور اس کی ہر طرح سے اعانت کرتے ہیں۔ نماز کا وقت ہو جاتا ہے تو جب تک نماز ادا نہ کر لیں

اپنی جگہ سے نہیں ہلتے بشرطیکہ ان کے پاس یا کہیں قریب پانی موجود ہو۔ یہ تو تھا کمزور صوفیہ کا حال، اور جو کیفیت سفر میں قوی صوفیہ کی ہوتی ہے وہ یوں ہے۔

ابراہیم خواصؒ کہتے ہیں کہ (سفر کے دوران) مجھ پر جس طرح کی بپتا بھی پڑی میں نے اس پر غلبہ حاصل کیا۔

ابو عمرانؒ سے سفر میں پیش آنے والے عجز اور غم واندوہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: جب بھی کوئی غم لاحق ہو تو اسے گرداب کی نذر کر دو۔ یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد کسی غم کے لاحق ہونے کی پرواہ ہی نہ کرو۔

ابو یعقوب سوسیؒ نے کہا: مسافر کو سفر میں چار چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو وہ سفر نہیں کر سکتا، علم جو اس کی رہنمائی کرتا ہے، پرہیزگاری جو اس کی حفاظت کرتی ہے، شوق جو اسے اٹھائے پھرتا ہے اور اخلاق جو اس کے کردار کو پاک رکھتا ہے۔

ابو بکر کتانیؒ کہتے ہیں کہ جب کوئی صوفی ایک بار یمن سے ہو آتا اور دوبارہ وہاں جاتا تو صوفیہ اس سے ترکِ تعلق کر لیتے۔

کہا جاتا ہے کہ سفر کو سفر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ انسانوں کے اخلاق کو ظاہر کرتا ہے۔

۴۸

صوفیہ کا اپنے ساتھیوں کے لیے کامل ایثار

میں نے شیخ ابو عبداللہ صُبَیحیؒ کے ساتھیوں کو یہ کہتے ہوئے سنا : فقیر کا فقر اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک کہ وہ دنیوی ملکیتوں کو ترک نہ کر دے اور جب ایسا کر لیتا ہے تو اس کے نتیجے میں اسے عزت و منزلت حاصل ہوتی ہے۔ پھر وہ منزلت کو چھوڑ دیتا ہے تو قوتِ نفس باقی رہ جاتی ہے، اسے بھی اس کو دوستوں کے کاموں میں لگ کر ختم کر دینا چاہیئے۔ تب جا کر صحیح معنوں میں اسے دولتِ فقر حاصل ہوتی ہے۔

میں نے ابو عبداللہ رودباریؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا : مظفر قرمیسینیؒ کو ایک ریتیلے قطعۂ زمین پر قدم رکھتے دیکھا ان کے ساتھ ایک شیخ بھی تھے۔ ان دونوں کی امرا شہر کے نزدیک بڑی قدر و منزلت تھی، یہ اپنے اثر و نفوذ کو بھرپور طور پر فقرا کے لیے استعمال کرتے تھے، حتیٰ کہ ان کی وہ قدر و منزلت بھی نہ رہی اور پورے شہر میں کوئی شخص ان کو بطور قرض یا خیرات یا رہن پر بھی کچھ دینے کو تیار نہ تھا، یہی وہ مطلوبہ حالت تھی جسے پا کر ان کو تسلی ہوئی اور وہ خوش ہوئے۔

ابراہیم شیبانؒ سے کہا گیا : مظفر قرمیسینیؒ کے بارے میں بتائیے کہ وہ کس حالت پر تھے۔ کیا انھوں نے دو خرقے پہنے ہوئے تھے یا اپنے دوستوں کی خاطر لوگوں سے مانگتے تھے یا ساتھیوں کی خدمت کرتے تھے؟ ابراہیم نے جواب دیا : انھوں نے جب کوئی قدم مروّت میں خالصۃً اللہ کے لیے اٹھایا اس سے پیچھے نہیں ہٹے۔

ایک صوفی بغداد میں یہ وطیرہ اختیار کیے ہوئے تھے کہ ذلت کے ساتھ لوگوں سے

مانگتے اور کھاتے، کسی نے اس کی وجہ دریافت کی فرمایا: میں نے یہ ذلیل کام اس لیے شروع کیا ہے کہ میرے نفس کو اس سے شدید نفرت تھی۔

ایک جلیل القدر شیخ کسی شہر میں وارد ہوئے، وہاں انھوں نے ایک سالک کو دیکھا، جو جملہ معمولاتِ سلوک پر عمل پیرا تھا اور اس لحاظ سے شہر میں اس کے زہد و تقویٰ کی بڑی دھوم تھی اور ہر شخص اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا، شیخ نے اس سے فرمایا: یہ جو مقام زہد و ورع میں تجھے حاصل ہے تیرے لیے درست ثابت نہیں ہوگا، جب تک کہ تو ایک ایک دروازے پر جاکر ٹکڑے مانگ کر نہ کھائے، مرید کے لیے یہ کام دشوار ثابت ہوا اور وہ ایسا کرنے سے عاجز رہا۔ مگر جب وہ بڑھاپے کو پہنچا تو لوگوں سے مانگنے کے لیے مجبور ہو گیا، تب جاکر اسے معلوم ہوا کہ یہ سب اسی نافرمانی کی سزا تھی جو اس نے اپنے ایّامِ ارادت میں اس شیخ کا کہنا نہ مان کر کی تھی۔

واقعۂ مذکورہ بالا میں شیخ ابو عبداللہ بن المقریؒ تھے اور سالک ابو عبداللہ سجزیؒ ائمہ تصوف میں سے ایک شیخ کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ روزہ رکھتے تھے اور افطاری کے لیے ٹکڑے مانگ کر لاتے اور کھاتے، ایک شخص ان کو جان گیا اور ان کے سامنے کھانا رکھ دیا مگر انھوں نے نہ کھایا اور وہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے کیونکہ وہ پہچان لیے گئے تھے کہ وہ صوفی ہیں۔

ممشاد دینوریؒ کے بارے میں مذکور ہے کہ جب بھی ان کے ہاں صوفیہ کی کوئی جماعت آتی تو وہ بازار جاکر جھولی میں روٹی کے ٹکڑے مانگ لاتے اور ان کو صوفیہ کے پاس لے جاتے۔

بنان حمّالؒ بیان کرتے ہیں کہ مجھے کبھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ میں طفیلی ہوں مگر ایک بار جب کہ میں نے ایک درویش کو دیکھا کہ دن کو روزہ رکھتا اور مغرب کے بعد بازار جاکر ہر دوکان سے ایک لقمہ مانگتا تا آنکہ اس کا گذارہ ہو جاتا تو واپس اپنی رہائش گاہ آجاتا۔ میں نے ایک رات اسے اپنے ساتھ لیا، اور دوکانوں سے اسے بہت سارا حلوہ، پھل اور دیگر کھانے پینے کی

چیزیں لے دیں، یہاں تک کہ اس کے پاس بہت کچھ اکٹھا ہو گیا۔ جب وہ واپس اپنی جگہ کی طرف جانے لگا تو مجھ سے کہنے لگا: اے شیخ! آپ کہیں کوتوال کے آدمی تو نہیں؟ میں نے کہا: نہیں، میں تو بنان الحمّالؒ ہوں۔ یہ سنتے ہی اس نے وہ سب طعام و فواکہ میرے منہ پر دے مارے اور کہا: اے طفیلی! یہ کام جو تو کرتا ہے ہمارے ہاں تو کوتوال کے آدمی کرتے ہیں نہ کہ صوفیہ کرام۔ تو لوگوں سے کہتا ہے کہ لے آؤ اور وہ سب کچھ لے آتے ہیں۔

ایک سالک نے اپنے دیگر ساتھیوں کے لیے روٹی کے ٹکڑے مانگے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے لگا، شیوخ کی ایک جماعت نے اس کے اس عمل کو ناپسند کیا اور کہا کہ تجھے نفس نے فریب دیا۔ اور یہ روٹی تو نے اپنے لیے مانگی اگر اپنے ساتھیوں کے لیے مانگی ہوتی تو خود ان کے ساتھ کھانے کو نہ بیٹھتا۔

صوفیہ کے لیے لوگوں سے اپنی ضرورت کے وقت مانگنے کے بھی کچھ اصول ہیں، جو صوفی بھی ایسا کرے اسے چاہیئے کہ مانگنے کو اپنی عادت نہ بنائے بلکہ اس سے پہلے کہ مانگنا اس کی عادت بن جائے وہ اسے ترک کر دے، اور ایسا صوفی کہ جو صرف اپنی ضرورت کے مطابق کوئی چیز لیتا ہے اسے اگر زیادہ پیش کیا جائے تو چاہیئے کہ وہ صرف اپنی ضرورت پوری کرے اور باقی کو مستحقین میں تقسیم کر دے۔

تقویٰ و پرہیزگاری کے ذریعے قبول عام حاصل کر کے لوگوں سے کچھ وصول کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ صوفی بھیک مانگ کر کھائے۔

اور صوفی جب مانگنے پر مجبور ہو جائے تو اس کا کفارہ اس کا صدق ہے۔

ایک شیخ پر پردیس میں کئی دن بغیر کھائے پیئے گذر گئے حتیٰ کہ جان نکلنے کی نوبت آ پہنچی مگر انھوں نے کسی سے کچھ مانگا نہیں ایسا کرنے کی وجہ پوچھی گئی، تو فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم کے اس قول نے روک لیا: "جس نے حقیقی سائل کو خالی لوٹا دیا اس نے بھلائی نہ پائی" اس وجہ سے میں نہیں جانتا کہ میرا کوئی مسلمان بھائی مجھے خالی لوٹا دے اور قول نبوی کے مطابق وہ بھلائی پانے سے محروم ہو جائے۔

(۴۹)

دنیوی تحائف اور صوفیہ کرام

ابو یعقوب نہر جوریؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابو یعقوبؒ سوسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم ارجان میں تھے تو ہمارے پاس ایک فقیر آیا۔ سہل بن عبداللہؒ بھی وہیں موجود تھے، فقیر نے کہا: آپ لوگ اہل کرم ہیں اور میں مصیبت و آزمائش میں گرفتار ہوں۔ سہل بن عبداللہؒ نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے جس نے تمہیں اس طرح مصیبت میں گرفتار کر دیا ہے۔ فقیر نے کہا: مجھے دنیوی مال میں سے ایک تحفہ پیش کیا گیا اور میں نے اسے اپنے لیے پسند کر لیا۔ جس کے نتیجے میں میں اپنے ایمان اور حال سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہ سن کر سہل بن عبداللہؒ نے ابو یعقوبؒ سے کہا اس شخص کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ ابو یعقوبؒ نے کہا: حال کھو دینے کی مصیبت ایمان کھو دینے سے بڑی ہے۔ سہلؒ نے کہا: میری بھی یہی رائے ہے۔

خیر النساجؒ کہتے ہیں: میں ایک مسجد میں داخل ہوا تو وہاں ایک جاننے والے فقیر کو دیکھا وہ دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ اور کہنے لگا، اے شیخ! مجھ پر کرم کیجئے کہ میری مصیبت بہت بڑی ہے۔ میں نے کہا: کیسی مصیبت؟ کہنے لگا: مجھے رنج والم کی زندگی سے نکال کر عافیت کی زندگی سے ہمکنار کر دیا گیا ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ یہ بہت بڑی مصیبت ہے۔ خیر النساج کہتے ہیں کہ اس کی مصیبت یہ تھی کہ اسے کوئی دنیوی تحفہ دیا گیا تھا۔

ابو تراب نخشبیؒ نے کہا: جب تم میں سے کسی پر نعمتیں زیادہ ہو جائیں تو اسے اپنے اوپر

صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم

رونا چاہیئے کیونکہ اس طرح وہ صالحین کے راستے سے بھٹک سکتا ہے۔

مجھے وجیہیؒ نے بتایا کہ بنان الحمّالؒ کی خدمت میں ایک ہزار دینار پیش کیے گئے اور انھیں ان کے سامنے ڈھیر کر دیا گیا تو انھوں نے لانے والے سے کہا: انھیں اٹھا لو اور یہاں سے چلے جاؤ، خدا کی قسم! اگر ان سکوں پر خدا کا نام کندہ نہ ہوتا تو میں ان پر پیشاب کرتا۔

کہتے ہیں کہ بنان الحمّالؒ کا بیٹا سویا ہوا تھا کہ اس کے سرہانے چار سو درہم رکھے گئے، اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ جس نے اپنی ضرورت سے زیادہ دولتِ دنیا لی، اس کا دل اندھا ہو گیا، جب وہ بیدار ہوا تو اس رقم میں سے دو دانگ (درہم کا ۱/۳ حصہ) لے لیے اور باقی لوٹا دیئے۔

ابن علوانؒ کو میں نے یہ کہتے سنا کہ ابوالحسن نوریؒ کی خدمت میں تین سو درہم پیش کیے گئے جو انھوں نے ایک جوہڑ کے پل پر بیٹھ کر ایک ایک کر کے پانی میں پھینک دیئے۔ اور کہنے لگے: میرے مالک! کیا تو مجھ کو ان سکوں سے بہلانا چاہتا ہے۔

جعفر خلدیؒ نے فرمایا: ابن زیریؒ جنید علیہ الرحمہ کے مریدوں میں سے تھے انھیں ایک مرتبہ کوئی دنیوی چیز بطور تحفہ دی گئی تو وہ فقراء (صوفیہ) سے الگ ہو گئے، اس کے بعد وہ ایک روز ہمیں راستے میں آتے دکھائی دیئے، ان کی آستین میں ایک رومال تھا جس میں بہت سے درہم بندھے ہوئے تھے، جب انھوں نے ہمیں دور سے دیکھ لیا تو کہا: اے دوستو! جب تم دولتِ فقر سے مالا مال ہو اور میں دولتِ دنیا سے تو پھر ملاقات کیسی اور سب درہم ہماری طرف پھینک دیئے۔

ابوسعید ابن الاعرابیؒ کہتے ہیں کہ ایک نوجوان ابواحمد قلانسیؒ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ پھر وہ اچانک غائب ہو گیا، اور بعد مدت کے لوٹا تو بے شمار تحائف اور مال لے کر آیا، ہم نے ابواحمدؒ سے کہا کہ ہمیں اس سے ملنے کی اجازت دیں تو انھوں نے فرمایا: نہیں، اس کی اور ہماری دوستی فقر کی وجہ سے تھی اگر وہ فقیری پر قائم رہتا تب تو ہم اس سے ملنے جاتے

مگر اب جب کہ وہ اس حالت میں نہیں لوٹا تو اسے چاہیئے کہ ہم سے ملنے آئے۔

ابو عبداللہ حصریؒ نے کہا: ابو حفص حدادؒ رملہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان کے پاس دو[2] خرقے تھے اور ان کی کمر بند میں ایک ہزار درہم بندھے ہوئے تھے، وہ دو دن وہاں ٹھہرے، اور اپنی اس رقم میں سے کچھ بھی اپنے اوپر خرچ نہ کیا بلکہ ساری رقم فقرا پر صرف کر دی۔

حصریؒ کہتے ہیں کہ میں اور شبلیؒ قحط کے دنوں میں ان کے بچوں کے لیے کچھ حاصل کرنے کے لیے باہر نکلے، شبلیؒ ایک شخص کے پاس گئے جس نے انھیں بہت سے درہم دیئے ہم اس شخص کے گھر سے نکلے تو ہماری جیبیں بھری ہوئی تھیں، راستے میں جو کوئی بھی حاجت مند ملتا شبلی ان دراہم میں سے اسے دیتے، حتّٰی کہ ہمارے پاس بہت کم درہم رہ گئے، تو میں نے ان سے کہا: میرے آقا! گھر میں بچے بھوکے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: تو میں کیا کروں؟ الغرض بڑی کوشش کے بعد میں نے بقیہ درہموں کی کچھ گاجریں وغیرہ لیں اور ان کے بچوں کے لیے لے گیا۔

عجیب و غریب امانت

ابو جعفر دراجؒ کہتے ہیں کہ میرے استاد ایک دن طہارت کے لیے باہر نکلے تو میں نے ان کے صندوق میں چار درہم کی مالیت کی چاندی پائی، مجھے بڑی حیرانگی ہوئی کیونکہ اس وقت حالت یہ تھی کہ ہم دونوں کے پاس کچھ کھانے کو نہ تھا۔ جب وہ واپس آئے تو میں نے عرض کیا: آپ کے صندوق میں چاندی پڑی ہوئی ہے اور ہم بھوکے ہیں۔ انھوں نے کہا: چاندی لے لو اور اس کے بدلے کوئی چیز خرید لو۔ میں نے کہا: آپ کو اپنے معبود کی قسم! یہ چاندی کا کیا معاملہ تھا؟ کہا: مجھے اللہ نے دنیوی اشیاء میں سے کچھ نہیں عطا کیا، نہ چاندی نہ سونا، اس لیے میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ یہ وصیت کر کے مروں کہ یہ چاندی میرے ساتھ دفن کر دی جائے تاکہ روزِ قیامت میں اللہ کے حضور یہ عرض کروں کہ دنیا میں سے آپ نے مجھے یہ کچھ عطا فرمایا تھا۔

خلیفہ معتضد باللہ نے ابو الحسین نوریؒ کو کچھ مال دیا تاکہ وہ اسے صوفیہ میں تقسیم کردیں، انھوں نے وہ سارا مال اپنے گھر میں ڈال دیا اور بغداد کے صوفیہ کو جمع کرکے ان سے کہا : آپ میں سے جسے بھی جس قدر ضرورت ہو وہ اندر جائے اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق مال لیتا جائے، اس طرح کوئی سو کوئی اس سے زیادہ کوئی کم اور کوئی کچھ نہ لیتا۔ جب سارے درہم ختم ہوگئے تو انھوں نے تمام صوفیاء کو مخاطب کرکے کہا : تم میں سے جس نے جس قدر درہم لیے اسی قدر وہ اللہ سے دور ہے اور جس نے درہم ترک کردیئے وہ اتنا ہی اللہ سے قریب ہے۔

۵۰

صوفیہ کے آدابِ کسبِ معاش

سہل بن عبداللہؒ نے کہا : جس نے کسبِ رزق پر طعن کیا اس نے سنت پر طعن کیا اور جس نے توکل پر طعن کیا اس نے ایمان پر طعن کیا ۔

جنید بغدادیؒ کسبِ معاش کے بارے میں کہتے ہیں : صوفی پانی ڈھوتا اور گٹھلیاں اٹھاتا ہے ۔

ایک مکتوب

شیخ اسحاق مغازلیؒ ، بشر بن حارثؒ جو کھڈی پر کام کرتے تھے کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کھڈی پر کام شروع کر کے روزی کے معاملے میں بے فکر ہو گئے ہو لیکن یہ بتاؤ کہ اگر اللہ تیری بینائی اور سماعت تجھ سے لے لے تو تو کس کی پناہ ڈھونڈے گا ۔"

کہتے ہیں کہ اس مکتوب کو پڑھنے کے بعد بشر بن حارثؒ نے کھڈی پر کام کرنا چھوڑ دیا ، اور عبادت میں مشغول ہو گئے ۔

میری موجودگی میں ابن سالمؒ سے اس وقت جب کہ وہ کسب معاش کے فضائل بیان کر رہے تھے کسی نے پوچھا :

ہم پر کسبِ معاش فرض ہے یا توکّل ؟ ابن سالمؒ نے فرمایا : توکل ، حالِ رسولؐ ہے اور کسب ، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ رسول اللہؐ نے مومنوں کے لیے کسب کو اس لیے سنت ٹھہرایا کہ وہ ان کی کمزوری کو جانتے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اگر مسلمان درجۂ توکل (جو کہ حالِ رسول ہے) سے گر جائیں تو کسبِ معاش کے درجہ سے بھی گر جائیں جو کہ سنتِ رسول ہے ۔ اور اگر وہ اس طرح کا طریق ان کے لیے وضع نہ فرماتے تو وہ ہلاک ہو گئے ہوتے ۔

عبداللہ بن مبارکؒ فرمایا کرتے تھے : جس نے طلبِ معاش کی ذلتیں نہیں اٹھائیں اس میں خیر نہیں ، اور تیرا کسب تجھے تفویض و توکّل سے نہیں روک سکتا بشرطیکہ تو ان دونوں کو کسب میں پیشِ نظر رکھے ، اور ضائع نہ کرے ۔

کہا جاتا ہے کہ ابو سعید خرازؒ ایک سال کسی قافلے کے ساتھ شام سے مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوئے ، دورانِ سفر وہ ایک رات صبح تک اپنے درویش ساتھیوں کے جوتے گانٹھتے رہے ۔

ابو حفص نے کہا : میں نے کسبِ معاش کو ایک بار چھوڑا اور پھر اسے اختیار کیا اس کے بعد طلبِ معاش مجھ سے خود بخود چھوٹ گیا اور میں نے پھر اسے اختیار نہ کیا ۔

ایک درویش کا بیان ہے کہ دمشق میں ایک سیاہ فام شخص تھا جو صوفیہ کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا ، سارا دن تین درہم کے عوض چونا کوٹتا اور تین روز تک ان تین دراہم سے گذارہ کرتا ۔ اُجرت ملتی تو کوئی طعام خرید کر اپنے ساتھیوں کے پاس جاتا اُن کے ساتھ مل کر کھاتا اور اس کے بعد کام پر لوٹ جاتا ۔

ابوالقاسم منادیؒ گھر سے کمانے نکلتے اور جہاں کہیں بھی دو دانق مزدوری مل جاتی وہیں سے گھر لوٹ آتے ۔

ابراہیم خواصؒ فرمایا کرتے تھے : جب مرید تین دن کے بعد اسباب پہ بھروسہ کرنا شروع کر دے تو اس کے لیے بازار میں جا کر روزی کمانا زیادہ بہتر ہے ۔

ابراہیم بن ادہمؒ فرماتے ہیں : تمہارا فرض ہے کہ بہادر و دلیر انسانوں کا طریق اپناؤ

کسبِ حلال کرو اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو۔

صوفیہ کے آداب کسبِ معاش میں سے یہ بھی ہے کہ جب وہ کسب رزق میں مشغول ہوں تو یہ خیال رکھتے ہیں کہ مبادا اپنے فرائض کی بروقت ادائیگی سے غافل ہو جائیں، اور وہ اپنے کام سے حصول رزق ہی کی نیت نہیں رکھتے، بلکہ اپنے کسب سے مسلمانوں کی اعانت کا ارادہ بھی رکھتے ہیں ان کے ساتھ انصاف کرتے ہیں، اور اگر ان کے رزق میں سے کوئی چیز بچ جائے تو وہ جمع نہیں کرتے بلکہ اپنے ان ساتھیوں پر خرچ کر ڈالتے ہیں جن کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کسی سے کچھ مانگتے ہیں، اور اگر اسے اس سلسلے میں اس کے ساتھی آزمائیں تو وہ پورے اترتے ہیں۔

اور اسی طرح وہ لوگ جن کے گذر بسر کا کوئی ذریعہ نہ ہو، اگر انھیں کوئی چیز تحفۃً پیش کی جائے تو اسے قبول کر لیتے ہیں اور وہ اس چیز کے اسباب پر اپنے نفسوں سے بڑھ کر توجہ دیتے ہیں۔

ابو حفص حدادؒ کے بارے میں کہتے ہیں کہ بیس برس روزانہ ایک دینار کے بدلے سارا دن مزدوری کرتے اور اسے صوفیہ پر خرچ کرتے، کسی سے کبھی اپنی حاجت پوری کرنے کا سوال نہ کرتے، روزہ رکھتے اور مغرب و عشاء کے درمیان مختلف دروازوں سے خیرات کرتے تھے۔

شبلیؒ نے ایک شخص سے سوال کیا: تمھارا کیا پیشہ ہے؟ اس نے جواب دیا: جوتے مرمت کرتا ہوں، آپ نے فرمایا: تو نے اللہ کو جوتے مرمت کرنے کے شغل میں بھلا دیا۔

ذوالنونؒ کا قول ہے: عارف جب طلبِ معاش میں لگ گیا تو اس نے کچھ نہ پایا۔

۵۱

حصول وعطا اور فقرا پر مہربانی کرنے سے متعلق صوفیہ کا طریق

سری سقطیؒ فرماتے ہیں مجھے جنت کی طرف جانے کا ایک مختصر ترین رستہ معلوم ہے اور وہ یہ ہے کہ نہ کسی سے کوئی چیز مانگو اور نہ کسی سے کوئی چیز لو۔ اس طرح تمھارے پاس کچھ بھی نہ ہوگا کہ کسی کو دو۔

جنید بغدادیؒ کہتے ہیں کہ کسی کو اس وقت تک کوئی شے لینا جائز نہیں جب تک اس شے کا خود سے جدا کرنا اس کے نزدیک عزیز تر نہ ہو۔

صبیحیؒ کے مرید ابوبکر احمد بن حمویہؒ نے کہا: جس نے اللہ کے لیے کوئی چیز لی اس نے عزت کے ساتھ لی اور جس نے اللہ کے لیے کوئی چیز ترک کی تو عزت کے ساتھ ترک کی اسی طرح جس نے غیر اللہ کے لیے کوئی چیز لی تو ذلت سے لی اور جس نے غیر اللہ کے لیے کوئی چیز چھوڑ دی تو ذلت کے ساتھ چھوڑی۔

میں نے احمد الوجیہیؒ سے اور انھوں نے زقاقؒ کو یہ کہتے سنا کہ مصر میں میری ملاقات یوسف صائغؒ سے ہوئی، ان کے پاس کچھ درہم تھے، جو انھوں نے مجھے دینے چاہے مگر میں نے انکار کر دیا، انھوں نے کہا: لے لو رد نہ کرو، اگر مجھے یہ احساس ہوتا کہ میری ملکیت میں کچھ درہم ہیں یا میں آپ کو کچھ دوں گا، تو میں یہ درہم کبھی آپ کو پیش نہ کرتا۔

ابو علی رودباریؒ نے کہا: میں نے ابن رقیع دمشقی سے بڑھ کر فقرا کے ساتھ نرمی و

اخلاق سے پیش آنے والا کوئی نہیں دیکھا، میں نے ایک رات ان کے پاس گذاری اور ان کو سہل بن عبداللہؒ کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے کہا: فقیر صادق کی یہ نشانی ہے کہ وہ نہ کوئی چیز مانگتا ہے نہ رد کرتا ہے اور نہ اپنے پاس رکھتا ہے۔ میں (ابوعلی رودباریؒ) نے جب ان سے رخصت چاہی تو وہ گئے اور کچھ درہم لے کہ میری اس جانب کھڑے ہو گئے جس طرف میں نے لوٹا ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، اور مجھ سے فرمایا: تو نے سہل بن عبداللہؒ کی کیا بات سنائی تھی پھر سے کہو میں نے انھیں پھر سے سناتے ہوئے جب یہ کہا کہ نہ تو کوئی چیز کسی سے مانگ اور نہ کوئی چیز رد کر یہ کہنا تھا کہ انھوں نے وہ درہم میرے لوٹے میں ڈال دیئے اور چلے گئے۔

ابوبکر زقاقؒ نے فرمایا: سخاوت یہ ہے کہ کھونے والا پانے والے کو عطا کرے نہ کہ عطا کرنے والا۔

ابومحمد مرتعشؒ نے کہا: میرے نزدیک کسی سے کچھ لینا اس وقت تک جائز نہیں جب تک باقاعدہ ارادہ نہ ہو کہ فلاں آدمی سے کچھ لینا ہے۔ اس طرح اس سے کچھ لینا اس کے لیے ہوگا نہ کہ خود اپنے لیے۔

جعفر خلدیؒ کہتے ہیں کہ جنیدؒ نے کہا: ایک روز میں نے کچھ درہم لیے اور ابن الکرینی کے پاس چلا گیا کہ ان کو دوں گا، اور وہ مجھے جانتے بھی نہ تھے، میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ درہم قبول کر لیں، تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: میں تو ان سے مستغنی ہوں، جواباً میں نے عرض کیا: اگر آپ ان سے مستغنی ہیں تو پھر میں ایک مسلمان ہوں میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ انھیں قبول فرمالیں لہٰذا میری خوشی کی خاطر ہی آپ لے لیں۔ یہ سن کر انھوں نے مجھ سے وہ درہم لے لیے۔

کہتے ہیں کہ ابوالقاسم منادیؒ جب اپنے پڑوس میں کسی گھر سے دھواں اٹھتا دیکھتے تو اپنے پاس موجود کسی شخص سے کہتے: ان کے گھر جاؤ اور کہو آپ نے جو کچھ پکایا ہے ہمیں

بھی اس میں سے دیں۔ کسی نے ان سے کہا: ممکن ہے کہ وہ پانی ہی گرم کر رہے ہوں۔ اور انھوں نے پھر سے کہا: جاؤ، ان کے پاس آخر یہ امیر لوگ کس لیے کوئی چیز تیار کرتے ہیں، سوائے اس کے کہ ہمیں دیں اور وہ قیامت کے روز ہماری سفارش کریں۔

جنید بغدادیؒ کہتے ہیں: میں حسین بن حصریؒ کے پاس کچھ درہم لے کر گیا کیونکہ ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا اور وہ ایک صحرا میں مقیم تھے جہاں کوئی ان کے اردگرد نہ تھا مگر انھوں نے درہم لینے سے انکار کر دیا میں نے درہم لے جا کر ان کے حجرے میں پھینک دیئے، جہاں ان کی اہلیہ موجود تھیں۔ اور یہ کہا کہ اے خاتون! یہ درہم آپ کے لیے ہیں۔ اس کے بعد حسین بن حصریؒ کے پاس درہم رد کرنے کا کوئی حیلہ نہ تھا۔

یوسف بن الحسینؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ اگر میں فقط اللہ کے لیے کسی شخص کو اپنا سارا مال دے دوں تو کیا اس طرح میری ملکیت میں سے اس کا حق پورا ہو جائیگا یوسف بن الحسینؒ نے جواب دیا: تیرے نزدیک یہ کیسا ہے کہ تو کسی شخص کو لینے کی ذلت سے دوچار کر دے اور خود عطا کرنے کی عزت پا لے جب کہ تمھیں تو یہ معلوم ہے کہ دینا عزت اور لینا ذلت ہے۔

تربیتِ اولاد اور تزویج کے آداب

ابوسعید اعرابیؒ کہتے ہیں کہ ابواحمد مصعب بن احمد قلانسیؒ کی شادی کا سبب یہ تھا کہ ان کے ساتھیوں میں سے ایک نوجوان نے ابواحمد قلانسیؒ کے دوست کی لڑکی سے شادی کے لیے پیغامِ نکاح بھیجا۔ جب نکاح کا وقت آیا تو اس نوجوان نے نکاح سے انکار کر دیا اس پر لڑکی کا والد بہت شرمندہ ہوا۔ یہ صورت حال ابواحمد قلانسیؒ نے دیکھی تو کہنے لگے: سبحان اللہ! ایک شخص اپنی نیک خصال بیٹی کی شادی تجھ سے کر رہا ہے اور تو انکار کر رہا ہے۔ الغرض یہ نکاح ابواحمد قلانسیؒ سے طے پایا۔ لڑکی کے والد نے ابو احمدؒ کا سر چوم کر کہا: میں نہیں جانتا تھا کہ اللہ کے ہاں میری اتنی وقعت ہے کہ مجھے آپ سا داماد عطا کیا اور میری لڑکی کے یہ نصیب کہ اسے آپ سا شوہر نصیب ہوا۔ ابوسعید اعرابیؒ کہتے ہیں کہ وہ لڑکی تیس برس تک ان کے ہاں رہی مگر اس تمام عرصہ میں وہ کنواری ہی رہی۔

کہتے ہیں کہ محمد بن علی قصّارؒ صاحبِ اہل و عیال بزرگ تھے ایک روز وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے کہ ان کی چھوٹی بیٹی آئی اور چیخ کر کہا، اے ربِ آسمان! ہمیں انگور چاہئیں۔ محمد بن علیؒ مسکرائے اور کہنے لگے کہ میں نے اپنے بچوں کو یہ تربیت دی ہے کہ جب بھی انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ مجھ سے طلب نہ کریں بلکہ اپنے رب سے مانگیں اب وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔

وجیہیؒ بیان کرتے ہیں کہ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ بنان حمّالؒ کے پاس ان کا بیٹا

آتا اور کہتا، ابّا جان! مجھے روٹی چاہیئے تو وہ انھیں تھپڑ مار کر کہتے جاؤ اپنے باپ کی طرح محنت کر کے حاصل کرو۔ وجیہیؒ کہتے ہیں کہ ایک روز ان کا بیٹا آ کر کہنے لگا: ابّا جان! مجھے کشمش لے دیں۔

بنانؒ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کشمش بیچنے والے کی دوکان پر لے جا کر اس سے کہا: تم میرے بچے کو ایک قیراط کی کشمش دے دو اور میں تیرے لیے آوازیں لگاتا ہوں "تاکہ تیرا مال بک جائے، دوکاندار نے ان کے بچے کو کشمش دے دی اور بنان الحمالؒ لوگوں کو پکارنے لگے: اے لوگو! اس بےچارے سے وہ غذا خرید لو جو ختم ہو جائے گی باقی نہیں رہے گی، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس دوکاندار کی ساری کشمش بک گئی۔

ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا: جب کوئی فقیر (صوفی) شادی کر لے تو گویا وہ کشتی میں سوار ہو گیا، اور جب اس کے اولاد ہوئی تو جان لو کہ غرق ہو گیا۔

مذکورہ حکایت سفیان ثوریؒ کے بارے میں بھی مشہور ہے۔

بشر بن حارثؒ نے کہا: اگر میں دنیوی ضروریات و حاجات کی جانب بہت زیادہ توجہ دوں تو مجھ میں اور ایک کوتوال میں کیا فرق رہ جائے گا۔

عبادت گذار میاں بیوی

ابو شعیب براثیؒ کی ایک جھونپڑی تھی۔ اس میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کوئی دنیادار خاتون وہاں سے گذری تو اس نے آپ سے شادی کی خواہش ظاہر کی، اور کہا کہ میں آپ کی خدمت کروں گی، اس خاتون نے اپنا تمام دنیوی مال و متاع ترک کر دیا، شادی ہو گئی اور جب خاتون جھونپڑی میں داخل ہونے لگی تو اس کی نظر ایک چٹائی پر پڑی فوراً کہہ اٹھی کہ اس چٹائی کو یہاں سے نکال دیں کیونکہ میں نے آپ ہی سے سنا ہے کہ زمین انسان سے یہ کہتی ہے کہ آج تو میرے اور اپنے درمیان چیزیں حائل کرتا ہے جب کل تو نے میرے پیٹ میں داخل ہونا ہے

اور میں نے درمیان میں کچھ حائل نہیں کرنا۔ ابوشعیب نے چٹائی باہر نکال پھینکی اور کہا: اب اندر آئیے اور وہ داخل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ وہ دونوں اسی حالت میں برسوں اس جھونپڑی میں مشغولِ عبادت رہے حتیٰ کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

صاحبِ اولاد صوفیہ کے آداب یہ نہیں کہ اہل و عیال کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں بلکہ انھیں فرائض کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیئے۔ ہاں ایسی صورت میں وہ اپنے توکل کو یہاں بھی بروئے کار لانے کے مجاز ہوں گے اگر ان کے اہل و عیال بھی اسی حال کے حامل ہوں جو وہ رکھتا ہیں۔

صوفیہ کا یہ طریق بھی نہیں کہ وہ امیر خواتین سے بیاہ رچا کہ ان سے فائدہ حاصل کریں بلکہ صوفیہ کا طریق یہ ہے کہ وہ غریب خواتین سے نکاح کریں اور ان کے ساتھ انصاف سے پیش آئیں۔ اگر کوئی امیر خاتون ان سے نکاح کی خواہش مند ہو تو اس سے حصولِ منفعت نہ کریں۔

فتح موصلیؒ نے ایک بار اپنے بچے کو اٹھا کر چوم لیا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ اسی وقت میں نے غیب سے یہ آواز سنی کہ اے فتح موصلیؒ! تجھے شرم نہیں آتی کہ ہمارے ہوتے ہوئے دوسروں سے بھی محبت کرتے ہو۔

فتح موصلیؒ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کبھی اپنے بچے کو نہیں چوما۔

ایک سوال اور اس کا جواب

مذکورہ بالا واقعہ کے ضمن میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اولاد تھی وہ انھیں چومتے اور گلے لگاتے تھے۔ اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ اقرع بن حابسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے دس بچے ہیں جنھیں میں نے کبھی نہیں چوما۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: جس نے رحم نہ کیا اس پہ رحم نہیں کیا جائے گا۔

ابوسعید خرّازؒ کہتے ہیں: میں رَملہ میں وارد ہوا تو سیدھا جعفر قصابؒ کے گھر گیا۔ ان کے ہاں رات بسر کی اور صبح رَملہ سے بیت المقدس کی راہ لی۔ بیت المقدس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جعفر قصابؒ بھی میرے پیچھے سر پر روٹی کے ٹکڑے اٹھائے پہنچ گئے، اور کہا: مجھے معاف کر دیجئے، مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ روٹی کے ٹکڑے میرے گھر میں موجود تھے۔

صوفیہ خلوت اور جلوت میں

سری سقطیؒ فرمایا کرتے تھے: مساجد میں محفلیں لگانا ایسا ہے کہ جیسے مساجد نہ ہوں بلکہ مے خانے ہوں جن کے دروازے بھی نہ ہوں۔

سری سقطیؒ ہی کا ایک اور قول ہے: نفس کو آلودگیوں سے پاک رکھنا، لوگوں کا مجالس اور محافل میں آداب کو ملحوظ رکھنا مروت کہلاتا ہے۔ اور اگر کوئی اس سے بھی آگے بڑھ جائے تو یہ اور بہتر ہے۔

کسی شیخ نے کہا: درویش کو اپنا زیادہ وقت خلوت نشینی میں گذارنا چاہیئے۔

ابو یزیدؒ کہتے ہیں: میں ایک رات نماز ادا کر رہا تھا کہ تھک گیا اور بیٹھ کر ٹانگیں پھیلا دیں کہ اتنے میں غیب سے آواز آئی کہ شاہوں کی مجلس میں بیٹھنے والے کو اپنی عادات بھی سنوارنی چاہئیں۔

ابراہیم بن ادھمؒ کہتے ہیں: ایک مرتبہ میں چار زانو ہو کر بیٹھا تو آواز آئی: کیا شاہوں کی محفل میں بیٹھنے کا یہ طریق ہے؟ اور اس کے بعد میں زندگی بھر چار زانوں ہو کر نہیں بیٹھا۔

ابراہیم خواصؒ کہتے ہیں: میں نے ایک درویش کو نہایت خوب صورت انداز میں بیٹھے ہوئے دیکھا، میں نے بڑھ کر اس کی جھولی میں کچھ درہم ڈال دیئے۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا: میں نے بیٹھنے کا یہ طریق ایک لاکھ درہم میں خریدا ہے کیا اسے تیرے ہاتھ اتنی حقیر سی رقم کے عوض بیچ ڈالوں۔

یحییٰ بن معاذؒ کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی مجلس میں بیٹھنا کہ جو تصوف کے مخالف ہوں، روح کو اندھا بنا دیتا ہے۔ اور ذوق کو نقصان پہنچاتا ہے۔

وجیہیؒ کہتے ہیں: ابن مملولہ العطارؒ اپنے ایک جلیس سے نہایت تنگ تھے میں نے کہا کہ ایسے شخص کو پاس کیوں بٹھاتے ہیں کہ جس سے آپ تنگ ہیں، انھوں نے کہا: مجھ سے اس کی جدائی بھی تو برداشت نہیں ہوتی۔

صوفیہ کا قول ہے کہ کسی کے کردار کو معلوم کرنا ہو تو اس کے دوست کا کردار دیکھ لو۔

حضرت قزازؒ رات بھر بیٹھے جاگتے رہتے تھے کسی نے اس کا سبب پوچھا تو فرمانے لگے، تصوف کی بنیاد تین چیزوں پر ہے:

(۱) ہمیشہ فاقے کے بعد کھانا۔

(۲) ضرورت کے مطابق گفتگو کرنا۔

(۳) نیند کا غلبہ ہو تو سونا۔

جعفرؒ کہتے ہیں کہ جنیدؒ مجھ سے کہا کرتے تھے: اگر میں یہ جانتا کہ دو رکعت نفل ادا کرنا تمھارے ساتھ بیٹھنے سے افضل ہے تو میں کبھی تمھاری صحبت اختیار نہ کرتا۔

○

۵۴

صوفیہ کی فاقہ کشی کے آداب

یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں: اگر فاقہ کشی بازار میں بکنے والی کوئی جنس ہوتی تو طالبینِ آخرت کے لیے بازار سے کوئی اور چیز خریدنا بہتر نہ ہوتا۔

فاقہ کشی مریدین کے لیے ریاضت، تائبین کے لیے تجربہ، زہاد کے لیے رہنمائی اور عارفین کے لیے مجد و شرافت کا باعث ہے۔

سہل بن عبداللہ کی حالت یہ تھی کہ جب فاقے سے ہوتے تو اور قوی ہو جاتے ہیں اور کچھ کھا لیتے تو کمزور پڑ جاتے۔ آپ کا کہنا ہے کہ جب تم سیر ہو جاؤ تو سیری عطا کرنے والے سے فاقے کی دعا کرو۔ اور فاقہ ہو تو اللہ سے سیری عطا کرنے کی استدعا کرو ورنہ تم سرکش ہو جاؤ گے۔

ابو سلیمان دارانی کہا کرتے تھے: اللہ کے ہاں فاقے کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ جو طلب کرے اسے عطا فرماتا ہے۔

میں نے ابن سالم کو یہ کہتے ہوئے سنا: فاقے میں بلی کے کان کے برابر کمی کرو اس سے زیادہ نہیں۔

سہل بن عبداللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بیس یا اس سے زیادہ دنوں تک کھانا نہیں کھاتے تھے اور یوں لگتا تھا کہ جیسے سہل بن عبداللہ نے کھانا ترک نہیں کیا بلکہ کھانے

نے ان کو ترک کر دیا ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کے قلب پر ایسی کیفیات وارد ہوتی تھیں جو ان کو کھانے پینے سے یکسر لاپرواہ بنا دیتی تھیں۔

عیسیٰ قصارؒ کہتے ہیں: درویش کو سیری کے بعد بھوکے رہنے کے لیے بے قرار ہونا چاہیئے تاکہ بھوکا ہو تو بھوک ہی اس کا ساتھی بنے۔

کسی شیخ سے ایک صوفی نے کہا: میں بھوکا ہوں۔ شیخ نے کہا: جھوٹ بولتے ہو۔ صوفی نے پوچھا، وہ کیسے؟ شیخ نے کہا: بھوکا رہنا تو اللہ کے سربستہ رازوں کے خزانے میں سے ایک راز ہے۔ جو اس شخص کو نہیں عطا کیا جاتا جو اسے افشا کرتا پھرے۔

ایک شیخ کے ہاں کوئی درویش مہمان ٹھہرا۔ شیخ نے کھانا پیش کیا۔ مہمان نے تناول کیا۔ شیخ نے پوچھا، کتنے دن سے بھوکے تھے۔ مہمان نے کہا: پانچ دن سے۔ شیخ نے کہا: تیرا بھوکا رہنا فقر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کا باعث بخیلی تھا کیونکہ تیرے پاس کپڑے تو موجود تھے اور اس کے باوجود تو نے فاقہ اختیار کی۔

۵۵

بیماری میں صوفیہ کے آداب

ممشاد دینوریؒ کے ایک مرید کا بیان ہے کہ آپ ایک مرتبہ شدید بیمار پڑے تو ان کے دوست عیادت کو آئے اور ان سے دریافت کیا : اب آپ خود کو کس طرح محسوس کرتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا : یہ سوال تو تم میری بیماری سے پوچھو کہ اس نے مجھے کس طرح محسوس کیا۔ دوستوں نے پوچھا : آپ کا دل کیسا ہے ؟ جواب دیا : وہ تو میں نے تیس برس ہوئے کھو دیا ہے۔

میں نے محمد ابن معبد البانیاسیؒ کو یہ کہتے سنا کہ کردی الصوفیؒ چھ ماہ مسلسل بیمار رہے جس کے نتیجے میں ان کے جسم میں کیڑے پڑ گئے۔ جب کوئی کیڑا نیچے گر جاتا تو آپ اسے اٹھا کر اپنے جسم کے اسی حصے پر رکھ دیتے جہاں سے وہ گرا ہوتا۔

ذوالنون مصریؒ اپنے ایک دوست کی بیمار پرسی کو گئے تو اس سے کہا : جو اس کی لگائی ہوئی چوٹ پر صبر نہیں کرتا وہ اس کی محبت میں سچا نہیں۔ اس پر ذوالنونؒ کے صاحبِ فراش دوست نے جواب دیا : اس کی محبت میں سچا تو وہ نہیں جس نے اس کی لگائی ہوئی چوٹ سے لذت حاصل نہ کی۔

سہل بن عبداللہؒ کے مریدین میں سے کوئی بیمار پڑ جاتا تو وہ اس سے کہا کرتے تھے : جب تجھے شدتِ تکلیف سے کراہتا ہو تو 'اوہ' کہو کیونکہ یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اور 'اُدخ' نہ کہو کیونکہ یہ شیطان کا نام ہے۔

ابوبکر احمد بن جعفر طوسیؒ کہتے ہیں : ابو یعقوب نہر جوریؒ کئی برس سے پیٹ کی تکلیف میں مبتلا تھے اور وہ یہ کہا کرتے تھے کہ مجھے معلوم ہے کہ اس تکلیف کی ایک دوا ہے جو ایک قیراط چاندی کے عوض خریدی جا سکتی ہے اور اس سے تکلیف دُور ہو سکتی ہے ۔ اس کے باوجود انھوں نے ساری زندگی وہ دوا نہ خریدی حتّٰی کہ انتقال فرما گئے ۔ ان کے علاج نہ کرانے کے بارے میں کسی شیخ سے استفسار کیا گیا تو کہا : ابو یعقوبؒ نے جس دوا کا ذکر کیا تھا وہ دراصل گرم لوہے سے داغنے کا طریقِ علاج تھا ۔ اور انھوں نے محض اس طریقہ علاج کے ممنوع ہونے کی وجہ سے اپنے مرض کا علاج نہ کرایا ۔

سفیان ثوریؒ بیمار پڑے تو ان کے ایک مرید کو عیادت کرنے میں کچھ دیر ہو گئی جس کے لیے انھوں نے اپنے شیخ سے معذرت کرنا چاہی مگر شیخ نے یہ کہہ کر انھیں روک دیا کہ معذرت نہ کرو کہ جس نے معذرت کی اس نے جھوٹ بولا ۔

سہل بن عبداللہؒ کو بواسیر کا مرض لاحق ہوا جس کی وجہ سے انھیں ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا پڑتا تھا ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے معلوم ہے کہ اس مرض کی دوا جو ایک قیراط میں آتی ہے مجھے اس مرض سے نجات دلا سکتی ہے ۔ مگر انھوں نے زندگی بھر وہ دوا نہیں خریدی تا آنکہ وہ اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے ۔

میں نے ان کے علاج نہ کرنے کے بارے میں ایک شیخ سے پوچھا تو فرمایا : علاج نہ کرانے کا سبب یہ تھا کہ وہ کسی کے سامنے برہنہ نہیں ہونا چاہتے تھے ۔

کہتے ہیں کہ بشر حافیؒ بیمار پڑے تو ایک طبیب انھیں دیکھنے آیا تو انھوں نے اس سے اپنی حالت بیان کی اس پر کسی نے بشر حافیؒ سے پوچھا : اے ابو نصر ! کیا آپ کو یہ خوف نہ ہوا کہ طبیب سے اپنی بیماری کا حال بیان کرنا اظہارِ شکایت کے مترادف ہو گا ۔ بشر حافی کہنے لگے : نہیں ، میں نے تو طبیب کو اسی قدر آگاہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کو مجھ پر یہ قدرت حاصل ہے ۔

میں نے ایک مکتوب میں جعفر خلدیؒ کے قلم سے لکھا ہوا پایا کہ جنیدؒ شدید بیمار پڑے تو

وہ ذوالنونؒ کا یہ قول دہرایا کرتے تھے "جسے کچھ عطا کیا جاتا ہے وہ شکر بجا لاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی کچھ عطا کر کہ ہم شکر ادا کریں" اور بعض اوقات وہ یوں بھی کہا کرتے تھے کہ یہ (بیماری) صوفیہ کی غذا ہے۔

۵۶

مشایخ کا اپنے مریدین سے حسنِ سلوک

مقامِ صحبت

جنیدؒ اپنے مریدین سے فرمایا کرتے تھے : اگر میں جانتا کہ دو رکعت نفل کی ادائیگی میرے لیے تمھارے ساتھ بیٹھنے سے افضل ہے تو میں تمھارے پاس نہ بیٹھتا ۔

بشر حافیؒ شدید سردی میں برہنہ جسم کھڑے کانپ رہے تھے ، ہم نے ان سے کہا : اے ابو نصر ! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے ؟ فرمایا : میں نے ان فقراء کو یاد کیا جن کے جسموں پر کپڑا نہ تھا ، تو ان سے ہمدردی کا اظہار کرنے کے لیے میرے پاس اور تو کچھ تھا نہیں ، لہٰذا یہی مناسب سمجھا کہ اپنی جان پر تکلیف سہہ کر ان کے لیے ہمدردی ظاہر کر دوں ۔

دُقّیؒ کہتے ہیں : مصر کی ایک مسجد میں ہم (درویشوں کی جماعت) بیٹھے تھے کہ زقّاقؒ داخل ہوئے اور مسجد کے ستون کے پاس نماز ادا کرنے لگے ۔ ہم نے یہ سوچا کہ شیخ نماز سے فراغت پالیں تو کھڑے ہو کر سلام عرض کریں ۔ اسی دوران وہ نماز سے فارغ ہو کر ہماری طرف آئے اور سلام کیا ۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ تو ہمارا فرض تھا کہ آپ کو سلام کرتے ، انھوں نے فرمایا : میرے رب نے کبھی میرے دل کو اس طرح کے عذاب میں مبتلا نہیں کیا ۔

احترامِ مشائخ

جریریؒ کہتے ہیں: میں حج کر کے لوٹا تو میں نے ابتدا جنیدؒ سے کی اور انھیں سلام کیا تاکہ انھیں ملنے کے لیے آنے کی تکلیف نہ ہو پھر میں گھر آیا، اور جب میں نے صبح کی نماز پڑھ کر پیچھے دیکھا تو جنیدؒ کھڑے تھے۔ میں نے کہا: حضور! میں سب سے پہلے آپ کے پاس سلام کرنے اسی لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو یہاں آنے کی زحمت نہ ہو۔ انھوں نے فرمایا: اے ابو محمد! وہ تیری فضیلت تھی اور یہ تیرا حق۔

ابو سعید ابن اعرابیؒ کا بیان ہے کہ ایک نوجوان ابراہیم صائغؒ نامی تھا اس کے والد مالدار آدمی تھے۔ مگر وہ خود ابو احمد القلانسیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ اور صوفیہ کی صحبت اختیار کر لی۔ ابو احمدؒ کے پاس جب بھی درہم ہوتے تو وہ ان کے بدلے ابراہیم صائغ کو حلوہ، بھنا ہوا گوشت اور آٹا خرید دیتے، اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔

جعفر خلدیؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص جنید علیہ الرحمہ کے پاس آیا اور کہا: میں اپنی تمام ملکیت کو چھوڑ کر فقر اختیار کر کے فقرا کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ خلدیؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس کے جواب میں جنیدؒ کو یہ کہتے سنا: نہیں، تمام ملکیت مت چھوڑو بلکہ اس قدر باقی رکھو کہ جس سے تمھاری ضرورت پوری ہو سکے، اور طلبِ حلال کے لیے جد و جہد کرتے رہو اس طرح مجھے یہ خدشہ نہیں رہے گا کہ تیرا نفس تجھ سے اپنا حق مانگے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ جب کسی کام کا ارادہ کر لیتے تو اس پر ثابت قدم رہتے۔

میں نے وجیہیؒ سے اور انھوں نے ابو علی رودباریؒ کو یہ فرماتے سنا: ہم جنگل میں تھے اور ہمارے ہمراہ ابو الحسن علوفیؒ بھی تھے، جب بھی راستہ گم کر بیٹھتے اور بھوک ستاتی تو علوفی ٹیلے پر چڑھ کر بھیڑیے کی طرح آوازیں نکالنے لگتے، جونہی قریب کسی قبیلہ کے کتے سنتے تو جواباً بھونکنا شروع کر دیتے اور اس طرح وہ ان کی آواز کی سمت پر چل پڑتے اور قبیلے سے کچھ کھانے پینے کو لے آتے۔

صلی اللہ علیہ وسلم

ابو سعید خرازؒ کہتے ہیں: میں رملہ میں وارد ہوا تو سیدھا جعفر قصابؒ کے گھر گیا۔ ان کے ہاں رات بسر کی اور صبح رملہ سے بیت المقدس کی راہ لی۔ بیت المقدس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جعفر قصابؒ بھی میرے پیچھے سر پر روٹی کے ٹکڑے اٹھائے پہنچ گئے، اور کہا: مجھے معاف کر دیجئے، مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ روٹی کے ٹکڑے میرے گھر میں موجود تھے۔

○

۵۷

آدابِ مریدین اور سالکین

میں نے ابو تراب نخشبیؒ کی کتاب میں لکھا ہوا پایا کہ حکمت اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جس کے ذریعے مریدین کے آداب اور طور طریقے تقویت پاتے ہیں۔

جنیدؒ سے سوال کیا گیا کہ حکایات بیان کرنے میں مریدین کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ آپ نے کہا: حکایات اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جو دلوں کے لیے باعثِ تقویت ہے۔ سوال کرنے والے نے مزید پوچھا کہ کیا اس ضمن میں کوئی قرآنی دلیل بھی ہے؟ ہاں، جیسے اللہ کا یہ قول:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۤءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ[1] — اور سب کچھ ہم تمھیں رسولوں کی خبریں سناتے ہیں جس سے تمھارا دل ٹھہرائیں۔

یحییٰ بن معاذؒ کا قول ہے: دانشمندی مریدین کے قلوب کے لیے ایسے پنکھے کی حیثیت رکھتی ہے جو ان سے دنیا کی گرمی کو دور کر دے۔

---

[1] ہود: ۱۱۹

ممشاد دینوریؒ کہا کرتے تھے: میری آنکھیں درویش صادق کو دیکھ کر ٹھنڈک پاتی ہیں۔ اور میرا دل حقیقت کے جویاں مرید کو دیکھ کر فرحت محسوس کرتا ہے۔

ابو تراب کا قول ہے: عارفین کی ریا، مریدین کا اخلاص ہے۔

ابو علی بن الکاتبؒ کہتے ہیں: جب مرید پوری طرح اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کرے تو پہلا فائدہ جو اسے اللہ کی جانب سے پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے اپنے ماسوا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

شبلیؒ مرید کے حیرت[1] میں واقع ہونے سے متعلق کہتے ہیں۔ حیرت دو وجوہات سے مرید کو لاحق ہوتی ہے۔ ایک ارتکاب گناہ کے شدید خوف سے اور دوسرے تعظیمِ قلب کا انکشاف ہونے پر۔ شبلیؒ کہتے ہیں کہ جب میں مبتدی تھا اس زمانے میں رات کو نیند غلبہ کرتی تو آنکھوں میں نمک ڈال لیتا، اور اگر پھر بھی نیند غائب نہ ہوتی تو سلائی کو گرم کر کے آنکھوں میں پھیر لیتا تھا۔

ابو سعید خرازؒ نے فرمایا: ایک مخلص و مؤدب مرید کی یہ علامت ہے کہ وقت، شفقت مہربانی اور سخاوت اس پر غالب ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے بندوں اور جملہ مخلوق کے مصائب کو ان سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خلقِ خدا کے لیے زمین کی مانند ہوتا ہے جس پر لوگ دوڑتے پھرتے ہیں، اپنے شیخ کے لیے ایک صالح ترین فرزند کی طرح ہوتا ہے بچوں کے لیے شفیق باپ ہوتا ہے۔ الغرض ساری مخلوق کے ساتھ اس کا رویہ اس قدر نرم اور محبت میں رچا ہوا ہوتا ہے کہ ہر وقت وہ ان کے غم میں شریک، ان کی فریاد میں شامل اور ان کی طرف سے پہنچنے والی ہر تکلیف کو برداشت کرتا ہے۔

مُرید صادق کی یہ صفت ہے کہ اگر اللہ اس سے چاہے کہ وہ خلق پر مہربان، انبیاء و صدیقین اور اولیاء و اصفیاء کے آداب و اخلاق پر عمل پیرا ہو تاکہ وہ اس کے اور اپنے مابین

---

[1]: اصطلاحِ صوفیہ میں حیرت انکشافِ حقیقت پر حیران ہونے کی کیفیت کو کہتے ہیں۔ (مترجم)

حائل حجابات کو اٹھا دے، تو بلاشبہ وہ ایسے اخلاق وآداب کو اپنا لیتا ہے اور اللہ سے ان پر عمل کرنے کے سلسلے میں مدد چاہتا ہے، اسی پہ بھروسہ رکھتا ہے اور ہر حال میں اس سے راضی رہتا ہے۔

سہل بن عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ مرید کا ضابطۂ اعمال یہ ہے کہ اس کے قلب میں فرض کی ادائیگی، گناہوں کی معافی مانگنا اور خلق سے سلامتی چاہنا گھر کر گیا ہو۔

یوسف بن حسینؒ نے مرید کی یہ علامات بیان کی ہیں: اس کا کسی کو نہ چاہنا بھی چاہنے کی طرح ہوتا ہے، اس کے دشمن بھی اسی طرح اس سے محفوظ ہوتے ہیں جس طرح اس کے دوست، ہر شے کو قرآن ہی میں پاتا ہے۔ جو جانتا ہے اس پر عمل کرتا ہے اور جو نہیں جانتا اس کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ لایعنی سوچ سے پرہیز کرتا ہے، عذاب سے نجات پانے کے لیے نہایت حریص اور نعمتِ خداوندی کے وعدوں سے رغبت رکھتا ہے اور غیروں کے اندر جھانکنے کے بجائے اپنے ہی قلب پر نظر رکھتا ہے۔

ابوبکر بارزیؒ مرید کو یہ نوید سناتے ہیں کہ راہ سلوک کے پہلے مقام میں نازل ہونے والی آزمائشوں سے گذر جانے کے بعد اس کے لیے آگے کا رستہ صاف ہے اور اس کے بعد وہ سوائے راحت وسہولت کے کسی اور چیز سے دوچار نہیں ہوتا۔

۵۸

آدابِ خلوتیاں

بشر حافیؒ فرمایا کرتے تھے : سالک کو خلوت میں اللہ جل مجدہ سے ڈرتے رہنا چاہیئے، اپنے گھر پر ہی رہے، اور اللہ اور اس کے کلام کو ہی اپنا ہمدم بنالے۔

میں نے دُقیؒ سے سنا : وہ درّاجؒ کے حوالے سے فرماتے تھے کہ ابو المسیبؒ ایک جلیل القدر صوفی تھے، اکثر ویران مساجد میں عزلت نشین رہتے۔ ایک رات مسجد میں ملاقات کے دوران میں نے ان سے پوچھا : آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ فرمایا : ہر جگہ کا۔ میں نے کہا : جو ہر جگہ کا رہنے والا ہوتا ہے اس کی کیا علامات ہوتی ہیں؟ فرمایا : وہ کسی چیز سے نفرت نہیں کرتا مگر ہر چیز اس سے نفرت کرتی ہے۔

ایک مرتبہ میں شبلیؒ کو ان کے پاس لے گیا انھوں نے دیکھتے ہی کہا : یہ اصطبل کے جانوروں میں سے نہیں، اگر ہے تو اس کے نشان کہاں ہیں؟ یہ سنتے ہی شبلی نے ایک چیخ ماری اور منہ لپیٹ کر کہا : خدا کی قسم! اس نے سچ کہا کہ اگر میں اصطبل کا چوپایہ ہوں تو میرے نشان کہاں ہیں۔

جنید بغدادیؒ کہتے ہیں کہ سلامتی، اسی کی دوست ہوتی ہے جو اس کا طلب گار ہو۔ صوفی مخالفت کو ترک کر دیتا ہے اور جس چیز کے بارے میں علم رکھنے سے علم شریعت روکے اس کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔

ابو یعقوبؒ سوسی کہتے ہیں : تنہائی اختیار کرنے پر صرف کامل صوفیہ ہی کو قدرت

حاصل ہوتی ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے مل جل کر رہنا ہی زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس طرح ایک دوسرے کو دیکھ کر اعمال صالح کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

مجھ سے ابوحفص عمر خیاطؒ نے یہ کہا کہ انھوں نے ابوبکر بن معلم کو انطاکیہ میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ ساٹھ برس کے بعد میں اس امر پر مجبور ہوگیا تھا کہ ایک بار پھر کلمہ شہادت تجدید ایمان کے لیے پڑھوں۔ کسی نے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو کہنے لگے کہ میں ساٹھ برس تک لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا رہا مگر جب تنہا ہو کر لکام نامی پہاڑ پر گیا اور حسب معمول عبادت کا ارادہ کیا تو مجھ سے اس انداز سے عبادت نہ ہوسکی جس بہتر انداز سے میں لوگوں کی موجودگی میں کیا کرتا تھا، اور میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جیسے مجھے اللہ پر ایمان ہی نہ رہا، اس کے بعد میں نے تجدید ایمان کے لیے کلمہ پڑھا اور دس سال اسی پہاڑ پر تنہائی میں ان تمام اوراد و وظائف اور دیگر عبادات میں خلوص و صفا پیدا کی جو میں لوگوں کے درمیان پیدا کیا کرتا تھا۔

ابراہیم خواصؒ نے ایک ویران جنگل میں ایک شخص کو دیکھا تو اس سے خلوت گزینی کا سبب پوچھا، اس شخص نے کہا، لوگوں اور دیگر ساتھیوں میں تھا تو توکل، تفویض اور رضا سے پوری طرح بہرہ ور تھا مگر جب میں نے لوگوں اور ساتھیوں کو چھوڑ کر اس ویرانے کا رُخ کیا تو یہاں مذکورہ تمام صفات سے میرا دامن خالی ہوگیا۔ اب میں یہاں مقیم ہوں تاکہ خلوت میں بھی خود کو انہی معمولات کا عادی کرلوں جن کا عادی جلوت میں تھا۔

۵۹

آدابِ محبت و رفاقت

ذوالنونؒ فرماتے ہیں : جو سفر دوست سے ملنے کی خاطر اختیار کیا جائے وہ طویل محسوس نہیں ہوتا اور محبوب کی موجودگی سے گھر تنگ نہیں کرتا۔

میں نے ابوعمر اسماعیل ابن نجیدؒ سے اور انھوں نے ابوعثمانؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا: اس شخص کی محبت پر کبھی یقین نہ کرو جو خود کو بچا بچا کر تم سے محبت کرتا ہو۔

جعفر خلدیؒ کہتے ہیں : ابن سماکؒ سے ان کے ایک دوست نے کہا کہ تمھارے اور میرے درمیان یہ قرار پایا کہ کل ہم ایک دوسرے کو عتاب کریں گے۔ ابن سماکؒ نے کہا نہیں، بلکہ یہ قرار پایا کہ ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں گے۔ کہتے ہیں کہ جو محبت ملنے سے بڑھے وہی محبت ہے۔

یحییٰ بن معاذ رازیؒ کا قول ہے : محبت وفا سے بڑھتی ہے اور جفا گھٹتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دوست سے منہ پھیرنا محبت پر رحم کرنا ہے۔

ابوالعباس ابن مسروق کہتے ہیں کہ ابوہریرہؓ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ فرمانا : "ایک دن چھوڑ کر ملو کہ اس طرح محبت میں اضافہ ہوتا ہے" اس میں ہمارے لیے ایک سنت موجود ہے۔

یحییٰ بن معاذؒ نے کسی شخص کے حال پوچھنے پر اسے جواب دیا کہ اس شخص کا کیا حال

ہوگا جس کا دشمن اس کی بیماری اور دوست اس کی مصیبت ہو۔

جنید بغدادی فرماتے ہیں : صوفیہ کو ایک نظر دیکھ لینا میرے لیے ہفتہ بھر کا زادِ راہ ہے

ایک شیخ کا قول ہے : جب مجھے (کسی مسلمان) بھائی کے خلوصِ محبت کا یقین ہو جائے تو میں اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ میں اس سے کب ملا۔

ابوالحسینؒ نوری کہتے ہیں : دوست کے لیے ہر چیز بے حساب ہوتی ہے جب کہ دشمن کو ہر چیز حساب سے دی جاتی ہے۔

جنیدؒ فرماتے ہیں : جب تو کسی کو دوست بنالے تو پھر اس کی نکتہ چینی کا بُرا نہ مان۔

جعفر خلدیؒ کہتے ہیں : میں نے ابو محمد مغازلیؒ کو یہ کہتے سنا کہ جو یہ چاہے کہ اس کی محبت لازوال ہو تو اسے اپنے قدیمی دوستوں کی محبت کو محفوظ رکھنا چاہیئے۔

○

۶۰

صوفیہ کے دنیا سے کوچ کرنے کے آداب

ابو محمد ہروی کہتے ہیں: میں نے وہ رات شبلیؒ کے پاس بسر کی تھی جس کی صبح کو وہ مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ ساری رات یہ دو اشعار ان کی زبان پر جاری رہے۔

کل بیت انت ساکنہ　　غیر محتاج الی السرج

وجھک المامول حجتنا　　یوم یاتی الناس بالحجج

ترجمہ اشعار: (۱) ہر وہ گھر جس میں تو رہتا ہو اُسے چراغوں کی کیا ضرورت ہے۔

(۲) جس روز سب لوگ اپنی اپنی دلیلیں لے کر آئیں گے ہم بھی تیرے چہرے کو جو کہ ہماری امیدوں کا مرکز ہے، بطور دلیل پیش کریں گے۔

ابن الغربیؒ کہتے ہیں: میں نے ابو تراب نخشبیؒ کے گرد ان کے ایک سو بیس مریدوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اور جن میں سے فقط دو مرید ایک ابن الجلاءؒ اور دوسرے ابو عبید بسریؒ کی موت حالتِ فقر میں ہوئی۔

شاد باش اے دل

ابن بنان مصریؒ کے دل پر اچانک ایسی کیفیت طاری ہوگئی تھی کہ اٹھ کر گھومنا شروع کر دیتے ایک مرتبہ ساتھیوں نے انھیں بنی اسرائیل کے میدان میں دیکھا تو انھوں نے آنکھیں کھولیں اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی اور کہا خوش ہو جاؤ کہ یہ جگہ احباب کی خوشیوں کی

جگہ ہے اور یہ کہتے ہی ان کی روح پرواز کر گئی۔

ابو علی رودباریؒ کہتے ہیں : میں ایک مرتبہ مصر میں وارد ہوا تو لوگوں کے اک ہجوم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم ایک ایسے نوجوان کے جنازے میں شامل ہوئے جس نے کسی شخص کو یہ شعر کہتے ہوئے سنا تو چیخ مار کر جان دے دی ؎

کبرت همة عبد

طمعت فی ان تراکا

ترجمہ : وہ شخص کتنی بڑی جرات کا مالک ہے جس کی جرات کو تیرے وصال کا شوق ہوا ہے۔

میرے کچھ دوستوں نے مجھ سے کہا کہ ابو یزید بسطامیؒ نے آخری لمحات میں یہ الفاظ کہے تھے : میں نے تجھے اس لیے یاد کیا کہ کہیں تجھ سے غافل نہ ہو جاؤں اور تو نے ہمیشہ مجھے سستی و تساہل پر ہی جھنجھوڑا۔

جنید بغدادیؒ کہتے ہیں : میں اپنے استاد ابن الکرینیؒ کے آخری وقت میں ان کے پاس ہی موجود تھا جب میں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تو مجھ سے کہا : دور ہے پھر میں نے سر زمین کی طرف جھکا لیا تو کہنے لگے : دور ہے۔ الغرض ان کا اس سے مطلب یہ تھا کہ اوپر نیچے دیکھنے یا اشارہ کرنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو تمھارے بہت قریب ہے تم خود ہی دور نکل جاتے ہو۔

جریریؒ نے کہا : میں ابو القاسم جنیدؒ کی وفات کے وقت ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور وہ مسلسل سجدے میں گرے ہوئے تھے۔ میں نے کہا : ابو القاسم ! آپ اس وقت بھی سجدے میں ہیں ؟ اس پر انھوں نے کہا : ابو محمد ! اس وقت جو کیفیت ہے اس میں مجھے سجدے کی شدید ضرورت ہے۔ الغرض میں ان کے پاس موجود تھا کہ ان کی روح سجدے ہی کی حالت میں پرواز کر گئی۔

ابوبکر دینوری کہتے ہیں : شبلی کی وفات کے وقت میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت انھوں نے مجھ سے فرمایا : میرے دل پر ایک ناجائز درہم کا بوجھ ہے جو میں نے پایا مگر اس کا مالک نہیں ملا۔ اگرچہ میں نے وہیں بازار میں اس کے نامعلوم مالک کی جانب سے کئی درہم خیرات بھی کر دیئے تھے تاہم اس وقت میرے لیے اس ایک درہم سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں۔ اس کے بعد فرمایا : نماز کے لیے مجھے وضو کرا دو میں نے انھیں وضو کرا دیا مگر ڈاڑھی کا خلال بھول گیا۔ زبان تو ان کی بند ہو چکی تھی اس لیے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی ڈاڑھی کے قریب لے گئے تو میں نے خلال کر دیا۔ اس کے بعد وہ دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔

شہادت گہِ الفت

ابوالحسین نوریؒ کے انتقال کا سبب یہ شعر تھا : ؂

لا زلت انزل من ودادك منزلا

تتحير الالباب عند نزوله

ترجمہ :۔ میں تیری محبت میں مسلسل ایک ایسے مقام پر اترتا رہا ہوں کہ جس تک رسائی پانے پر عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔

مذکورہ بالا شعر سنتے ہی آپ پر وجد طاری ہو گیا اور اسی عالم میں صحرا کی طرف نکل گئے وہاں سرکنڈوں کا ایک سلسلہ تھا جو تازہ کاٹا گیا تھا اور ان کی جڑوں سے اوپر کے باقی ماندہ حصے تلواروں کی طرح کھڑے تھے آپ ان پر یہی شعر پڑھتے ہوئے مسلسل چلتے رہے پاؤں سے خون بہتا رہا مگر آپ رکے نہیں تاآنکہ اسی حالت میں آپ نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

ابن عطاؒ کی شہادت اس طرح ہوئی کہ وہ وزیر کے پاس گئے ہوئے تھے وزیر آپ سے درشت کلامی سے پیش آیا۔ اس پر آپ نے اس سے کہا : اے شخص اپنے رویے

میں کچھ نرمی پیدا کردو مگر وزیر نے ان کے سر پر جوتے مارنے کا حکم دیا جس سے ان کا انتقال ہو گیا۔

ابراہیم خواصؒ رَی کی جامع مسجد میں اس وقت مالکِ حقیقی سے جا ملے تھے جب کہ ان کو عارضۂ اسہال لاحق تھا اور وہ ہر بار رفع حاجت کے بعد وضو کرتے یہاں تک بالآخر آپ پانی میں کھڑے کھڑے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

ابو عمران اصطخریؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابو تراب نخشبیؒ کو ایک ویرانے میں اس حالت میں دیکھا کہ وہ بغیر سہارے کے سیدھے کھڑے تھے اور روح نکل چکی تھی۔

میں نے ابو عبداللہ احمد بن عطاؒ سے اور انھوں نے کسی صوفی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب یحییٰ اصطخریؒ کے انتقال کے وقت ہم ان کے گرد بیٹھے تھے تو کسی نے ان سے کہا کہ کہو اشہد ان لا الہ الا اللہ۔ یہ سنتے ہی وہ اٹھ بیٹھے اور ہم میں سے باری باری ہر ایک کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتے رہے کہ کہو اشہد ان لا الہ الا اللہ اور اس کے بعد پیٹ کے بل لیٹ کر جان دے دی۔

جنید بغدادی سے کہا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ ابو سعید خرازؒ مرتے وقت بہت زیادہ وجد میں تھے۔ جنیدؒ نے جواب دیا عجب نہیں کہ موت کے وقت ان کی روح محبوبِ حقیقی کی جانب شوق سے محوِ پرواز ہو گئی ہو۔

موت کے بارے میں صوفیا کے آداب کے سلسلے میں میں نے انتہائی اختصار سے کام لیا ہے۔

O

(۶۱)

مسائلِ تصوف سے متعلق صوفیہ کے مختلف نظریات

اس باب میں، میں نے صوفیا کے ان انوکھے اور مختلف مسائل کا ذکر کیا ہے جو علماً فقہاء اور اہلِ ظاہر پر مشکل اور ان کے بس سے باہر ہیں۔

جمع و فرق

جمع و فرق دو اسماء ہیں۔ جمع سے مراد جمع متفرقات اور فرق سے مراد تفرقۂ مجموعات ہے جب یہ کہا جائے کہ صرف اللہ موجود ہے اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں تو یہ جمع ہے اور جب یہ کہا جائے کہ دنیا، آخرت اور کائنات تو یہ فرق ہے جیسا کہ اللہ تعالٰے نے اس آیت میں جمع کر دیا:

شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ[1] — اللہ تعالٰے نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اور آیت کے اس ٹکڑے میں فرق کیا ہے۔

وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا — اور (گواہی دی) فرشتوں نے اور عالموں

---

[1] آل عمران : ۱۸ -

بِالْقِسْطِ [1] — انصاف سے قایم ہوکر۔

ایک اور مقام پر جمع کرتے ہوئے فرمایا:

قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ [2] — یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر۔

اور فرق کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ [3] — اور (ایمان لائے) اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اتارا گیا ابراہیم پر۔

گویا جمع اصل ہے تو فرق فرع۔ اور اصول کی پہچان فروع سے ہوتی ہے جب کہ فروع کا ثابت ہونا اصول کا محتاج ہے۔ اور ہر جمع جو فرق سے خالی ہو زندقہ ہے اور ہر فرق جمع کے بغیر بے کار۔

جمع و فرق کا مفہوم بیان کرتے ہوئے متقدمین میں سے ابوبکر طاہر الابہری کہتے ہیں: صوفیہ کے نزدیک جمع سے مراد جمع آدم علیہ السلام ہے اور فرق سے مراد فرقِ اولادِ آدم ہے۔ اور مزید یہ کہ ان کے نزدیک جمع سے مراد معرفت ہے اور فرق سے مراد احوال۔

جمع و فرق کے بارے میں جنید کے یہ اشعار ملاحظہ کریں ؎

فتحققتك فی سری فناجاك لسانی

فاجتمعنا لمعان وافترقنا لمعانی

ان یکن غیبك التعظیم عن لحظ عیانی

فلقد صیرك الوجد من الاحشاء دانی

ترجمہ: (۱) اے میرے رب! میں نے تجھے اپنے باطن میں پا لیا اور میری زبان نے تجھ سے سرگوشی کی بعض صفات میں تو ہم یکجا ہیں اور بعض میں جدا۔

---

[1] : آل عمران : ۱۸ [2] : البقرۃ : ۶ [3] : بقرۃ : ۱۳۶

(۲) اگر تیری تعظیم نے بظاہر تجھے میری آنکھوں سے غائب کر رکھا ہے مگر تیرے وجد نے تجھے میری آنتوں سے قریب کر دیا ہے۔

نوریؒ کا قول ہے: حق تعالیٰ کے ساتھ جمع ہونا غیر سے علیحدہ ہونا ہے۔ اور اس کے غیر سے جدا ہونا اس کے ساتھ جمع ہونا ہے۔

ایک قول ہے کہ "جمع" اتصال کو کہتے ہیں جس میں علیحدگی نہیں واقع ہو سکتی اور اگر علیحدگی واقع ہو تو وصل نہیں۔ اور تفرقہ، شہود ہے اس کے لیے جو علیحدگی کا مشاہدہ کرے۔

صوفیہ کا قول ہے کہ جو اللہ کے ساتھ مجموع ہو وہ صفات سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اور جو صفات کے ساتھ مجموع ہو وہ حق سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں کیفیات ایک دوسرے کی ضد ہیں، کیونکہ حق کے ساتھ قایم ہونا اپنی حجت سے خروج ہے اور حق کے ساتھ قایم ہونا حق سے محجوب رہنا ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور قول یہ ہے کہ جمع بشریت کا شہود بشریت کے ساتھ جمع ہونا ہے، اور فرق تقسیم رسوم سے علیحدہ ہونے کو کہتے ہیں۔

جنیدؒ فرماتے ہیں: بندے کا وجد سے قریب ہونا جمع اور اس کا بشریت میں کھو جانا فرق ہے۔

ابوبکر واسطیؒ نے فرمایا: جب تو نے اپنی جانب نگاہ کی تو یہ فرق ہے اور جب اپنے رب کی طرف نظر کی تو یہی جمع ہے۔ جب تو اپنے سے علاوہ کے ساتھ قائم ہے تو یہی تیری موت ہے۔

فنا و بقا

ابو یعقوب نہر جوریؒ سے فنا و بقا کے بارے میں پوچھا گیا، تو فرمانے لگے: فنا بندے کا اللہ کے ساتھ قایم ہونا ہے اور بندے کے افعال کی جگہ اللہ کا قایم ہو جانا یعنی اس کی

صفات اور افعال کا قایم ہو جانا، بقا ہے۔

ابو یعقوبؒ علمِ فنا و بقا کے بارے میں فرماتے ہیں : بندے کو فنار و بقا دونوں کیفیتوں میں عبودیت کا ساتھ حاصل رہنا چاہیے اور اسے علمِ رضا پر عمل پیرا ہونا چاہیئے جس کو فنار و بقا کے راستے پر عبودیت کی رفاقت حاصل نہ ہو وہ صرف مدعی ہے اور عمل سے خالی۔

میرے نزدیک فنا و بقا دو اسم ہیں جو مؤحد بندے کے لیے دو اوصاف ہیں جو اسے مقامِ عمومی سے مقامِ خصوصی تک پہنچنے کے لیے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

فنار و بقار کے چار مدارج

① فنارِ جہل اور بقارِ علم۔
② فنارِ معصیت اور بقارِ طاعت۔
③ فنارِ غفلت اور بقارِ ذکر۔
④ فنارِ افعالِ بندہ اور بقارِ عنایتِ خداوندی۔

سمنون نے فرمایا : بندہ حالِ فنار میں محمول اور حالِ حمل میں موردو ہوتا ہے۔ یہ اوصاف ہیں جو اوصاف ہی کی طرف لے جاتی ہیں اور فنا کا پہلا مقام وجود اور بقا کے لیے مشاہدات کا قیام ہے۔

قولِ خداوندی ہے :

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ[1] اور تمھارے پاس جو نعمت ہے سب اللہ کی طرف سے ہے۔

مذکورہ آیت کی تشریح میں ابو سعید خرازؒ کہتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے اُن کو

---

[1] : النحل : ۵۳۔

ان کے افعال میں ان کے افعال سے الگ کر دیا اور یہی فنا کی پہلی کیفیت ہے۔

جعفر خلدیؒ کہتے ہیں : میں نے جنیدؒ کو فنا کی تعریف سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب بندے کو اپنے اوصاف سے الگ ہونے کا احساس بھی نہ رہے تو سمجھ لو کہ اس نے بقائے کلی کو پا لیا۔ آپ نے مزید کہا کہ میں نے جنیدؒ سے یہ بھی سنا کہ فنا یہ ہے کہ تو اپنے اوصاف سے پوری طرح خود کو فنا کر دے۔

ابن عطاءؒ کہتے ہیں : جو اپنی ذات سے ذاتِ حق کے ساتھ فنا نہ ہوا پھر حق سے حق کے ساتھ فنا نہ ہوا اور حضورِ حق میں اپنی موجودگی کے احساس سے بے خبر نہ رہا وہ کبھی مشاہدۂ حق تک نہیں پہنچ سکتا۔

ابوبکر شبلیؒ نے کہا : جو حق سے حق کے ساتھ۔ فقط حق کے حق کے ساتھ قائم ہونے کے لیے فنا ہوا وہ ربوبیت و عبودیت دونوں کے احساس سے فنا ہوا۔

رویمؒ نے کہا : علمِ فنا کی پہلی سیڑھی، حقائق بقا کی طرف نزول ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے علاوہ ہر شے پر قدرت و فوقیت حاصل ہے۔ اور ہر حال میں اسی کی ذات میں جا کر گم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بندے کی خواہش صرف اسی کی ذاتِ اقدس ہی رہ جاتی ہے اور اللہ کے سوا ہر چیز ساقط ہو جاتی ہے یہاں تک کہ بندوں کی عبادت ان کے فنائے نفس کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے اور ان کی عبادت صرف اللہ کے لیے اور اسی کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس کے بعد کی کیفیت کیا ہوتی ہے اس کا احاطہ عقل نہیں کر سکتی اور زبانیں اس کے بارے میں گنگ ہو جاتی ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ [1] زمین پر جتنے ہیں سب کو فنا ہے۔

---

[1] : الرحمٰن : ۲۵

فانی کی پہلی علامت اس سے دنیا و آخرت کی خواہش کا مٹ جانا اور اس کی جگہ ذکر اللہ کا وارد ہونا ہے۔ اس کے بعد اللہ کے ذکر کے وارد ہونے کی خواہش بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ صرف ذکر اللہ کی خواہش لے لیتی ہے پھر یہ خواہش بھی باقی نہیں رہتی اور اس کی جگہ صرف اللہ کی خواہش باقی رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد خواہش کا احساس بھی نہیں رہتا۔ اور اس کی جگہ فناءُ الفناء اور بقاء البقاء کی خواہش لے لیتی ہے۔

مسئلہ حقایق

سری سقطیؒ فرماتے ہیں: اہل حقائق کا کھانا بیماروں کے کھانے کی مانند پرہیزی ہوتا ہے اور ان کی نیند ڈوبنے والے شخص کی نیند جیسی ہوتی ہے۔

جنیدؒ سے ماہیتِ حقیقت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے: جب میں اللہ کی یاد میں محو ہوتا ہوں تو اور چیزوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔

ابو تراب نخشبیؒ کہتے ہیں: حقیقت کی علامت آزمائش ہے۔

بعض صوفیہ کا خیال ہے کہ حقیقت کی علامت آزمائش کا دور ہو جانا ہے۔

رویمؒ نے کہا: حقیقتِ کاملہ کا تعلق علم سے ہوتا ہے۔

ابو جعفر صیدلانیؒ کہتے ہیں: حقائق کی تین اقسام ہیں۔ پہلی قسم کی حقیقت علم کے تابع ہوتی ہے، دوسری قسم کی حقیقت وہ ہے کہ علم اس کے تابع ہوتا ہے اور تیسری قسم کی حقیقت علم سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

ابو بکر زقاقؒ فرماتے ہیں میں صحرائے بنی اسرائیل میں تھا کہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ علمِ حقیقت علمِ شریعت کا مخالف ہے۔ اسی لمحے میں نے دیکھا کہ ایک شخص کیکر کے درخت کے نیچے کھڑا پکار رہا ہے "اے ابو بکر زقاقؒ! ہر وہ حقیقت جو شریعت کی مخالف ہو کفر ہے۔"

غالباً رویمؒ سے کسی نے پوچھا کہ مقامِ عبودیت کب حاصل ہوتا ہے ؟ آپ نے فرمایا: اس وقت جب بندہ اپنی باگ ڈور اپنے رب کے حوالے کر دے اپنی قوت وطاقت سے بری ہو جائے اور یہ جان لے کہ جملہ مخلوقات حق تعالیٰ سے قائم اور اسی کے لیے ہے۔

صحیح ترین حقیقت وہ ہے جو علمِ شریعت سے مربوط ہو۔

جنیدؒ کا قول ہے : حقائق نے بندوں کے قلوب میں صرف تاویلات بیان کرنے کے لیے جاگزین ہونے سے انکار کیا۔

خدا تعالےٰ کی تعریف

مزینؒ کبیرؒ کہتے ہیں : صوفیہ کرام نے وجودِ باری تعالےٰ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ اللہ گم نہیں کہ اسے ڈھونڈا جائے اس کی کوئی حد نہیں کہ اس کا ادراک کیا جائے۔ پس جس نے موجود کو پایا اسے دھوکہ ہوا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک موجود سے مراد معرفتِ حال اور ایک ایسے علم کا کشف ہے جو حال سے خالی ہو۔

عبداللہ بن طاہر الابہریؒ کہتے ہیں : حقیقت علم شریعت ہے اور علمِ شریعت حقیقت۔

علم ،حقیقت اور حق

شبلیؒ فرماتے ہیں : علم ،حقیقت اور حق تینوں میں فرق ہے ۔علم ہمیں مختلف اسباب اور واسطوں کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے۔

حقیقت ، اللہ تعالےٰ براہِ راست بندوں کے دلوں میں اتارتا ہے۔ اور حق کا کوئی راستہ متعین نہیں۔

حقیقتِ انسانیت

جعفر قرویؒ نے کہا : حقیقتِ انسانیت یہ ہے کہ کوئی انسان تجھ سے اذیت نہ پائے۔

کیونکہ خود لفظِ انسانیت کا معنی بھی یہی ہے کہ ہر چیز تجھ سے مانوس ہو۔

وصل و عقل

کسی شیخ کا قول ہے: وصلِ حق کی حقیقت، عقل کا رخصت ہونا ہے۔

جنید بغدادی کہتے ہیں: بلاشبہ حقایق لازمہ اور پختہ ارادے طالبین کے راستے سے ہر اس سبب، رکاوٹ، تاویل اور وسوسے کو دور کر دیتے ہیں جو حصول مراد کو متاثر کرے۔

الغرض صوفیہ کے نزدیک حق بات یہی ہے کہ حال کی درستگی اور دوام سیر الی اللہ کا دار و مدار واضح علمی براہین و دلائلِ حقہ پر ہے۔

واسطیؒ فرماتے ہیں: جب حقائق کے خزانے ظاہر ہوتے ہیں تو پوشیدہ حقایق محجوب ہو جاتے ہیں۔

مسئلۂ صدق

جنید بغدادیؒ کہتے ہیں: جس نے صدق اور کوشش کے ساتھ کوئی چیز طلب کی اسے اگر تمام نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور ملا ہے۔

ابو سعید خرازؒ نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے آسمان سے اترے اور انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ صدق کیا ہے؟ میں نے کہا: ایفاء عہد۔ انھوں نے کہا: تو نے سچ کہا۔ اس کے بعد میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ غائب ہو گئے۔

یوسف بن حسینؒ صدق کی جامع تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تنہائی سے محبت رکھنا، مناجاتِ الٰہی، حق گوئی میں ظاہر و باطن کو یکساں رکھنا، خلق کی طرف توجہ کیے بغیر اپنی ذات پر نظر رکھنا، علم شریعت سیکھنا اور اس پر عمل کرنا بایں طور کہ کھانا، لباس اور کسب معاش حلال ہو، صدق کہلاتا ہے۔

کسی دانا کا قول ہے: صدق کی علامت طاعت کو چھپانا ہے، اور اہلِ صدق کے دلوں کے لیے خوشگوار ترین چیز اللہ تعالٰی کے عفو و درگذر کا مشتاق ہونا اور اس سے حُسنِ ظن رکھنا ہے۔

ذوالنونؒ کہتے ہیں: صدق اس دھرتی پر اللہ کی تلوار ہے جو ہر شے کو کاٹ ڈالتی ہے۔

حارث محاسبیؒ نے کہا: صدق کو جملہ احوال کی رفاقت حاصل ہے۔

جنیدؒ کا قول ہے: صدق کی حقیقت ہر حال میں اللہ کی مرضی سے موافق رہتی ہے۔

ابویعقوبؒ کہتے ہیں: ظاہراً اور باطناً موافقتِ حق کرنا اور ہلاکت کے موقع پر بھی سچ کہنا صدق ہے۔

کسی شیخ کا قول ہے کہ ارادے میں کامل توجہ کا نام صدق ہے۔

سہل بن عبداللہؒ کے مطابق تصوف کے سات اصول ہیں:

۱۔ کتاب اللہ سے تمسک
۲۔ اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۳۔ رزق حلال
۴۔ اذیت رسانی سے پرہیز
۵۔ گناہوں سے اجتناب
۶۔ توبہ کرنا
۷۔ ادائیگی حقوق۔

حصری کہتے ہیں صوفیہ کے چھ اصول ہیں:

۱۔ پاکیزہ رہنا
۲۔ فقط اللہ کو قدیم جاننا
۳۔ لوگوں سے دوری
۴۔ ترک وطن
۵۔ اپنی علمیت کو فراموش کر دینا
۶۔ اپنی جہالت کو بھلا دینا۔

ایک صوفی کے نزدیک تصوف کے سات اصول ہیں:

۱۔ ادائیگی فرائض
۲۔ حرام چیزوں سے اجتناب
۳۔ تعلقات دنیوی کو ترک کر دینا
۴۔ فقر اختیار کرنا

۵ - ترکِ طلب

۶ - کوئی چیز ایک وقت سے دوسرے وقت کے لیے ذخیرہ نہ کرنا

۷ - ہر حال میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا۔

اخلاص

جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں: اپنے عمل کو اپنے آپ سے بھی پوشیدہ رکھنا اخلاص ہے۔

ابن عطا کہتے ہیں: اخلاص آفات سے بچاتا ہے۔

حارث محاسبیؒ کہتے ہیں: اخلاص اللہ کے ساتھ ان معاملات میں سے ہے جس میں خلق کو کوئی دخل نہ ہونا چاہیئے اور بندے کو اپنے نفس کو تو پہلے ہی خارج کر دینا چاہیئے۔

ذوالنونؒ نے کہا: اخلاص شیطان جیسے ضرر رساں دشمن کے ضرر سے محفوظ رکھتا ہے۔

ابو یعقوب سوسیؒ فرماتے ہیں: اخلاص وہ پوشیدہ ترین عمل ہے جس کا فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ اس کو لکھ سکیں اور بندے کے دشمن شیطان کو بھی اس کی خبر نہیں ہو پاتی کہ وہ کوئی نقصان پہنچا سکے یہاں تک کہ خود بندے کے اپنے نفس کو بھی اس سے آگاہی نہیں ہوتی کہ وہ اس پر فخر کر سکے۔

سہل بن عبداللہؒ کہتے ہیں کہ یہ ایک المیہ ہے کہ آپ کو لا الٰہ کہنے والے تو بہتیرے مل جائیں گے مگر عبادت میں مخلص بندے کم ہی ملیں گے۔ آپ نے مزید کہا کہ ریاکاری سے مخلص بندے ہی بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

جنید بغدادیؒ کہتے ہیں: بندے کا اپنے رب کے ساتھ معاملہ اس قدر اخلاص پر مبنی ہونا چاہیئے کہ اس میں خلق اور یہاں تک کہ خود اس کے اپنے نفس کا بھی کوئی دخل نہ ہو۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی سوال کرے کہ اخلاص کیا ہے؟ تو اسے یہی جواب دو کہ اللہ کے لیے اپنے ارادے کو ہر آلائش سے مکمل طور پر پاک کرنا اور اللہ کے سوا جملہ مخلوقات کو اپنے دل و دماغ سے اس طرح نکال دینا کہ دل میں کسی اور کا خوف و خطر باقی نہ رہے، اخلاص کہلاتا ہے۔

مخلص کی علامت

مخلص بندے کی یہ علامت ہے کہ وہ مناجاتِ الٰہی کے لیے ہر وقت خلوت کا مشتاق رہتا ہے۔ اللہ کی عبادت کے ذریعے خلق سے واقفیت کی کمی اور اپنے معاملہ خداوندی میں خلق کے دخل کو ناپسند کرتا ہے۔

ابوالحسین نوریؒ نے کہا، خلق سے میل جول ترک کر دینا اخلاص ہے۔

ذکرِ الٰہی

ابن سالمؒ فرماتے ہیں: ذکر الٰہی تین طرح کا ہے:

۱۔ زبانی ذکر، جس میں ایک نیکی کے عوض دس نیکیاں ملتی ہیں۔

۲۔ قلبی ذکر، جس میں ایک نیکی کے بدلے سات سو نیکیاں ملتی ہیں۔

۳۔ وہ ذکر کہ جس کے بدلے ملنے والے ثواب کا کوئی حد و حساب نہیں اس طرح کے ذکر میں دل محبت و حیا سے معمور ہو جاتا ہے۔

ابن عطائؒ سے کسی نے پوچھا کہ ذکرِ الٰہی کا بندے کے باطن پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا، جب ذکر الٰہی اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ باطن پر وارد ہوتا ہے تو بشریت کی تمام آلودگیوں کو زائل کر دیتا ہے۔

سہل بن عبداللہؒ فرماتے ہیں: ذکرِ الٰہی کا ہر مدعی ذاکر نہیں ہوتا۔ آپ نے مزید کہا،

ذکر وہی ہے جس کے دوران بندے کو یہ معلوم رہے کہ اللہ عزوجل اسے دیکھ رہا ہے اور وہ خود اسے اپنے قلب کے ذریعے دیکھتا ہو اور اس قدر قرب ہو کہ بندہ اس سے حیا کرے اور وہ اللہ کو اپنی ذات اور اس کے احوال پر غالب سمجھے۔

ارشاد خداوندی ہے:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا [1]	تو اللہ کا ذکر کرو جیسے اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے بلکہ اس سے زیادہ۔

ایک اور مقام پر زیادہ اختصار کے ساتھ فرمایا:

اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا [2]	اللہ کو بہت یاد کرو۔

اور فرمایا:

فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ [3]	تو میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کروں گا۔

مذکورہ بالا آیات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ذاکرین کے باعتبارِ ذکرِ الٰہی مختلف مراتب ہیں۔

کسی شیخ نے کہا: جس کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ایک ہے مگر اس کے ذاکرین مختلف اور ان کے مراتب بھی جدا جدا ہیں۔ ذکر کی اصل یہ ہے کہ حق تعالٰی کو اس کی جملہ صفات کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔ پھر ذکر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) زبانی ذکر یعنی تہلیل، تسبیح اور تلاوت قرآن کی صورت میں۔

(۲) قلبی و روحانی ذکر یعنی ایسا ذکر کہ جس میں دل اللہ کی توحید، اس کے اسماء و صفات، قدرت اور احسانات پر متوجہ ہوں۔

---

[1] : البقرۃ : ۲۰۰ [2] : الاحزاب : ۴۱

[3] : البقرۃ : ۱۵۲۔

اللہ تعالےٰ نے امید وارانِ رحمت کو اپنا وعدہ، خوف رکھنے والے کو وعید، متوکلین کو اپنی کفالت، مراقبہ کرنے والوں کو غیب کی اطلاعات اور محبّین کو اپنا وصل یاد دلایا۔

ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں : ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اس طرح سے ذکرِ الٰہی کرے کہ خود اپنے ذکر کو بھی بھول جائے یعنی ماسوا اللہ فراموش کر دے۔

حقیقتِ غناء

جنید بغدادیؒ سے پوچھا گیا کہ استغناء باللہ اور افتقار الی اللہ میں سے کونسی کیفیت مکمل ترین ہے ؟ آپ نے جواباً کہا : افتقار الی اللہ ہی کے ذریعے استغناء باللہ حاصل ہوتی ہے اور جب افتقار الی اللہ درست ہو تو استغناء باللہ کی تکمیل ہو جاتی ہے اور استغناء باللہ درست ہو تو افتقار الی اللہ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دونوں میں سے مکمل ترین کیفیت کونسی ہے ؟ کیونکہ دونوں کیفیتیں اپنی تکمیل میں ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہیں۔

یوسف بن حسینؒ کہتے ہیں : غناء کی علامت یہ ہے کہ غنا دین کے لیے ہو نہ کہ دنیا کی خاطر۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ غنی کب قابلِ ستائش ہوتا ہے ؟ آپ نے کہا : جب وہ کسی چیز کو سیدھے اور صحیح راستے سے کمائے۔ اور اکتساب میں ہمیشہ نیکی و تقوٰی کو پیش نظر رکھتا ہو۔ کسبِ معاش میں کسی طرح کی زیادتی یا گناہ کو راہ نہ دے۔ اللہ سے تعلق جوڑ لینے کے بعد مال کی جانب میلان نہ رکھتا ہو، اسے حصولِ مال پر خوشی نہ ہو اور اس کے کھو دینے پر غم نہ ہو۔ امیری میں بھی اللہ کا محتاج رہے۔ اور فقیری میں بھی اللہ ہی کو اپنے لیے کافی جانتا ہو اور وہ اس کے خزانہ برداروں میں سے ایک خزانہ بردار ہو کہ جس کی امیری اپنے لیے نہیں بلکہ اللہ کے لیے ہو۔ جب کوئی بندہ مذکورہ صفات سے متصف ہو تو وہ اہلِ نجات اور کامیابی پانے والوں میں سے ہے۔ اور یہی ہے وہ بندہ کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق جنت میں پانسو برس قبل داخل ہوگا جیسا کہ حدیث شریف کے الفاظ

ہیں : " میری امت کے فقرا میری امت کے امرا سے پانسو برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے "

عمرو بن عثمان مکیؒ سے غنا کی جامع تعریف بیان کرنے کو کہا گیا تو فرمایا : غنا کی تعریف یہ ہے کہ تو خود غنا سے مستغنی ہو جائے کیونکہ غنا کو اپنے لیے کافی سمجھنا غنا کے محتاج ہونے کے مترادف ہے۔ اور جب تو اللہ ہی کو اپنے لیے کافی جانے اور اسی سے خود کو غنی سمجھے تو جان لے کہ تو خود غنا اور اس کے علاوہ سے مستغنی ہو گیا۔

جنیدؒ فرماتے ہیں : فقر مصائب کا وہ سمندر ہے جس کی ہر مصیبت بڑی ہے۔ آپ ہی سے کسی نے سوال کیا کہ کب فقیر صادق اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اغنیا سے پانسو برس پہلے جنت میں داخل ہو؟ آپ نے فرمایا : اس وقت جب کہ فقیر ہر عمل فقط اللہ کے لیے دل سے کرے۔ اور جو کچھ اللہ نے منع فرمایا اس میں فرمانِ خداوندی کے تابع رہے ، حتّٰی کہ وہ فقر کو اپنے لیے اللہ کی وہ عظیم نعمت سمجھنے لگے کہ جس کے کھو جانے کا اسے خوف دامنگیر رہے جیسا کہ غنی کو اپنی امیری کے کھو جانے کا فکر لگا رہتا ہے۔ اور وہ اللہ کی جانب سے فقر کے عطا ہونے پر صابر و شاکر اور راضی ہو، اپنے دین کی حفاظت کرے ، اپنے فقر کو پوشیدہ رکھے ، لوگوں سے لاتعلقی کا مظاہرہ کرے اور اپنے رب کو اپنے لیے کافی سمجھے جیسا کہ ارشادِ رب العزت ہے :

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ [1]	ان فقیروں کے لیے جو راہ خدا میں روکے گئے۔

بلاشبہ جو شخص یہ اوصاف رکھتا ہوگا اسے قیامت میں نجات ملے گی اور اغنیا سے پانسو برس قبل جنت میں داخل کیا جائے گا۔

ابن الجلاءؒ نے کہا : جس نے فقر میں پرہیزگاری کو اختیار نہ کیا بے شک اس نے حرامِ محض

---

[1] : البقرۃ : ۲۷۳

کھایا، اور اسے پتہ بھی نہ چلا۔

جنیدؒ کہتے ہیں : لوگوں میں سے معزز ترین شخص، وہ فقیر ہے جو ہر حال میں خوش رہتے۔

مزینؒ کا قول ہے : فقیر وہ ہے جو ہمہ وقت محتاج ہو (یعنی محتاج الی اللہ)۔ اور آپ ہی نے مزید کہا کہ جب فقیر اللہ کی جانب لوٹ کر جائے گا تو وہ خود کو مختلف علوم سے متصف پائے گا، اور وہ خود اپنے وجود پر حیران ہوگا۔

جنیدؒ کا قول ہے : انسان کا فقر اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ یہ یقین نہ کرے کہ روز قیامت اس سے بڑھ کر کوئی فقیر عرصۂ حساب میں نہیں اترے گا۔

مسئلۂ روح

شبلیؒ فرماتے ہیں : ارواح، اجساد اور خواطر، اللہ کے ساتھ قائم ہیں نہ کہ اپنی ذات کے ساتھ۔ (یعنی اللہ کے بغیر ان کا کوئی وجود نہیں)۔

اور آپ ہی نے کہا کہ ارواح لطیف ہو کر اوپر کو اٹھیں اور مشاہداتِ حقائق کی سرحد پر جا کر ٹھہر گئیں۔ وہاں انھوں نے کسی ایسے معبود کو نہیں پایا کہ جسے وہ خود دیکھ سکیں جب کہ ان کا اپنا وجود بھی قائم ہو۔ اور اس مقام پر ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ حادث کبھی قدیم کا مشاہدہ نہیں کرسکتا۔

ابوبکر واسطیؒ کہتے ہیں : روح دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ روح جس پر مخلوقات کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ اور دوسری روح وہ ہوتی ہے جس سے قلب منور ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ روح ہے جس کے بارے میں قول باری تعالیٰ ہے :

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا[1]	اور یونہی ہم نے تمھیں وحی بھیجی ایک جانفزا چیز اپنے حکم سے۔

[1] الشوریٰ : ۵۲۔

روح کو اس کے لطیف ہونے کے سبب روح کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

جب جوارح اپنے اوقات میں برائی سے روکنے کے ملکہ کو بگاڑ دیتا ہے تو اس وقت روح، مشاہدات سبب سے محجوب ہوتی ہے۔

اور جب بھی روح کو ایام داوقات سے دوچار ہونے کے نتیجے میں کسی گناہ سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ خطابات کو جان لیتی ہے اور معاملات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

روح کے بارے میں واسطی کا ایک اور قول ہے کہ دو چیزیں ہیں، روح اور عقل، پس روح کبھی روح کو بھلائی سے نہیں نواز سکتی اور نہ ہی عقل کبھی عقل سے کسی برائی کو دور کر سکتی ہے۔

ابو عبداللہ نباجی کہتے ہیں : جس عارف کو وصل کی دولت حاصل ہو اس میں دو[۲] روحیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جس میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوتا اور دوسری وہ روح کہ جس میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

کسی شیخ کا قول ہے کہ روح کی دو قسمیں ہیں۔ روح قدیمی اور روح بشری۔ اور انھوں نے دلیل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول سے پکڑی کہ "میری آنکھیں تو سو رہی ہوتی ہیں مگر دل جاگتا رہتا ہے" گویا ان کا ظاہر روح بشری کے ساتھ سو رہا ہوتا ہے جب کہ باطن بیدار ہوتا ہے اور اس میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک قول ہے : "مجھ سے کوئی چیز بھلا دی جاتی ہے تاکہ میں اس طرح کی سنت قائم کر دوں" اور ایک دوسرا قول ہے : "وہ کوئی شے بھولتے ہی نہیں" تو یہ جو دوسرا قول ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ ان کی روح قدیمہ تھی جو نہیں بھولتی تھی۔

اسی ضمن میں ایک اور قول نبوی ہے :

"میں تم میں سے کسی ایک کی مانند نہیں، میں تو اپنے رب کے ہاں رہتا ہوں"

مذکورہ حدیث کا مضمون دراصل صفت ہے روح قدیمی کی۔ کیونکہ انھوں نے اس کے

بارے میں جو کچھ فرمایا وہ روح بشری کا وصف نہیں ۔

میرے نزدیک روح کے بارے میں شیخ موصوف نے جو کچھ کہا صحیح نہیں کیونکہ قدیم کبھی قدیم سے جدا نہیں ہو سکتا جب کہ مخلوق، قدیم سے متصل ہی نہیں ہوتی ۔

میں نے ابن سالم کو سنا جب کہ ان سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا ثواب و عذاب، روح و جسم دونوں کو ملے گا یا فقط جسم کو ؟ تو آپ نے فرمایا : اطاعت و نافرمانیٔ خدا فقط جسم سے روح کے بغیر سرزد نہیں ہوتی اور نہ ہی اکیلے روح سے جسم کے بغیر واقع ہوتی ہے بلکہ روح و جسم دونوں کی باہمی موجودگی سے اس کا ظہور ہوتا ہے لہٰذا ثواب یا عذاب بیک وقت دونوں کو پہنچے گا ۔

جس نے ارواح کے تناسخ، ایک جسم سے دوسرے میں منتقلی اور اس کے قدیم ہونے کے بارے میں کچھ کیا تو بے شک وہ بڑی گمراہی اور نقصان سے دوچار ہوا ۔

اشارہ

اگر کوئی یہ پوچھے کہ اشارہ کا کیا مطلب ہے تو اس کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح اللہ نے فرمایا : "تبارك الذی" تو اس میں الذی کنایہ کی طرح ہے ۔ اور کنایہ لطافت کے اعتبار سے اشارے کی مانند ہے ۔ اور اشارہ کو فقط اکابر صوفیہ ہی جان سکتے ہیں ۔

اللہ کی جانب اشارہ کرنے سے متعلق اقوالِ صوفیہ

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ نے کہا : ہر وہ اشارہ جو لوگ اللہ کی جانب کرتے ہیں انہی کی طرف پلٹ آتا ہے تا آنکہ وہ حق تعالےٰ کی طرف حق تعالیٰ ہی کے ذریعے اشارہ کریں جو کہ ان کی دسترس سے باہر ہے ۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ کے پاس ایک شخص مسئلہ دریافت کرنے آیا تو آپ نے آنکھ سے آسمان کی جانب اشارہ کیا (یعنی اللہ کو معلوم ہے) اس پر اس شخص نے کہا : اے ابا القاسم!

اللہ کی جانب اشارہ مت کرو کیونکہ وہ اس آسمان سے زیادہ تمہارے قریب ہے بحضرت جنیدؒ نے فرمایا: بے شک تو نے سچ کہا۔

عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمہ نے فرمایا: صوفیہ کا حقایق کو جان لینا توحید ہے مگر اللہ کی جانب کسی طرح کا اشارہ کرنا شرک۔

کسی صوفی کا قول ہے کہ ہر ایک نے اس کی جانب اشارہ کرنا چاہا مگر کوئی بھی ایسا نہ کر سکا۔

جنید بغدادیؒ نے ایک شخص سے جو اللہ کی جانب اشارہ کرتا تھا کہا کہ اے فلاں! تو کب تک اس کی طرف اشارے کرتا رہے گا۔ چھوڑ کہ وہ تیری جانب خود اشارہ کرے۔

ابو یزید علیہ الرحمہ کا کہنا ہے: جس نے اس کی طرف علمی طور پر اشارہ کیا تو کفر کا ارتکاب کیا کیونکہ علمی اشارہ صرف معلوم شے (یعنی جو انسانی علم میں آسکے) پر واقع ہو سکتا ہے۔ اور جس نے معرفت کے ذریعے اس کی جانب اشارہ کیا تو الحاد کیا کیونکہ معرفت کی بنیاد پر کیا جانے والا اشارہ فقط محدود شے کی طرف ہو سکتا ہے۔

میں نے دُقیؒ سے سنا کہ مرید کی حقیقت کے بارے میں زقاق علیہ الرحمہ سے پوچھا گیا تو فرمایا: مرید کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف اشارہ کرتا ہے تو اسے اپنے اشارے کے قریب خیال کرتا ہے جب کہ کامل کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ترکِ اشارہ پر ہی اللہ کو پاتا ہے۔ یہی بات جنید علیہ الرحمہ کے بارے میں بھی بیان کی جاتی ہے۔

ابو الحسین نوری علیہ الرحمہ کا قول ہے: ہم اس کی جانب جس قدر قریب ترین اشارہ کریں وہ بعید ترین ہے۔

یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے: جب تو دیکھے کہ کوئی شخص عمل کی جانب اشارہ کرے تو جان لے کہ اس کا طریق اتقاء کا ہے اور کوئی علم کی جانب اشارہ کرے تو وہ راہِ عبادت پر گامزن ہے۔ اور کوئی رزق کے معاملہ میں اس کی جانب اشارہ کرے تو

وہ زہد اختیار کرتا ہے اور کوئی آیات کی جانب اشارہ کرے تو وہ ابدال کے راستے پر ہے اور کوئی نعمتوں اور اللہ کی مہربانیوں کی جانب اشارہ کرے تو وہ عارفین کے طرز کو اپنائے ہوئے ہے۔

ابو علی رودباری علیہ الرحمہ نے فرمایا: ہمارا یہ علمِ تصوف ایک اشارہ ہے جب عبادت کی صورت اختیار کرے تو وہ پوشیدہ ہو جاتا ہے۔

ابو یعقوب سوسی علیہ الرحمہ سے کوئی شخص مسئلہ دریافت کرنے لگا تو اشارے بھی ساتھ کرتا جاتا تھا۔ اس پر ابو یعقوب نے اس سے کہا: مجھے تمھارے سوال کی سمجھ اشارے کرنے کے بغیر بھی آجائے گی۔ گویا انھوں نے ایسا کرنے کو ناپسند کیا۔

ظرف

جنید بغدادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ظرف سے مراد اخلاقِ فاضلہ کو اپنانا، عاداتِ رذیلہ سے اجتناب اور اللہ کے احکامات پر عمل کرنے کے بعد ان پر نظر نہ کرنا ہے۔

مروّت

احمد بن عطار علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: مروت یہ ہے کہ تو جو عمل کرے اسے اللہ کے لیے زیادہ نہ سمجھے اور جب بھی تو اللہ کے لیے کوئی عمل کرے تو یہ سمجھے کہ جیسے تو نے کچھ کیا ہی نہیں اور مزید کرنے کی چاہت رکھتا ہے۔

لفظ صوفی کی تحقیق

احمد بن عطار علیہ الرحمہ نے کہا کہ صوفی کو اس نام سے غیر اللہ کی کدورتوں سے پاک ہونے اور برے لوگوں کے مراتب سے دور ہونے کے باعث پکارا جاتا ہے۔

ابو الحسین نوری علیہ الرحمہ نے کہا: خلق سے الگ ہو کر عبادت گذاروں کی صف میں،

شامل ہونے اور مرتبۂ واجدین پر پہنچ کر حق تعالےٰ کی قربت میں رہنے کی وجہ سے نیکوکاروں کا یہ طائفہ صوفیہ اور صوفی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ نے فرمایا: انھیں اس نام سے اس لیے پکارا جاتا ہے کہ فنائِ ذات کے بعد ان کی اپنی ذات کا صرف اس قدر حصہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس پہ نام کا اطلاق ہو سکے۔

کسی صوفی کا قول ہے: صوفی کے نام سے اس طائفہ کو اس لیے پکارا جاتا ہے کہ یہ لوگ روحِ قناعت کے ساتھ زندہ اور رجوع الی اللہ کے وصف سے آراستہ ہوتے ہیں۔

سببِ رزق

یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمہ نے فرمایا: بندے کا طلب کئے بغیر رزق پانا اس بات کی دلیل ہے کہ رزق صاحبِ ضرورت کی حاجت کے مطابق معین ہے۔

ایک صوفی کا قول ہے کہ اگر میں نے قبل از وقت رزق طلب کیا تو نہیں پایا اور اگر بعد از وقت طلب کیا تو بھی نہیں پایا لیکن بوقت ضرورت طلب کیا تو مجھے میری ضرورت کے مطابق عطا کیا گیا۔

ابو یعقوب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں اس بات میں کہ رزق کا سبب کیا ہے لوگوں نے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ رزق اپنی توجہ اور اہتمام کرنے سے حاصل ہوتا ہے ان کا تعلق قدریہ سے ہے۔

کچھ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سببِ رزق تقویٰ ہے۔ انھوں نے اس آیت مبارکہ سے استدلال کیا:

"وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ — اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے لیے نجات کی راہ نکال دے گا۔ اور اسے

حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ[1] وہاں سے روزی دے گا جہاں اس کا گمان نہ ہو۔

جنھوں نے تقویٰ کو سببِ رزق ٹھہرایا بلاشبہ انھوں نے غلطی کی کیونکہ سببِ رزق تو تخلیق ہے جیسا کہ ارشاد رب العالمین ہے :

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ[2] اللہ ہے جس نے تمھیں پیدا کیا پھر تمھیں روزی دی۔

رزق کی بلا امتیاز تقسیم

قرآن مجید کے الفاظ سے یہ ظاہر ہے کہ رزق عطا کرنے میں اللہ نے کفر و ایمان کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ مومن ہو کہ کافر اسے رزق عطا کرتا ہے۔

ابو یزید بسطامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں : میں نے کسی عالم کے ہاں ایک سالک کی تعریف کی تو انھوں نے پوچھا : اس سالک کا ذریعہ معاش کیا ہے ؟ اس پر میں نے کہا : چونکہ مجھے اس کے خالق کے بارے میں کوئی شک نہیں اس لیے میں ضروری نہیں سمجھتا کہ اس سے اس کے رازق کے بارے میں پوچھوں۔ یہ سن کر وہ عالم شرمندہ ہو کر چل دیا۔

مقام فنا اور عبدیت

جنید علیہ الرحمہ سے سوال کیا گیا کہ بندے کا اپنا نام و نمود جاتا رہے اور اس کی جگہ اللہ کا حکم لے لے اس کی وضاحت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا : جب معرفت خداوندی بڑھتی ہے تو بندے کے اپنے آثار مٹتے چلے جاتے ہیں اور اس سے اس کی خصوصیات رخصت ہو جاتی ہیں، پھر اک مقام آتا ہے کہ علم حق تعالیٰ کا ظہور ہوتا ہے اور حکم اللہ ثابت ہو جاتا ہے۔

---

[1] : الطلاق : ۲، ۳۔ [2] : الروم : ۴۰۔

یکسانیتِ مدح و ذم

جنید علیہ الرحمہ سے سوال کیا گیا کہ بندے کے لیے کب اس کی برائی کرنے والا اور اچھائی بیان کرنے والا یکساں ہو جاتے ہیں ؟ آپ نے فرمایا : جب بندہ یہ جان لے کہ اس کی تعریف یا عیب جوئی کرنے والا خود مخلوق ہے اور مخلوق ہوتے ہوئے کسی مخلوق کی برائی یا بھلائی بیان کرنا، غلط بیانی اور چغل خوری ہے ۔

سکونِ قلب

ابن عطائ سے پوچھا گیا کہ سکون قلب کب عطا ہوتا ہے ؟ فرمایا : حق الیقین کو جان لینے سے جو کہ قرآن کریم ہے ۔ اس کے بعد بندہ علم الیقین سے نوازا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ عین الیقین کے مقام تک پہنچتا ہے تو اسے سکونِ قلب کی دولت حاصل ہوتی ہے جب بندہ سکونِ قلب سے مالا مال ہو تو اس کی علامات یہ ہوتی ہیں کہ وہ محبت و خوف رکھتے ہوئے اللہ کی قضا اور اس کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے ، اور بغیر کسی وسوسے کے وہ اسی کی ذاتِ برحق کو اپنا محافظ و مددگار سمجھتا ہے ۔

ایک انجانا غم

ابو عثمان حیری علیہ الرحمہ سے دریافت کیا گیا کہ اس انجانے غم کی وضاحت کیجئے جو انسان کو پہنچتا ہے مگر اسے اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا ؟ آپ نے جواباً فرمایا : روح تمام گناہ اور جرائم نفس کو یاد کراتی ہے مگر جب نفس اسے بھلا دیتا ہے اور روح نفس کو گناہوں سے خالی پاتی ہے تو گناہوں کے وہ بادل روح کو ڈھانپ لیتے ہیں اور نتیجۃً روح ایک ضعف و کمزوری کا شکار ہو جاتی ہے اور یہی وہ غم ہے جسے بندہ محسوس تو کرتا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ اسے کہاں سے لاحق ہوا ۔

فراستِ مومن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے : "مومن کی فراست سے بچو، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"

حدیث مذکور کے بارے میں یوسف بن الحسین علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان برحق ہے اور یہ اہلِ ایمان کے لیے ایک امتیاز ہے۔ نورِ الٰہی سے منور قلوب رکھنے والوں اور ان کے لیے جن کی شرح صدر کی گئی شرف و بزرگی ہے مگر یہ حدیث ان لوگوں کے لیے نہیں جو کثرتِ نیکی اور قلتِ گناہ کی بنیاد پر خود کو اس کے مضمون کا مصداق سمجھتے ہیں۔ اور نہ ان کے لیے جو حقیقتِ ایمان و سعادت سے خود کو بہرہ ور نہیں کرتے۔ بلکہ یہ تو کسی خاص شخص یا طبقے کی طرف اشارہ کئے بغیر تمام اہلِ ایمان کے لیے باعثِ فضیلت ہے۔

وہم، عقل اور فہم

ابراہیم خواص علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ وہم عقل و فہم کے مابین ٹھہر جانے کو کہتے ہیں اسے نہ تو عقل سے کوئی واسطہ ہے کہ اس کی صفات سے منسوب ہو سکے اور نہ ہی فہم سے کوئی تعلق کہ اس کی صفات میں سے شمار ہو سکے۔ اس کی مثال اس روشنی کی سی ہے جو پانی اور سورج کے درمیان ہوتی ہے کہ سورج سے منسوب ہوتی ہے اور نہ پانی سے اور اس کی ایک اور مثال اس اونگھ کی سی ہے جو بیداری اور نیند کے درمیان ہوتی ہے کہ نہ تو انسان جاگ رہا ہوتا ہے اور نہ سویا ہوا۔ اور بیداری یہ ہے کہ اس میں عقل کا فہم میں باقاعدہ نفوذ اور رسائی ہوتی ہے یا فہم کا نفوذ عقل میں ہو رہا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ عقل و فہم کے مابین کوئی درمیانی چیز نہیں ہوتی اور فہم عقل کا خلاصہ ہے جیسا کہ کسی چیز کا خالص حصہ اس کا مغز یا

نچوڑ کہلاتا ہے۔

ظالم، مقتصد اور سابق بالخیرات کی تشریحات

ارشاد باری تعالےٰ ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ	پھر ہم نے کتاب کا وارث کیا اپنے
اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ	چنے ہوئے بندوں کو تو ان میں کوئی اپنی
ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ	جان پر ظلم کرتا ہے اور ان میں کوئی میانہ
وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ [1]	چال پر ہے اور ان میں کوئی وہ جو اللہ
	کے حکم سے بھلائیوں میں سبقت لے گیا۔

ابو یزید بسطامی مذکورہ آیت مبارکہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سابق اسے کہتے ہیں جو محبت کے کوڑوں سے فگار، کشتۂ تیغِ شوق اور درِ ہیبت پر فروکش ہو۔

مقتصد وہ ہے جو حسرت کے چابک سے زخمی، مقتولِ تیغِ ندامت اور بابِ کرم پر مقیم ہو۔

ظالم اسے کہتے ہیں جو آرزو کے دُروں سے چھلنی، خنجرِ حرص کا مارا ہوا اور عقوبت کے دروازے پر پڑا ہوا ہو۔

---

[1]: فاطر: ۳۲

[2]: ہیبت و انس ایسی دو کیفیات ہیں جو صوفی پر علی الترتیب مشاہدہ جلال و جمال کے نتیجے میں طاری ہوتی ہیں۔ وہ صوفیہ جو اہلِ تمکین میں شمار ہوتے ہیں ان دونوں کیفیات سے بالاتر ہوتے ہیں۔ (مترجم)

کسی اور شیخ نے فرمایا کہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا سزائے حجاب سے دوچار ہوتا ہے، مقتصد (میانہ رو) باب کرم میں داخل ہوتا ہے اور نیکی کی طرف سبقت کرنے والا پروردگارِ عالم کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے۔

اور کسی نے کہا کہ ظالم (نفس پر زیادتی کرنے والا) ندامت کی سزا پاتا ہے، مقتصد (میانہ رو) حزم و احتیاط کا دامن تھامے رہتا ہے اور سابق (نیکی کی طرف سبقت کرنے والا) دل و جان سے حق تعالٰے کی بارگاہ میں سربسجدہ ہوتا ہے، گویا ظالم اللہ کی جانب دور سے اشارہ کرنے کے حجاب کا شکار ہوتا ہے، مقتصد کے سامنے ایک واضح پردہ حائل ہوتا ہے اور سابق قرب کی دولت سے مالامال ہوکر اللہ کی بارگاہ میں محبوب ہوتا ہے۔

اسی ضمن میں کسی اور نے کہا کہ ظالم حرفِ "د" ہے، مقتصد حرفِ "ب" اور سابق حرفِ "م" ہے۔

امید اور تمنّا

رویم بن احمدؒ سے دریافت کیا گیا کہ کیا مرید کو تمنّا کرنی چاہیئے؟

آپ نے یوں وضاحت فرمائی کہ وہ تمنا نہیں کر سکتا مگر امید رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ امید رکھنے میں آگے بڑھنے کی لگن موجود ہوتی ہے جب کہ تمنا کرنے میں نفس شامل ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ تمنا صفاتِ نفس میں سے ہے اور امید صفاتِ قلب سے تعلق رکھتی ہے۔

فرعون اور سِرّ نفس

سہل بن عبد اللہ علیہ الرحمہ کہتے ہیں، نفس کا سِر ہوتا ہے جو خلق خدا میں سے صرف فرعون پر غالب آگیا تھا اور اس نے دعویٰ کر دیا تھا کہ انا ربکم الاعلیٰ (میں ہی تمہارا خدائے بزرگ و برتر ہوں)۔

لہ: ہر ایسی چیز جو بندے اور اللہ کے درمیان آڑ بنے، اصطلاح صوفیہ میں حجاب کہلاتی ہے۔ (مترجم)

نفس کے سات حجابات آسمانی اور سات حجابات ارضی ہیں۔ جب بندہ اپنے نفس کو زمین میں دفن کرتا چلا جاتا ہے تو اس کا قلب آسمانوں کی بلندیوں تک پہنچتا چلا جاتا ہے۔ اور جب بندہ نفس کو پاتال میں دفن کر دیتا ہے تو اس کا قلب عرش تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

غیرت بشریہ اور غیرت الٰہیہ

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: غیرت دو طرح کی ہوتی ہے۔ (۱) غیرت بشریہ اور (۲) غیرت الٰہیہ۔

غیرت بشریہ وہ غیرت ہے جو اشخاص پر کی جاتی ہے۔ اور غیرت الٰہیہ یہ ہے کہ بندہ دل کو ماسوا سے بالکل خالی کر دے۔

گناہ، تصورِ گناہ اور نیت گناہ

فتح بن شخرف علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: میں نے ذوالنون مصریؒ کے استاذ اسرافیل سے پوچھا کہ کیا واقعۃً گناہ کرنے سے پہلے پوشیدہ خیالات پر بھی عذاب ہوگا؟ چند دن تک تو انھوں نے اس سوال کا جواب نہ دیا مگر ایک دن فرمانے لگے: اے فتح! (فتح بن شخرف) اگر تو نے عمل سے پہلے اس کی نیت بھی کر لی تو پھر ہر گناہ کے ساتھ ساتھ اس کے تصور کرنے پر بھی عذاب ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک چیخ ماری اور تین روز اس دنیا میں رہنے کے بعد رحلت فرما گئے۔

احوالِ قلوب

ابوبکر محمد بن موسیٰ الفرغانی الواسطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: قلوب تین حالتوں پر ہوتے ہیں: (۱) وہ دل جن کا امتحان لیا گیا ہو۔

(۲) وہ دل جو جڑ سے اکھیڑ دیئے گئے ہوں۔

(۳) وجد میں لائے گئے دل۔

ان تینوں حالتوں میں سے پہلی حالت پر جو دل فائز ہوتے ہیں وہ وجد میں لائے گئے دل ہیں کیونکہ یہ کیفیت اسی وجہ سے پہلی ہے کہ اس سے قبل اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا جب وجد کی کیفیت سے قلوب نکل آتے ہیں تو حالتِ اصطلام یعنی جڑ سے اکھڑنے کی کیفیت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ یہی موت ہے اور اس کے بعد نشان مٹ جانے کی حالت ہوتی ہے۔ جو کیفیت فنا ہے۔ اور یہی فنار کی کیفیت ہی بندے کا اول و آخر ہے۔ تاکہ وہ یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ میں نے پہل کی یا میں بعد میں آیا۔ اور یہ تیسری حالت ہی وہ حالت ہے کہ جس نے زبانوں کو گنگ کر دیا کہ وہ اس کے متعلق کچھ کہہ سکیں۔

آزمائش کی تین صورتیں

ابو محمد جریری علیہ الرحمہ بندگانِ خاص کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان پر تین طرح کی آزمائشیں ڈالی جاتی ہیں ایک وہ جو مخلصین پر سزا کے طور پر نازل کی جاتی ہے، دوسری سابقین پر اور کفارے کی جگہ ڈالی جاتی ہے اور تیسری انبیار و صدیقین پر صدقِ احتیارات کی صورت ہیں۔

حُب اور وُد میں فرق

حب میں قربت اور دُوری دونوں کیفیتیں ہوتی ہیں جب کہ وُد میں ہجر بعد اور قرب تینوں کیفیات نہیں ہوتیں۔ حب پر فائز بندہ مقامِ حق الیقین وُد پر فائز مقامِ عین الیقین اور اپنے باطن کی غیر سے حفاظت کرنے والا بندہ علم الیقین پر فائز ہوتا ہے۔

الغرض وُد ایک ایسا وصل ہے کہ اس میں مواصلت نہیں کیونکہ وصل ثابت ہے جبکہ مواصلت دراصل تصرفِ اوقات کا نام ہے۔

گریہ و زاری

ابو سعید خراز علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ گریہ و زاری کرنے کی اٹھارہ وجوہات ہیں:

(۱) گریہ و زاری فقط اللہ کے لیے اللہ کے ذریعے اور اسی کے ساتھ

ہونی چاہیئے۔

(۲) گریہ و زاری اللہ سے اس وقت کرنی چاہیئے جب بندے کے سامنے وصلِ محبوب کے حصول کے لیے طوالتِ انتظار کا ذکر ہو۔

(۳) خوفِ ہجر کے وقت۔

(۴) احکامِ الٰہیہ میں تساہل پر خوف سزا کے وقت۔

(۵) اللہ کا وصال حاصل کرنے سے مانع حادثات پر۔

(۶) جب قلب اللہ کے لیے مضطرب ہو۔

(۷) روحوں کا اللہ کی محبت میں سرشار ہو جانے پر۔

(۸) جب عقل اللہ کی محبت میں شدتِ غم سے زایل ہو جائے۔

(۹) محبتِ الٰہی میں آہیں بھرنے کی کثرت ہو جانے پر۔

(۱۰) رقتِ فریاد سے۔

(۱۱) اللہ کے حضور حاضر ہونے پر۔

(۱۲) اللہ تعالیٰ کی قربت پانے کی خاطر بساطِ ذلت پر لوٹنے کی وجہ سے۔

(۱۳) فخر میں مبتلا ہونے پر یہ اندیشہ کہ اللہ اُسے خود سے دور نہ کر دے۔

(۱۴) اس بات پر گریہ کرنا کہ مبادا وہ راستے سے ہٹ کر عدمِ وصال سے دوچار نہ ہو جائے۔

(۱۵) خود کو لقاءِ الٰہی کے قابل نہ سمجھنے پر۔

(۱۶) اللہ سے اس بات پر شرما جانے کے وقت کہ وہ اسے کس آنکھ سے دیکھے گا۔

(۱۷) بعض ایسے اوقات سے محروم ہو جانے پر جن کا وہ عادی رہا ہو۔

(۱۸) اس وقت جب کہ وہ وصل کی کیفیت سے سرشار ہو اور اللہ اسے اپنی شفقت میں لپیٹ لے جیسے دودھ پیتا بچہ ماں کا

دودھ پیتا جاتا ہے اور روتا جاتا ہے۔

شاہد

جنید بغدادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: شاہد سے مراد حق تعالیٰ ہے۔ جو انسان کے ضمیر میں موجود ہے اس کے تمام اسرار سے واقف ہے۔ وہ ان کے دلوں میں اپنے جمال کا نظارہ کرتا ہے اور دیکھنے والا ایسی صورت میں جب بھی اسے دیکھتا ہے تو وہ در اصل اپنے علم ہی کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے۔

صوفیہ کے شاہد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ صوفی مقام مریدین سے گذر کر عارفین کے عمومی مقام کا مشاہدہ کرے۔ اور وہ اس شاہد کے آثار و آیات کو دیکھ لے جو غیب میں حاضر ہے اور اسی صورت میں نہ وہ تنگ ہوتا ہے، نہ کوتاہی کرتا ہے اور نہ ہی غفلت اختیار کرتا ہے اگر اس سے مرید کی سی غفلت سرزد ہو جائے تو وہ شاہد نہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی اس میں بظاہر دکھائی دیتا ہے وہ باطل اور طریق صوفیہ کے خلاف ہے۔

خلوصِ معاملات وعبادات

کچھ مشایخ کرام نے ابوالحسین علی بن ہند قرشی فارسی کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ معاملات و عبادات میں خلوص سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: عقل راستہ دکھاتی ہے، حکمت اشارہ کرتی ہے اور معرفت مشاہدہ کراتی ہے۔ بلاشبہ خالص ترین عبادت صرف چار چیزوں کے جان لینے سے حاصل ہوتی ہے:

(۱) معرفتِ خدا۔
(۲) معرفتِ نفس۔
(۳) معرفتِ موت۔
(۴) بعد از موت اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید کی معرفت۔

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا وہ اپنی حقیقت کو جان گیا، جس نے نفس کو جان لیا

اس نے خود کو نفس کی مخالفت اور مجاہدے پر آمادہ کر لیا، جس نے موت کو سمجھ لیا اس نے خود کو اس کی آمد کے لیے تیار کر لیا اور جس نے بعد از موت اللہ کے وعدوں اور وعیدوں سے آگاہی حاصل کر لی اس نے ممنوعات سے کنارہ کشی اور مامورات کی تعمیل اختیار کر لی۔

اللہ تعالےٰ کے حق کی حفاظت کی تین اقسام ہیں :

(۱) وفا

(۲) ادب

(۳) مروت۔

وفا سے مراد قلب کا صرف اللہ کی یگانگی کی طرف متوجہ ہونا، اس کے نورِ ازلی کے ذریعے مشاہدۂ وحدانیت پر ثابت قدم رہنا اور زندگی کو فقط محبوبِ الٰہی کے ذکر سے عبارت سمجھنا ہے۔

ادب یہ ہے کہ باطن کو غیر کے خیالات و خطرات سے محفوظ کیا جائے، احوال کی حفاظت کی جائے اور حسد و عداوت سے اجتناب کیا جائے۔

مروت یہ ہے کہ ذکرِ محبوب پر زبانی اور عملی دونوں لحاظ سے پابندی ہو، زبان اور نظر کی حفاظت کی جائے، حرام کھانے اور ناجائز لباس سے احتراز کیا جائے۔

اور یہ تمام خوبیاں ادب کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں کیونکہ دنیا و آخرت کی ہر بھلائی کی بنیاد ادب ہی ہے۔

فیّاضی

حارث محاسبی علیہ الرحمہ کہتے ہیں : کریم وہ ہے جو اس بات کی پرواہ نہ کرے کہ اس نے کس کو نوازا۔

ابوالقاسم جنید بن محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں : کریم وہ ہے جو تجھے کسی وسیلے کا محتاج نہ ہونے دے۔

صوفیہ کے ایک گروہ کا قول ہے : فیاضی یہ ہے کہ اظہارِ ارادہ سے پہلے ہی مراد

پوری کردی جائے۔

ایک اور طائفۂ صوفیہ کا کہنا ہے: عطا وہ ہے کہ جو توقع سے بڑھ کر ہو۔

فکر

حارث محاسبی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: یہ سوچنا کہ اشیاء اللہ کے ساتھ قائم ہیں فکر کہلاتا ہے۔

صوفیہ کا قول ہے: تفکر صحتِ غور و خوض کو کہتے ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ فکر قلوب کو تعظیم الٰہی سے معمور کر دیتا ہے۔

فکر و تفکر میں فرق

فکر و تفکر میں فرق یہ ہے کہ تفکر قلب کو گردش میں رکھتا ہے جب کہ فکر قلب نے جو کچھ جان لیا اسی پر رک جانے سے عبارت ہے۔

اعتبار[1]

حارث محاسبی علیہ الرحمہ نے فرمایا: اعتبار سے مراد کسی شئے کو کسی دوسری شئے پر دلیل بنا کر کوئی نتیجہ اخذ کرنا ہے۔

کچھ صوفیہ کا قول ہے: اعتبار یہ ہے کہ جس سے ایمان واضح ہو جائے اور عقل اس سے اپنا پورا حق وصول کر لے۔

بعض صوفیہ کہتے ہیں: اعتبار غیب میں نافذ ہوتا ہے کوئی چیز اس کو مانع نہیں ہوتی۔

---

[1]: اخذ نتائج کے سلسلے میں انسانی استدلال اور سوچ کو اعتبار کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ صوفیہ کے نزدیک انسانوں کے اخذ کردہ تمام مفہومات و نتائج اعتباری ہیں یعنی ان میں ترمیم و تنسیخ کی گنجائش ہے۔ (مترجم)

نیّت

صوفیہ کا قول ہے: عمل کے لیے عزمِ مصمم ہی کو نیت کہتے ہیں۔
بعض کا کہنا ہے کہ نیت عمل کی پہچان ہے۔
جنید بن محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: نیت، افعال کی تصویر ہے۔
کسی کا قول ہے: مؤمن کی نیت اللہ تعالےٰ لیے ہے۔

درست کیا ہے؟

صوفیہ کا قول ہے: فقط توحید ہی درست ہے۔
جنید بن محمد علیہ الرحمہ نے فرمایا: ہر وہ گفتگو جو اذنِ خداوندی سے ہو درست ہے۔

خلقِ خدا پر شفقت

جنید بن محمد علیہ الرحمہ سے سوال کیا گیا کہ خلقِ خدا پر شفقت سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ خلقِ خدا پر شفقت یہ ہے کہ وہ جو کچھ تجھ سے طلب کرے تو اپنی جانب سے اسے دے اور تو اسے کسی ایسی ذمہ داری کا پابند نہ کرے کہ جس کا وہ متحمل نہ ہو سکے یا جو اس کی بساط سے باہر ہو۔ اور نہ ہی تو اس سے وہ کچھ کہے جو اس کے علم میں نہ ہو۔

پرہیزگاری

صوفیہ کہتے ہیں: جن امور کا حکم دیا گیا ہے ان کا بجا لانا اور جن سے روکا گیا ہے ان سے پرہیز کرنا ہی پرہیزگاری ہے۔
بعض کا کہنا ہے: پرہیزگاری، مؤمن کا حرم ہے جیسا کہ کعبۃ، حرمِ مکہ ہے۔
کچھ کا قول ہے: پرہیزگاری، نورِ قلب ہے جس کی مدد سے مؤمن حق و باطل میں تمیز کرتا ہے۔

سہل بن عبداللہ، جنید بن محمد، حارث محاسبی اور ابوسعید خراز علیہم الرحمہ نے فرمایا: پرہیزگاری کا مطلب ظاہر و باطن کی یکسانیت ہے۔

سِرّ

بعض صوفیہ نے کہا: سِر وہ ہے جس کو دل میں آنے والے کسی خیال کے ذریعے نہیں جاسکتا بلکہ اسے اللہ غائب رکھتا ہے اور صرف اسی کے ذریعے اس کا احساس کیا جاسکتا ہے۔

ایک طائفۂ صوفیہ کا کہنا ہے کہ سِر دو طرح کے ہوتے ہیں:

ایک وہ جو فقط للہ کے لیے ہے اور اس کا علم اس کو بلا واسطہ ہوتا ہے (یعنے صرف وہی اس سے باخبر ہوتا ہے خلق کو اس کا علم نہیں ہوتا)۔

دوسری قسم کا سِر، وہ جو خلق کے لیے ہے اور اس کو اللہ تو بہر حال جانتا ہے مگر اس کے ساتھ خلق کو بھی اس کا علم عطا فرماتا ہے۔

ایک طائفۂ صوفیہ کا کہنا ہے کہ سِر کی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق اللہ تعالٰی سے ہے اور اس سے صرف وہی باخبر ہوتا ہے خلق کو کوئی علم نہیں ہوتا۔ دوسری قسم کا سِر خلق سے متعلق ہے اس سے اللہ تعالٰی کے ساتھ اسی کی وساطت سے بندہ بھی باخبر ہوتا ہے۔

حسین بن منصور حلاج علیہ الرحمہ نے فرمایا: ہمارے اسرار (راز) اس قدر انوکھے ہیں کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی ان کا گذر نہیں ہو سکتا۔

یوسف بن حسین علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: مردانِ خدا کے دل بھیدوں کی قبریں ہیں۔ آپ ہی کا ایک اور قول ہے: اگر (میری قمیص کے) بٹن کو بھی میرے بھید کا علم ہو جائے تو اسے توڑ پھینکوں۔

اسی ضمن میں کسی نے کہا ہے ؎

حاس بسر قداء سر جمیعها ‏ ‏ ‏ ‏ وکلاهما في سرها مسرور

ما ستر مسرور یشیر بسره ‏ ‏ ‏ ‏ منه الیه سادیا مغرور

ترجمہ اشعار: وہ ایک ایسے بھید کو محسوس کرنے والا ہے کہ جس نے اسے پوری طرح

خوش کر دیا ہے گویا وہ اور اس کا بھید محبوب کے بھید میں مسرور ہیں۔

اور وہ صاحبِ راز جو اپنے بھید کی جانب اشارہ کرتا ہے وہ سراسر دھوکے میں ہے۔

چند اور اشعار ؎

یا سرّ سرّ یدق حتّی . یخفی علی وھم کل حیّ

و ظاھر باطن تجلّی من کل شیءٍ لکلّ شیءٍ

ترجمہ اشعار: اے رازوں کے راز کہ کبھی تو اس قدر دشوار فہم ہے کہ ہر ذی روح پر مخفی ہو جاتا ہے۔

اور اے رازوں کے راز کہ تو ظاہر بھی ہے اور باطن تو ہر شے سے اور ہر شے کے لیے ظاہر ہوتا ہے۔

ابوالحسین نوری کے چند اشعار ؎

۱- لعمری ما استودعت سرّی و سرّھا

سوانا حذارا ان تشیع السّرایر

۲- و لا لاحظته مقلتای بلحظةٍ

فتشھد بخوانا العیون النواظر

۳- و لکنّ جعلت الوھم بینی و بینه

رسولاً فادّی ما تکن الضمآیر

ترجمہ اشعار: (۱) مجھے اپنی زندگی کی قسم! میں نے اپنے اور محبوب کے سرّ کا سوائے اس کے اور اپنے کسی کو امین نہیں بنایا کہ مبادا بھید کھل جائیں اور پھیل جائیں۔

(۲) اس راز کو تو میری آنکھوں نے بھی نہیں دیکھا چہ جائے کہ دیکھنے والی آنکھیں اس کا مشاہدہ کر سکیں۔

(۳) مگر میں نے اس کے اور اپنے درمیان وہم و تخیل ہی کو ایک پیغام رساں بنایا ہوا ہے اور وہی مجھ پر وہ کچھ ظاہر کرتا ہے جو لوگوں کے باطن پوشیدہ رکھتے ہیں۔

مختلف مسائل کے بارے میں صوفیہ کے اقوال سے متعلق جو کچھ مستحضر تھا بیان کر دیا تمام تر تفصیلات کا احاطہ تو مشکل ہے۔ بہر صورت یہ مختصر ذکر بھی کافی ہے۔

عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمہ کا قول ہے: سارے علم کے دو حصے ہیں یعنی نصف سوال ہے اور نصف جواب۔

۶۲

صوفیہ کے مکتوبات

احمد بن علی کرجی علیہ الرحمہ کا بیان ہے کہ جنید بغدادی علیہ الرحمہ نے ممشاد دینوری علیہ الرحمہ کو ایک مکتوب ارسال کیا جس کے جواب میں انھوں نے خط کی پشت پر تحریر فرمایا کہ ایک صحیح (صوفی) نے اپنی طرح کے دوسرے (صوفی) کو کیا لکھنا ہے کیونکہ حقیقت کی پہچان میں وہ دونوں کبھی مختلف ہی نہیں ہوتے۔

ابوسعید خراز علیہ الرحمہ نے ابو العباس احمد بن عطار علیہ الرحمہ کو لکھا : اے ابا العباس ! مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ بتاؤ جس کی پاکیزگی کامل، جملہ آثارِ نفس سے بری اور اس طرح وہ حق کے ساتھ، حق کے لیے اور حق کے ذریعے قایم ہو کہ نہ اس کے لیے اور نہ ہی اس سے متعلق کوئی شئے باقی رہے۔ اور حق اسے بیمار کرے یا کسی مصیبت سے دوچار کرے تو یہ اس کے لیے بھی ایک آزمائش ہو اور اس کے بارے لوگوں کے لیے بھی امتحان ثابت ہو۔ اگر میرے لیے اس طرح کے کسی شخص کا پتہ آپ کو ہے تو اس کی طرف میری رہنمائی کریں اور اگر وہ مجھے قبول کرلے تو اس کا خادم بن کر رہوں۔

مکتوب عمرو بن عثمان مکّی علیہ الرحمہ بنام طائفہ بغداد

آپ اس وقت تک حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ مٹے ہوئے راستوں سے آگے نہ بڑھ جائیں اور ہلاکت خیز صحراؤں کو طے نہ کرلیں۔

اس مکتوب کے پڑھے جانے کے وقت جنید، شبلی اور ابو محمد جریری علیہم الرحمۃ بھی موجود تھے اور اسی موقع پر جنیدؒ نے فرمایا: کاش! مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ان راستوں میں کون داخل ہے۔ جریری نے کہا: اے کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ ان میں کون شامل نہیں ہے۔ اور شبلی نے کہا تھا: کاش کہ مجھے ان کی جانب سے ہوا کی بو تک بھی نہ پہنچتی۔

مکتوب ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ بنام ابوالقاسم جنید علیہ الرحمہ

اے ابوالقاسم! آپ کا اس حال کے بارے میں کیا خیال ہے جو بلند ہوا اور ظاہر ہو گیا، ظاہر ہوا تو غالب آگیا اور غالب ہوا تو فوقیت لے گیا۔ پھر وہ مقیم ہو گیا اور جگہ لے لی الغرض شواہد مٹنے والے ہیں، اوہام و تخیلات غائب ہونے والے ہیں، زبانیں گنگ ہیں، اور علوم فانی ہیں۔ اگر کسی کو مذکورہ حالت لاحق ہو اور اس کی طبیعت بوجھل ہو جائے تو اسے سوائے وحشت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا اور اگر کسی کی طبیعت اس طرح کی حالت کے نتیجے میں خوش و خرم ہو تو سوائے دوری پانے کے کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ اور نتیجۃً وہ اس حال کو پہنچ جائے گا کہ گویا زنجیروں اور ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا ہے اور اس کی عقل بھی مغلوب ہو گی اور اس طرح وہ حق سے حق کے ذریعے متصل ہوگا اور خلق اس کے لیے بمنزلہ ایک بندھن کے ہو گی۔

(۱) یا هلال السماء لطرفِ کلیل

فاذا ما بدا أضاأطرفیه

(۲) کنت ابکی علی منه فلما

ان تولی بکیت منه علیه

ترجمہ اشعار: اے آسمان کے ہلال! تو آنکھ کے لیے رات کی مانند ہے کہ جب رات ظاہر ہوتی ہے تو ہلال کے کنارے روشن ہو جاتے ہیں۔

۲۔ میں اپنے آپ اس کی وجہ سے روتا تھا مگر جب اس نے پیٹھ پھیری تو میں اس پہ اسی کی وجہ سے رویا۔

جوابِ جنیدؒ بنامِ شبلیؒ

ابوبکر شبلیؒ کا خط ایک بدھ سے دوسرے بدھ تک جنید کے پاس پڑا رہا اور پھر جنید نے اسی کاغذ کے ٹکڑے پہ اس کا جواب تحریر کیا:

"اے ابوبکر! اللہ اللہ! ہم تو لوگوں میں رہتے ہوئے جب ایک لفظ کو سامنے رکھتے تو اسے سونگھتے اور مختلف پہلوؤں سے اس کے بارے میں تہہ خانوں میں بیٹھ کر گفتگو کرتے تھے مگر تم ہو کہ اس پابندی کو بھی ترک کر دیا۔

تمھارے اور اکابر صوفیہ کے درمیان ہزار طبقے ہیں جن میں سے پہلے طبقے کے خیالات وہی تھے جو تمھارے ہیں۔"

ابوعلی رودباریؒ کا ایک مکتوب

جب ہم رُملہ میں تھے تو ان دنوں وہیں پہ ایک شخص ہاشمی نسل کا تھا۔ اس کے پاس ایک کنیز نہایت خوش آواز اور صاحب فراست تھی۔ ہم نے ابوعلی رودباریؒ سے جا کر کہا کہ وہ اس ہاشمی کو لکھیں کہ ہمیں اس کنیز کے پاس جا کر اس سے کچھ سننے کی اجازت دے۔ اس پہ ابوعلی رودباری نے میری موجودگی میں اس شخص کو یہ خط لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اللہ تعالےٰ تمھاری حاجت کو پورا کرے اور تیری آرزو کو بر لائے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تمھارے پاس ایک چشمۂ رواں ہے جس سے اہلِ دل آ آ کر پیمانِ وفا کے جام پیتے اور حقائقِ صفا سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اگر ہمیں اجازت دے دی گئی تو ہم چاہیں گے کہ اس چشمۂ اہلِ دل کا مالک مجلس کو غیروں کی موجودگی سے خالی کرے اور کنیز کو ظاہر بینوں کی آنکھ سے پوشیدہ رکھے۔ ہمارا آنا آپ کی اجازت پر منحصر ہے۔

والسلام

ابوعلی رودباریؒ کے نام ابوعلی بن ابی خالد صوریؒ کے ایک مکتوب سے اقتباس

میں نے ابوعلی بن ابی خالد صوریؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابوعلی رودباریؒ کو ایک خط لکھا جس میں انھیں یہ دو شعر لکھ بھیجے تھے : ؎

ان کتمی ابا علی لحبّی ـــ لک فراراً من التشارک فیہ

جند اروذ بار ماذی علینا ـــ لک حقاً و ذاک منہ بتیہ

ترجمۂ اشعار : (۱) اے ابوعلی! تجھ سے اپنی محبت کو میرا پوشیدہ رکھنا اسے شرکت سے پاک رکھنے کی جانب فرار ہے۔

(۲) کیا خوب ہے تو اے خطۂ رودبار! تیرا ہم پر کیا حق ہو سکتا ہے جب کہ وہ (ابوعلی) تجھ سے باہر چٹیل میدان میں ہے۔

ابوعلی صوریؒ کہتے ہیں کہ کچھ دنوں بعد ابوعلیؒ سے ملاقات ہوئی تو میرے ہاتھ میں کاغذ کا جو ٹکڑا تھا اس پر یہ اشعار لکھے ؎

۱- اغراک بالحب حب فی تخیبہ ـــ لطف الجنان وعطف فی تعتبہ

۲- یا ابن الصبابات عن ورد بلا صدر ـــ نجعت صفوا الھوی فی غیر مطلبہ

۳- قف تحت صفتہ بالود منک لہ

مستھترا بتباریح الشجون بہ

ترجمۂ اشعار : (۱) تجھے محبت پر محبت نے اکسایا، محبت میں ناامیدی لطف بہشت ہے اور اس میں ملامت، مہربانی و کرم ہے۔

(۲) اے محبت کرنے والے تو نے گھاٹ پر آنے اور واپس نہ ہونے کے سبب محبت کی پاکیزگی و خلوص میں عدم مقصدیت کو ملا دیا۔

(۳) اس کے چبوترے کے نیچے اس کے لیے اپنی محبت لے کر آلام و مصائب کی سوزشوں کے ساتھ اس کا فریفتہ ہو کر کھڑا ہو۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کے ایک مرید بیمار پڑ گئے تو انھوں نے شیخ کو دعا کے لئے لکھا جس کے جواب میں ذوالنون نے یہ تحریر بھیجی۔

اے میرے بھائی! آپ نے مجھے یہ لکھا کہ دعا کروں کہ اللہ آپ سے اپنی نعمتوں کو واپس لے لے۔ میرے بھائی! جان لو کہ اہلِ صفا، صاحبانِ عزم و ہمت اور مصائب و ابتلا سے گذرنے والے بیماری و مصیبت سے انس رکھتے ہیں کیونکہ امراض و مصائب اُن کی زندگی میں شفا کے مترادف ہیں۔ جس نے مصیبت و آزمائش کو نعمت نہ جانا وہ دانش مند نہیں اور جس نے اپنے مہربان کو اپنے اوپر امین نہیں بنایا اس نے گویا اپنا معاملہ اہلِ تہمت کے حوالہ کر دیا۔

میرے بھائی! تجھے اپنے رب سے حیا کرنا چاہیئے کیونکہ حیا انسان کو شکوہ و شکایت سے باز رکھتا ہے۔

والسّلام

ایک شخص نے ذوالنون علیہ الرحمہ کو لکھا کہ اللہ تعالٰے تجھے اپنے قرب سے مانوس فرمائے اس پر ذوالنون نے اسے جواباً لکھا:

"اللہ تعالٰے تجھے اپنے قرب سے متنفر فرمائے کیونکہ جب اللہ نے تجھے اپنے قرب سے مانوس کر دیا تو یہ تیرا اپنا اندازہ و تدبیر ہے۔ اور جب اس نے تجھے اپنے قرب سے متنفر کیا تو یہ اللہ کا اندازہ اور اس کی تدبیر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں یہاں تک وہ تجھے اپنا بے قرار بنا کر چھوڑ دیتا ہے"

جعفر خلدیؒ کہتے ہیں کہ میں نے جنیدؒ کو یہ کہتے سنا کہ ایک دفعہ سری سقطیؒ نے ایک رُقعہ مجھے دیا اور کہا کہ یہ تیرے لیے میری حاجت پوری کرنے کے عوض میں ہے۔ میں نے رقعہ کھول کر پڑھا تو لکھا تھا کہ میں نے ایک ویرانے میں حُدی خوان کو یہ اشعار گاتے ہوئے سنا۔

ے ابکی وھل تدرین ما یبکینی

ابکی حذاراً ان تفارقینی

وتقطعی وصلی و تھجرینی

ترجمہ : میں روتا ہوں اور کیا تو جانتی ہے کہ مجھے کیا چیز رُلا رہی ہے ۔ میں تو اس ڈر سے روتا ہوں کہ کہیں تو مجھ سے بچھڑ نہ جائے اور کہیں تو مجھ سے تعلق توڑ کر جدا نہ ہو جائے ۔

ابو عبداللہ رودباریؒ کہتے ہیں کہ مجھے میرے ایک دوست نے لکھا :

" یہ خط جو میری محبت کا آئینہ دار ہے ایک ایسا نور ہے جس نے میری آنکھ کو فقط تجھ پہ مرتکز کر دیا ہے ۔ والسلام "

ابو عبداللہ رودباریؒ نے کسی دوست کو ایک مکتوب میں لکھا :

" آپ کو مرتبہ و نصیب مل جانے کے بعد شوق و محبت اختیار کرنے کی طرف کس چیز نے مائل کیا ۔ اور کس چیز نے آپکو اتصال پر مداومت اختیار کرنے کے بعد وصل کے رشتے کو قطع کرنے پر آمادہ کیا ۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خط کا آنا ایک ایسی خوشی دیتا ہے جو مسرتِ قرب کے برابر ہے "

ایک شیخ کا مکتوب

" تمہارے ساتھ شدید محبت نے مجھے تیری طرف اشارہ کرنے سے بچائے رکھا تیرے قرب نے مجھ سے تیرے ذکر کا سامان غائب کر دیا ۔ لہٰذا تیری حقیقت ظاہر ، تیری نشانیاں تابناک اور تیری سطوت غالب ہے ۔ تیری سطوت ظاہر ہوئی تو میری معرفت گونگی ہو گئی ۔ میری عقل اس کے آتے ہی جاتی رہی ۔ میرا علم اس کے ظہور کو بیان کرنے سے قاصر ہو گیا اور تیری حقیقت کے غلبے کے نتیجے میں میری عبادت اس کے بیان سے عاجز رہی ۔

والسلام

ابو طیب احمد بن مقاتل عکیؒ کہتے ہیں کہ ابو الخیر التیناتیؒ نے جعفر خلدیؒ کو ایک خط میں لکھا :

" فقراء کی جہالت کا بوجھ آپ پر ہے کیونکہ آپ دنیا والوں کی طرف مائل ہو گئے اور اپنے امور میں مشغول ہو گئے جس کے نتیجے میں فقراء جاہل رہ گئے "

ایک دانا کے نام یوسف بن حسینؒ کا مکتوب

یوسف بن حسینؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دانا کو دنیا کی طرف مائل ہونے اور اپنی طبیعت میں ایسی خصلتوں کے پانے کی شکایت کی جنھیں میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔ اس پر انھوں نے مجھے لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمھارا خط موصول ہوا۔ تم نے جو کچھ لکھا اسے میں سمجھ گیا۔ تمھیں اللہ تعالیٰ شرافت و بزرگی عطا فرمائے۔ بلاشبہ میں تمھاری شکایت میں تمھارے ساتھ شریک ہوں اور تمھاری مصیبت میں تمھارا مددگار ہوں۔ اگر تو مسلسل خدا کو پکارتا رہے اور اس کے در پہ دستک دیتا رہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے۔ اگر تجھے صفا و طہارت اپنی مرضی کے مطابق حاصل ہو جائے تو گناہوں کے ارتکاب کرنے کی مصیبت کو چھوڑ دے جس سے تجھے دین و دنیا کسی میں بھی منفعت حاصل نہ ہوگی۔ اور اس شخص کا قرب ترک کر دے جس سے مل کر تو خود کو غفلت و برائی سے مامون نہ رکھ سکے اور ایسے حالات میں قناعت و اطمینان پر اکتفا کرو۔ ۔ ۔ ۔

والسّلام

یوسف بن حسینؒ کہتے ہیں کہ ایک حکیم نے دوسرے حکیم کو لکھا کہ وہ اسے اصلاح نفس کے بارے میں کوئی طریق بتائے اس پر اس حکیم نے جواباً لکھا:

"مجھے اپنے نفس کے بگاڑ سے ہی فرصت نہیں کہ تیرے نفس کی اصلاح کروں، مجھے اپنے اندر کوئی چیز ایسی نہیں دکھائی دیتی جو دوسروں کے لیے اچھی ہو۔

والسّلام"

ابو العباس احمد بن عطاؒ اور ابو سعید خرازؒ کی خط و کتابت

ابو العباس احمد بن عطاؒ نے ابو سعید خرازؒ کو ایک خط میں لکھا:

"میں آپ کو یہ اطلاع دیتا ہوں کہ آپ کے جانے کے بعد فقرآ اور
ہمارے ساتھی ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے ہیں"
ابوسعید خراز نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:
"آپ نے لکھا ہے کہ میرے جانے کے بعد ہمارے مریدین ایک
دوسرے کی مخالفت کرنے لگے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کا اللہ پر غیرت
کرنا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے کاملاً اتفاق کر کے ایک دوسرے پر بھروسہ
نہ کر لیں۔ اور اس طرح اللہ سے دور نہ ہو جائیں۔

نامہ بنامِ حبیب

رودباریؒ کہتے ہیں کہ ایک محب نے اپنے حبیب کو جو کہ اس کو جھڑکتا رہتا تھا یہ لکھا:
"محبت کبھی زائل نہیں ہوتی آپ میرے شہر میں آئیں تاکہ میری محبت میں
اضافہ ہو مگر قبیلہ کے دشمنوں سے نہ ملنا، کہ کہیں وہ یہ گمان نہ کر لیں کہ آپ
خشک مزاج ہیں"

ایک شیخ کے مکتوب سے اقتباس

"جدائی کی تلخی پر غور کرو جو مجھے وصل کی شیرینی سے محروم رکھتی ہے۔ اور میری
آنکھیں نہیں چاہتیں کہ تیری دید کی ٹھنڈک سے آسودہ ہوں کیونکہ اس طرح انھیں
خدشہ ہے کہ کہیں تجھ سے دوری کے باعث وہ جلنے نہ لگیں، میرا جگر ملاقات
کے وقت کانپ اٹھتا ہے اور فراق کی گھڑیوں میں میری آنکھیں آنسو بہانے
لگتی ہیں۔
میں بزبانِ شاعر اپنا حال سناتا ہوں ؎

وما فی الدھر اشقٰی من محب — وان وجد الھوی حلو المذاق
تراہ باکیاً فی کل حین — مخافۃ فرقۃٍ اولاشتیاق

فیبکی ان نأوا شوقاً الیھم ویبکی ان دنوا خوف الفراق
فتسخن عینہ عند التنائی وتسخن عینہ عند التلاق

ترجمہ اشعار: (۱) اگر محب شیرینی محبت کا ذائقہ پالے تو پھر اس سے بڑھ کر کوئی بدبخت نہیں۔
(۲) تو اسے ہر وقت شوقِ الفت یا خوفِ جدائی کے باعث روتا ہوا پائے گا۔
(۳) اگر وہ اس سے دور ہو جائے تو شوق محبت میں روتا رہتا ہے اور اگر محبوب قریب ہو جائے تو وہ خوفِ جدائی سے روتا رہتا ہے۔
(۴) محبوب سے دوری کے باعث اس کی آنکھیں جلتی ہیں اور وصال پانے کے وقت بھی اس کی آنکھیں جلتی ہیں۔

ہرن کی رفاقت

حسین بن جبریل المرندی علیہ الرحمہ جو اجل مشائخ میں سے تھے انھیں مکہ مکرمہ میں اپنے ایک شاگرد کا یہ خط موصول ہوا:

"میرے شیخ! آپ کے مریدین میں سے تمام باہم رفیق بن گئے جب کہ میرا کوئی رفیق نہ تھا اسی حال میں ایک روز میں نے طواف کے دوران ایک ہرن کو بھی طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے وہ بہت اچھا لگا اور اسی کو اپنا رفیق بنا لیا میرے پاس ہر روز رات کو جَو کی دو روٹیاں ہوتی تھیں جن میں سے ایک اس کے لیے اور دوسری میرے لیے ہوتی، وہ ہرن کئی ماہ تک دن رات میرے پاس رہا۔ ایک روز مجھ سے افطار کرنے میں کچھ تاخیر ہو گئی اور جب افطار کرنے لگا تو دیکھا کہ ہرن دونوں روٹیاں کھا چکا ہے۔ اس پر میں نے اس سے کہا: تجھ پر افسوس ہے! تو نے خیانت کی، یہ سنتے ہی اس کے آنسو بہنے لگے اور حیا کے مارے مجھ سے جدا ہو کر چلا گیا۔ میں آپ سے اور آپ کے احباب سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اللہ کے حضور دُعا فرمائیں کہ وہ

اس ہرن کو میری طرف لوٹا دے ۔

مصائب سے پیار

شاہ کرمانیؒ نے ابو حفصؒ کو لکھا :

"جب میں خود کو ہر طرف سے مصائب میں گھرا ہوا پاؤں تو کیا کروں ؟"

اس پر ابو حفصؒ نے انھیں لکھا :

"اپنے مصائب سے پیار کرو مگر اس طرح کہ تجھے ان سے پیار کا احساس تک نہ ہو ۔"

ابن مسروق کہتے ہیں کہ سری سقطیؒ نے کہا کہ میرے کسی دوست نے مجھے خط لکھا جس کے جواب میں میں نے اسے لکھا :

"اے بھائی ! میں آپ کو اللہ تعالےٰ سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہوں ، جو اطاعت گزار بندے کی اطاعت میں مدد فرماتا ہے اور جو نافرمان بندے سے اس کی نافرمانی کا انتقام لیتا ہے لہٰذا آپ کو کہیں اس کی اطاعت اس کے عذاب سے مامون ہونے کی طرف مائل نہ کرے ۔ اور کہیں اس کی معصیت آپ کو اس کی رحمت سے مایوسی کی طرف نہ لے جائے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں ڈرنے والا اور مایوسی سے دور رہنے والا بنائے اور اسی طرح وہ ہمیں اور آپ کو امیدوارِ رحمت بنائے مگر اس طرح کہ ہم میں غرور نہ آ جائے ۔
والسلام "

جنید بغدادیؒ نے علی بن سہل اصبہانیؒ کے نام ایک خط میں لکھا :

"اے بھائی ! حقائق لازمہ مضبوط ارادے اور صحیح و اہم عزائم جس کو حاصل ہوں انھیں وہ ہر عیب سے دُور ، ہر خلل سے محفوظ ، باطن کی گہرائیوں پر پڑنے والے ہر اثر کو زائل ، اور ہر اس تاویل کو جو مقصد و مراد کو موہوم کرنے والی ہو ، کو واضح کر دیتے ہیں ۔

الغرض اہل عرفان کے ہاں حق فقط صحتِ احوال کے ساتھ لازم ہے۔ اور ان کے ہاں طریقِ سلوک کو بہم طے کرنے کے بارے میں علمی دلائل اور براہینِ حق موجود ہیں ۔“

صوفیہ کرام کے مراسلات و مکتوبات اس قدر زیادہ ہیں کہ تمام کا ذکر ممکن نہیں خاص کر وہ طویل مکتوبات شامل نہیں کیے جا سکے جیسے ابوالحسین نوری کا مکتوب بنامِ جنید بغدادیؒ آزمائش و مصیبت کے موضوع پر، ابوسعید خرازؒ کا مکتوب بنامِ ابوالحسین نوریؒ اور جنید بغدادیؒ کا مکتوب بنامِ یحییٰ بن معاذ اور یوسف بن الحسین اور ان دونوں کے جوابی خطوط، تاہم یہاں ہم ان طویل مکتوبات میں سے جنیدؒ کا مکتوب بنامِ ابوبکر الکسائی الدینوریؒ پیش کرتے ہیں جو کہ قدرے مختصر ہے۔

مکتوبِ جنیدؒ

اے میرے بھائی!

اس وقت تمہارا ٹھکانہ کیا ہوگا جب دودھ والی اونٹنیاں چھوٹی پھریں گی (یعنی قیامت کے روز) اور تیرا گھر کہاں ہوگا جب کہ سب گھر تباہ ہو چکے ہوں گے، اور تیری منزل کہاں ہوگی جب کہ سب منزلیں چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ صحرا بن چکی ہوں گی اور تیرا مکان کہاں ہوگا جب کہ ہر مکان کے نشان تک مٹ چکے ہوں گے، اور تیری کیا خبر پڑے گی جب کہ سب خبروں کو جمع کرنے والے بھی چلے گئے ہوں گے، اور کس چیز کا نظارہ کرو گے جب کہ دیکھنے کی جگہیں برباد ہو چکی ہوں گی اور کس طرح شب و روز کی گذرگاہ پر پڑاؤ ڈالو گے اور کس طرح تقدیر کے مصائب سے خود کو بچاؤ گے اور کس طرح صبر کرو گے جب کہ صبر کرنے یا تسلی پانے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ اب اگر رو سکو تو روؤ ایک ایسی عورت کی مانند جو اپنا بچہ گم کر چکی ہو اور سخت مغموم و دکھی ہو۔ اور روؤ ہزاروں عزیزوں کے کھو جانے پر۔ جلیل القدر جانشینوں کے فنا ہو جانے پر

جو کچھ پوشیدہ گذر چکا اس کے ظاہر کرنے پر، مہربان و شفیق بزرگان کرام کے رخصت ہو جانے پر، اور اچانک اچک لیے جانے پر، زلزلہ خیز تند ہواؤں کے بعد کے حالات پر، زوردار مسلسل گرج کی اس آواز پر جو چیزوں کو اکھاڑ کر رکھ دے، شدتِ انتظار کے غلبے پر، اعترافِ گناہ کرنے والی نگاہوں پر۔ اور تیرے لیے کہاں جائے پناہ ہوگی اور جائے صدور جب کہ خواب پریشان ہو جائیں گے، دل پارہ پارہ ہو جائیں گے، عقلیں زایل ہو جائیں گی، خیریں اٹھا لی جائیں گی اور تمھارا حال پوشیدہ مصائب ڈوبتے ستاروں اور ان مشتبہ راستوں میں گم ہو جن کی تاریکیوں نے تمھیں ادھر اُدھر کے راستوں میں بھٹکا دیا اور تم پر آسمان و زمین ایک ہو گئے، اور یہی گمراہیاں پھر تمھیں پانی کی گہرائیوں میں لے گئیں اور ایک مٹھائیں مارتے ہوئے بحرِ ذخار میں داخل کر دیا جس کے سامنے ہر دریا ماش کے دانے کے برابر ہے اور اس دریا نے تمھیں اپنی بھاری موجوں کے حوالے کر کے تمھیں اپنے خوفناک تھپیڑوں کی زد میں رکھ دیا۔ تو اب کون تمھیں ہلاکت کی ان جگہوں اور مصیبتوں سے نجات دلائیگا، یا تمھیں یہاں سے نکالے گا۔

اے ابوبکر! میرا یہ خط آپ کے نام ہے میں اللہ کی بے حد حمد بیان کرتا ہوں اور دنیا و آخرت میں اس سے عافیت کا طلب گار ہوں۔ مجھے آپ کے جملہ خطوط موصول ہو چکے ہیں اور ان میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے میں نے سمجھا۔ آپ کے ذہن میں جو کچھ موجود ہے اسی نے مجھے جواب دینے پر راغب کیا۔ آپ نے اپنے دکھ کا جو اظہار کیا ہے تو اس سے مجھے بھی رنج پہنچا ہے۔ آپ کی حالت میرے نزدیک معتوب نہیں بلکہ قابلِ رحم ہے بجائے اس کے کہ میں آپ کی آزمائش میں اضافہ کا سبب بنوں بلکہ آپ کے لیے یہی کافی ہوگا کہ میں آپ کے ساتھ نرمی و مہربانی کروں۔ مجھے آپ سے خط و کتابت کرنے میں یہ خیال حائل رہا کہ مبادا کوئی اور آپ کے علم کے بغیر

میرے خط کو پڑھ لے کیونکہ آج سے کچھ عرصہ پہلے میں نے اصفہان کے کچھ اصحاب کو ایک خط لکھا تھا جسے بعض اور لوگوں نے کھول کر پڑھ لیا تو اس میں سے انھیں کچھ باتیں سمجھ نہ آسکیں۔ مجھے ان کی دوری اور جدائی نے تھکا دیا، اور مجھے ان کی طرف سے ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ لوگوں کے ساتھ نرمی برتنا چاہیئے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس چیز کو دیکھنے کی کوشش کریں جسے وہ سرے سے سمجھتے ہی نہ ہوں اور نہ ہی ان سے کوئی ایسی بات کہنی چاہیئے جو وہ سمجھ نہ سکیں، بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ بغیر کسی ارادے کے کر بیٹھتے ہیں۔ اللہ آپ کو اور ہمیں بچائے اور سلامت رکھے۔

آپ پر یہ لازم ہے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو اور اپنے ہم عصر اہلِ معرفت سے شناسائی پیدا کرو لوگوں سے ان کے علم کے مطابق گفتگو کرو اور اور انھیں اس چیز سے دور رکھو جو وہ نہ جانتے ہوں کیونکہ ایسا کم ہی ہوتا ہے، کہ کوئی کسی چیز کو نہ جانتے ہوئے اس کا دشمن نہ ہو جائے۔

بلاشبہ لوگوں کی مثال سو اونٹنیوں کے اس گلّے کی سی ہے جن میں سے ایک بھی سواری کے قابل نہ ہو اور اللہ نے علماء و حکماء کو اپنی رحمت بنا کر بھیجا ہے، اور اس رحمت کو اپنے بندوں کے لیے وسیع فرما دیا، اپنے حال سے بے نیاز ہو کر لوگوں کے احوال کی جانب توجہ کرو اور اپنے دل سے ان کے ساتھ ان کے مقام کے مطابق مخاطب ہو کیونکہ یہ تیرے اور ان کے لیے بہت زیادہ سود مند ہوگا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہم نے اس کتاب میں یہ خط اور حکایت اس لیے شامل کی کہ جو اسے پڑھے اسے اس میں موجود صحیح اشارات اور فصیح عبارات سے فائدہ حاصل ہو اور اسے صوفیہ کے باہمی خط و کتابت کے مقاصد سے آگاہی حاصل ہو کیونکہ ہر طرح کے لوگ آپس میں اپنے اپنے معیار کے مطابق خط و کتابت کرتے ہیں۔

۶۰۳

صوفیہ کی کتابوں سے چند تعارفی اقتباسات

جنید بغدادیؒ کی ایک کتاب کا پیشِ لفظ

اے میرے بھائی! تجھے اللہ تعالےٰ برگزیدہ ہونے کی فضیلت سے نوازے، تجھے اشیاء کا احاطہ کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے۔ اہلِ دانش کے علم سے مالامال کرے، اور علمِ معرفت سے اسی قدر نوازے جو تیرے لیے بہت مناسب ہو پھر وہ تجھے اپنے لیے ماسوا اللہ سے خالی کر دے کہ تو اس کا ہو جانے سے بھی بے نیاز ہو کر اس کا ہو جائے تاکہ وہ تجھے تیرے متوجہ ہونے سے اس طرح جدا کر دے کہ جو مشاہدہ وہ تجھے کرائے اس میں کسی اور شئے کا مشاہدہ داخل ہو کر تجھے اصل مشاہدہ سے خارج نہ کر دے۔

اسی کی ذات اول الاول ہے جس کے ذریعے وہ رسوم و آثار مٹ گئے جو اس چیز سے مشابہ ہیں جو اس نے اپنی بلندی و عظمت کو اپنے لیے مخصوص فرماتے ہوئے اپنے ہی پاس رکھی اور تجھ کو اس سے بے خبر رہنے دیا پھر اس نے تمھیں تمھارے لیے تجرید کی اولین تفرید اور وجود تفرید کی حقیقت میں جدا کر دیا۔ اس طرح جب وہ منفرد ٹھہرا تو وہی ظاہر ہوا اور خلق کے مشاہدہ کے فنا ہونے کے بعد مشاہدۂ حق کو بھی فنا کر دیا یہاں پہ حق تعالےٰ نے اس کے لیے حقیقت الحقیقت کا ظہور ہوا اور حقیقتِ علم کی انتہا سے علمِ توحید تک جو کچھ علم تجرید کی تفرید پہ گذرا وہ اسی کے ذریعے جاری ہوا اور اس (حقیقت الحقیقت) کو اللہ تعالےٰ

نے اکثر ان لوگوں سے محجوب رکھا جو خود کو اس سے منسوب کرتے، اس کا دعویٰ کرتے اور اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک اور اقتباس

تجھے حقیقتِ اختصاص نے لوائح انتقاص سے فنا کر دیا اور حق تعالیٰ نے تجھے مشاہدہ و ملاحظہ سے پوشیدگی میں پناہ دی تاکہ تو اس کا ذکر کرتے وقت خود اپنے ذکر اور حال سے بے خبر ہو جائے، پھر یاد دلایا کہ اس نے تجھے ازل میں اس وقت یاد کیا جب کہ آزمائش کی کیفیت اور اس کا زمانہ بھی ابھی وجود میں نہیں آیا تھا بے شک وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

اقتباس

اللہ جل مجدہٗ نے تمھیں اپنی طاعت سے نوازا، اپنی دوستی سے مختص کیا، اپنے پردۂ رحمت سے ڈھانپا اپنے محبوب سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ پر چلنے کی توفیق دی، اپنی کتاب مطہر و مقدس کا فہم عطا فرمایا، حکمت و دانائی کی زبان سے بہرہ ور کیا، قرب سے مانوس فرمایا، فوائد سے دامن بھر دیا، ترقیوں اور اضافوں سے مالا مال کیا، اپنے در پر بٹھالیا اور اپنی بارگاہ میں تجھے خادم رکھا تاکہ تو اس کی موافقت کرنے والا اور اس کی محبت کا جام نوش کرنے والا ہو جائے پھر یہ ہو کہ زندگی، زندگی پالے روح، روح سے مل جائے، نعمتوں کی تکمیل ہو جائے، تو عتاب سے محفوظ ہو جائے اور اس طرح عافیت و سلامتی مکمل ہو۔

اقتباس

تیرے لیے وہ عجائب ظاہر ہوئے جن کی خبریں پردۂ غیب میں پنہاں تھیں وہ حقائق آشکارا ہوئے جو پوشیدہ تھے، مخفی غرائب کے راز واضح ہوئے، پوشیدہ خزانوں کے سربستہ بھید تجھ سے اس کی زبان کے ذریعے مخاطب ہوئے وہی زبان جس کے ذریعے وہ اپنے

مقامِ خفی کی خبر دیتا ہے پس واضح ترین گفت گو جو اس کے مقصدِ بیان کو واضح کرتی ہے وہ فصاحت لسانی بلکہ وہ طرزِ اظہار ہے جس کے ذریعے اللہ تعالےٰ اپنے موضوعِ بیان کو ظاہر فرماتا ہے اور یہ اپنے وقت پر ہی ظاہر ہوتا ہے۔

اقتباس

اللہ تعالےٰ تجھے اپنی مخصوص حفاظت میں لے جس کے ذریعے وہ اپنے مخلص دوستوں کو محفوظ فرماتا ہے، اور وہ آپ کو اور ہمیں اس کی مرضی کے راستوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے وہ تجھے اپنے انس کے گنبد میں پناہ عطا فرمائے، وہ تجھے اپنی بزرگی و کرامت کے نوع بنوع باغات کی طرف لے جائے، اللہ تیری اس طرح حفاظت فرمائے جیسے وہ ماں کے پیٹ میں بچے کی کرتا ہے وہ تیرے لیے ایسی زندگی کو دوام بخشے جو زندگی کے قائم رہنے سے مبرّا اور اللہ کی ابدیت کے ہمیشہ جاری رہنے پر منحصر ہو، وہ تجھے ہر اس شے سے جدا فرمائے جو تو اس کے ساتھ لاحق کرتا ہو اور جو وہ تجھ سے متعلق رکھتا ہو حتیٰ کہ تو اس طرح اس کے دوام میں تنہا ہو جائے نہ تو رہے نہ تیرے متعلقات اور نہ تیرا یہ احساس کہ تو اسے جانتا ہے الغرض صرف تیرا رب ہی باقی رہے۔

جنید علیہ الرحمہ کی تحریروں سے چند تعارفی اقتباسات ہم نے پیش کئے جن میں لطیف اشارات اور ایسے پوشیدہ رموز ہیں جو مشکل حقائق کی وضاحت کرتے ہیں اور رازہائے سربستہ کا پتہ دیتے ہیں۔

ان تحریروں میں آپ کو تجرید توحید اور حقیقتِ تفرید سے متعلق ایسی خاص باتیں ملیں گی جو فقط انہی اہلِ معرفت کا حصہ ہیں، لہٰذا جو بھی ان عبارات کو پڑھے اسے چاہیئے کہ ان پر غور کرے کیونکہ ان میں اہلِ فہم کے لیے فوائد اور اہلِ عنایت کے لیے مزید اضافے اور قلوب کے لیے بہترین فائدے موجود ہیں۔ بلاشبہ اللہ ہی اچھائی کی توفیق دینے والا ہے۔
جنید کے علاوہ اور بھی کئی بزرگانِ کرام کی اس طرح کی عبارات بکثرت ہیں جن میں سے کچھ اقتباسات ہم یہاں ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔

ابوعلی رودباریؒ کی ایک تحریر

اللہ تعالےٰ تجھے کمالِ احوال کے مقاصد تک رسائی عطا فرمائے اور تجھ سے خالص محبت رکھنے والوں اور دوستی کرنے والوں کے دل تیرے لیے دائمی فضل اور بھلائی کے ساتھ مانوس کرے، جو کچھ تیرے اوپر واضح ہو وہ زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی تجھے عطا فرمائے وہ ہمیں وہ کچھ بخش دے جن تک آرزوؤں اور تکمیل احوال کی رسائی نہ ہو سکتی ہو اور تیرے لیے اپنے فضل و کرم میں مزید اضافہ فرمائے جس کا اس نے تجھے عادی کر دیا ہے۔
اللہ تعالےٰ ہمیں اپنے لطف و کرم میں سے وہ کچھ عطا فرمائے جس کی ہم تمنا کریں۔

ابوسعید ابن الاعرابی کی ایک تحریر

اللہ آپ کی حفاظت فرمائے جس طرح بچے کی حفاظت کی جاتی ہے۔ وہ آپ کو اور ہمیں نیکوکاروں سے ملائے جن کے قلوب کو کھول دیا گیا اور انھوں نے وعدہ اور وعید کا مشاہدہ کر لیا جو ان میں سے خوف رکھتا ہو اس سے رجا بعید نہیں اور جو ان میں سے صاحب رجاً ہو تو خوف بھی اس کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اللہ کی محبت کے ساتھ غالب اور اس کی ہیبت سے سر جھکاتے ہوئے ہوتے ہیں۔
محبت ورجار کی کیفیت نے انھیں مسرور کر رکھا ہوتا ہے تا کہ وہ مایوس ہو جائیں اور انھیں خوف دامن گیر ہوتا ہے تا کہ وہ فریب زدہ رہیں یا مامون رہیں گویا وہ خوف و رجاً کے درمیان کھڑے ہوتے ہیں۔
شوق نے انھیں قلق میں مبتلا رکھا تو ذوق نے انھیں بے قرار کیا، حسن ظن ان کا قائد بنا لیے جانے لگا خوف ان کو چلائے رکھا توفیق ان کا بدرقہ ہوئی تو محبت ان کی سواری وہ طالب بھی ہیں اور مطلوب بھی۔ راستے کے نشان ان پر واضح ہوتے ہیں اور گھاٹ آباد جو انھیں بھلائیوں کا پتہ دیتے ہیں اور وہ عمدہ نئی نعمتیں اور فوائد لے کر پلٹتے ہیں۔

خداوند تعالٰی تمھیں اپنے آپ سے فنا کر کے اپنے ساتھ زندہ فرمائے اور فہم سے تمھاری تائید فرمائے تیرے قلب کو ہر وہم سے خالی کر دے، مسافت سے فنا کر کے قرب سے نوازے اور وحشت سے فنا کر کے انس عطا فرمائے۔

ایک اور اقتباس

اللہ نومولود بچے کی مانند تیری حفاظت فرمائے، اور معصوم دوست کی طرح تجھے رکھے، تجھے ان نعمتوں کی معرفت عطا کرے جو وہ تجھ پر انعام کرے، اور تجھ سے وہ کچھ سرزد کرائے جو اس نے تیری فطرت میں ودیعت کیا ہو، تجھے تیرے نفس قاطعہ سے محجوب رکھے، نفس کی رکاوٹوں، مصائب، اعمال پہ نظر رکھنے، سعی و کوشش اور تزکیۂ نفس میں تیری کفایت فرمائے، تجھے تیرے نفس کی قید سے نجات عطا کرے اور اس کے تحیر سے متعلق عوارض میں تیری حفاظت فرمائے، تجھے تیرے نفس سے دور کر کے اپنے ساتھ مختص فرمائے تاکہ تیرے اندر عبودیت راسخ ہو جائے اور اس طرح تیرے عمل کو پاکیزہ کرے چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو، تیری سعیٔ قلیل کو بڑھائے، تیری زندگی کو پاکیزہ فرمائے چاہے تو موت سے ہمکنار ہو جائے یہاں تک کہ تجھے اس زندگی سے نواز دے جس میں موت نہیں اور ایسی بقائ عطا کر دے جس کو فنا نہیں، وہ تیرے معاملہ کی اس خوبی سے نگہبانی فرمائے جیسا کہ اس نے اوائلِ معاملہ میں تیری حیرانگی کے وقت تیری کفایت کی بے شک وہی ہر معاملے کی ابتدا کرنے والا اور اس کو انجام تک پہنچانے والا ہے۔

ابو خراز کی تحریروں سے چند اقتباسات

اللہ تعالٰی اپنے ذکر میں تجھے تیرے نفس سے محفوظ فرمائے، تجھے شکر بجالانے سے مطلع فرمائے، تجھے تیرے اعمال کے نتیجے میں اپنی معرفت سے حصہ عطا فرمائے تاکہ تو ان میں سے ہو جائے جنھوں نے اس کے لیے ہدایت کی رسی کو بٹا۔ وہ اس ہدایت میں تیرے مقام کو بلند فرمائے اور اس کے بیان کو تجھ پر منکشف کرے، میں اللہ تعالٰی سے یہ دعا کرتا ہوں کہ تیرے

منتشر نفس کو مجتمع کر کے تجھ پر اس کی ساری باتوں کو ظاہر فرما دے بے شک وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔

اللہ تعالٰے اپنے ذکر کے طفیل تیرے نفس سے تیری حفاظت فرمائے، پھر شکر ادا کرنے کی توفیق عطا کرے اور ادائیگی شکر کو قبولیت سے نوازے۔ اپنی بے پناہ نعمتوں سے حصہ عطا فرمائے اور اپنے عذابِ شدید سے پناہ میں رکھے۔ لاریب وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔

ایک اور اقتباس پیش ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ ابوسعید خراز علیہ الرحمہ کی عبارت سے ہے وہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالٰے تمھیں اعلیٰ علم سے مالامال فرمائے بلند رتبہ ذکر سے منقش کرے، اپنی حفاظت میں رکھے، اپنی دوستی کی دولت سے مخصوص کرے، جس چیز کو تیری نگرانی میں دے اس میں تیری حفاظت فرمائے، وہی تیرا مددگار اور تجھے کافی ہو، وہی تجھے شفا بخشے، اپنی یاد سے بہرہ ور کرے، تجھ سے دوستی رکھے، اپنی اطاعت سے مانوس کرے، بلندی عطا فرمائے اور تجھے خواہشاتِ نفس کے حوالے نہ کرے۔

کردی الصوفی الأرموی کی ایک تحریر

اللہ تعالٰے تمھیں وہ کچھ عطا فرمائے جس کی وجہ سے اس نے تم پر بخشش کی۔ اللہ تعالیٰ تمھیں امور میں غور و فکر کرنے والا بنا کر تمھیں صفات کی خواہش سے بچائے۔ وہ تجھے، تجھ سے محفوظ کرے اس حالت کے ذریعے جس میں اس نے تیری ابتدا کی اور اسی طرح تیرے آغاز کی عظمت سے بھی تجھے محفوظ رکھے، وہ تجھے تجلّی کے اس مقام میں فروکش فرمائے جس کا اس نے ارادہ کیا اور جس کی خواہش کی گئی۔

ان کو مصیبت نے گھیر لیا تو سرِتسلیم خم کیا، جو مدارات کرتا ہے اس کے لیے اسرار جمع ہوتے ہیں اور جو غموں کو برداشت کرتے ہیں ان کے غم جاتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اس سے جو کچھ اپنے ذمہ لیا بخوشی لیا اور اس کی محبت کی وادیوں میں بکھر گئے، انوارِ توحید کی

روشنیوں اور تجرید کی چمک نے انھیں پوشیدہ طور پر اچک لیا۔ الغرض وہ اس کے لیے اس سے ہر چیز سے جدا ہو گئے اور اسی کے ذریعے جدا ہوئے گویا وہ اسی طرح ہیں جیسے تھے۔

دقی علیہ الرحمہ کی چند تحریریں

اللہ تعالیٰ تیرے لیے اپنی بزرگی مبارک فرمائے، تو اس کے محبین کے لیے باران رحمت اس کی موافقت کرنے والوں کے لیے جائے پناہ، اس کی معرفت کا راستہ دکھانے والا، اس کی وحدانیت سے نسبت رکھنے والا، اور اس کے ذریعے اس کی خبر دینے والا ہے، تجھے اللہ نے ازل سے اپنے لیے تخلیق فرمایا، اپنے سربستہ راز سے مطلع کیا، اپنی قدرت کے معمولات دکھاتے تیری زبان کو اپنی حکمت و دانائی کے اظہار کا ذریعہ بنایا، تجھے اپنی طرف راہ دکھانے کے لیے قائم فرمایا اور تجھے اپنے حسن اظہار کے ذریعے مریدین اور بالغ نظر مستعد محققین کے لیے معیار قرار دیا۔

بلاشبہ وہی ان تمام مذکورہ باتوں کا متصرف ہے اور اس کی جانب سوائے اس کی ذات کے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ والسلام

اللہ تعالیٰ تمھیں صاحب عز و شرف بنائے اور بلندی عطا فرمائے، اپنی عطا و بخشش سے قریب تر کرے، اپنی نعمتوں سے مالا مال کر کے تجھے راضی فرمائے، آزمائش و مصیبت سے تجھے اپنی پناہ میں رکھتے ہوئے تجھے سکون و شفا عطا فرمائے اور تجھ پر عائد ذمہ داریوں میں تیری حفاظت و کفایت فرمائے، بلاشبہ وہ ولی و قدیر ہے اور مہربان ہے ان کے لیے جو اس کے در پر ملتجی ہوئے، جو اس پر بھروسہ رکھے اسے خوف سے امن دیتا ہے، ہم اپنے اور تمھارے لیے ہر مصیبت و آزمائش سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں اور اپنے ہر گناہ کے لیے اسی سے بخشش و پناہ مانگتے ہیں۔

ایک اقتباس

اللہ تجھے اپنی محبت عطا کرے، تجھے اپنی مہربانی اور عطا کردہ نعمت سے محروم نہ فرمائے

اپنے غضب وسختی اور آزمائش سے تجھے پناہ دے، تجھے اپنے افعال میں مشغول کر کے ذکر وشکر سے غافل نہ فرمائے، وہی مالک اور صاحب قدرت ہے۔ اللہ تجھے متقین کی طرح گناہ سے محفوظ فرمائے، عشق سلیم سے نوازے، اپنے ذکرِ بلند سے آگاہ فرمائے، اور اپنے دائمی دیدار سے بہرہ ور فرمائے۔

بلاشبہ وہی قدرت والا اور مالک ومولیٰ ہے۔

ہم نے اس کتاب میں صوفیہ کرام کے خطوط اور ان کی تحریروں کے اقتباسات اس لیے شامل کیے ہیں کہ قارئین ان میں موجود بلند معانی اور لطیف اشارات پر غور کریں تاکہ وہ ان کے ذریعے صوفیہ کے مراتب، لطیف نکات، پاکیزہ قلوب اور ان کے علم، عقل اور ادب پر استدلال کر سکیں۔

ایک وجہ ان تحریروں کے شامل کرنے کی یہ بھی ہے کہ اہلِ معرفت کا یہ طریق رہا ہے کہ اگر وہ مجلس میں نہ بیٹھیں یا ملاقات نہ کریں تو مشکل مسائل کو اپنے خطوط اور اشعار کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔

۶۴

احوال و اشارات پر مبنی صوفیہ کے اشعار

ذوالنونؒ کے اشعار

یوسف بن الحسینؒ کہتے ہیں کہ میں نے بعض ثقہ اشخاص سے سنا کہ ذوالنون المصری رحمہ اللہ علیہ نے یہ شعر کہے ؎

اذا ارتحل الکرام الیك یوماً　　لیلتمسوك حالاً بعد حالِ
فان رحالنا حطت رضاءً　　بحکمك عن حلول و ارتحالِ
انخنا فی فنائك یا الٰهی　　الیك مفوضین بلا اعتلالِ
فسنا کیف شئت و لا تکلنا　　الی تدبیرنا یا ذا المعالی

ترجمہ اشعار : (۱) جب کریم لوگ تیری طرف کسی روز رحلت کریں گے تاکہ وہ تجھ سے ایک کے بعد دوسرے حال کو طلب کریں۔

(۲) تو بلاشبہ ہم نے سفر کرنے اور پڑاؤ کرنے سے خود کو پیچھے رکھا اور فقط تیرے حکم پر راضی رہتے ہوئے ہی ایسا کیا۔

(۳) یا الٰہی! ہم نے تیری بارگاہ میں بغیر کسی حیل و حجت کے خود کو تیرے سپرد کرتے ہوئے اقامت اختیار کر لی۔

(۴) ہماری رہنمائی فرما جیسا کہ تو چاہے اور ہمیں اسے بلندیوں کے مالک! ہماری تدبیر کے حوالے نہ کر۔

ذو النون رحمۃ اللہ علیہ کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں ؎

من لاذ باللہ نجا باللہ　　وسرّہ مرُّ قضاء اللہ

ان لم تکن نفسی بکفّ اللہ　　فکیف انقاد لحکم اللہ

للہ انفاس جرت للہ　　لا حول لی منھا بغیر اللہ

ترجمۂ اشعار : (۱) جس نے اللہ کی پناہ لی وہ اللہ کے ذریعے نجات پا گیا۔ اور اللہ کے فیصلے کے طے ہونے نے اسے مسرور کر دیا۔

(۲) اگر میری جان قبضۂ قدرت میں نہ ہوتی تو کیسے خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتا۔

(۳) جاری سانسیں اللہ کے لیے ہیں مجھے کسی سانس میں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں۔

ابوالقاسم جنید علیہ الرحمہ کے اشعار

ابو عمرو بن علوان نے مجھے جنید علیہ الرحمہ کے یہ شعر سنائے ؎

تغرب امری عند کل غریب　　فصرت عجیباً عند کل عجیب

و ذالک لانّ العارفین رأیتھم　　علی طبقات فی الھواء رتوب

فأصبح امری لیس یدرک غورہ　　سوی أنّنی للعارفین خطیب

ترجمۂ اشعار : (۱) ہر نامانوس و اجنبی کے نزدیک میرا معاملہ نامانوس و اجنبی ہو گیا۔ اور میں ہر عجیب کے نزدیک عجیب ہو گیا۔

(۲) اور یہ اس لیے کہ تم عارفین کو درجہ بدرجہ ہوا میں قائم دیکھو گے۔

(۳) تو میرا معاملہ ایسا ہو گیا کہ اس کی گہرائی کو پایا نہیں جا سکتا سوائے اس کے کہ میں عارفین کے لیے خطیب ہوں۔

درد و الم سے متعلق جنید علیہ الرحمہ کے یہ اشعار پیش ہیں :

؎

یاموقد النار فی قلبی بقدرتہ لو شئت اطفیت عن قلبی بك النار

لا عار ان مت من خوفٍ وحذرٍ علی فعالك بی لا عار لا عارا

ترجمۂ اشعار : (۱) اے میرے دل میں اپنی قدرت سے آگ جلانے والے اگر تو چاہے تو میرے دل کی آگ کو بجھا ڈالے۔

(۲) اس میں مجھے کوئی عار نہیں اگر میں خوف وحذر سے مر بھی جاؤں مجھے تیرے کاموں پر کوئی عار نہیں کوئی عار نہیں۔

جنید علیہ الرحمہ کے کچھ اور اشعار ؎

یا مسری اسفاً یا متلفی شغفاً

لو شئت انزلت تعذیبی بمقدار

حاشاك من استغاثاتی فکیف وقد

اولیتنی نعماً طاحت باذکار

ترجمۂ اشعار : (۱) اے مجھے تأسف کی آگ میں جلانے والے اور اے مجھے شوق محبت میں ہلاک کرنے والے! اگر تو چاہتا تو مجھ پر عذاب کو کسی مقدار میں نازل کرتا۔

(۲) تجھے کس طرح کوئی چیز میری فریادوں سے خارج کرسکتی ہے جب کہ تو نے مجھ پر ایسی نعمتوں کے احسان کئے ہیں کہ جو ذکر کرنے سے تلف ہو جاتی ہیں۔

ابوالحسین نوریؒ کے ابیات

میں نے رملہ میں علی الوجیہی کو یہ کہتے سنا کہ ابوالحسین نوریؒ نے ابوسعید خرازؒ کو ایک خط میں یہ اشعار لکھے ؎

لعمری ما استودعت سرّی وسرّہ سوانا حذاراً ان تشیع السرائرُ

ولا لاحظتہ مقلتای بنظرۃٍ فتشھد نجوانا القلوب النواظرُ

ولکن جعلت الوھم بینی وبینہ رسولاً فادّی ما تکن الضمائرُ

ترجمۂ اشعار : (۱) مجھے اپنی زندگی کی قسم! میں نے اپنے اور اس کے راز کو اس لیے امانت کے طور پر مخفی رکھا کہ مبادا ہمارے بھید عام ہو جائیں۔

(۲) اس راز کو تو میری آنکھوں نے بھی ایک جھلک نہیں دیکھا چہ جائیکہ دوسرے لوگوں کی آنکھیں اسے دیکھ سکیں۔

(۳) بلکہ ہم نے وہم کو ہی اپنے اور اس کے درمیان پیامبر بنا رکھا ہے کہ اس کے ذریعے وہ راز بیان کیے جا سکتے ہیں جو باطن کی گہرائیوں میں موجود ہوتے ہیں۔

قنادؒ کے چند اشعار

قنادؒ نے ابوالحسین نوریؒ کو اس کے حال کو کھو دینے پر افسوس کرتے ہوئے لکھا:

انعی الیك اشارات القلوب معاً
لم یبق منهن الا دارس العلم

انعی الیك قلوباً طال ماهطلت
سحائب الجود منها الجر الحکم

انعی الیك نفوساً طاح شاهدها
فیما ورا الحیث بل فی شاهد القدم

انعی الیك لسان الحق مذ زمنٍ
اودی واذکاره فی الوهم کالعدم

انعی الیك بیاناً تستکین لهٗ
اسماع کل فصیح مقول فهم

انعی وحقك اخلاقاً لطائفةٍ
کانت مطایاهم فی مکمن الکظم

ترجمۂ اشعار : (۱) میں تمہیں قلوب کے اشارات کے بارے میں خبر دیتا ہوں کہ ان میں سے صرف مٹے ہوئے نشان باقی ہیں۔

(۲) میں تمھیں ایسے قلوب کی خبر دیتا ہوں کہ اکثر ان میں سے جود و کرم کے بادل حکمتوں کے دریا برساتے ہیں۔

(۳) میں تمھیں ایسے نفوس کی خبر دیتا ہوں کہ جن کا شاہد مکانیت سے آگے گم ہو گیا بلکہ قدیم ہونے میں گم ہو گیا۔

(۴) میں تمھیں ایک لسان الحق یعنی مردِ کامل کی خبر ایک زمانے سے دیتا رہا تا آنکہ وہ نہ رہا اور اس کی یادیں خیالات میں کالعدم ہو گئیں۔

(۵) میں تمھیں ایک ایسے بیان کی خبر دیتا ہوں جو ہر فصیح الکلام، اور سمجھدار کے کانوں کو سکون بخشتا ہے۔

(۶) تمھیں اپنی جان کی قسم! میں تمھیں ایک ایسے طائفہ کے خصائل بتاتا ہوں جن کی سواریاں غصہ پی جانے کی کمین گاہ میں ہوتی تھیں۔

جنید بغدادیؒ کے دو اشعار

جعفر خلدیؒ نے مجھے جنید علیہ الرحمہ کے یہ دو شعر سنائے ؎

فلما جفیت وکنت لا أجفی

و دلائل الهجران لا تخفی

وارالک تسقینی وتمزجنی

ولقد عهدتك شاربی صرفاً

(۱) مجھ پر کیوں سختی کی گئی جب کہ مجھ پر سختی نہیں کی جاتی تھی۔ اور ہجر کی نشانیاں چھپی نہیں رہتیں۔

(۲) میں یہ خیال کرتا ہوں کہ تو ہی مجھے پلائے گا اور مجھ سے ملے گا اور میں نے صرف تجھے ہی اپنا ندیم ٹھہرایا ہے۔

عبد اللہ بن الحسینؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے احمد بن الحسین بصریؒ کو یہ کہتے سنا کہ میں جنیدؒ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ کسی نے ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے یہ

اشعار کہے ؎

نمّ علی سرّ وجدہ النفس

والدمع من مقلتیہ ینجبس

مدلہ هائم لہ حرق

انفاسہ بالحنین تختلس

مهذب عارف لہ فطن

من نور انس الحبیب یقتبس

یا بأبی الاشعث الغریب فتیً

لیس لہ دون سؤلہ انس

یا بابی جسمہ الزکیّ و ان

کان علیہ خلق دنس

ترجمہ اشعار: (۱) اس کے وجد کے راز کی نَفَس نے غمازی کی اور آنسو اس کی آنکھوں سے پھوٹ نکلے۔

(۲) وہ مدہوش و سرگرداں ہے اور اسے جلن لاحق ہے اس کی سانسیں شوقِ عشق کے مارے اکھڑ رہی ہیں۔

(۳) وہ مہذب اور عارف ہے اس کو انسِ حبیب کے نور سے زیرکی حاصل ہے۔

(۴) میرا باپ قربان ہو اس پراگندہ وغبار آلود بالوں والے مسافر نوجوان پر جس کو اپنی التجا کے بغیر کسی چیز سے انس نہیں۔

(۵) میرا باپ قربان ہو اس پر جس نے اگرچہ میلے بوسیدہ کپڑے پہن رکھے ہیں۔ مگر اس کا جسم پاکیزہ ہے۔

ابو علی رودباریؒ کے اشعار

مجھے ابوبکر رقی علیہ الرحمہ نے دمشق میں ابو علی احمد بن محمد رودباریؒ کے یہ اشعار سنائے ؎

حد القناعة محو الكل منك اذا

لاح المزيد بحد عنه مطلع

فان تحقق وصف الوجد مشتملاً

على الاشارات لم يلوى على الطمع

(۱) حد قناعت یہ ہے کہ جب مزید کی ضرورت غالب حد تک ظاہر ہو تو تجھ سے سب کچھ محو ہو جاتے۔

(۲) اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ وجد کی کیفیت اشارات پر مشتمل ہے تو پھر (سالک) طمع کی طرف نہیں جھکتا۔

مجھے وجیہیؒ اور ان کو ابو علی رودباریؒ نے اپنے یہ اشعار سنائے ؎

کتبت الیکم بماء الجفون

وقلبی بماء الھوی مشرب

وکفی تخط وقلبی یمل

وعینای تمحو الذی تکتب

(۱) میں نے تمہیں پلکوں سے گرتے آنسوؤں کے ساتھ لکھا جب کہ میرا دل شراب الفت سے سیراب تھا۔

(۲) میری ہتھیلی لکھتی ہے اور دل لکھواتا ہے اور آنکھیں جو کچھ لکھا ہو مٹا دیتی ہیں۔

مجھے ابو عبداللہ احمد بن عطار رودباری نے اپنے خالو ابو علی رودباری کے یہ اشعار سنائے ؎

تأمل من بعد میلة

حلول فنائك صفو الوصال

موانع عن احتواء الوصال

الیك عن الوصل فی كل حال

علی ان یرد علیك الصفات

بنعت التمکن عند الکمال

فاقنع بقنعته ان قراه

ففتّ مَدَی لحظه فی النّوال

(۱) اس نے غور و عوض کے بعد تیرے صحن میں فروکش ہونے کو ہی وصال خالص قرار دیا ہے۔

(۲) تیرا وصال پانے میں ہر حالت میں رکاوٹیں حائل ہیں۔

(۳) تاکہ وہ کمال پر متمکن ہونے کی حالت میں تیری صفات کو تجھ پر لوٹائے۔

(۴) پس اس کے ٹیلے کی طرف آنا کہ تو اسے دیکھے اور اس کے دیکھنے کی مدتِ انتظار بخشش پاکر ختم ہو جائے۔

ابوعلی رودباری کے چند اور اشعار ؎

انی اجلك عن روحی و ابذلها

فداءُ عبدك روحٌ انت واهبها

وکیف تفدیك روح انت واهبها

وقد مننت علی من یفتدیك بها

(۱) میں تجھ کو اپنی روح پر ترجیح دیتا ہوں اور اسے تجھ پر قربان کرتا ہوں حالانکہ تیرے بندے کی قربانی وہی روح ہے جس کا عطا کرنے والا بھی تو ہی ہے۔

(۲) ایک روح! تیرے حضور خود کو بطور فدیہ کیسے پیش کرسکتی ہے مگر تو نے اس شخص پر احسان کیا ہے جس نے اسے تیرے حضور فدیہ کے طور پر پیش کیا۔

ابراہیم الخواصؒ کے اشعار

مجھے ابوبکر احمد بن ابراہیم المؤدب البیرونیؒ نے مصر میں ابراہیم الخواص علیہ الرحمہ کے یہ اشعار سنائے ؎

صبرت علی بعض الاذی خوف کلّہ
ودافعت عن نفسی لنفسی فعزّت

وجرّعتھا المکروہ حتی تدرّبت
ولو جرعتھا جملۃً لاشمأزّت

الارب ذل ساق للنفس عزۃً
ویارب نفس بالتعزّز ذلّت

ساصبر نفسی ان فی الصبر عزۃ
وارضی بدنیائی وان ھی قلّت

(۱) تمام کے خوف سے میں کچھ اذیت پر صابر ہو گیا اور میں نے اپنے نفس سے نفس کے لیے دفاع کیا تو وہ معزز ہو گیا۔

(۲) اور میں نے نفس کو ناپسندیدہ چیز گھونٹ گھونٹ کر کے پلا دی حتیٰ کہ وہ اس کا عادی ہو گیا۔ اگر میں اسے ساری مکروہ چیز ایک دم ہی پلا دیتا تو وہ خوفزدہ ہو جاتا۔

(۳) کتنی ہی ایسی ذلتیں ہیں جو نفس کے لیے باعث عزت ہوتی ہیں اور کتنے ہی ایسے نفس ہیں جو عزت حاصل کرنے میں ذلیل ہو جاتے ہیں۔

(۴) جب میں نے غیر سے غنا ر طلب کرنے کے لیے ہاتھ پھیلایا اور اس سے نہ مانگا جس نے کہا کہ مجھ سے مانگو تو میرا ہاتھ وہیں پر شل ہو گیا۔

(۵) میں اپنے نفس کو صبر ہی کراؤں گا کیونکہ صبر میں عزت ہے۔ اور میں اپنی دنیا پر راضی ہوں چاہے وہ قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

مجھے ابوحفص عمر الشمشاطیؒ نے رملہ میں خواصؒ کے یہ شعر سنائے ؎

لقد وضح الطریق الیک قصداً
فما احد ارادک یستدل

فان ورد الشتاء ففیک صیف
وان ورد المصیف فانت ظل

۱ تیری طرف کا راستہ صاف اور واضح ہے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے تیری جانب ارادہ کیا ہو اور اس نے تیرے راستے کا پتہ دریافت کیا ہو۔

۲ اگر موسم سرما وارد ہو تو تیرے اندر ہی موسم گرما ہے۔ اور اگر گرمیاں آئیں تو تو سایہ ہے۔

عمر شمشاطی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ ان اشعار میں بیان کردہ مضمون اس آیت کریمہ سے لیا گیا ہے:

قَالَ كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ۔[1] موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا یوں نہیں بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے اب راہ دیتا ہے۔

سمنون علیہ الرحمہ کے اشعار

سمنون جنھیں سمنون المحب بھی کہا جاتا ہے، نے وجد کی تعریف بیان کرتے ہوئے یہ اشعار کہے: ؎

هبنی وجدتك بالعلوم وجدها
من ذا يجدك بلا وجود يظهر
ايقظتنی بالعلم ثم تركتنی
حيران فيك ملدداً لا ابصر
ياغايبا والدهر يبرز عزه
مالاح منك صغيرة قد يبهر
قد كنت اطرب للوجود مروعا
طوراً يغيبنی وطوراً احضر

---

[1] الشعراء: ۶۲۔

افنی الوجود بشاھد مشھودہ

یغنی الوجود و کلّ معنی یحضر

وطرحتنی فی بحر قدسك سابحاً

ابغیك منك بلا وجود یظھر

(۱) فرض کرو میں نے تجھے علوم اوران کے وجد سے پایا مگر کون ہے جو تجھے ویسے ہی پائے گا جب کہ تیرا کوئی وجود نہیں مگر ظاہر ہے۔

(۲) تو نے مجھے علم کے ذریعے بیدار کر دیا اور پھر اپنے بارے میں اس طرح حیران و بدنام چھوڑ دیا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

(۳) اے غائب! کہ جس کی عزت کو پوری کائنات ظاہر کرتی ہے تجھ سے متعلق کائنات کی ادنیٰ نشانی بھی بہت بڑھ کر تیرے ہونے کی وضاحت کرتی ہے۔

(۴) میں تجھے پانے کے لیے حیران و پریشان جھومتا رہتا تھا۔ اور یہ شوق کبھی مجھے غائب کر دیتا تو کبھی حاضر کر دیتا۔

(۵) مشہود نے شاہد کے لیے وجود کو فنا کر دیا۔ وہ وجود کو فنا کر دیتا ہے مگر ہر معنی میں حاضر بھی رہتا ہے۔

(۶) تو نے مجھے اپنے بحر قدس میں تیرتا ہوا پھینک دیا۔ اور میں تجھے تلاش کرتا پھرتا ہوں کہ تو بلا وجود کے ظاہر ہے۔

سمنون کے کچھ اور اشعار سے

شغلت قلبی عن الدنیا ولذتھا

فانت فی القلب شیٔ غیر مفترق

وما تطابقت الاجفان عن سنۃ

الا وجدتك بین الجفن والحدق

(۱) میں نے دل کو دنیا اور اس کی لذتوں سے موڑ لیا۔ اب تک تو ہی میرے دل میں ایسی چیز ہے جو اس سے جدا ہونے والی نہیں۔

(۲) جب بھی میری آنکھیں اونگھ سے بند ہونے لگی ہیں تو میں نے ان میں تجھے ہی پایا۔

ابوالحسن سری سقطیؒ کے پسندیدہ اشعار

مجھے جعفر خلدیؒ نے ایک گفتگو کی مناسبت سے سری سقطیؒ کے وہ اشعار سنائے جو وہ اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

ولما ادعیت الحب قالت کذ بتنی

فما لی اریٰ الاعضآء منك کواسیا

فما الحب حتی یلصق الجلد بالحشا

وتذبل حتی لاتجیب المنادیا

وتنحل حتی لا یبقی لك الھوی

سوی مقلۃ تبکی بھا اوتناجیا

(۱) جب میں نے دعوائے محبت کیا تو محبوبہ نے کہا کہ تو نے جھوٹ بولا کیا وجہ ہے کہ میں تیرے اعضا پر لباس پہنا ہوا دیکھ رہی ہوں۔

(۲) محبت یہ ہے کہ تیری جلد انتڑیوں سے لگ جائے اور تو اس قدر مرجھا جائے کہ پکارنے والے کو جواب نہ دے سکے۔

(۳) اور تو اس قدر کمزور ہو جائے کہ محبت تیرے لیے سوائے آنکھ کے اور کچھ باقی نہ چھوڑے کہ تو اس کے ذریعے روئے اور باتیں کرے۔

جنیدؒ کہتے ہیں کہ میں جب سری سقطیؒ کی کوٹھڑی میں داخل ہوا تو وہ جھاڑو دے رہے تھے اور ساتھ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے ؎

وما رمت الدخول علیہ حتی

حللت محلۃ العبد الذلیل

واغضیت الجفون علی قذاھا

وصُنتُ النفس عن قال و قیل

(۱) میں نے اس وقت تک محبوب کے پاس جانے کا ارادہ نہیں کیا جب تک میں ایک ذلیل بندے کے مقام پر نہ پہنچا۔

(۲) میں نے ظلم کو سہہ لیا مگر شکوہ نہ کیا اور میں نے اپنے نفس کو قیل وقال سے محفوظ رکھا۔

سری سقطیؒ کے چند اور پسندیدہ شعر ؎

مافی النہار ولا فی اللیل لی فرج

فما ابالی اطال اللیل ام قصرا

ترجمہ: مجھے دن کو خوشحالی حاصل ہے اور نہ رات کو چین، پھر مجھے کیا پرواہ کہ رات طویل ہو جائے یا مختصر۔

بسترِ مرگ پر شبلیؒ کا پسندیدہ شعر

ابو عمرو زنجانیؒ نے مجھے تبریز میں یہ شعر سنایا اور کہا کہ شبلیؒ نے بسترِ مرگ پر یہی شعر پڑھا ؎

قال سلطان حبه انالا اقبل الرشا

فسلوه فدیته لم قتلی تحرشا

(۱) محبوب کی محبت کے غلبہ نے کہا کہ میں رشوت قبول نہیں کرتا۔

(۲) اس سے پوچھو کہ میرے قتل کے پیچھے کیوں پڑا ہے میں نے تو خود کو اس پر قربان کر دیا۔

شبلی کے چند اور اشعار ؎

اظلت علینا منك یوما غمامة

اضاءت لنا برقا و ابطأ رشاشها

فلا غیمھا یجلو فییأیس طامع

ولا غیثھا یاتی فیروی عطاشھا

(۱) تیری جانب سے ایک روز ہم پر گھٹا بھی چھائی اور بجلی بھی چمکی مگر برسی نہیں۔

(۲) نہ اس گھٹا کے بادل چھٹتے ہیں کہ بارش کی آس لگانے والا مایوس ہوجاتے،

اور نہ اس میں سے بارش برستی ہے کہ پیاسوں کی پیاس بجھے۔

پھر شبلیؒ نے نساجؒ سے کہا: اس میں تمھارا کیا مقام ہے؟ نساجؒ نے کہا: مقامِ ذلت۔ شبلیؒ نے کہا: آہ! تو ذلت کا ذکر میری موجودگی میں بجائے اس کے مکان پر غیرت کرتے ہوئے کرتا ہے۔ پھر شبلی یہ شعر پڑھنے لگے ؎

لقد فُضِّلَتْ لیلیٰ علی الناس کالتی

علی الف شھر فضلت لیلۃ القدر

فیا حبھا زدنی جویً کل لیلۃٍ

ویا سلوۃ الایام موعدک الحشر

(۱) لیلے کو تمام لوگوں پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح لیلۃ القدر کو ہزار راتوں پر فضیلت دی گئی۔

(۲) اے محبوبہ کی محبت! ہر رات میرے درد والم اور سوز عشق کو اور بڑھا اور اے زندگی کی آسودہ حالی! اب تم سے حشر کا وعدہ ہے۔

ابوبکر شبلی نے ایک روز اپنی مجلس میں یہ شعر سنائے ؎

وعینان قال اللہ کونا فکانتا

فعولان بالالباب ما فعل الخمر

ترجمہ: قسم ایسی دو آنکھوں کی! کہ جنھیں اللہ تعالے نے کہا کہ ہوجاؤ تو وہ ہوگئیں وہی کام کرنے والیاں جو شراب عقلوں کے ساتھ کرتی ہے۔

شبلی نے پھر اس شعر کی تشریح میں کہا کہ آنکھوں سے میری مراد بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں نہیں بلکہ دل کی آنکھیں ہیں جو اسرار سے معمور ہوتی ہیں لہٰذا وہ شخص قابلِ رشک ہے

جو دل کی آنکھیں سننے والے کان اور خوش کن گفتار رکھتا ہو۔

ابوالفرج عکبریؒ کہتے ہیں کہ میں نے شبلیؒ سے غیرت کے بارے میں پوچھا، تو فرمایا:
بشری غیرت اشخاص کے لیے ہوتی ہے اور غیرتِ الٰہیہ وقت پر ہوتی ہے تاکہ ان میں سے
ماسوا اللہ کو ضائع کر دے، اس کے بعد آپ نے یہ شعر کہے ؎

ذاب مما فی فؤادی بدنی !

و فؤادی ذاب مما فی البدن

فاقطعوا حبلی و ان شئتم صلوا

کل شیء منکم عندی حسن

صحّ عند الناس انی عاشق

غیر ان لم یعلموا عشقی لمن

(۱) میرے دل میں جو کچھ ہے اس سے میرا بدن پگھل گیا۔ اور جو کچھ بدن میں ہے
اس سے میرا دل پگھل گیا۔

(۲) مجھ سے چاہے تعلق جوڑ دو یا چاہے توڑ دو۔ میرے نزدیک تو تمھاری ہر چیز
خوب صورت ہے۔

(۳) لوگ بجا کہتے ہیں کہ میں عاشق ہوں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ میرا عشق کس
سے ہے۔

ایک علمی مذاکرہ کے دوران آپ نے یہ شعر کہے ؎

و شغلت عن فهم الحدیث سوی

ما کان منك وحبکم شغلی

و ادیم نحو محدّثی نظری

ان قد فهمت وعندکم عقلی

(۱) میں صرف وہی بات سمجھتا ہوں جو تیری جانب سے ہو اور تمھاری محبت ہی
میرا شغل ہے۔

(۲) اور میں مسلسل اپنی نظر اپنے مخاطب پر جمائے رکھتا ہوں یعنی میں نے تمھاری بات سمجھ لی ہے حالانکہ میری عقل تمھارے پاس ہے۔

شبلی اپنی مجلس میں یہ دو شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے ؎

رانی فاوسانی عجائب لطفہ
فھمت وقلبی بالفراق یذوب
فلا غائب عنی فاسلو بذکرہ
فلا ھو عنی معرض فأغیب

(۱) اس نے مجھے دیکھا پھر اپنے لطف کے عجائب دکھائے اور میں اس کے عشق میں دیوانہ ہوگیا اور اب میرا دل فراق سے پگھل رہا ہے۔

(۲) وہ مجھ سے غائب بھی نہیں کہ میں اس کی یاد سے تسلی حاصل کر لوں اور نہ وہ مجھ سے منہ موڑتا ہے کہ میں اس سے دور ہو جاؤں۔

شبلی کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جری السیل فاستبکانی السیل اذجری
وفاضت لہ' من مقلتی غروب
یکون اجاجاً دونکم فاذا انتھی
الیکم تلقی طیبکم فیطیب

(۱) سیلاب آیا تو اس نے مجھے رلا دیا اور اس کے ساتھ میری آنکھوں کی آنسو بہانے والی رگوں نے بھی اس کے لیے سیلابِ اشک بہا دیا۔

(۲) سیلاب کا پانی تمھارے لیے کڑوا ہوگا مگر جب وہ تم تک پہنچ جائے اور تمھارے شیریں پانی سے مل جائے تو وہ بھی میٹھا ہو جاتا ہے۔

سہل بن عبداللہؒ کے اشعار

سہل بن عبداللہؒ نے مصائب پر صبر کرنے کے بارے میں یہ اشعار کہے ؎

اتذکر ساعة العقت فیھا
وانت ولیدھا عسلاً وصبرا

لتعلم ان ھذا الدھر یمسی
ویصبح طعمہ حلواً ومُرّا

فلا یملأک محبوب سرورا
وان وافاک مکروہ فصبرا

وان قارفت فی دنیاک ذنباً
فقل فی اثرہ یارب غفرا

(۱) کیا تجھے وہ گھڑی یاد ہے جب تو مولود بچہ تھا اور تجھے شہد اور ایلوا (کڑوا گوند) چٹایا گیا۔
(۲) اس لیے تیرے ساتھ ایسا کیا گیا تاکہ تجھے معلوم ہو کہ یہ زمانہ ہے جس کا ذائقہ صبح کو میٹھا ہوتا ہے تو شام کو کڑوا۔
(۳) تجھے چاہیئے کہ تیری دلپسند چیز تجھے خوشی و سرور سے بھر نہ دے یعنی تو غرور میں نہ آجائے اور اگر تجھے ناپسندیدہ چیز ملے تو اس پر صبر کرنا چاہیئے۔
(۴) اگر تو دنیا میں گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس کے بعد اپنے رب سے استغفار کر۔

یحییٰ بن معاذ رازیؒ کے اشعار

اموت بداءٍ لا یصاب دوائیا
ولا فرج مما اری فی بلائیا

یقولون یحیی جن من بعد صحة
ولا یعلم العذال ما فی حشائیا

اذا کان داء المرء حب ملیکه

فمن غیرہ یرجو طبیبا مداویا

مع الله یقضی دھرہ متلذذا

تراہ مطیعًا کان اوکان عاصیا

ذرونی وشانی لا تزیدون کربتی

و خلوا عنانی نحو مولی الموالیا

الا فاھجرونی وارغبوا فی قطیعتی

ولا تلشفوا عمایجن فؤادیا

کلونی الی المولی وکفوا ملامتی

لآنس بالمولی علی کل مابیا

① میں ایک ایسی بیماری سے مر رہا ہوں کہ جس کو کوئی دوا درست نہیں کر سکتی اور نہ ہی مجھے اپنی تکلیف سے کسی طرح کی آسودگی ہے۔

② کہتے ہیں کہ یحییٰ صحت یاب ہونے کے بعد دیوانہ ہو گیا مگر مجھے ملامت کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ میری انتڑیوں یعنی میرے باطن میں کیا ہے۔

③ جب انسان کا مرض اس کے مالک کی محبت ہو تو وہ کیونکر کسی اور کو اپنا طبیب مان کر علاج کرائے گا۔

④ ایسا شخص اپنے اللہ ہی کے ساتھ زندگی کو مزے سے گذارتا ہے چاہے تجھے وہ مطیع نظر آئے یا عاصی۔

⑤ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تم میری سختی کو بڑھاؤ نہیں مجھے آقاؤں کے آقا کے پاس جانے دو۔

⑥ مجھے چھوڑ دو اور مجھ سے تعلق توڑنے میں رغبت دکھاؤ اور میرے دل کو جس چیز نے ڈھانپ رکھا ہے تم اسے ہٹاؤ نہیں۔

⑦ مجھے اپنے آقا کے سپرد کر دو اور میری ملامت سے احتراز کرو تاکہ میں اپنے

مولیٰ کے ساتھ اپنے سارے دکھ درد لیے ہوئے مانوس ہو جاؤں۔

ابوالعباس ابن عطاء کے شکر سے متعلق اشعار

وکم بدٍ لك عندی ماشکرت لها

حملتها انت عنی مع بوادیکا

ضعفت عن حملها عجزاً لتحملها

لکن ایادیك تحملها ایادیك

(۱) تیرے مجھ پر کتنے ہی ایسے احسانات ہیں جن کا میں نے شکر ادا نہیں کیا۔ اور تُو نے مجھ سے اپنی وادیوں سمیت ان کا بوجھ اٹھا لیا۔

(۲) میں کمزور تھا ان کے اٹھانے سے عاجز تھا لیکن تو خود ہی اپنے احسانات کے بوجھ کو مجھ سے اٹھا لے گا۔

ابوالعباس ابن عطاء کے دو اور شعر

کیف شکری لمن به یحسن الشکر

ومنه شکری لـه فی الوداد

انما یشکر المحبون وجداً

وصفاءً من خاصة الانفراد

(۱) میں محبت میں اس کا شکر اس کے لیے کیسے ادا کر سکتا ہوں جس سے خود شکر آراستگی پاتا ہے۔

(۲) بے شک انفراد سے متعلق خاص طبقے کے محب ہی وجد و صفا کی حالت میں اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔

ابوالعباس ابن عطاء کے کچھ اور اشعار

حقاً اقول لقد کلفتنی شططاً

حملی هواك وصبری ان ذالعجیب

جمعتَ شیئین فی قلبی لہ خطر

نوعین ضدّین تبرید و تلهیب

نار تقلقنی والشوق یضرمها

کیف یجتمعا روح وتعذیب

لاکنت ان کنت ادری کیف یسلمنی

صبری علیك وصبری صبر ایوبا

لما تحقق بالبلوی اقشعر لها

فظل من ثقلها عریان مکروبا

قد مسّنی الضرّ والشیطان ینصب ولی

وانت ذو قوۃ والعبد منکوب

فلا تکلنی الی نفسی فیظفر لی

من کان یقربنی اذکنت محبوبا

(۱) میں سچ کہتا ہوں کہ تو نے مجھے بڑی سختی میں ڈال دیا ہے یہ کہ میں تیری محبت کو برداشت کروں اور صبر بھی کروں یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔

(۲) تو نے میرے دل میں دو کیفیتوں یعنی ٹھنڈا کرنے اور شعلہ بھڑکانے کو اکٹھا کر دیا ہے جب کہ یہ دونوں مختلف اور ایک دوسرے کی ضد ہیں ایسے میں میرے دل کو خطرہ لاحق ہے۔

(۳) ایک آگ ہے جو مجھے اذیت پہنچاتی ہے اور ایک شوق ہے جو اس آگ کو اور بھڑکاتا ہے تو کس طرح آرام اور عذاب اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

(۴) اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ کس طرح میرا صبر مجھے تیرے حوالے کر دے گا تو میں کچھ نہ کہتا اور میرا صبر صبرِ ایوب کی طرح ہوتا۔

(۵) جب اس نے مصیبت و ابتلا کی تحقیق کر لی تو وہ لرز گیا اور اس کے بوجھ سے اپنے بھید کو چھپا نہ سکا اور کرب میں مبتلا ہو گیا۔

(۶) مجھے مصیبت نے آلیا ہے اور شیطان مجھ سے عداوت کر رہا ہے اور تو صاحب قوت اور بندہ مصیبت کا شکار ہے۔

(۷) مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر ورنہ وہ مجھ پر غالب آنے میں کامیاب ہو جائے گا جو (شیطان) میرے محجوب ہوتے ہوئے میرے قریب آتا تھا۔

درندہ موت سے بچانے کا باعث بنا

کہتے ہیں کہ ابوحمزہ صوفیؒ کنوئیں میں گر گئے لوگوں نے کنوئیں کے دھانے کو اوپر سے بند کر دیا۔ ایک درندہ آیا، کنوئیں کا دھانہ کھولا اور نیچے اتر کر ابوحمزہؒ کو اپنے پاؤں سے لٹکا کر کنوئیں سے باہر نکالا۔ ایسے میں ابوحمزہؒ نے ہاتف کی آواز سنی کہ اے ابوحمزہ! یہ خوب ہے کہ ہم نے تمھیں موت سے، موت کے ذریعے بچا لیا۔ ——— اسی موقع پر ابوحمزہؒ نے یہ اشعار کہے ؎

نہانی حیائی منك ان اکتم الھوی
واغنیتنی بالفھم عنك من الکشف

تلطفت فی امری فابدأت شاھدی
الی غائبی واللطف یدرك باللطف

تراٰئیت بی بالغیب حتی کانما
تبشرنی بالغیب انك فی الکف

اراك وبی من ھیبتی لك وحشة
فتؤنسنی باللطف منك وبالعطف

وتحیی محباً انت فی الحب حتفه
وذی عجب لون الحیاة مع الحتف

(۱) میری حیا نے مجھے روکے رکھا کہ میں تجھ سے اپنی محبت کا اظہار کروں تو نے خود ہی سمجھ کر مجھے راز عشق عیاں کرنے سے بے نیاز کر دیا۔

(۲) تو نے میرے معاملے میں مجھ پر لطف و کرم کیا اور میری موجودہ کیفیت کو غائبانہ کیفیت پر عیاں کر دیا۔ اور لطف و کرم کو لطیف انداز سے ہی سمجھا جاسکتا ہے

(۳) تو غیب میں بھی مجھے اس طرح دکھائی دیا کہ گویا غائب ہوتے ہوئے مجھے یہ بشارت دے رہے ہو کہ تو میری ہتھیلی میں ہے۔

(۴) اگرچہ تیری ہیبت سے مجھ پر وحشت طاری ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ تو اپنی نرمی و مہربانی سے مجھے مانوس کر دیتا ہے۔

(۵) وہ محب جس کے لیے محبت میں تم موت ہوا سے تم زندہ کر دیتے ہو اور یہ عجیب بات ہے کہ موت کے ساتھ زندگی ہے۔

ابو نصر بشر بن الحارث کے چند اشعار

لا تعجبن لوحدتی و تفردی

و من التفرد فی زمانك فازدد

ذهب الاخاء فلیس ثم اخوة

الا التملق باللسان و بالید

فاذا تکشف لی بما فی قلبه

عاینت ثم نقیع سم الاسود

(۱) میری تنہائی اور خلوت گزینی سے ہرگز حیران نہ ہو تم بھی اپنے زمانے میں تنہائی اختیار کرنے کی طرف بڑھو۔

(۲) بھائی چارہ دنیا سے رخصت ہو گیا اب اس کی جگہ بھائی یا دوست باقی نہ رہے بلکہ زبان اور ہاتھ کے ذریعے چاپلوسی باقی رہ گئی ہے۔

(۳) جب کسی کے دل کو اپنے سامنے عیاں دیکھتا ہوں تو وہاں مار سیاہ کے زہر کا کنواں پاتا ہوں۔

یوسف بن حسین رازی کے اشعار

احب من الاخوان کل موأتی !

غیبًا عمی الطرف عن عشراتی

یوافقنی فی کل امرٍا حبہ ا

و یحفظنی حیا و بعد وفاتی

فمن لی بھذا لیتنی قدوجد تہ

فقاسمتہ مالی و من حسناتی

(۱) ساتھیوں میں سے اس ساتھی سے محبت رکھتا ہوں جو میری لغزشوں سے اندھا اور لاعلم ہو کر میرا ساتھ دیتا ہو۔

(۲) ایسا ساتھی جو ہر معاملے میں میری موافقت کرتا ہو اور میری حفاظت کرے زندگی میں اور موت کے بعد۔

(۳) ایسا ساتھی کون ہے کاش! میں اسے پالیتا تو اپنا مال اور نیکیاں اس کے ساتھ تقسیم کرلیتا۔

ابو عبد اللہ القرشیؒ کے اشعار

وانت خلیط النفس فی کل شأنھا

و لکن نفس الذات منک مبائنہ

تخامرھا حتی کانک انھا

و تفنی قواھا فالقوی منک فانیہ

یعارضھا الواشون فیک بکل ما

یقلقھا فی سرھا و العلانیہ

وبلغتها ماكنتَ انتَ لهابِه

فتعذرهم فی کل ماکان کائنه

لقد قرحت آماقهافیك مرّة

وقد قرحت منها اسویدائۂ ثانیه

(۱) اور تونفس کا ساتھی ہے ہر حالت میں۔لیکن نفسِ ذات تجھ سے جدا ہے۔

(۲) تو اس کے (نفس کے) ساتھ اس طرح مل گیا ہے کہ گویا تو سراپا نفس ہے۔اور اس کے قوٰی معدوم ہو گئے یعنی اس کے قوٰی تیرے ساتھ فنا ہو گئے۔

(۳) تیرے بارے میں چغلخور اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور اسے پوشیدہ وظاہر طور پر تکلیف پہنچاتے ہیں۔

(۴) اور جو کچھ تو اس (نفس) کے لیے رکھتا تھا اسے پہنچا دیا لہٰذا وہ ان (چغل خوروں) کو معذور سمجھتی ہے ہر اس چیز میں جو واقع ہوئی۔

(۵) اس کی آنکھوں کے گوشے تیری محبت میں جب پہلی بار زخمی ہوئے تو دوسری بار اس گوشۂ چشم کے زخم سے دل میں پیدا ہونے والا سیاہ نقطہ زخمی ہو گیا۔

ابوعبداللہ ہیکلیؒ کے اشعار ابوعبداللہ قرشیؒ کے نام

ذات هويته تكون مذكره

معروفة تحت الخواطر منكره

لا تجتلی عین العقول ضیاءها

فلها بها الابصار عنها مبصره

واعزّ ممتنع مكان تناول

منها علی من لا یراها مخبره

سبل المعارف کلها الا بہا

مسدودة عنہا المذاهب مقفرہ

فاذا علقت بہا و غبت بعینہا

عنہا تجلت للعقول مخبرہ

(۱) وہ ذات جس کی حقیقت معروف و مذکور ہے مگر نفس کے مطابق اس کی حقیقت غیر معروف و اجنبی ہے۔

(۲) چشمِ عقل اس کے نظارے سے عاجز ہے کیونکہ عقل کی راہ میں ظاہری آنکھیں نگہبان بن کر راستے کو روک لیتی ہیں۔

(۳) اور اس کو پانے میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کے لیے ہے جو اسے خبردار کرنے والی نہ سمجھے۔

(۴) معارف کے سارے راستے صرف اسی سے ہیں اور باقی سارے راستے بے آب و گیاہ ویران اور اس کی طرف سے بند ہیں۔

(۵) جب تو اس حقیقتِ ذات سے متعلق ہو گیا اور اس کی آنکھ سے اس کے ذریعے غائب ہوا تو وہ عقل معرفت و آگاہی دینے کے لیے ظاہر ہوئی۔

ابوسعید خرازؒ کے چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

قلب یحبک لا یومی الی احد

تکاد ھمتہ تلقک بالخبر

فؤادہ بک مشغوف و مہجتہ

تذوب من قلق التقریب والنظر

قلب بک تجتنی الاذھان فطنة

اذا سمت للثریا عزی ومفتخری

مریخات من الشجو الدفین بہا

کوامن جمعت فی السمع والبصر

سبحان من لو یشاء ابدی عجائبہا

حتی تری سرّہا فی الوجہ کالقمر

(۱) وہ قلب جو تجھ سے محبت کرتا ہے کسی کی جانب اشارہ نہیں کرے گا۔ قریب ہے کہ اس کا پختہ ارادہ تجھ سے کوئی خبر لے کر ملے۔

(۲) اس کا دل تجھ پر فریفتہ ہے اور اس کی روح قرب و مشاہدے کے قلق سے پگھلی جاتی ہے۔

(۳) اے میرے عز و افتخار! وہ دل جو تجھ سے بلندی پائے اس سے لوگ ذہانت حاصل کرتے ہیں۔

(۴) کتنی ایسی کمزوریاں ہیں جو پوشیدہ غم و اندوہ سے ہوتی ہیں اور ان کے کئی راز ہیں جو کہ سمع و بصر میں جمع کیے گئے۔

(۵) پاک ہے وہ ذات اگر چاہے تو اپنے عجائبات کو ظاہر فرما دے یہاں تک کہ تو چہرے میں اس کے سر کو اس طرح دیکھے جیسے چاند۔

ابو عبد اللہ قرشیؒ نے ہیکلی کے اشعار کے جواب میں ذیل کے شعر لکھے بعض کا خیال ہے کہ یہ اشعار ابو سعید خراز کے ہیں ؎

اذا البس الحق المحق حقیقۃً

من الوجد بانت عن لغوت السرائر

و لیس لان السر یسمی بما یلی

علیہ بہ لکن اوصاف قادر

و لا تاب عن مکنونہا لفظ عارف

و لکن بتمثیل اللطیف المآثر

اذا طلعت شمس علیہا بنورہا

فانت خلیط للشعاع المباشر

۵ بعید من الذات العزیز مکانها

ولم تعر من نعت لنعتک قاهر

(۱) جب حق تعالےٰ طالبِ حق کو وجد کی کیفیت میں حقیقت سے ہمکنار کردے تو وہ حقیقت بھیدوں کی صفات سے جدا ہو جاتی ہے۔

(۲) اور یہ نہیں کہ سر کو اس چیز سے موسوم کر دیا گیا جو اس پر غالب آگئی بلکہ یہ تو اوصافِ قادر میں سے ہے۔

(۳) اور تو اس حقیقت کے پوشیدہ راز کی بنا پر لفظ عارف سے نفرت نہ کر بلکہ لطیف و شریفانہ تمثیل سے کام لے۔

(۴) جب اس حقیقت پر آفتاب اپنی روشنی کے ساتھ طلوع ہو جائے تو تم امنڈ کر آنے والی شعاعوں کے ساتھی بن جاؤ گے۔

(۵) اس حقیقت کا مقام ذاتِ غالب سے دور ہے اور صفت بیان کرنے سے اپنی غالب آنے والی صفت سے دُور نہیں ہوا۔

ابوالحدیدؒ نے ابوعبداللہ القرشیؒ کو یہ شعر لکھے ؎

اھابک ان اقول ھلکت وجداً

علیک وقد ھلکت علیک وجداً

ولو ان الرقاد دنا لطرفی

جلدت جفونها بالدمع جلدا

(۱) میں تجھ سے یہ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ تیرے عشق نے مجھے ہلاک کیا حالانکہ میں تیری محبت ہی میں ہلاک ہوا ہوں۔

(۲) اگر نیند میری آنکھوں کے قریب پھٹکی تو میں اپنی پلکوں کو آنسوؤں کے کوڑوں سے ماروں گا۔

ابوعبداللہؒ نے جواباً یہ شعر لکھ بھیجے:

ولكني اقول حيث حقًا !
اذا الوجد المبرح منك يهدا

وان حل الرقاد بجفن عيني
فقدت اجابة لك لا لاهدا

(۱) لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر تیرا تکلیف دہ شدید عشق مجھے آرام پہنچائے تو میں حقیقت سے شرمندہ ہوں گا۔

(۲) اور اگر نیند میری پلکوں پر ڈیرے بسائے تو میں تمہیں جواب دینے کی خاطر سو لیتا ہوں نہ کہ آرام کی خاطر۔

اشعارِ صوفیہ سے متعلق ایک احتیاط

مذکورہ تمام اشعار میں بعض مشکل اور کچھ واضح ہیں۔ ان میں صوفیہ کے لطیف اشارات اور دقیق مضامین بیان کیے گئے ہیں لہٰذا جو بھی ان کو پڑھے تو پوری طرح غور سے پڑھے تاکہ وہ اصل معرفت کے رموز و نکات کو پا سکے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان اشعار کے کہنے والوں سے کوئی ایسی بات منسوب کر دے جو ان کے شایانِ شان نہ ہو۔ اگر قاری کو کسی شعر میں اشکال لاحق ہو اور اسے سمجھ نہ سکے تو چاہیئے کہ کسی ایسے شخص سے اس کے بارے میں تبادلہ خیال کرے جو ان کے مفاہیم سے واقف ہو۔ کیونکہ ہر مقام کے لیے ایک مخصوص گفتگو اور ہر علم کے لیے اس کے ماہرین ہوتے ہیں۔ اگر ہم خود ہی یہاں ان اشعار کی تشریحات بیان کرنے لگیں تو اندیشہ ہے کہ کتاب طویل ہو جائے۔

۶۵

متقدمین مشائخ کی دعائیں

ذوالنونؒ کی دعائیں

"اے خدا! قدرت و قوت ہے تو تیرے لیے ہے اور بخشش و فضل ہے تو تیری اور تو ہی تمام مخلوقات کو اپنی قوت و قدرت کی اعانت پہنچاتا ہے۔ تو جو چاہتا ہے اسے پوری طرح سرانجام دیتا ہے۔ عجز و جہل تیرے کام میں حائل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کمی و بیشی تیرا راستہ روک سکتی ہے اور کیسے وہ تجھ سے تعرّض کریں یا تیری تدبیر کے رستے میں آئیں، جب کہ انھیں تو نے ہی تخلیق کیا اور نئے سرے سے پیدا کیا۔ اور جس طرح تو نے انھیں پیدا کیا وہ کیوں نہ پیدا ہوتے۔

تو دلائل کے ساتھ موجود ہے تیری خلق کو تیرے سوا کوئی اور ہرگز پیدا نہیں کر سکتا۔ برکت والی ہے تیری ذات کہ ہر معلوم چیز تیری ہی مخلوق ہے اور ہر نامعلوم مخلوق بھی تیری ہی صنعت کا نمونہ۔ کوئی شخص اس دنیا میں تیرا ادراک نہیں کر سکتا۔ کوئی مکان تجھ سے مستغنی نہیں، تیرے سوا کوئی تجھے صرف اس طور پر جان سکتا ہے کہ تیری وحدانیت کا اقرار کرے۔ تیری مخلوق میں سے فقط ناقص معلومات رکھنے والا ہی تیری معرفت سے محروم رہتا ہے۔ کوئی شے تجھے کسی دوسری شے سے غافل نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی کوئی تیری قدرت کی انتہا کو معلوم کر سکتا ہے۔ کوئی جگہ تجھ سے خالی نہیں اور کوئی حالت، کسی اور حالت سے تیری توجہ کو ہٹا نہیں سکتی۔"

ذوالنونؒ کی ایک اور دُعا ——————

" اے اللہ! ہماری آنکھوں کو آنسوؤں کے فوارے بنا دے، ہمارے سینوں کو سوز و عبرت سے معمور کر دے، ہمارے قلوب کو ابواب السمٰوات کی کھڑکھڑاہٹ کی موج کا غوّاص بنا دے اس طرح کہ وہ تیرے خوف سے ویرانوں اور بیابانوں میں تھکے ہارے سرگرداں پھرتے رہیں۔

اے قلوبِ فریفتگان کے حبیب اور راغبین کی رغبتوں کے مقصود! ہماری آنکھوں پر اپنی معرفت کے دروازے کھول دے اور ہماری معرفت کے لیے اپنے نورِ حکمت کے مفہوم عیاں فرما دے۔"

ذوالنونؒ کی ایک اور دُعا ——————

" اے میرے رب! تو سب انس کرنے والوں سے بڑھ کر اپنے اولیائے سے انس کرنے والا، اور اپنے مشاہدات میں تجھ پر بھروسہ کرنے والوں کے لیے قریب ترین کفایت کرنے والا ہے حتیٰ کہ ان کے باطن اپنے اسرار کو پا لیتے ہیں۔

الٰہی! میرا راز تجھ پر عیاں ہے۔ اور میں تیرا شیدا ہوں۔ جب بھی مجھے گناہ وحشت زدہ کر دیں تو یہ جان کر کہ تیرا ذکر میرے دل کو سکون پہنچاتا ہے کہ امور و معاملات کی زمام تیرے ہاتھ میں ہے اور ان کا وقوع تیری قضا سے ہے۔

اے میرے رب! مجھ سے بڑھ کر ذلت و تقصیر کا مستحق کون ہو سکتا ہے۔ بیشک تو نے مجھے ضعیف و عاجز پیدا کیا۔ تجھ سے زیادہ عفو و درگذر کرنے والا کون ہے۔ تو مجھے ازل سے جانتا ہے اور تیرا حکم میرا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میں نے تیرے اذن سے ہی تیری اطاعت کی تیرا مجھ پر احسان ہے۔ تیرے جانتے ہوئے میں نے نافرمانی کی لہٰذا تجھے مجھ پر حجت حاصل ہے۔

میں تیرے حضور تیری رحمت کے وجوب کے باعث، اپنی حجت کے منقطع ہونے کے باوجود، تیرے در کا محتاج ہونے کے سبب، اور مجھ سے تیرے درگذر کرنے کی بنا پر یہ درخواست گذارتا ہوں کہ تو میرے ظاہری و باطنی گناہوں کو معاف فرما دے۔

دعائے یوسف بن الحسینؒ

"اے میرے رب! میں تیری نعمتوں کا پودا ہوں، تو مجھے اپنے عذاب سے کٹی ہوئی فصل کا باقی ماندہ حصہ نہ بنا۔ اے اللہ!

اے اللہ! ہمیں وہ کچھ عطا کر جو تو ہم سے چاہتا ہے۔

اے رب! تونے ہمیں مانگے بغیر دولتِ ایمان سے نوازا ہمیں اپنی عفو طلب کرنے سے محروم نہ فرما کیونکہ ہم تیری طرف ہی رجوع کرنے والے اور تیری نافرمانی پہ اصرار کرنے سے تائب ہیں۔ ہم تجھ سے ڈرنے والے اور تیرے حضور توبہ کرنے والے ہیں۔

اے اللہ! جو کچھ تونے از قسم ایمان و اسلام ہمیں عطا کیا اور جس کے ذریعے تونے ہماری ہدایت کی اسے ہماری جانب سے قبول فرما اور ہمیں معاف کر دے۔

الٰہی! تیری نعمتوں نے ہمارا احاطہ کیا ہوا ہے اور ان کے شکر کا تو ہی سزاوار ہے۔ تیری عظمت و جلال کی قسم! کسی نے تیرا شکر ادا نہیں کیا مگر تیرے ہی ذریعے۔"

یوسف بن الحسینؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دانا کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا:

"سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے جو انعامات عطا کیے ان پر شکر ادا کیا اور مذمت کی اس عمل کی کہ اگر وہ چاہتا تو اس سے بچا لیتا۔

اس نے شکر ادا کیا خود خلق کی جانب سے کیونکہ وہ اللہ ہے کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔

یوسف بن حسینؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک شیخ کو مناجات میں یہ شعر کہتے سنا ؎

أَيَا جُوْدَ رَبِّيْ نَاجِ رَبِّيْ بِحَاجَتِيْ

فَمَالِيْ إِلَىٰ رَبِّيْ سِوَاكَ شَفِيْعُ

ترجمہ: اے میرے رب کے جود و کرم میرے رب سے میری حاجت کے بارے میں سرگوشی کر کیونکہ میرا اپنے رب کے حضور تیرے سوا کوئی سفارشی نہیں۔

دعائے جنید بغدادیؒ

جنید بغدادیؒ کی کتاب "کتاب المناجات" سے ایک دُعا:

"اے میرے اللہ! اے سب سے بہتر سننے والے میں تیرے حضور دستِ سوال دراز کرتا ہوں۔ اے سب سے بڑھ کر شرافت وکرم والے میں سوال کرتا ہوں تیری فیاضی و بزرگی کے ساتھ، اے سب سخیوں سے بڑھ کر سخاوت کرنے والے سوال کرتا ہوں تیرے فضل وکرم کے ساتھ، اے بہترین عطا کرنے والے سوال کرتا ہوں تیرے لطف واحسان کے ساتھ۔ میں تیرے حضور ایک عاجز، کمزور اور گریہ وزاری کرنے والے کی حیثیت سے درخواست پیش کرتا ہوں جس کا شوق تیرے لیے شدت اختیار کر چکا ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق اس نے تیری بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کی ہے اور تیرے خزانوں میں جو کچھ ہے اس کے لیے اس کی رغبت بڑھ چکی ہے اور اس نے یہ جان لیا ہے کہ کوئی چیز تیری مشیت کے بغیر نہیں ہوتی۔ اور ہر شافع تیری اجازت کے بعد ہی شفاعت کر سکتا ہے۔ کتنے ہی ایسے قبیح امور ہیں جنھیں تو نے ڈھانپ لیا کتنے ہی ایسے مصائب ہیں جنھیں تو نے پھیر دیا اور کتنی ہی ایسی لغزشیں ہیں کہ جن سے تو نے گرنے کے بعد اٹھا دیا، اور کتنی ایسی لغزشیں ہیں جن میں تو نے تلطف سے کام لیا۔ کتنی ہی ایسی مکروہ چیزیں ہیں جنھیں تو نے رفع کر دیا۔ اور کتنی تعریفیں ہیں جنھیں تو نے پھیلا دیا۔

اے فریادیوں کے فریادرس، اے خاموش رہنے والوں کے دلوں کے بھید جاننے والے، اے خلوتوں میں حرکات کرنے والوں کی خبر رکھنے والے اور اے کوشش و محنت کرنے والوں کی ہر چھوٹی بڑی بات کے جاننے والے! میں تیرے حضور یہ سوال کرتا ہوں کہ میرے بُرے اعمال کی وجہ سے میری آواز کو اپنی بارگاہ میں شنوائی سے محروم نہ کرنا۔ میرے

باطن کی وہ پوشیدہ باتیں جنھیں تو جانتا ہے ان پر مجھے رسوا نہ کرنا، میری خلوتوں کی برائیوں پر مجھے سزا دینے میں جلدی نہ فرما، جملہ احوال میں مجھ پر نرمی فرما اور ہر حال میں مجھ پر مہربان رہ۔

اے میرے رب، میرے سردار، میرے سہارے! میں باطنی بیماریوں کے پر خطر راستوں کی کثرت سے تیرے حضور پناہ کا طالب اور فریاد رس ہوں اور ضمیر و قلب کے ایسی علتوں میں گرفتار ہونے سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کیونکہ قریب ہے کہ یہ علتیں میرے سینے میں بھر جائیں اور میری زبان و عقل تیرے ذکر کے بارے میں تفریح و انبساط کا شکار ہو جائے، اور میرا جسم میری غلامی کرنے سے رک جائے۔ میں ایک ایسے جلس میں ہوں جو مجھے مذکورہ خامیوں کی وجہ سے لاحق ہے اور کمی کا باعث بن رہا ہے۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ان تمام خامیوں کو میرے ذکر و قلب سے دور فرما دے اور میرے شب و روز کو اپنے ذکر، غلامی اور عبادت سے معمور کر دے تاکہ واردات قلب اور احوال میں یکسانیت رہے۔ ان میں فتور، اکتاہٹ و بے قراری، کمی اور کوئی برائی نہ ہو تاکہ قرب کی گھڑیوں میں اس کے ذریعے میں تیزی سے تیری قربت پا سکوں اور سبقت کے میدانوں میں تیری جانب جا سکوں، اے اکرم الاکرمین! اپنے قرب کی خوش مزہ لذتیں مجھے عطا فرما۔"

ابو سعید دینوریؒ کی دعا

"اے اللہ! میں تجھ سے تیرے وسیلے ہی کے ذریعے سوال کرتا ہوں کیونکہ کوئی وسیلہ تیرے وسیلے سے بہتر نہیں، اور میں سوال کرتا ہوں تجھ سے تیرے اس وسیلے کے ذریعے جو اہل حق کو حاصل ہے اور اس وسیلے کے ذریعے جو اہل حق کا ہے۔ اور اہل حق کے وسیلے سے کیونکہ قدیم سے تجھے ہر شے کا علم ہے اور تیری سلطنت و قدرت ہر شے پر حاوی ہے۔ اے اللہ! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیج اور ان کی آل پر اور تو

مجھ سے فلاں فلاں معاملہ فرما ——————"

ابوبکر شبلیؒ کی دعا

"اے میرے رب! اے آسمانوں اور زمینوں کی ضیاء، اے آسمانوں اور زمین کے جوہر، اے آسمانوں اور زمین کے قائم رکھنے والے، اور اے آسمانوں اور زمیں کے نور! تیرے اسماء کے وسیلے سے اور تیرے اپنے وسیلے سے میں سوال کرتا ہوں کیونکہ کوئی وسیلہ تیرے وسیلے سے بڑھ کر نہیں اور تیرے نازل کردہ کلام مجید کے وسیلے سے اور اس کے وسیلے سے جسے تو نے اس کلام کا فہم عطا فرمایا۔

اے اللہ! اے وہ معبود کہ تیرے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، اور اے کہ تو اللہ ہے حضرت محمدؐ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیج اور ان کی ساری آل پر درود بھیج۔ تو ان کو منتشر ہونے سے بچا، ان کے ظاہر پر رحم فرما، ان کے باطنوں کو آباد کر، ان کی کفایت و حفاظت فرما، ان کے لیے ہر عوض کا عوض بن جا، ان پر رحم فرما، ان کو آنکھ کے جھپکنے کی دیر تک بھی اپنے سے غافل نہ ہونے دے اور نہ ہی اس سے کم مدت کے لیے، اور میں ہر وسیلے کے وسیلے کے ذریعے تجھ سے سوال کرتا ہوں کیونکہ ایسا وسیلہ تیری ہی ذات ہے۔ اور تو ان کو اسی وسیلے کے ذریعے متقی بنا دے انھیں اپنے لدنی معانی کے سمجھنے میں مقام بلند عطا فرما اور ان کو توفیق دے کہ جب کہیں تحقیق سے کہیں اور خاموش رہیں تو ان کے پیش نظر تیرے سوا اور کوئی نہ ہو۔"

یحییٰ بن معاذ رازیؒ کی دعائیں

"الٰہی! میرے سہارے! میری آرزو! اور میرے اعمال کی تکمیل کرنے والے"

آپ یہ دعا بھی کیا کرتے تھے

"الٰہی! جب میرے عمل کی زبان گونگی ہو جاتی ہے تو میں تیرے حضور اپنی آرزو کی زبان سے دعا مانگتا ہوں"

الٰہی! کتنے خوشگوار ہیں الہام کے واقع ہونے کے وہ مواقع جو تیری جانب سے واردات قلب پر نازل ہوتے ہیں اور کتنی لذیذ ہیں وہ سرگوشیاں جو باطن مقامات غیب میں تجھ سے کرتا ہے۔ الٰہی جب تو قیامت کو مجھ سے فرمائے گا کہ میرے بندے! تونے میرے خلاف کیسے جرات کی تو میں جواب دوں گا کہ میرے مالک! مجھ پر تیرے احسان نے، اگر تونے سب مجھے اپنے دشمنوں کے درمیان جہنم میں داخل کر دیا تو میں انھیں بتادوں گا کہ میں تجھ سے دنیا میں محبت کرتا تھا اور تو ہی میرا آقا و مولا اور ہر شے سے مجھے بے نیاز کر دینے والا ہے"

آپ یہ دعا بھی کیا کرتے تھے :

"یا اللہ! اگر تونے مجھے نجات دی تو اپنی عفو کے ذریعے سے اور اگر عذاب دیا تو اپنے عدل کے مطابق، میں ہر اس چیز پر راضی ہوں جو مجھ پر واقع ہو کیونکہ تو میرا رب اور میں تیرا بندہ ہوں، الٰہی! تو جانتا ہے کہ نہ میں آگ کی تاب رکھتا ہوں اور نہ جنت کا سزاوار ایسے میں سوائے تیرے عفو کے اور کوئی چارہ نہیں"

"الٰہی! سیدی! سروری! تیرے کرم کی صفت نے مجھے اپنے بُرے عمل سے روک لیا اگرچہ اس عمل میں میرے لیے سرور و حظ تھا اور تیری نعمتوں نے مجھے اپنے اچھے اعمال سے بھی بے نیاز کر دیا حالانکہ ان میں میری نجات تھی۔ اور تجھ سے مجھے جو سرور و لطف حاصل ہوتا ہے اس نے مجھے اپنے نفس کا سرور و لطف بھلا دیا"

"اے میرے رب! میں تجھ سے تیرے ہی ذریعے قرب حاصل کرتا ہوں، میں تجھ پر دلائل پیش کرتا ہوں تو میری حجت تیرے انعامات ہوتے ہیں نہ کہ میرے عمل۔

میں یہ نہیں سمجھتا کہ آج جس کو تونے اپنی فضل کی چادر سے ڈھانپ لیا کل تو اس کا محاسبہ فرمائے گا، تیرا عفو، گناہوں کو ڈبو دیتا ہے اور تیری رضا، آرزوؤں کو نیست کر دیتا ہے۔

"میرے رب! میرے سردار! میرے مولا! اور مجھے ہر شے سے بے نیاز کرنے والے میں نے اپنے آپ کو گناہ کر کے ضائع کر دیا میرے نفس کو توبہ کی توفیق عطا فرما، تو جانتا ہے کہ تیرے بندوں میں سے کریم الاخلاق ہر اس شخص کو معاف کر دیتا ہے جس نے اس سے زیادتی کی ہو۔ اور میں نے اپنے نفس پر زیادتی کی تو ذاتِ اکرم الاکرمین ہے

لہٰذا مجھ سے درگذر فرما۔ الٰہی! تو جانتا ہے کہ ابلیس تیرا اور میرا دشمن ہے اور کوئی شے میری بخشش سے بڑھ کر اس کے مکر و فریب پر غالب آنے والی نہیں۔ پس اے ارحم الراحمین میرے لیے بخشش فرما۔"

عمر الملطی کو میں نے انطاکیہ میں یہ کہتے سنا کہ میں نے ایک شیخ کو دعا کے لیے کہا، تو فرمایا: اے نوجوان میں تیرے لیے دعا کرتا ہوں مگر دعا کے دوران تیرا موجود رہنا ضروری ہے اگر میں دعا کروں اور تو موجود نہ ہو تو میری دعا تجھے کوئی فائدہ نہیں دے گی۔

ابراہیم بن ادھمؒ اور ڈوبتا سفینہ

کہتے ہیں کہ ابراہیم بن ادہمؒ ایک سفینے میں سوار تھے کہ دریا میں طغیانی آگئی لوگوں کو کہا گیا کہ وہ اپنے سامان دریا میں پھینک دیں۔ کسی نے ان سے کہا کہ اے ابو اسحاق! ہمارے لیے اللہ سے دعا کرو۔ انھوں نے کہا: یہ وقتِ دعا نہیں وقتِ تسلیم ہے۔"

کسی صاحبِ معرفت کا قول ہے: اللہ کے حضور میں تیری دعا کی یقینی قبولیت کا دار و مدار دعا میں تیری صدق دلی پر ہے۔

سری سقطی کی دُعا

مجھ سے جعفرؒ نے بحوالہ جنید بغدادیؒ بیان کیا کہ سری سقطی علیہ الرحمۃ یوں دعا فرماتے تھے:

"اے اللہ! جب کبھی تو مجھے عذاب دے تو مجھے ذلت حجاب کی سزا سے محفوظ رکھنا۔"

ابو حمزہ کہتے ہیں کہ میں نے سری سقطیؒ سے کہا: میرے لیے دعا فرمائیں۔ آپ نے یہ دعا کی:

"اللہ تعالٰی تمھیں اور مجھے شجر طوبیٰ کے سایہ تلے اکٹھا فرمائے، کیونکہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ جب اولیاء اللہ جنت میں داخل ہوں گے تو پہلے درخت طوبیٰ کے

نیچے استراحت کریں گے "

دعائے خضر علیہ السلام

ابو محمد جریریؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کہا : ابراہیمؒ مارستانی کو یہ کہتے سنا کہ مجھے خواب میں حضرت خضر علیہ السلام نے ہاتھ کی انگلیوں پر گن کر دس کلمات سکھائے جو یہ ہیں :

" اے میرے اللہ ! میں تیرے حضور بہتر حاضری ، تیری جانب کامل توجہ ، تیرے کلام کو سمجھنے ، تیرے معاملات میں بصیرت ، تیری طاعت پر قائم رہنے ، تیرے ارادے پر مداومت کرنے ، تیرے حضور میں حاضر ہونے کے لیے عجلت ، تیرے تعلق میں حسنِ ادب ، سلامتی کو تیری ہی جانب پھیرنے اور تیری جانب دیکھنے کی توفیق کا سوال کرتا ہوں "

ابو عبید بسری کہتے ہیں کہ میں نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالے عنہا کو خواب میں دیکھا، میں نے عرض کیا : یا امی ! مجھے کوئی دعا سکھائیں ۔ آپ نے فرمایا ؛ اے ابو عبید ! کہو : "اے اللہ ! میرے زادِ راہ کو کم کر اور میری اعانت کو بہتر فرما ۔ اور دنیا و آخرت کے معاملات میں میری مدد فرما " میں نے عرض کیا : یا امی ! اس دعا کو کچھ اور بڑھا دیں ۔ آپ نے فرمایا : اے ابو عبید ! تیرے لیے اتنی ہی کافی ہے ۔

ایک عارف یہ دعا کیا کرتے تھے :

" میں ہجوم میں تجھے اسی طرح پکارتا ہوں جس طرح ارباب کو پکارا جاتا ہے اور خلوت میں اس طرح جیسے احباب کو پکارا جاتا ہے "

وجوہاتِ دعا

میں نے کسی عارف سے پوچھا کہ اہل تفویض و تسلیم کے ہاں دعا کرنے کی وجوہات کیا ہیں، تو انھوں نے فرمایا : اہل تفویض و تسلیم دو وجوہ کی بنا پر اللہ کے حضور دعا کرتے ہیں ۔ ایک یہ کہ اس سے ظاہری جوارح کی تزئین ہوتی ہے کیونکہ دعا ایک طرح کی خدمت و نوکری ہے کہ جس

سے اعضا رستور تے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے وہ حکم خداوندی کی بجا آوری کرتا ہے۔

جنیدؒ کی ایک دعا یہ ہے :

" الٰہی میرے سردار ، میرے مولیٰ ! جو تجھ پر ایمان لایا اس کے لیے تیری ذات سے بڑھ کر بہتر حکم دینے والا کون ہے ، جس نے تیرا ارادہ کیا اور تجھ سے ڈرتا رہا اس کے لیے تجھ سے بڑھ کر وسیع رحمت والا کون ہے ، اور جس نے تیری جانب ارادہ کیا اور تیری اطاعت اختیار کی اس کے لیے تجھ سے بڑھ کر جلد لطف و کرم کرنے والا کون ہے ۔ الغرض یہ تمام بندے تیری نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے اور تیرے فضل کے سبب تیری عبادت کرتے ہیں ۔ ان کے غم تیرے ذریعے تیرے لیے جاتے رہتے ہیں ۔ ان کا مقصود فقط تیری ذات ہے ان کے قلب تیرے ساتھ تیری جانب آتے ہیں ، تیرے لیے ان کے نصیب فنا ہوتے ہیں اور صرف تیرے لیے ہی ان کے نصیب ہوتے ہیں شب و روز وہ تیری طرف ہی متوجہ رہتے ہیں ہر حال میں تیرا رُخ کرتے ہیں اور احوال پر تجھے ہی ترجیح دیتے ہیں ۔ لہٰذا میں سوال کرتا ہوں : اے میرے رب ! اے میرے مولیٰ ! کہ تو اپنے فضل سے میرے لیے محافظ ، کافی ، بچانے والا اور رحم فرمانے والا ہو جائے کیونکہ میرا ٹھکانہ تُو ہے میں تجھ سے مدد طلب کرتا ہوں ، تیری طرف راغب ، تیری جانب آنے والا ، اور امورِ دنیا و آخرت میں تجھ پر ہی توکل کرنے والا ہوں ۔ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین ۔"

یہ تھیں وہ دعائیں جو صوفیہ کرام کے اپنے مخصوص احوال و معانی سے متعلق ہیں ۔ اور جو چاہے ان پر غور کر کے ان سے برکت حاصل کر لے ۔ اللہ ہی توفیق بخشنے والا ہے ۔

۶۶

صوفیہ کی باہمی وصیتیں

حضرت رویم علیہ الرحمۃ نے ایک صوفی کو ان الفاظ میں وصیت فرمائی: اے بیٹے! اگر کر سکو تو اللہ کے لیے اپنی روح قربان کر دینا اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو مہملات و خرافات میں نہ پڑنا۔

یوسف بن الحسینؒ کے مریدین ان کے پاس جمع ہوئے اور کہا کہ ہمیں وصیت فرمائیں۔ تو آپ نے کہا: میری ہر بات کی پیروی کرنا مگر دو چیزوں پر عمل نہ کرنا ایک یہ کہ اللہ کے نام پر قرض نہ لینا اور دوسرے یہ کہ بے ریش لڑکوں کی صحبت اختیار نہ کرنا۔

سری سقطیؒ سے کہا گیا کہ ہمیں وصیت کیجئے تو فرمایا: اللہ کے نام پر قرض نہ لینا اور امرد کے چہرے پر نظر نہ ڈالنا۔

کسی شخص نے ابوبکر البارزیؒ سے کہا کہ مجھے وصیت کیجیے، تو فرمانے لگے: خود پرستی، کسی چیز کی عادت ڈالنے اور اپنی آسائش کی طرف متوجہ رہنے سے بچو۔

ابوالعباس بن عطاؒ نے اپنے دوستوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا: جو کچھ تم پر واقع ہو اس پر غم کرنے سے احتراز کرو اور تم پر یہ واجب ہے کہ وہی کرو جو اللہ تم سے چاہتا ہے نہ کہ وہ کچھ جو تم چاہتے ہو۔

جعفر خلدیؒ کہتے ہیں کہ جنیدؒ ایک شخص کو یہ وصیت کر رہے تھے: اپنے نفس کو پہلے پیش کرو اور اپنے عزم کو مؤخر کرو۔ اپنے نفس کو مؤخر اور عزم کو مقدم نہ کرنا کیونکہ اس طرح بہت سستی واقع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

میں نے ابوسعید خراز کے ایک خط میں ان کے مرید کے نام یہ وصیت پڑھی: اے میرے بھائی! اپنے ساتھیوں سے خلوص برتو، اور اہل دنیا سے اس طرح مل جل کر رہو کہ انھیں اپنے ظاہر پر گواہ بناؤ، اپنے عمل اور دین کے ذریعے ان کی مخالفت کرو، مگر انھیں ملامت نہ کرو۔ اگر وہ ہنسیں تو تم رو دو۔ اگر وہ خوش ہوں تو تم مغموم رہو اگر وہ آرام کریں تو تم محنت کرو، اگر وہ سیر ہوں تو تم فاقہ کرو، اگر وہ دنیا کا ذکر کریں تو تم آخرت کو یاد کرو، گفتگو، نظر، حرکت، کھانے، پینے اور لباس کے کم ہونے پر صبر کرو حتیٰ کہ جب اللہ چاہے تو وہ اپنی رحمت سے تمھیں فردوس میں سکون و آرام عطا فرمائے۔

ابوسعید خراز نے اپنے کسی مرید کو یہ وصیت فرمائی: اے مرید! میری وصیت کو یاد کر لو۔ اللہ تعالے کی طرف سے ثواب کی رغبت رکھو اور اپنے نفس امارہ کی طرف متوجہ ہو کر اسے طاعت سے پگھلا دو، اس کی مخالفت کر کے تم اسے تنہا چھوڑ کر مار ڈالو، اُسے تم اللہ کے سوا ہر شے سے مایوسی کے ساتھ ذبح کر ڈالو، اسے تم اللہ سے حیا کرنے کے ذریعے قتل کر دو۔ صرف اللہ ہی تجھے کافی ہے، تو ہر نیکی میں سبقت کرے، ہر مقام پر عمل نیک کرے۔ اور تیرا دل اللہ سے اس قدر ڈرنے والا ہو کہ تیری طرف سے کوئی بات قبول ہی نہ کرے۔ یہ ہیں قبولیت و اخلاص اور صدق کے وہ حقائق جن کے ذریعے تو بالآخر نجات پا کر اپنے رب کے حضور میں رسائی حاصل کرلے گا۔ واللہ یفعل ما یشاء ویحکم ما یرید۔

ذوالنون نے اپنے ایک مرید کو یہ وصیت کی: اے میرے بھائی! اسلام سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں، تقویٰ سے بڑی کوئی بزرگی نہیں، کوئی عقل ورع سے زیادہ پرہیزگار نہیں، توبہ سے بڑھ کر کوئی کامیاب سفارش کرنے والا نہیں، عافیت سے بڑھ کر کوئی باعزت لباس نہیں، سلامتی سے بڑھ کر کوئی حفاظت کرنے والا نہیں، قناعت سے بڑھ کر کوئی غنی کر دینے والا خزانہ نہیں اور رضا سے بڑھ کر کوئی دولت ضرورت کو پورا کرنے والی نہیں۔ جس نے گذارے کی مقدار پر گذارہ کر لیا اس نے اپنے لیے آرام کو استوار کر لیا، رغبت کوشش کی کنجی اور تھکاوٹ کی سواری ہے، حرص گناہوں کی کثرت کی طرف لے جانے والی ہے اور حرص جملہ برائیوں کی جڑ ہے۔ اکثر جھوٹی طمع، بُری آرزو اور امید محرومی اور خسارے کی

تجارت ثابت ہوتی ہے۔

جنیدؒ نے اپنے کسی مرید کو وصیت کرتے ہوئے کہا: میں تمہیں ماضی پر کم اور حال پر زیادہ متوجہ ہونے کی وصیت کرتا ہوں۔

میں نے ابو عبداللہ الخیاط دینوریؒ سے کہا کہ مجھے کوئی وصیت کیجئے تو فرمایا: میں تمہیں ایک ایسی خصلت کے اپنانے کو کہتا ہوں کہ جس کے علاوہ میں کوئی ایسی خصلت نہیں جانتا جس کے ساتھ کوئی آفت لگی ہوئی نہ ہو۔ میں نے کہا: وہ خصلت کون سی ہے؟ کہا کہ وہ خصلت یہ ہے: تو پیٹھ پیچھے اپنے بھائی کا ذکر اچھے انداز سے کرے اور اسی طرح اس کے لیے دعا بھی کرے۔

کہتے ہیں کہ ابوبکر الوراقؒ نے کہا: "میں نے عزت کی خواہش کی وجہ سے عزت اور ذلت کے ڈر سے ذلت خرید لی۔ اور یہ جزا ہے اس شخص کی جس نے وصیتِ الٰہی کی مخالفت کی۔

ایک شخص ذوالنون مصری کے پاس آیا اور کہا، مجھے کوئی وصیت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: اگر تو علم غیب میں صدقِ توحید کے ساتھ مضبوط ہے تو تیرے لیے تیری پیدائش سے بھی قبل یعنی آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر آج تک انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی دعوت گذر چکی۔ تیرے لیے اسی طرح دعوت ہی بہتر تھی اور اگر تو ایسا نہیں تو پھر ڈوبتے کو آواز کیسے بچا سکتی ہے!

میں نے ابو محمد المہلب بن احمد بن مرزوق مصریؒ سے سنا انھوں نے کہا کہ ابو محمد المرتعشؒ نے اپنی وفات کے وقت مجھے یہ وصیت کی کہ میں ان کا قرضہ جو اٹھارہ درہم تھا، چکا دوں، جب ہم ان کی تدفین سے فارغ ہوئے تو ان کے جسم کے کپڑوں کی قیمت اٹھارہ درہم مقرر کی گئی جنھیں میں نے اٹھارہ درہم میں خرید لیا۔ اس طرح حساب پورا پورا نکلا۔ اور ہم نے ان کا قرضہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد مشائخ جمع ہوئے اور انھوں نے ان کا چیزیں رکھنے کا تھیلا اٹھایا اس میں کچھ معمولی سی چیزیں تھیں، جن میں سے ہر ایک نے کچھ لیا اور چلے گئے۔

ایک شخص ابراہیم بن شیبانؒ کے پاس حاضر ہوا اور وصیت کے لیے کہا: آپ نے فرمایا: اللہ کو یاد کرو اور اسے بھلاؤ نہیں۔ اگر ایسا نہ کر سکو تو موت کو مت بھولنا۔

کسی عارف نے یہ وصیت کی: اپنا نام عابدوں کی فہرست سے مٹا دو۔

ابوبکر الواسطیؒ سے وصیت کے لیے کہا گیا تو فرمایا: اپنی سانسوں اور اوقات کا شمار رکھو۔ والسلام۔

کسی شیخ سے وصیت کرنے کو کہا گیا تو فرمانے لگے "قلت و ذلت کو اللہ کے لیے برداشت کرتے ہوئے اسی کے ہو جاؤ۔

ذوالنونؒ فرماتے ہیں کہ میں جبل المقطم پر پھر رہا تھا کہ میں نے ایک غار میں کسی شخص کو یہ کہتے سنا: پاک ہے وہ ذات جس نے میرے قلب کو یاس سے محروم کرکے اسے آرزوؤں سے آباد کر دیا کیونکہ یاس نے مجھے اس سے جدا کیا اور اس کی آرزو نے مجھے اس سے ملا دیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو وہ ایک ایسا شخص تھا کہ عبادت نے اس کا رنگ بدل دیا تھا اور زہد نے اسے زخمی کر دیا تھا میں اس کے قریب گیا تو اس نے مجھے چھوڑ کر پیٹھ پھیر لی۔ میں نے کہا: مجھے کوئی وصیت فرمائیں۔ تو اس نے کہا: دیکھو! کہیں تمھاری آرزو اللہ تعالےٰ سے پلک جھپکنے کی دیر تک بھی منقطع نہ ہو۔ غم اور خوشی کو اکٹھا کرو، اللہ اور اپنے درمیان تعلق قایم کرو، تو اس روز خوشی پائے گا جب باطل کام کرنے والے خسارے میں ہوں گے میں نے کہا: کچھ اور؟ تو کہا: اتنا ہی کافی ہے۔

ایک شخص نے ذوالنون سے کہا کہ مجھے اپنا کوئی قول عطا کیجیے، انھوں نے کہا: شک کو یقین پر ہرگز ترجیح نہ دینا، تسکین کے بغیر اپنے نفس سے خوش نہ ہونا، اگر تجھ پر زمانے کی کوئی مصیبت آن پڑے تو اسے حسن صبر کے ساتھ برداشت کر لینا، اپنی آرزوؤں کا مرکز ہمیشہ قایم رہنے والی ذاتِ خبیر کو ہی سمجھنا تو اسے اپنی آرزوؤں کے ساتھ قایم پاتے گا اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق کو غنیمت سمجھنا کیونکہ اللہ کے بندے اسی سے پیار کرتے اور اسی سے سکون و انس پاتے ہیں۔ انھوں نے اس کی معرفت حاصل کی اور اس کی معرفت ہی کے ذریعے اس کی آرزو کی اور عین الیقین کی حالت میں اس کے ساتھ تعلق قایم کیا، پھر ان کی نظریں عظیم و جلیل قدرت والے کی طرف اٹھیں تو اس نے انھیں اپنے تعلق کا جام شیریں نوش کرایا۔ اور اپنے خلوص کی لذتوں سے انھیں شاد کام کیا۔ ان کے آہ و بکا کی گونج عرش کے گرد سنائی دیتی ہے اور ان کے پکارنے کی آواز آسمانوں کے دروازوں کو کھٹکھٹاتی ہے تاکہ جلدی سے

کھلیں اور دعا قبول ہو۔

جنیدؒ ایک وصیت میں لکھتے ہیں ، اے برادر ! عمل کر پھر جلدی کر اس سے قبل کہ تیری موت تیری طرف جلدی کرے ، آگے بڑھو اور آگے بڑھو اس سے پہلے کہ تیری طرف بڑھا جائے۔

اللہ تعالٰے نے تیرے گذرے ہوئے بھائیوں اور دوستوں کے بارے میں تجھے وصیت کی ہے لہٰذا ان کے حقوق تجھ پر باقی ہیں اور تیرے لیے نافع ہیں اور اس کے سوا سب کچھ ہمارے لیے نہیں بلکہ تم پر ان کے حقوق ہیں۔ یہ ہماری وصیت و نصیحت ہے تیرے لیے۔ اسے قبول کر کہ اس طرح تو معاملے کو بہتر بنائے گا اور اس پر عمل کرنے سے کامیابی حاصل کرے گا۔ والسلام۔

یہ تھیں صوفیہ کی چند وصیتیں اور ان کے مخصوص مقاصد جو ہم نے بیان کر دیئے ہیں۔

و باللہ التوفیق

(۶۷)

سماع

حسنِ آواز، سماع اور مستمعین کے مختلف درجات

ارشادِ باری تعالےٰ ہے:

یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ[1] (اللہ تعالیٰ) بڑھاتا ہے آفرینش میں جو چاہے۔

مفسرین کے مطابق اس آیت کریمہ کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ بندوں کو اخلاقِ حسنہ سے سنوارتا اور حسنِ آواز کی نعمت سے آراستہ فرماتا ہے۔

اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

آپ نے فرمایا: "اللہ تعالےٰ اپنے نبی کی خوش آوازی کے سوا کسی آواز کو زیادہ توجہ سے نہیں سنتا۔"

اور آپ نے فرمایا: "کوئی شخص اپنی خوش گلو کنیز کو اس قدر توجہ سے نہیں سنتا جس قدر اللہ جل جلالہ ایک خوش الحان قاری قرآن کی قرأت کو سماعت فرماتا ہے۔"

اور آپ نے فرمایا: "حضرت داؤد علیہ السلام کو اتنی شیریں آواز عطا کی گئی تھی کہ زبور پڑھتے وقت ان کے گرد، ان کی امت بنی اسرائیل، جنات، جنگل کے درندے اور پرندے

---

[1] فاطر: ۱

اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ اور ان کی مجلس سے چار چار سو جنازے اٹھتے تھے۔"

ایک روایت ہے: "حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی کو لحن داؤدی سے نوازا گیا ہے"

حدیث میں ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت فرمائی اور مدّ کو لمبا کھینچ کر آواز کو ترجیع دی۔[1]

ایک موقعہ پر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ آپ میری قرأت سن رہے ہیں تو میں اچھی طرح بنا سنوار کر قرات کرتا۔

ارشادِ نبوی ہے: "قرآن کو اپنی آوازوں سے آراستہ کرو"

میرے نزدیک اس قول نبوی کے دو مفہوم ہیں:

پہلا یہ کہ قرآن غیر مخلوق ہے لہٰذا یہ تو ممکن نہیں کہ قرآن کو آراستہ کیا جائے لہٰذا اس سے شارع علیہ السلام کی مراد یہ ہے کہ اپنی آوازوں کو قرآن کی قرأت سے آراستہ کرو گویا ان میں سوز، نغمگی اور ترنم پیدا کرو تاکہ جب تلاوت کرنے قرآن کے قریب جاؤ تو اچھی آواز لے کر جاؤ۔ یہ مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں قاعدہ تقدیم و تاخیر کو پیش نظر رکھ کر اخذ کیا گیا یعنے قولِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو یوں پڑھا جائے گا: "اپنی آوازوں کو قرآن سے آراستہ کرو" اور اس طرح کی مثالیں قرآن میں جابجا ملتی ہیں جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ	سب خوبیاں اللہ کو جس نے اپنے
عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ	بندے پر کتاب اتاری اور اس میں
يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا[2]	کجی نہ رکھی۔

اس آیت میں قیمًا کا معنٰے عوجًا سے پہلے کیا گیا ہے یعنی تقدیم و تاخیر ہے۔

---

[1]: قاری کا آواز کو بالتکرار گھماتے رہنا ترجیع کہلاتا ہے۔ (مترجم)

[2]: الکہف: ۱—۲

ایک مقام پر قرآن کریم میں خدائے بزرگ و برتر نے بھدی آوازوں کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ [1] — بے شک سب آوازوں میں بُری آواز گدھے کی ہے۔

اللہ کا بھدی آوازوں کو بُرا قرار دینا اس حکمت کا حامل ہے کہ اس کی جانب سے بھدی آوازوں کی مذمت دراصل اچھی آوازوں کی تعریف ہے۔

اہلِ دانش و بینش نے کائنات میں موجود خوبصورت آوازوں اور دلکش نغموں کے کیا کیا مفہومات بیان کیے ہیں۔ چند ایک یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

ذوالنون مصریؒ کا قول ہے: وہ تمام اشارات و خطابات جو اللہ نے ہر پاکیزہ سیرت مرد و عورت کو عطا فرمائے ہیں، حسن آواز کے دائرے میں آتے ہیں۔

یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں: اچھی آواز، عشقِ الٰہی سے معمور دلوں کے لیے سرمایۂ راحت ہے۔

کسی اہلِ دل کا قول ہے: خوش لحنی اللہ کی جانب سے ملنے والی وہ نعمت ہے جس کے ذریعے عشقِ حقیقی کے شعلوں میں جلنے والے قلوب ٹھنڈک اور سکون پاتے ہیں۔

میں نے احمد بن علی الوجیہیؒ سے اور انھوں نے ابوعلی رودباریؒ کو یہ کہتے سنا کہ ابوعبداللہ حارث بن اسد المحاسبیؒ فرمایا کرتے تھے: تین چیزیں ہیں جو باعثِ منفعت ہیں:

(۱) خوش آوازی مگر دیانت کے ساتھ

(۲) حسن صورت مگر کردار کے ساتھ

(۳) حسن اخوت مگر وفائے کے ساتھ۔

بُندار بن حسینؒ فرمایا کرتے تھے: خوب صورت آواز گداز لہجہ اور لطیف زبان کی صورت میں ایک حاضر جواب دانائی اور کارآمد و زار کی جیسی ہے۔ اور یہ وہ خوبی ہے جو اللہ ہی کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔

---

[1] لقمان: ۱۹

حسن صوت کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ گہوارے میں پڑا بے چین روتا ہوا بچہ جب نرم و گداز آواز سنتا ہے تو خاموشی سے سو جاتا ہے۔

قدیم لوگوں کا یہ دستور تھا کہ سودا کے مریضوں کا علاج خوب صورت آوازوں کے ذریعے کرتے اور مریض شفایاب ہو جاتے تھے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ خوب صورت اور دلکش آوازوں میں اللہ تعالیٰ نے ایک خوبی یہ بھی رکھی ہے کہ جب وادیوں میں چلنے والے اونٹ تھک کر بیٹھ جاتے ہیں تو حُدی خوان کی ایک سُریلی تان پر وہ کس تیزی سے متوجہ ہو کر مستی کے عالم میں چل پڑتے ہیں اور اس قدر تیز چلتے ہیں کہ محملیں گرنے لگتی ہیں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ جب حدی خواں کی آواز رک جاتی ہے تو بوجھ، تھکاوٹ اور نغمہ بار صدا کی مستی میں حد سے زیادہ تیز رفتاری ان کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہوتی ہے۔

خوش گلو حبشی اور مست اونٹ

دمشق میں دقیؒ نے مجھے خوش آوازی کی حکمت سمجھاتے ہوئے یہ حکایت سنائی کہ ایک دیہات میں قبائل عرب سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے میری ضیافت کی اور مجھے اپنے خیمے میں لے گیا۔ خیمے کے اندر میں نے ایک حبشی غلام کو بیڑیوں میں جکڑا ہوا پایا اور خیمے کے باہر مردہ اونٹ دیکھے۔ ایک اونٹ جو بچ رہا تھا وہ بھی یوں لگتا تھا جیسے عالم نزع میں ہو۔ اسی دوران موقع پا کر اس حبشی غلام نے مجھ سے کہا کہ آپ آج میرے مالک کے مہمان ہیں اور اس کے نزدیک آپ ایک شریف النسب شخص ہیں لہٰذا آپ میری سفارش کریں کہ وہ مجھے اس قید سے آزاد کر دے کیونکہ وہ آپ کا کہنا رد نہیں کرے گا۔

اتنے میں میرے سامنے کھانا چن دیا گیا۔ جسے میں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ یہ بات میرے میزبان کے لیے باعثِ تشویش تھی۔ اس لیے اس نے سوال کیا: آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ میں نے کہا، جب تک آپ اس غلام کی خطا معاف کر کے اس کی بیڑیاں کھول نہیں دیتے میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اس نے کہا: اے شخص! اس غلام نے تو

مجھے مفلس و کنگال کر دیا ہے ۔ مجھے اور میرے خاندان کو نقصان پہنچایا ہے ۔

میں نے پوچھا : اس نے کیا خطا کی ؟

میزبان نے جواب دیا : اس غلام کی آواز بہت اچھی ہے ۔ میرا گذارہ انہی اونٹوں پر تھا کہ اس نے ان پر بہت زیادہ بوجھ لادکر ہانکا اور حدی گاتا ہوا ساتھ چلا یہاں تک کہ یہ اونٹ اس کی دلکش آواز پرست ہو کر تین دن کا سفر ایک رات میں طے کر کے جب منزل پر پہنچے اور بوجھ اتارا گیا تو ایک کے سوا سب کے سب اونٹ وہیں پر ڈھیر ہو گئے ۔ چونکہ آپ میرے مہمان ہیں اس لیے میں اسے معاف کر کے رہا کر دیتا ہوں غلام کی رہائی کے بعد ہم نے کھانا کھایا ۔

صبح ہوئی تو میں نے چاہا کہ اس غلام کی خوش آوازی کا لطف اٹھایا جائے میں نے اس کے مالک سے غلام کو گانے کا حکم دینے کے لیے کہا ۔ مالک نے غلام کو حکم دیا کہ جس اونٹ پر وہ پاس کے کنویں سے پانی ڈھویا کرتا ہے اس کے پاس حدی گائے ۔ جوں ہی اس غلام کی حدی کی لَے فضا میں بلند ہوئی ۔ اونٹ اپنی جگہ سے مست ہو کر اٹھا اور فرطِ سرور میں رسی تڑالی ۔ میں اپنی جگہ پر منہ کے بل گر گیا ۔ مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ میں نے کبھی اس غلام کی آواز سے بڑھ کر کوئی خوبصورت آواز سنی ہو ۔ غلام حدی کی تانیں اڑا رہا تھا اور اس کا مالک چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا : اے شخص تو اب مجھ سے اور کیا چاہتا ہے تو نے تو میرے اونٹ کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے ۔ مجھ سے دور ہو جاؤ مجھ سے دور ہو جاؤ ۔

میں نے انطاکیہ میں احمد بن محمد الطلیؒ اور انھوں نے بُشرؒ کو یہ کہتے سنا کہ میں نے اسحاق بن موصلیؒ سے ماہر گانے والے کی تعریف پوچھی تو فرمانے لگے : جس کو اپنی سانسوں پہ قدرت ، اختلاس[1] میں لطافت اور ریاضت تام حاصل ہو وہی ایک ماہر گانے والا ہے ۔

---

[1] : اختلاس کسی حرکت کو پُر نہ پڑھنے کو کہتے ہیں جب کہ کسی حرکت کو اس قدر پُر کر کے پڑھنا کہ حرکت ، حرف علت کی صورت اختیار کر جائے اِشباع کہلاتا ہے ۔ (مترجم)

۶۸

سماع اور اس کے مفہوم سے متعلق صوفیہ کے مختلف اقوال

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ نے سماع کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرمایا: سماع، اللہ کی جانب سے قلب پر وارد ہونے والے معانی ہیں جو حق کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اگر کوئی حق کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے قلب پر وارد ہونے والے معانی کو پا لیا اور جس نے نفسانی خواہشات کے زیر اثر اس کی طرف توجہ کی وہ زندقہ میں مبتلا ہو گیا۔

احمد بن ابی الحواری علیہ الرحمہ نے ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمہ سے سماع اور خوش الحانی سے گائے جانے والے اشعار سننے کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ بات یہی ہے کہ گانے والے دو ہوں۔

ابویعقوب نہر جوری علیہ الرحمہ کہتے ہیں: سماع ایک ایسی حالت کو کہتے ہیں جس کے دوران دل میں سوز و گداز کی آگ بھڑکتی ہے اور اس کے نتیجے میں راز کھلتے ہیں۔

بعض صوفیہ کا قول ہے کہ سماع اہل معرفت کو غذاءِ روحانی کے لطف سے شاد کام کرتا ہے کیونکہ سماع کا یہ وصف ہے کہ وہ حد درجہ لطیف ہوتا ہے۔ اس سے فقط لطافت و رقتِ طبع کے ساتھ ہی استفاضہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ خود لطیف ہے۔ اور

اس سے فقط لطافتِ طبع اور صفائے قلب کے ساتھ ہی اس کے اہل لوگ استفاضہ کر سکتے ہیں کیونکہ سماع خود لطیف، اور پاک و شفاف ہے۔

ابوالحسینؒ دراج فرماتے ہیں: سماع مجھے روشنی و نور کے میدانوں میں سے ایک میدان میں لے آیا ہے اور اس نے عطا و بخشش کی چوکھٹ پر مجھے وجودِ حق سے ہمکنار

کر دیا اور اس نے مجھے مئے صفا، کے جام پلائے جس کی سرمدی مستیوں سے سرشار ہو کر میں رضا کی منزلوں کا اوراک پا گیا۔ اور اسی کے ذریعے میں حقیقت کی پاکیزہ فضاؤں اور گلستانوں کی طرف آنکلا۔

ایک مرتبہ ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ سے سماع کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: سماع بظاہر فتنہ اور بباطن عبرت ہے۔ جس نے باطنی اشارے کو پالیا اس کے لیے عبرت کو سننا جائز ٹھہرا اور ظاہری استماع کرنے والے نے فتنے کو دعوت دی اور مصیبت سے دوچار ہوا۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ کا کہنا ہے کہ سماع کے لیے تین شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو سماع اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔ پوچھا گیا کہ وہ تین شرائط کیا ہیں، تو فرمایا: زماں، مکان اور ہم مشرب ساتھی۔

کہتے ہیں کہ جس نے پاکیزہ رنگ کے سماع کو پسند نہیں کیا۔ اس کی وجہ اس کے قلب میں پیدا ہو جانے والا وہ نقص اور دنیوی مشغولیت ہے جس نے اسے اس جانب سے دور رکھا۔

جعفر بن محمد الخلدی کا بیان ہے کہ جنید بن محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: فقراء پر تین مواقع پر رحمتِ خداوندی کا نزول ہوتا ہے۔ ایک بوقتِ سماع کیونکہ وہ راست اور جائز انداز سے سماع کرتے ہیں اور وجد ہی کی حالت میں قیام کرتے ہیں۔ دوسرے اس وقت جب وہ علمی گفت گو کرتے ہیں کیونکہ ان کا موضوع اولیاء و صدیقین کے احوال و آثار ہی ہوتے ہیں۔ تیسرے اس وقت جب وہ کھانا تناول کرتے ہیں کیونکہ وہ فاقے ہی کی صورت میں کھاتے ہیں۔

ابو علی رودباری علیہ الرحمہ نے سماع سے متعلق کہا تھا: کاش! ہم اس سے کلیتاً چھٹکارا پا لیتے۔

ابو الحسین نوری علیہ الرحمہ کا قول ہے کہ صوفی وہ ہے جو سماع سنے اس کے اسباب کو پسند کرے۔

میں نے ابو طیب احمد بن مقاتل عکّی کو یہ کہتے سنا کہ ابو القاسم جنیدؒ کے مریدین میں سے

ابوالحسین بن زیریؒ ایک فاضل شیخ تھے ان کا دستور تھا کہ اکثر و بیشتر سماع کی محفلوں میں حاضر ہوتے اور سماع اچھا لگتا تو چادر بچھا کر بیٹھ رہتے اور کہتے کہ صوفی اپنے دل کے ساتھ رہتا ہے جہاں دل آگیا بیٹھ گیا اور دل نے حامی نہ بھری تو وہاں سے یہ کہتے ہوئے کہ سماع اہلِ قلوب کے لیے ہے، چل دیتے۔

میں نے ابوالحسن حصریؒ کو ایک بار کہتے سنا کہ میں ایسے سماع کا ذکر کیا کروں کہ جو سماع برپا کرنے والے کے سماع کو منقطع کرنے پر ختم ہو جائے۔ چاہیئے تو یہ کہ سماع مسلسل جاری رہے۔ اور انھیں سے سماع کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: چاہیئے کہ پیاس بھی دائمی ہو اور پینا بھی دائمی، کیونکہ جس قدر زیادہ پیا جائے گا پیاس بھی اسی قدر بڑھے گی۔

۶۹

عوام الناس کے لیے جوازِ سماع کی شرائط

بندار ابن حسینؒ کا قول ہے : جو بھی سماعِ طیب کو نہیں سنتا اس کی قوتِ ادراک میں نقص ہے کیونکہ ہر طرح کی صنعت حاصل کرنے میں تکلف برتنا پڑتی ہے۔ چاہے اس منفعت کا تعلق جائز اشیاء سے کیوں نہ ہو جب کہ سماع اگر بُرے مقاصد سے پاک ہو تو یہ ایسا مباح فعل ہے جس میں کسی طرح کا کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص سماع کو پاکیزہ طریقے اور حسنِ آواز سے جائز طور پہ لذت یاب ہونے کی خاطر اس طرح سنے کہ اس سے اس کا مقصد کوئی برائی، اختلاف لہو ولعب اور ترک حدود نہ ہو تو سماع کسی طرح بھی ناجائز نہیں۔

جوازِ سماع

جوازِ سماع پر مندرجہ ذیل آیات سے استدلال کیا جاتا ہے :

ارشادِ ربّ عزوجل ہے :

وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ [1] — اور خود تم میں (نشانیاں ہیں) ، تو کیا تمھیں سوجھتا نہیں۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ — ابھی ہم انھیں دکھائیں گے اپنی آیتیں

---

[1] : الذاریٰت : ۲۱

وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ [1] — دنیا بھر میں۔

جو کچھ اللہ جل ذکرہ نے ہمیں اپنے نفسوں میں دکھایا اسے ہم نے اپنے حواس خمسہ میں دیکھا بایں طور کہ انھیں حواس کے ذریعے ہی ہم اشیاء اور ان کے اضداد میں فرق کر سکتے ہیں جیسے آنکھ اچھے اور برے میں تمیز کرتی ہے، ناک خوشبو اور بدبو میں فرق بتاتی ہے۔ منہ کے ذریعے ہم تلخی و شیرینی میں تمیز کرتے ہیں، ہاتھ نرم اور سخت کا احساس کرتا ہے۔ اور اسی طرح کان اچھی اور بری آوازوں میں تمیز کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ [2] — بے شک سب آوازوں میں سے بُری آواز گدھے کی ہے۔

مذکورہ آیت مبارکہ میں جہاں بری آوازوں کی مذمت کی گئی ہے دراصل اس مذمت میں اچھی آوازوں کی تعریف پنہاں ہے اور بری و اچھی آوازوں میں تمیز فقط سماع کے ذریعے ہی کی جا سکتی ہے۔ سماع سے مراد حضور قلب، ادراک اور جملہ اوہام سے خالی الذہن ہو کر نہایت غور سے مائل بہ سماعت ہونا ہے۔

اللہ جل ذکرہ نے اپنی کتاب میں اہل جنت کے لیے جن نعمتوں کا ذکر فرمایا ان کی خوب صورت الفاظ میں توصیف فرمائی مثلاً :

سدر فاکھۃ (بے کانٹوں کے بیریاں) طلح منضود (کیلے کے گچھے)، فاکھہ کثیرۃ (بے شمار میوے) لحم الطیر (پرندوں کا گوشت) حور عین (بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں) السندس (کریب کا کپڑا) استبرق (قناویز) رحیق مختوم (سربمہر شراب) ارائک (آراستہ تخت) قصور (محلات) غرف (بالاخانے) اشجار (درخت) انہار (نہریں)۔

---

[1]: حم السجدۃ : ۵۳

[2]: لقمٰن : ۱۹

اور یہ بھی فرمایا :

فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ۝ [1] باغ کی کیاری میں ان کی خاطرداری ہوگی ۔

مجاہد نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں کہا کہ آیت میں اس سماع کا ذکر کیا گیا ہے جو اہلِ جنت، بہشت کی خوبصورت حوروں اور خوبرو دوشیزاؤں کے دلکش مترنم آوازوں میں سنیں گے۔ وہ گا رہی ہوں گی۔ جیسا کہ حدیث ہے : "ہم ہمیشہ زندہ رہنے والیاں ہیں ہمیں کبھی موت نہیں آئے گی ہم سدا نرم و تازہ رہیں گی، ہم پر کبھی (بڑھاپے) کی سختی نہیں آئے گی ۔

اللہ تعالے نے شراب کو جملوں نعمتوں سے الگ کر کے حرام قرار دیا۔ حدیثِ نبوی ہے : جس نے دنیا میں شراب پی وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا مگر یہ کہ وہ توبہ کرلے ۔

اس طرح سماع بھی جو کہ مذکور نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے ان نعمتوں میں شامل ہے جو اللہ نے بندوں کے لیے اس دنیا میں حلال ٹھہرائی ہیں۔ اور شراب کو باقی تمام نعمتوں سے اس طرح الگ کیا گیا کہ اسے نصِ قرآنی اور احادیث ظاہرہ سے حرام قرار دیا۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف لے گئے کیا دیکھتے ہیں کہ دو لڑکیاں دف بجا رہی ہیں اور ساتھ گا رہی ہیں آپ نے انھیں گانے سے نہیں روکا۔ مگر یہ سب کچھ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ غضب ناک ہوگئے اور فرمانے لگے : کیا رسول اللہ کے گھر میں شیطان کی بانسری بج رہی ہے؟ اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : چھوڑو، اے عمر! کیونکہ ہر قوم کی عید ہوتی ہے (یعنی خوشی کے مواقع ہوتے ہیں)۔

مذکورہ حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگر گانا نا جائز ہوتا تو عید یا غیرِ عید دونوں مواقع پر

---

[1] : الروم : ۱۵

ناجائز ہوتا۔ الغرض اس ضمن میں کئی روایات ملتی ہیں۔

ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر مغموم حالت میں یہ شعر پڑھتے ہوئے داخل ہوئے ؎

کل امری مصبح فی اھلہ

والموت ادنی من شراک نعلہ

ترجمہ: ہر شخص اپنے اہل وعیال میں مگن ہے جب کہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی قریب تر ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب زیادہ پریشان ہوتے تو زخرہ اوپر اٹھاتے اور یہ اشعار پڑھتے ؎

الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃ   بوادٍ وحولی اذخر وجلیل

وھل اردن یوماً میاہ مجنۃ   وھل یبدون لی شامہ وطفیل

ترجمہ: کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ کیا میں کوئی رات کسی وادی میں اس طرح گذاروں گا کہ میرے گرد اذخر وجلیل جیسی خوشبودار گھاس ہو۔

اور کیا میں کسی روز مکہ سے قریب مقام مجنہ کے پانی کے گھاٹوں پہ داخل ہوں گا اور کیا مجھے طلوع وغروب آفتاب اور چاند کے بیچ کی سیاہی کا منظر دکھائی دے گا۔

اسی طرح ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا لبید کا یہ شعر پڑھا کرتی تھیں ؎

ذھب الذین یُعاش فی اکنافھم

وبقیت فی خلف کجلد الاجرب

ترجمہ: وہ لوگ کوچ کر گئے جن کے پہلو میں زندگی بسر کی جاتی تھی اور اب میں اس طرح باقی رہ گیا ہوں جیسے نیام کا چمڑا۔

یہ شعر پڑھنے کے بعد ام المومنین فرماتیں کیا ہی اچھا ہوتا اگر لبید ہمارا زمانہ پاتا۔

صحابہ کرام اکثر اشعار پڑھا کرتے تھے اور اس طرح کی روایات کثیر تعداد میں ملتی ہیں۔
مجھے ابو عبد اللہ حسین بن خالویہ نحوی نے انھیں ابن الانباری نے باسناد بتایا :
کعب بن زہیر نے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنا مشہور قصیدہ
"بانت سعاد" پیش کیا تھا، جس کے کچھ اشعار یہ ہیں :

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول

متیم اثرها لم یفد مکبولُ

ترجمہ : سعاد بچھڑ گئی اس لیے آج میرے دل کی حالت خستہ ہے اور اس قیدی کی مانند
ہے جس کا فدیہ ادا نہیں کیا گیا اور وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

وما سعاد غداة البین اذ ظعنوا

الا اغن غضیض الطرف مکحولُ

ترجمہ : جدائی کی صبح کو جب انھوں نے کوچ کیا تو سعاد گنگناتی جھکی جھکی نظروں اور
سرمگیں آنکھوں والی ہرنی کی مانند تھی۔

شجت بذی شبم من ماء محنیة

صافٍ بابطح اضحی وهو مشمولُ

ترجمہ : وہ شراب (جو سعاد کے دانتوں کو پلائی گئی) ایسی ہے کہ جس میں وادی کے
موڑ پر وسیع سنگریزوں والی ندی سے بوقت چاشت لیے گئے پانی کی آمیزش کر کے
اس کی تیزی کو توڑا گیا ہے۔

تنفی الریاح القذی عنه وافرطه

من صوب ساریة بیض یعالیل

ترجمہ : ہوائیں اس ندی سے تنکوں کو صاف کر دیتی ہیں یہاں تک کہ اس میں کوئی
ایسی چیز باقی نہیں رہتی جو اسے گدلا کر سکے اور اس ندی کو انتہائی سفید پہاڑوں
نے رات کے وقت برسنے والے بادلوں سے لبریز کیا ہے۔

اکرم بہا خلّۃ لو انّہا صدقت

موعودھا اولو ان النصح مقبول

ترجمہ : سعاد کس قدر معزز و شریف النسب دوست ہے کاش ! اس نے وعدہ وفا کیا ہوتا یا بھلائی کی بات مان لی ہوتی ۔

لکنہا خلۃ قد سیط من دمہا

فجع وولع و اعراضٌ و تبدیل

ترجمہ : لیکن وہ میری دوست کہ جس کی محبت کا اسیر ہوں اس کے خون میں مصیبت زدہ بنانے، دروغ گوئی، منہ موڑنے اور دوست بدلنے کی فطرت سرایت کیے ہوئے ہے ۔

کانت مواعید عرقوب لہا مثلاً

وما مواعیدہ الا الا باطل

ترجمہ : عرقوب نامی مشہور وعدہ خلاف عرب، کے وعدے اس کے لیے مثال بن گئے ہیں اور عرقوب کا ہر وعدہ جھوٹا ہوتا تھا ۔

ارجو و آمل أن تدنو ا مودّتہا

وما اخال لدینا منك تنویل

ترجمہ : مجھے امید ہے اور میری آرزو ہے کہ سعاد کی محبت مجھ سے قریب ہوگی حالانکہ میں تم (سعاد) سے وصل پانے کا گمان نہیں کرتا ۔

ولا تمسك بالوصل الذی زعمت

الّا کما یمسك الماء الغرابیل

ترجمہ : وہ جو وعدہ کرتی ہے اس کو اس طرح تھامے رہتی ہے جیسا کہ چھلنیاں پانی کو تھامے رہتی ہیں یعنی وعدہ وفا کرنا تو اس کی عادت سے ہی خارج ہے جیسا کہ چھلنیاں پانی کو روکتی نہیں بلکہ یکدم گرا دیتی ہیں ۔

فلا یغرنک مامنک وماوعدت
ان الامانی و الاحلام تضلیل

ترجمہ: تو تمہیں ہرگز اس کا وعدہ اور امید دلانا دھوکہ نہ دے دے کیونکہ آرزوئیں اور خواب گمراہ کر دیتے ہیں۔

امست سعاد بارض لن یبلغہا
الا العتاق النجیبات المراسل

ترجمہ: سعاد ایک ایسی زمین پر پہنچ گئی جو دور واقع ہے اور جس تک صرف بے عیب مضبوط ترین نسل والے اور تیز رفتار اونٹ ہی پہنچ سکتے ہیں۔

ولن یبلغہا الا عذافرۃ
فیہا علی الاین ارقال وتبغیل

ترجمہ: اس زمین تک صرف وہی اونٹنی پہنچ سکتی ہے جو جسمانی اعتبار سے بڑی اور مضبوط ہو اور باوجود تھکاوٹ کے وہ تیز رفتاری سے فاصلہ طے کرتی ہو۔

ضخم مقلدھا فعم مقیدھا
فی خلقہا عن نبات الفحل تفضیل

ترجمہ: اس اونٹنی کی گردن اور ٹانگیں موٹی ہوں اور اپنی بناوٹ و ساخت میں دوسری اونٹنیوں پر سبقت رکھتی ہو۔

حرف اخوھا ابوھا من مھجنۃ
وعمہا خالہا قوداءُ شملیل

ترجمہ: وہ اونٹنی انتہائی مضبوط سخت، اچھی نسل والی خالص نسب والی، لمبی کمر والی، طویل گردن والی، سبک سیر اور تیز رفتار ہو۔

شاعری

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "بعض اشعار میں دانائی کی باتیں ہوتی ہیں"

ایک اور حدیث نبوی ہے: "حکمت و دانش مومن کی گمشدہ متاع ہے۔"
جب شعر کا پڑھنا جائز ٹھہرا تو اسے ترنم، خوش الحانی، حدی، نصب، رمل اور رجز کی صورت میں پڑھنا بھی درست ہے بشرطیکہ اس میں برے مقاصد، مخالفت اور حدود سے تجاوز نہ ہو۔

سماع اور بعض فقہا و علماء

سماع کی اجازت بعض علماء اور فقہاء نے بھی دی ہے اور اسے جائز سمجھا ہے مثلاً مالک بن انس علیہ الرحمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک دوپہر کو کسی شخص کو جوان کے دروازے پر اجازت طلب کر رہا تھا یہ شعر گاتے ہوئے سنا ؂

مابال قومك یا رباب
خزراً کانهم غضاب

ترجمہ: اے رباب! تیری قوم کو کیا مصیبت ہے کہ انھوں نے آنکھیں سکیڑ رکھی ہیں جیسے وہ غصے میں ہوں۔
مالک بن انس نے اس شخص سے کہا کہ تو نے ایک تو لفظوں کی ادائیگی ٹھیک نہیں کی، دوسرے تو نے قیلولے سے محروم کر دیا۔ اس شخص نے آپ سے پوچھا کہ ادائیگی کس طرح ہو۔ اس پر آپ نے کہا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ یہ کہتے پھرو کہ میں نے اسے انس بن مالک سے سیکھا ہے۔
انس بن مالک رض اور اہل مدینہ کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ وہ سماع کو ناپسند نہیں کرتے تھے۔ اور اس کے جواز میں کئی روایات ہیں جن کے راوی عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن عمر اور دیگر کئی صحابہ و تابعین کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔
حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ نے بھی سماع اور ترنم سے اشعار پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ اس میں آداب و شرائطِ سماع کی پابندی کی جائے۔
ابن جریج علیہ الرحمہ کا کہنا ہے کہ یمن سے میرے کوچ کرنے اور مکہ میں اقامت اختیار کرنے

کا سبب فقط دو شعر تھے جو میں نے کسی سے سنے۔ اشعار یہ ہیں ؎

یا للہ قولی لہ من غیر معتبۃٍ ، ماذا اردت بطول المکث بالیمن
ان کنت الممت اذنبا او ھممت بہ فما وحدت بترک الحج من ثمن

ترجمہ: خدا کی قسم! میں یہ بات بغیر کسی خفگی کے کہہ رہا ہوں کہ یمن میں طویل قیام سے تو کیا چاہتا ہے۔

اگر تو نے کسی گناہ کا ارتکاب کر لیا تھا یا ارادہ کر لیا تھا تو تجھے ایسے میں بیت اللہ کا حج نہ کرنے سے کیا وصول ہوا۔

ابن جریج کے بارے میں ایک واقعہ یہ ہے کہ وہ چونکہ سماع کو جائز سمجھتے تھے اس پر کسی نے ان سے پوچھا کہ جب قیامت کو آپ کو بھی لایا جائے گا اور آپ کے گناہوں اور نیکیوں کو بھی پیش کیا جائے گا تو آپ کا سماع نیکی و برائی میں سے کس پلڑے میں ہوگا۔ آپ نے جواب دیا: نہ نیکیوں میں اس کا شمار ہوگا اور نہ برائیوں میں کیونکہ سماع مشابہ ہے لغو سے اور لغو کا ذکر اللہ نے ایک مقام پر اس طرح فرمایا ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ أَيْمَانِكُمْ[1] — اللہ تمہیں نہیں پکڑتا ان قسموں میں جو بے ارادہ زبان سے نکل جائے۔

الغرض عوام الناس کے لیے سماع کا جواز فقط اس شرط پر ہو سکتا ہے کہ سماع کے دوران ان کے پیش نظر فاسد مقاصد نہ ہوں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جن سازوں مثلاً کمان کی تانتیں، بانسری، طبلہ، ڈگڈگی اور دیگر گانے بجانے کے آلات کے ساتھ سماع کے سننے سے منع فرمایا ہے ان سے باز رہیں کیونکہ ان سازوں کے ساتھ سماع اہل باطل کا سماع ہے جسے احادیث صحیحہ کے مطابق ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

○

---

[1] : البقرہ : ۲۲۵

۷۰

سماعِ خواص اور ان کے درجات

میں نے ابو عمرو اسماعیل بن نجیدؒ سے اور انھوں نے ابو عثمان سعید بن عثمان رازیؒ الواعظ کو یہ کہتے ہوئے سنا:

"سماع کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم کا سماع مریدین و مبتدیوں کے لیے ہے جس کے ذریعے وہ اعلیٰ احوال تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں ان سے یہ خدشہ بھی رہتا ہے کہ کہیں وہ ریاکاری و فتنے کا شکار نہ ہو جائیں۔

دوسری قسم کا سماع صدیقین کے لیے ہے جس کے ذریعے وہ اپنے احوال میں اضافہ کرتے ہیں اور وہی کچھ سنتے ہیں جو ان کے مقامات و احوال کے موافق ہو۔

تیسری قسم کا سماع عارفین، عارفین میں سے اہلِ استقامت کا ہے۔ ان لوگوں کا حال بوقت سماع یہ ہوتا ہے کہ ان پر کسی طرح کی حرکت یا سکون کی کیفیت طاری ہو وہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں کرتے جس سے اللہ پر اعتراض یا اس کی نافرمانی کا عنصر شامل ہو۔"

ابو یعقوب اسحاق بن محمد ایوب نہرجوری کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کا قول ہے:

"اہلِ سماع کے تین طبقے ہوتے ہیں:

پہلے طبقے والے اپنی حرکت یا سکون کی حالت میں اپنے وقت کے مطابق رہتے ہیں۔

دوسرے طبقے والے خاموش اور پرسکون رہتے ہیں۔

تیسرے طبقے والے اپنے ذوق میں مخبوط ہو جاتے ہیں اور یہی طبقہ ہے جو کمزور ہے"

بندار بن حسین کہتے ہیں: "سماع کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم میں سماع سننے والے اپنی طبیعت کے موافق سنتے ہیں۔

دوسری قسم کا سماع وہ جسے حال کی کیفیت کے ساتھ سنا جاتا ہے۔ اور

تیسری قسم میں سماع کو حق کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے۔

طبیعت کے مطابق سننے میں خاص و عام دونوں شامل ہیں۔ ہر ذی روح اچھی آواز کو پسند کرتا ہے کیونکہ روح کے ناطے یہ ذوق لازمی ہے۔ اور جو شخص اپنے حال کے مطابق سنتا ہے۔ وہ اس میں غور و فکر کرتا ہے حتیٰ کہ اس پر بعض کیفیات کے ذکر سے ایک مخصوص حالت طاری ہوتی ہے۔ کیفیات یہ ہیں مثلاً عتاب، خطاب، وصل، ہجر، قرب، بُعد، کسی چیز کے کھو دینے کا افسوس، مستقبل میں کسی واقع ہونے والی چیز کے لیے شوق و انتظار، طمع، خوفِ عذاب، مانوس ہونا، سہولت و کشائش، جدائی کا غم، پاس عہد، تصدیق وعدہ، وعدہ شکنی، بے قراری، اشتیاق مسرتِ وصال، ناامیدی، خلوص و صفاءِ محبت۔ الفت میں استقامت، حصولِ مرتبہ کے بعد وقوعِ اشتیاق، وصل حبیب کے وقت رقیب کی نگہداری، تکالیف غم، اقسامِ فتنہ، چشم نم ہونا، اشک بہانا، آہیں بھرنا اور حسرتیں باندھنا۔

جب سماع سننے والے پر مذکورہ بالا تمام کیفیات کو سننے کے نتیجے میں اس کے اپنے حال سے موافق ایک حال طاری ہو جائے تو یہ ایک ایسی مؤثر کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے صفاءِ قلب کے مطابق اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نتیجۃً (اس کے باطن میں) ایک آگ بھڑک اٹھتی ہے جو اپنے شرارے جوارح پر پھینکتی ہے۔ ایسی کیفیت میں اس کے اعضاء و جوارح پر ہیجان و اضطراب اور حرکت و تغیر کی حالت

طاری ہو جاتی ہے۔ ایسے میں وہ اپنی بساط کے مطابق ضبط کرتا ہے اگر واردات سماع بہت قوی ہوں تو وہ اس کے ضبط کرنے سے عاجز بھی آجاتا ہے۔ ایسی حالت میں خدائے لم یزل کی ذاتِ اقدس ہی ان کی رہنمائی و حفاظت فرماتی ہے۔ اگر اس دوران اللہ کی رحمت ان کے شاملِ حال نہ ہو تو سماع سننے والوں کی عقلیں جاتی رہیں اور ان کی روحیں ان کے جسم چھوڑ جائیں مگر جو سماع کو حق کے ساتھ اور حق سے جو سماع کو براہِ راست سنتا ہے وہ مذکورہ کیفیات سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسے احوال کی طرف التفات کرتا ہے کیونکہ چاہے یہ احوال کتنے ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہوں پھر بھی حظِ بشری سے مبرّا نہیں ہوتے بلکہ انسانی حدود سے بھی مربوط ہوتے ہیں۔ اگر بندہ کا سماع اللہ کے ساتھ، اسی کے لیے، اسی سے بلاواسطہ اور اسی کی جانب ہو تو یہ احوال باوجود بشری اسباب رکھنے کے لغزش سے پاک اور صاف رہتے ہیں اور اس طرح کا سماع کرنے والے ہی حقایق شناس، احوال آگاہ، افعال و اقوال سے فانی، فقط اخلاص اور صفاءِ توحید سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ ان کی بشریت گم اور باقی دلچسپیاں فانی ہو جاتی ہیں۔ فقط ان کے حقوق باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ خلق کے موارد کو حق کے ساتھ دیکھتے ہیں اور ان کا مشاہدہ ہر علت و حظِ بشری یا روح کے نعمت سے لطف اندوز ہونے سے مبرّا ہوتا ہے۔ پھر وہ سماع کے واردات کے ذریعے اپنے قلوب پر اللہ کی حکمت کا مظاہرہ اور اس کی قدرت کے آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کی نظر اللہ کے عجائب لطف و غرائب علم تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ اللہ تبارک و تعالےٰ کا فضل ہے جسے وہ چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ سماع سننے کے اعتبار سے اہلِ سماع کی تین اصناف ہیں۔ ایک وہ جنھیں ابناءِ حقائق (شناسایانِ حقیقت) کہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سماع کے دوران اللہ تعالےٰ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو سماع میں اپنے احوال مقامات اور اوقات سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق علم سے ہوتا ہے

اور جن حقائق کا وہ اللہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس میں صدقِ طلب کا جوہر موجود ہوتا ہے۔

تیسرے وہ جو خالصتاً فقیر ہوتے ہیں۔ یہ جملہ علائق سے دور اور ان کے دل حبِّ دنیا سے پاک اور جمع و منع سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جو خلوص دل کے ساتھ سماع سنتا ہے اور سماع سننا ان کے لائق ہے۔ یہ سب لوگوں سے بڑھ کر سلامتی کے نزدیک اور فتنے سے محفوظ ہوتے ہیں۔

واللہ اعلم۔

۷۱

طبقاتِ اہلِ سماع

سماعِ قرآن کرنے والا طبقہ

اہلِ سماع کے مختلف طبقے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے لیے سماع کا ایک طریق رکھتا ہے۔ یہاں اس باب میں اس طبقے کا ذکر کیا جاتا ہے جنھوں نے فقط سماعِ قرآن کو اختیار کیا اور مندرجہ ذیل آیات سے استدلال کیا:

ارشادِ ربّانی ہے:

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا[1] — اور قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔

فرمایا:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ[2] — سن لو! اللہ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے۔

اور فرمایا:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ — اللہ نے اتاری سب سے اچھی کتاب
كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ — کہ اول سے آخر تک ایک سی ہے
تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ — دوہرے بیان والی اس سے بال کھڑے

---

[1] : المزمل : ۴   [2] : الرعد : ۲۸

يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ[1]	ہوتے ہیں ان کے بدن پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کی کھالیں اور دل نرم پڑتے ہیں یادِ خدا کی طرف رغبت میں۔

فرمایا:

اَلَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ[2]	کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں۔

فرمایا:

لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا[3]	اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو تو ضرور اسے دیکھتا جھکا ہوا پاش پاش ہوتا۔

فرمایا:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ[4]	اور ہم قرآن میں آتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔

اور فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهٗ[5]	ان بندوں کو جو کان لگا کر بات سنیں پھر اس کے بہتر پر چلیں۔

ان آیاتِ مبارکہ کے علاوہ بھی اس ضمن میں کئی آیات ہیں جو بطور حجت کے پیش کی

---

[1] : الزمر : ۲۳ — [2] : الحج : ۳۵

[3] : الحشر : ۲۱ — [4] : بنی اسرائیل : ۸۲

[5] : الزمر : ۱۸

جا سکتی ہیں۔

سماع قرآن سے متعلق طبقے نے آیات کے ساتھ ساتھ بعض احادیث نبوی سے بھی استشہاد کیا ہے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے : " قرآن کریم کو اپنی آوازوں سے مزین کرو "

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا : تلاوت قرآن کرو؟ ابن مسعود نے عرض کیا : میرا کیونکر آپ کے سامنے تلاوت کرنے کی جسارت کروں کہ آپ پر قرآن اترا ہے ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : میں اپنے علاوہ دوسرے سے تلاوتِ قرآن کو سننا پسند کرتا ہوں ۔

براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ " والتین والزیتون . . . . الخ" تلاوت کرتے سنا ۔ اور میں نے ان سے بڑھ کر اچھی قرأت کسی سے نہیں سنی ۔

قولِ رسول خیر الانام صلے اللہ علیہ وسلم ہے : " مجھے سورہ ہود اور اس جیسی سورتوں نے (جن میں عذابِ الٰہی کا ذکر ہے) بوڑھا کر دیا ہے "

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ابو موسیٰ کو آل داؤد کی سی خوش الحانی عطا کی گئی ہے ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا گیا : یا رسول اللہ ! (صلے اللہ علیہ وسلم) بہترین قرأت کس کی ہے ۔ آپ نے فرمایا : اس کی جو تلاوت کرے تو اللہ کا خوف رکھتا ہو ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل صفہ رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کو کپڑے پھٹے ہوئے یا چھوٹے ہونے کے سبب ڈھانپ رہے ہیں اور قاری انھیں قرآن سنا رہا ہے ۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت پڑھی :

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ[1]

تو کیسی ہو گی جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں۔

تو آپ پر جیسے غشی سی طاری ہو گئی۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی :

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ[2]

اگر تو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں۔

تو آپ پر گریہ طاری ہو گیا۔

رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ شعار تھا کہ جب بھی کوئی رحمت والی آیت پڑھتے تو دعا کرتے اور خوش ہوتے اور جب عذاب بیان کرنے والی آیت پڑھتے تو دعا کرتے اور اللہ کی پناہ مانگتے۔

جو بھی قرآن کو سنے اسے چاہیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو پیش نظر رکھے۔ آپ نے فرمایا: " ایسی قرأت کا کوئی فائدہ نہیں جس میں غور و فکر شامل نہ ہو "۔

قرآن کریم میں سماع قرآن کرنے والوں کی دو قسمیں بیان کی گئیں ہیں۔ ایک قسم کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا :

وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ[3]

اور ان میں سے بعض تمہارے ارشاد سنتے ہیں یہاں تک کہ جب تمہارے پاس سے نکل کر جائیں علم والوں سے کہتے ہیں ابھی انھوں نے کیا فرمایا۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی۔

---

[1] : النساء : ۴۱ [2] : المائدۃ : ۱۱۸

[3] : محمد : ۱۶

یہ تو تھے وہ لوگ جو قرآن کو اپنے کانوں سے سنتے ہیں مگر ان کے دل غیر حاضر ہوتے ہیں۔ اسی لیے ایسے لوگوں کی قرآن نے مذمت کی اور ان کے دلوں پہ مہریں لگا دیں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا	اور ان جیسا نہ ہونا جنھوں نے کہا ہم
سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ [1]	نے سنا اور وہ نہیں سنتے۔

دوسری قسم کے بارے میں یہ آیت مبارکہ دیکھئے:

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى	اور جب سنتے ہیں وہ جو رسول کی طرف
الرَّسُولِ تَرَى أَعْيُنَهُمْ	اترا تو ان کی آنکھیں دیکھو کہ آنسوؤں سے
تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا	ابل رہی ہیں۔ اس لیے کہ وہ حق کو
عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ [2]	پہچان گئے۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کی اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں توصیف فرمائی کیونکہ اپنے دلوں کو حاضر کر کے سماعِ قرآن کرتے ہیں۔

یہاں اگر میں ان تمام لوگوں کا ذکر کروں جو قرآن سننے یا تلاوت کرنے سے بے ہوش ہو گئے، جن پہ گریہ طاری ہو گیا، جو مر گئے اور جن کے اعضاء جدا ہو گئے تو بیان بہت طول پکڑ جائے گا اور انحصار نہ رہے گا البتہ کچھ کے واقعات پیش ہیں۔

زرارہ بن اوفی رضی اللہ عنہ جو صحابی تھے ایک مرتبہ امامت کر رہے تھے اور قرأت میں ایک آیت پڑھی تو وہ بے ہوش ہو گئے اور بعد میں انتقال کر گئے۔

اسی طرح ابو جہیر رضی اللہ عنہ جو تابعی تھے ان کے سامنے صالح المری نے تلاوتِ قرآن کی تو وہ بے ہوش ہو کر رحلت کر گئے۔

ابو بکر شبلی علیہ الرحمہ سے ابو علی المغازلی علیہ الرحمہ نے سماعِ قرآن کے بارے میں پوچھا کہ بعض اوقات میں قرآن کی کوئی آیت مبارکہ سنتا ہوں تو وہ مجھے ترکِ اشیاء اور دنیا

---

[1]: الانفال: ۲۱ [2]: المائدہ: ۸۳

دنیا سے منہ پھیرنے پر متنبہ کرتی ہے مگر میں کچھ دیر بعد پھر سے اپنی پہلی حالت یعنے اپنے احوال اور لوگوں کی طرف واپس آجاتا ہوں۔

شبلی علیہ الرحمہ نے جواب دیا: قرآن کی جس آیت کے ذریعے اللہ تعالے نے تمھیں اپنی طرف کھینچا وہ اس کا کرم تھا اور جب وہ تمھیں پھر سابقہ حالت کی طرف لوٹا لایا تو یہ تم پر اس کی شفقت تھی۔ اور یہ واپسی اسی لیے ہوئی کہ تم اللہ کی جانب متوجہ ہونے میں اپنی قوت و طاقت سے مبرا نہیں ہوتے۔

احمد بن ابی الحواری علیہ الرحمہ بیان کرتے ہیں کہ سلیمان دارانی علیہ الرحمہ نے کہا: بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ میں ایک ہی آیت کریمہ میں پانچ پانچ رات مسلسل مستغرق رہتا ہوں۔ اور اگر میں اس میں غور و فکر کو ترک نہ کر دیتا تو اس سے آگے نہ پڑھ سکتا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک آیت سامنے آتی رہے اور عقل اس میں پرواز کرنے لگتی ہے۔ ایسے میں وہی پاک ذات ہی اسے واپس لاتی ہے۔

جنید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ سری سقطی علیہ الرحمہ کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے سامنے ایک شخص بے ہوش پڑا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اس نے ایک آیت سنی اور ہوش جاتے رہے۔ میں نے کہا کہ اسے وہی آیت سنائی جائے جس سے یہ بے ہوش ہوا تھا۔ یہی عمل کیا گیا اور وہ شخص ہوش میں آگیا۔ سری علیہ الرحمہ کہنے لگے یہ علاج تمھیں کس طرح سوجھا؟ میں نے کہا کہ مجھے یہ معلوم تھا کہ یعقوب علیہ السلام کی بینائی چلے جانے کا سبب مخلوق (یعنے قمیص یوسف علیہ السلام) تھی اور اسی مخلوق کے ذریعے ہی ان کی بینائی لوٹ آئی تھی۔ اگر ان کی بینائی کے چلے جانے کا سبب حق ہوتا تو کبھی مخلوق کے ذریعے نہ لوٹتی۔ میرا یہ جواب ان کو بہت پسند آیا۔

ایک صوفی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک رات کو بار بار یہ آیت پڑھتے تھے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ [1] ہر جان کو موت چکھنی ہے۔

---

[1] آل عمران : ۱۸۵

اسی دوران ہاتف نے صدا دی کہ کب تک یہ آیت دہراتے چلے جاؤ گے۔ اب تک اس نے چار ایسے جنوں کو ہلاک کر ڈالا ہے جنھوں نے اپنی پیدائش سے لے کر آج تک کبھی اپنے سر آسمان کی طرف نہیں اٹھائے۔

میں نے احمد بن مقاتل عکیؒ کو کہتے سنا: میں ایک مسجد میں ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ کے پہلو کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ امام نے یہ آیت پڑھی:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ أَوْحَیْنَآ إِلَیْكَ[1] — اگر ہم چاہتے تو یہ وحی جو ہم نے تمھاری طرف کی اسے لے جاتے۔

آیت سنتے ہی انھوں نے ایک ایسی چیخ ماری کہ مجھے ڈر ہوا کہ مبادا ان کی روح پرواز کر گئی، تھوڑی دیر بعد میں نے ان کو دیکھا کہ ان پر کپکپی طاری تھی اور بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ احباب ہی کو اس طرح مخاطب کیا جاتا ہے؟

جس نے سماع قرآن اختیار کرنا ہو وہ ان آیات و احادیث اور اخبار کے مطابق اختیار کرے جو ہم نے بیان کیں۔

ہر شخص کو سماع قرآن کے لیے حضور قلب، تدبر، تفکر اور عبرت حاصل کرنا ضروری ہے اور اس کے قلب پر قرأتِ قرآن سے جو کیفیت طاری ہو گی اس کے نتیجے میں وہ اپنی کیفیات پر سماعِ قرآن کے دوران غالب رہے گا۔ اگر اس پر حال طاری نہ ہو گا اور اس کے قلب میں قرآن کے سننے سے وجد کی کیفیت پیدا نہ ہو گی اور وہ ویسے ہی جوش میں آجائے گا تو ایسے شخص کی مثال قرآن کریم کے ان الفاظ میں موجود ہے:

كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ[2] — مثال اس کی سی ہے جو پکارے ایسے کو کہ خالی چیخ پکار کے سوا کچھ نہ سنے۔

---

[1]: بنی اسرائیل: ۸۶ [2]: البقرۃ: ۱۷۱

۷۲

سماعِ قصائد و اشعار

اہل سماع کا وہ طبقہ جس نے سماعِ قصائد و اشعار کو اختیار کیا ان کا استدلال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول " بعض اشعار میں حکمت کی باتیں ہوتی ہیں " اور یہ کہ " دانائی مومن کی متاع گم گشتہ ہے " سے ہے۔

اس طبقے کا موقف یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ چونکہ کلام اس کی صفت ہے اور لا فانی و غیر مخلوق ہے للہذا جب یہ ظاہر ہو تو یہ طاقتِ بشریت سے باہر ہے کہ اس کو برداشت کر سکے۔ نہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعض حصے دوسرے حصول سے زیادہ بہتر ہوں اور نہ ہی اسے نغماتِ مخلوقہ کے ساتھ مزین کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ دوسری اشیاء آراستہ ہوتی ہیں اور یہی تمام اشیاء میں سے احسن ہے۔

ارشادِ باری تعالےٰ ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ [1]

اور بے شک ہم نے قرآن یاد کرنے کے لیے آسان فرما دیا تو ہے کوئی یاد کرنے والا۔

اور فرمایا:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو

---

[1] : القمر ۵۴ : ۱۷

جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا[1]   ضرور اسے دیکھتا جھکا ہوا پاش پاش ہوتا۔

اگر قرآن کریم کی آیاتِ بیّنات کو ان کے حقائق سمیت قلوب پر نازل فرماتا اور قرآن کی تلاوت کے دوران اس کی ہیبت و تعظیم میں سے ایک ذرہ برابر بھی قلوب پر منکشف فرماتا تو دل مارے دہشت و تحیر کے پھٹ جاتے۔

اس طبقہ کے لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ ایک شخص قرآن کو کئی بار ختم کر جاتا ہے مگر اس کے دل پر کوئی رقت تلاوت کے دوران نہیں پیدا ہوتی مگر تلاوت خوش آوازی و ترنم سے کی جاتی ہے تو اس پر وجد و رقت طاری ہو جاتی ہے اور سننے میں بھی ایک لذت حاصل کرتا ہے، پھر یہی ترنم و خوش الحانی جب کلام الٰہی سے علاوہ کسی اور کے کلام کے ساتھ استعمال کی گئی تو بھی وہ لذت و لطف سے ہمکنار رہا۔ اس تجربے سے اس طبقے والوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ تلذذ و لطف اور رقت و وجد جسے وہ قرآن سے متعلق سمجھتے تھے واقعتاً قرآن ہی سے ہوتا تو خوش الحانی و ترنم کے علاوہ تلاوت کے دوران میں جاری رہتا۔

پاکیزہ نغمگی طبائع کے موافق ہوتی ہے۔ اور اس کی نسبت حظوظ کی ہے حقوق کی نہیں، اور قرآن اللہ جل ذکرہ کا کلام ہے۔ اس کی نسبت حقوق کی ہے حظوظ کی نہیں اور ان قصائد و اشعار کی نسبت بھی حظوظ کی ہے حقوق کی نہیں۔

اگرچہ اہلِ سماع درجات و خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں مگر سماع یکساں طور پر طبائع کے موافق، حظِ نفس کا سامان اور روح کے لیے نعمت ہے۔ کیونکہ دلکش آوازوں اور پاکیزہ نغمات میں جو لطافت پنہاں ہے اس سے ہی تو سماع عبارت ہے۔

قصائد و اشعار میں رقیق مضامین، رقت، فصاحت، لطافت اور اشارات موجود ہوتے ہیں۔ اور جب ان اشعار و قصائد کو خوبصورت نغموں کی صورت میں ڈھال لیا جاتا ہے اور یہ دونوں یعنی نغمہ و شعر آپس میں ہم آہنگ ہوتے ہیں تو یہ سرمدی لذتوں سے قریب اور قلوب پر ایک لطیف سا بار بن کر نازل ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے بہت کم خطرناک ہوتے ہیں کہ یہ

---

[1] : الحشر : ۲۱

ان دونوں کا باہم مربوط ہونا مخلوق کا مخلوق سے مربوط ہونا ہے۔

جس شخص نے سماع قرآن کے بجائے سماع قصائد و اشعار کو اختیار کیا تو اس لیے کہ اسے قرآن کی تعظیم کا خیال تھا اور وہ اس خطرے سے دور رہنا چاہتا تھا کیونکہ قرآن کلامِ حق ہے اور انسانی نفس پہ اگر انوارِ حقایق ظاہر ہو جائیں اور اپنے معانی اس پر واضح کر دیں تو وہ سکڑ کر رہ جاتا ہے، اپنی اپنی حرکات سے ساکن ہو جاتا ہے اپنے حظوظ کو فنا کر دیتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب تک بشریت باقی رہتی ہے اور ہم اپنی صفات و حظوظ کے ساتھ اپنی روحوں کو دردناک نغموں اور اچھی آوازوں کے ساتھ لذت یاب کرتے ہیں۔ اس وقت تک ہماری خوشی و انبساط انہی اشعار و قصائد کے حظوظ کی بقار کے ساتھ زیادہ بہتر ہے بجائے اس کے کہ ہم کلام اللہ کی نغمگی سے انبساط حاصل کریں جب کہ کلام اللہ اُس کی صفت ہے جو اس سے ہی ظاہر ہوتی اور اسی کی طرف لوٹتی ہے۔

علمار کی ایک جماعت نے ترنم و نغمگی سے قرآن کی قرأت کو ناپسند کیا ہے۔ اور اسے ناجائز قرار دیا ہے۔

اللہ تعالے کا ارشاد ہے:

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا[1] ترجمہ: اور قرآن مجید خوب خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔

اس آیت میں ترتیل قرآن سے متعلق حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ کلامِ الٰہی حق ہے۔ لافانی ہے اور انسان اپنی حادث و فانی طبائع کے سبب اس سے دوری سی محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا عوام الناس کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی خاطر دلکش آوازوں سے مزین کر کے اسے پڑھنے کو کہا گیا ہے۔ اگر قلوب حاضر ہوں، باطن صاف ہوں، اور نفوس مؤدب ہوں تو پھر خوش الحانیوں اور خوش آوازیوں کی ضرورت ہی نہیں۔

---

[1] : المزمل : ۴

۷۴

سالکین اور مبتدئین کے احوالِ سماع

میں نے ابو عمرو عبدالواحد بن علوان رحؒ سے مالک بن طوقؒ کے گھر کے صحن میں اس سے یہ واقعہ سنا کہ ایک نوجوان جنید علیہ الرحمہ کی مجلس میں رہتا تھا وہ جب بھی کوئی تصوف کا نکتہ ان کی زبانی سنتا تو اس کی چیخ نکل جاتی ۔جنید علیہ الرحمہ نے ایک دن اس سے کہا : اگر تو نے یہ حرکت دوبارہ کی تو میں تجھے اپنی مجلس سے نکال دوں گا ۔ اس کے بعد جنید علیہ الرحمہ جب بھی کوئی تصوف کا بحث چھیڑتے تو اس نوجوان کا رنگ متغیر ہو جاتا مگر اس قدر ضبط سے کام لیتا کہ اس کے ہر موئے بدن سے پانی کا قطرہ ٹپک پڑتا ۔ مجھے ابو عمرو نے یہ بتایا کہ اسی نوجوان نے ایک روز اس زور سے چیخ ماری کہ دل پھٹ گیا اور دنیا سے گذر گیا ۔

میں نے خواص علیہ الرحمہ کے ایک مرید ابو الحسین سیروانیؒ کو دمیاط میں جنید علیہ الرحمہ کے بارے میں کہا کہ انھوں نے کہا : میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے سماع سنا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ۔ اور ایک دوسرے شخص کو دیکھا کہ اس نے ذکر سنا اور مر گیا ۔

میں نے محمد بن داؤد الدقی علیہ الرحمہ سے سنا کہ انھوں نے کہا : ابو الحسین درّاجؒ نے کہا کہ میں اور ابن الفوطیؒ بصرہ اور ابلہ کے درمیان دجلہ پر سے گذر رہے تھے کہ ہماری نظر ایک نہایت خوش منظر محل پر پڑی جس کے جھروکے میں ایک شخص بیٹھا تھا اور ایک مغنّیہ اس کے سامنے کھڑی یہ شعر گا رہی تھی ؎

کل یوم تتلون غیر هذا بك اجمل

فی سبیل الله ودّ کان منی لك یبذل

ترجمہ: میری محبت تو تیرے لیے اللہ کی راہ میں صرف کی جارہی ہے مگر تو ہے کہ ہر روز رنگ بدلتا ہے یہ طریق تیرے لیے اچھا نہیں۔

اسی وقت محل کے نیچے ایک نوجوان پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہاتھ میں چھاگل لیے یہ شعر سن رہا تھا۔ اس نے گانے والی لڑکی سے کہا: اے لڑکی! تجھے اللہ اور اپنے آقا کی قسم! مجھے یہی شعر پھر ایک بار سناؤ۔ لڑکی نے پھر شعر سنایا۔ نوجوان نے کہا: بخدا! میرا حال بھی حق تعالےٰ کے ساتھ ہے کہ ہر روز رنگ بدلتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے ایک آہ بھری پھر الحمدللہ کہا اور ہم نے ٹٹولا تو وہ بے جان تھا۔

اس کے بعد ہم وہاں ٹھہر گئے کیونکہ ایک فرض کی ادائیگی ہم پر لازم ہوگئی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ گانے والی لڑکی کو اس کے مالک نے کہا: جا تو آج سے اللہ کی راہ میں آزاد ہے۔ اس کے بعد ہم نے یہ بھی دیکھا کہ بصرہ کے لوگ آئے، اس نوجوان کا جنازہ پڑھا اور جب اس کو دفن کر چکے تو اس محل کے مالک نے بآواز بلند کہا: کیا تم مجھے نہیں جانتے کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں میں تم سب لوگوں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اپنی تمام ملکیت اللہ کی راہ میں قربان کرتا ہوں، میری تمام کنیزیں آزاد ہیں اور یہ محل آج سے مسافروں کے لیے وقف کرتا ہوں اس کے بعد اس نے اپنا لباس اتار پھینکا ایک چادر کو ازار بنایا دوسری کو اوڑھ لیا اور ایک طرف کو چل دیا لوگ اسے دیکھتے رہے اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ لوگ یہ منظر دیکھ کر رو پڑے۔ بہت عرصہ بعد تک نہ اس شخص کو کسی نے دیکھا اور نہ اس کی کوئی خبر سنی میں نے اس واقعے سے بڑھ کر معنی خیز اور یاد رہنے والا واقعہ کبھی نہیں دیکھا۔

میں نے احمد بن علی وجیہیؒ سے اور انھوں نے کہا کہ میں نے ابو علی رودباریؒ کو یہ کہتے سنا کہ میں مصر میں داخل ہوا تو لوگوں کو صحرا کی جانب سے واپس آتے ہوئے دیکھا۔ میرے دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ ہم ایک نوجوان کے جنازے سے آرہے ہیں جس نے کسی کو ایک شعر کہتے ہوئے سنا اور چیخ مار کر مرگیا۔ شعر یہ تھا ؎

کبرت همه عبد طمعت فی ان تراکا
او ما حسب لعین ان تری من قد راکا

ترجمہ: اس شخص کی ہمت بلند ہے جس نے تجھے دیکھنے کی خواہش کی۔ کیا آنکھ کے لیے یہی کافی نہیں کہ اسے دیکھ لے جس نے تجھے دیکھا ہو۔

دقی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ ابن الجلاّ علیہ الرحمہ سے سنا اور انھوں نے کہا، میں نے مغرب میں دو واقعے بڑے عجیب نوعیت کے دیکھے۔ ایک یہ کہ میں نے جامع قیروان میں ایک شخص کو صفوں کے آگے سے گذرتا ہوا دیکھا جو لوگوں سے کچھ مانگتے ہوئے کہہ رہا تھا : اے لوگو! مجھے صدقہ وخیرات دو، کیونکہ میں صوفی منش تھا اور اب ضعیف ہوگیا ہوں۔ دوسرا واقعہ یہ کہ میں نے دو شیوخ دیکھے جن میں سے ایک کا نام جبلہ اور دوسرے کا نام زریق تھا۔ دونوں کے شاگرد اور مریدین بھی تھے۔ ایک روز زریق اور اس کے مریدین جبلہ سے ملنے گئے تو وہاں زریق کے ایک مرید نے قرآن کی تلاوت کی جسے سن کر جبلہ کے ایک مرید نے چیخ ماری اور جان دے دی۔ وہ دن گذرا اور صبح ہوئی تو جبلہ نے زریق سے کہا کہ آپ کا وہ مرید کہاں ہے جس نے کل تلاوت کی تھی۔

اس شخص کو بلایا گیا تو جبلہ نے اس سے تلاوت کرنے کو کہا، اس نے تلاوت کی تو جبلہ نے چیخ ماری اور قاری کی روح پرواز کر گئی۔ اس پر جبلہ نے کہا : ایک کے بدلے ایک (دنیا سے رخصت ہوگیا) اور جس نے اس کی ابتدا کی وہ زیادہ ظالم ہے۔

محمد بن یعقوب علیہ الرحمہ نے جعفر مبرقع علیہ الرحمہ جو اجل صوفیہ میں سے تھے، کا یہ واقعہ بیان کیا کہ وہ ایک مرتبہ کسی جگہ محفل سماع میں موجود تھے کہ اچانک وجد میں آکر کھڑے ہوگئے اور اسی کیفیت میں کہا : مریدین کا سلسلہ ہم پر ختم کر دیا گیا۔

طالب کے لیے اس وقت تک سماع درست نہیں جب تک کہ وہ اسماء و صفاتِ الٰہیہ سے باخبر نہ ہو۔ تاکہ وہ ایسی صورت میں اللہ سے اسی بات کو منسوب کرے جو شایانِ بارگاہِ خداوندی ہو۔ اس کا قلب حبِ دنیا یا تعریف پسندی سے ملوث نہ ہو، اس کے دل میں نہ تو لوگوں سے طمع ہو اور نہ ہی مخلوقات کی طرف جھکاؤ۔ اور وہ اپنے قلب کی دیکھ بھال کرتا ہو، اپنے حدود کی حفاظت کرتا ہو اور اپنے وقت کا محافظ ہو۔ اگر وہ ان مذکورہ شرائط کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سماع کو اختیار کرے تو بلاشبہ اس کا یہ طریقِ سماع تابعین،

سیر الی اللہ کرنے والے اور اللہ کا خوف رکھنے والے صوفیہ کے طریق سماع میں داخل ہوگا اور ایسے میں وہ جو کچھ سنے گا وہ اسے مجاہدہ و معاملہ پر ابھارے گا۔ اسے چاہیئے کہ بتکلیف سماع اختیار نہ کرے اور نہ ہی تلذّذ کے لیے سنے تاکہ کہیں اس طرح کی عادت اسے عبادت اور حفاظتِ قلب سے غافل نہ کر دے۔

اگر کہیں بھی اسے اس طرح کی شرائط کے مطابق سماع کرنے کا موقع نہ مل سکے تو اسے چاہیئے کہ سماع کو ترک کر دے فقط وہیں پر سماع اختیار کرے جہاں ایسا ذکر جاری ہو جو اسے اللہ سے تعلق جوڑنے، اسے یاد کرنے اسی کی حمد و ثنا بیان کرنے اور اس کی رضا چاہنے پر آمادہ کرے۔ اگر تو مبتدی ہو اور شرائط و آدابِ سماع سے بے خبر تو اسے شیوخ سے رجوع کر کے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لینی چاہئیں تاکہ وہ لہو ولعب کا شکار ہو کر شیطان کے دھوکے میں آ کر فقط لذتِ نفس میں ہی گرفتار ہو کر نہ رہ جائے۔

۷۴

متوسط درجے کے شیوخ کا سماع

میں نے وجیہی علیہ الرحمہ سے اور انھوں نے طیالسی رازی علیہ الرحمہ کو یہ کہتے سنا کہ میں ذوالنون علیہ الرحمہ کے استاد اسرافیل علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ زمین پر بیٹھے اپنی انگلیوں سے کچھ کرید رہے تھے اور ساتھ ساتھ کچھ ترنم سے پڑھ رہے تھے۔ جب مجھے دیکھا تو کہا: کیا تم کوئی چیز خوبصورت آواز سے پڑھ سکتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں۔ انھوں نے فرمایا: تمھارا تو دل ہی نہیں ہے۔

میں نے ابوالحسن علی بن محمد صَیرفیؒ سے اور انھوں نے روُیمؒ کو جب کہ ان سے پوچھا گیا کہ انھوں نے مشائخ کو سماع کے وقت کیسا پایا؟ یہ کہتے ہوئے سنا: میں نے انھیں سماع کے دوران اس طرح پایا کہ جیسے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں بھیڑیا گھس جائے۔

میں نے قیس بن عمر حمصی علیہ الرحمہ سے سنا: وہ کہتے ہیں کہ میرے پاس ابوالقاسم بن مروان نہاوندی تشریف لائے اور یہ ابوسعید خراز کی صحبت میں بھی رہ چکے تھے۔ یہ ایک عرصے سے سماع چھوڑ چکے تھے۔ میرے ساتھ ایک دعوت میں کسی شخص کو انھوں نے اشعار پڑھتے ہوئے سنا جس میں سے ایک مصرع یہ تھا۔

ع   واقف فی الماء عطشان ولکن لایسقی

ترجمہ: پانی کے بیچ میں پیاسا کھڑا ہے مگر اسے پانی نہیں پلایا جاتا۔

ہمارے سارے ساتھی اٹھتے تھے اور وجد کرتے تھے جب سب خاموش ہو گئے تو القاسم نے ہر ایک سے اس مصرع کا مفہوم پوچھا اور اکثر نے یہ مفہوم بیان کیا کہ مصرع میں پیاس

سے مراد احوال کی پیاس ہے۔ اور یہ کہ بندہ روکا گیا ہوتا ہے اس حال سے جس کی اس کو تشنگی ہوتی ہے۔ مگر اس مفہوم سے کسی کو تشفی نہ ہوتی تھی۔ بالآخر سب نے ابوالقاسم سے پوچھا کہ آپ اس کا مفہوم بتائیں اور انھوں نے کہا: اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ بندہ احوال کے وسط میں کھڑا ہوتا ہے اور تمام طرح کی کرامات اس کے اردگرد ہوتی ہیں مگر ان میں ایک ذرہ بھی اسے نہیں دیا گیا ہوتا۔

میں نے یحییٰ بن رضا علوی سے بغداد میں سنا اور انھوں نے مجھے یہ واقعہ لکھا بھی تھا۔ ان کے مطابق ابوحلمان نام کے ایک صوفی نے گلی میں پودینہ بیچنے والے ایک شخص کو یہ آواز لگاتے سنا:

یَا سَعْتَرَ ابَرّی

(جنگلی پودینہ!)

اور سنتے ہی غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش میں آیا تو پوچھا گیا کہ غشی کا کیا سبب تھا؟ اس نے کہا: میں نے پودینہ بیچنے والے کی آواز کو یوں سنا کہ جیسے وہ کہہ رہا ہو، اسع تری برّی (کوشش کروگے تو میرے احسان کو پالوگے)۔

اسی قصّے کو سامنے رکھتے ہوئے بیشتر مشائخ و علماء نے یہ وضاحت کی کہ سماع کا ہر سامع پر اس کے وقت، حال اور کیفیت کے مطابق اثر ہوتا ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور حکایت یہ ہے کہ عتبۃ الغلام علیہ الرحمہ نے کسی شخص کو یہ شعر کہتے سنا ؎

سبحان جبار السماء

ان المحب لفی عناء

ترجمہ: آسمان کا پیدا کرنے والا رب پاک ہے اور اس میں شک نہیں کہ محبت کرنیوالا تکلیف میں ہے۔

عتبہ نے شعر سن کر کہا تو نے سچ کہا۔ اور ایک دوسرے شخص نے سن کر کہا تو نے جھوٹ بولا۔ اس پہ ایک شیخ نے جو ان کیفیات سے واقف تھا، کہا: دونوں نے

ٹھیک کہا۔ عتبہ نے محبت میں اپنی مشکلات وآلام کی بنا پر کہا کہ سچ ہے اور دوسرے نے محبت میں راحت وآرام پانے کی بنار پر کہا کہ جھوٹ ہے۔

احمد بن مقاتل علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ ذوالنون مصری علیہ الرحمہ بغداد میں داخل ہوئے تو بہت سے صوفیاء ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اور ان کے ہمراہ ایک قوال بھی تھا۔ انھوں نے ذوالنون سے عرض کیا کہ وہ قوال کو کچھ سنانے کی اجازت مرحمت فرمائیں! ور انھوں نے اجازت دے دی۔

قوال نے یہ شعر گائے ؎

صغیرھواك عذبنی　　فکیف بہ اذا احتنکا

وانت جمعت من قلبی　　ھوىً قدکان مشترکا

اما ترثی بمکتئب

اذا ضحك الخلی بکی

ترجمہ: تیری تھوڑی محبت نے مجھے مبتلائے عذاب کر دیا اس وقت کیا حالت ہوگی جب یہ پوری طرح مجھ پر غالب آجائے گی۔

تو نے میرے دل کی وہ ساری محبت اپنے لیے اکٹھی کرلی جو دوسروں کے لیے بھی مشترک تھی۔

کیا تو اس مبتلائے غم پر ترس نہیں کھائے گا کہ محبت سے عاری لوگ تو ہنستے ہیں اور وہ روتا ہے۔

اشعار سن کر ذوالنون کھڑے ہوتے اور پھر منہ کے بل گر پڑے ان کے بعد ایک اور شخص بتکلف وجد کرتا ہوا اٹھا تو ذوالنون علیہ الرحمہ نے اس سے کہا: ذرا اس ذات والا صفات کی طرف بھی توجہ کرو، جو تمھاری اس بناوٹ کو دیکھ رہی ہے۔

ذوالنون علیہ الرحمہ نے اس بتکلف وجد کرنے والے سے جو کچھ کہا اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس کا قیام خالصتاً اللہ کے لیے نہیں تھا۔ اگر اس شخص کا وجد حقیقی ہوتا تو وہ نہ بیٹھتا ذوالنون علیہ الرحمہ کو کیونکہ اس کے وجد کا علم ہو گیا اس کا جواب یہی ہے کہ مشائخ اپنے سے

کم تر صوفیہ کے احوال کو اپنی قوتِ معرفت کے ذریعے جان لیتے ہیں۔ اور ان کے ذمہ پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ انھیں اپنی حدود سے تجاوز نہ کرنے دیں اور نہ ہی انھیں دوسروں کی کیفیت کا دعویدار بننے دیں۔

ابوالحسین نوری علیہ الرحمہ نے ایک مجلسِ سماع میں یہ شعر سنا ؎

مازلت انزل من ودادك منزلا

تتحیر الالباب عند نزوله

ترجمہ: میں ہمیشہ تیری الفت و محبت میں ایک ایسے مقام پہ فائز رہا کہ عقل وہاں تک پہنچنے پر ورطۂ حیرت میں پڑ گئی۔

شعر کا سننا تھا کہ وہ اٹھے اور وجد کرتے ہوئے چکر آنے لگے تو بانس کے ایک کھیت میں گر پڑے جسے تازہ کاٹا گیا تھا اور اس کے جڑ کے قریب حصے باقی تھے جو تلواروں کی طرح کھڑے تھے۔ وہ اٹھ کر ان پہ چلنے لگے اور صبح تک یہی شعر پڑھتے رہے۔ خون ان کے پاؤں سے جاری تھا بعد میں ان کے پاؤں اور پنڈلیاں متورم ہوگئیں جس کے نتیجے میں وہ چند دن زندہ رہ کر انتقال کر گئے۔

ابوسعید خراز کہتے ہیں کہ میں نے علی بن موفق جو اجل شیوخ میں سے تھے کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ ایک مجلسِ سماع میں موجود تھے انھوں نے کوئی کلام سنا اور کہنے لگے کہ مجھے کھڑا کر دو۔ حاضرین نے انھیں کھڑا کر دیا، وہ وجد کرنے لگے اور اسی حالت میں کہا کہ میں رقص کرنے والا شیخ ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ انھوں نے خود کو رقص کرنے والا اس لیے کہا کہ وہ اس طرح اپنے حال کو اپنے حبیبوں اور ساتھیوں سے چھپانا چاہتے تھے اور ان کا ایسا کہنا حسنِ ادب بھی ہے کیونکہ اس طرح کہنے سے وہ خود رفتگی اور تسکین سے بچ رہتا ہے جو مبتدیوں کے احوال میں سے ہیں۔

میرے کچھ دوستوں نے بتایا کہ ابوالحسین دراج علیہ الرحمہ نے کہا کہ میں نے بغداد سے یہ ارادہ کیا کہ یوسف بن الحسین علیہ الرحمہ سے رے میں جا کر ملاقات کروں اور انھیں سلام کروں۔ جب میں رے کے علاقے میں داخل ہوا تو ان کی رہائش گاہ کے بارے میں

لوگوں سے پوچھا۔ مگر ہر ایک نے یہی کہا کہ اس زندیق سے مل کر کیا کرو گے؟ یہاں تک کہ یہ بات سنتے سنتے میں تنگ آگیا اور واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اور وہ رات ایک مسجد میں گذاری۔ صبح ہوئی تو میں نے سوچا کہ اتنی دور سے آیا ہوں تو اب انھیں کم از کم دیکھتا تو چلوں۔ اور میں نے پھر سے ان کی رہائش گاہ کا پتہ لوگوں سے پوچھا بہر حال میں اس مسجد تک پہنچ گیا جہاں وہ مقیم تھے۔ مسجد میں داخل ہوا تو انھیں محراب میں بیٹھا ہوا پایا۔ ان کے سامنے رحل میں قرآن کریم پڑا ہوا تھا اور وہ تلاوت کر رہے تھے۔ شیخ خوش شکل اور خوش ریش تھے۔ میں ان کے قریب گیا، سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ میں اُن کے رو برو بیٹھ گیا۔ انھوں نے پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا بغداد سے۔ پھر پوچھا: کس لیے؟ میں نے جواباً کہا: سلام عرض کرنے کے لیے۔ کہنے لگے، اگر تمھیں کسی شہر میں کوئی شخص یہ کہتا، میرے پاس ٹھہرو میں تمھیں گھر اور لونڈی خرید دوں گا تو کیا تم میری طرف آنے سے رک جاتے۔ میں نے عرض کیا، مجھے میرے اللہ نے اس طرح کی آزمائش میں ڈالا ہی نہیں اور اگر مبتلا کر دیتا تو مجھے معلوم نہیں کہ میری کیا حالت ہوتی۔ پھر انھوں نے سوال کیا کہ کیا تم کوئی کلام خوش آوازی سے پڑھ سکتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، انھوں نے کہا کہ سناؤ اور میں نے یہ شعر سنائے ؎

رایتك تبنی دائماً فی قطیعتی ولو کنت ذا حزم لھدمت ماتبنی
کأنی بکم واللیت افضل قولکم الا لیتنا کنا اذا اللیت لا تغنی

ترجمہ: (۱) میں نے تمھیں ہمیشہ میرے ساتھ تعلق توڑنے کی بنیاد ڈالتے دیکھا ہے اگر عقل مند ہوتا تو ایسی ہر بنیاد کو گرا دیتا۔

(۲) میں تیرے ساتھ ہوتا ہوں اور تیری گفتگو کا اکثر حصہ اے کاش کے لفظ پر مشتمل ہوتا ہے کاش کہ ہم اس طرح ایک دوسرے سے متعلق ہوتے کہ اُس میں اے کاش کے لفظ کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

یہ اشعار سنتے ہی انھوں نے قرآن کریم کو رکھ دیا اور اس قدر گریہ طاری ہوا کہ ڈاڑھی اور کپڑے تر ہو گئے، ان کی حالت قابل رحم تھی۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا بیٹے!

رسے کے لوگوں کو مجھے زندیق کہنے پر ملامت نہ کرو کیونکہ میں صبح کی نماز سے بیٹھا تلاوت کر رہا ہوں مگر میری آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا مگر ان دو شعروں نے تو مجھ پر قیامت برپا کر دی۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ اس شعر پر بہت کثرت سے وجد کیا کرتے تھے ؎

ودادکم هجرٌ و حبکم قلی

و وصلکم صرم و سلمکم حرب

ترجمہ: تیری دوستی جدائی ہے تو تیرا پیار غصہ اور تیرا وصل قطعِ تعلق ہے تو تیری صلح، جنگ۔

دقی علیہ الرحمہ ایک شب کو آدھی رات تک وجد کی حالت میں سر کے بل گرتے اور اٹھتے رہے۔ لوگوں کی حالت یہ تھی کہ رُو رہے جاتے تھے اور قوال یہ شعر گا رہے تھے ؎

باللہ فاردد فؤاد مکتئبٍ

لیس لہ من حبیبہ خلفٌ

ترجمہ: خدارا! اس دل گرفتہ کا دل لوٹا دو جس کے لیے اس کے حبیب کا کوئی بدل ہی نہیں۔

سماع کے بارے میں مخصوص اہلِ کمال صوفیاء کا طرزِ عمل

ابوالحسنؒ احمد بن محمدؒ سے میں نے بصرہ میں سنا اور انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے والد سے سنا اور انھوں نے فرمایا:

میں نے ساٹھ برس سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ کی خدمت کی مگر کبھی قرآن کریم یا کوئی کلام سننے سے ان کے چہرے پہ کوئی تغیر نہیں دیکھا۔ عمر کے آخری دنوں میں کسی نے ان کی موجودگی میں یہ آیت تلاوت کی:

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ الخ[1] — تو آج نہ تم سے کوئی فدیہ لیا جائے الخ

میں نے انھیں آیت سننے کے بعد دیکھا کہ وہ کپکپائے اور قریب تھا کہ گر پڑتے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو میں نے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے کہا: ہاں پیارے اب ہم ضعیف ہو چکے ہیں۔

ابن سالم علیہ الرحمۃ نے بھی اپنے والد سے سنا کہ انھوں نے کہا میں نے سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ کو دوسری بار اس طرح دیکھا کہ میں ان کے روبرو بیٹھا آگ تاپ رہا تھا اور ان کے شاگردوں میں سے ایک نے سورہ فرقان پڑھنا شروع کی۔ جب وہ "الملك يومئذٍ الحق للرحمٰن" تک پہنچا تو سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ مضطرب ہو گئے اور قریب تھا کہ

---

[1] الحدید: ۱۵

گر پڑتے۔ میں نے ان سے اس کا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ اس کا سبب میری ضعیفی ہے۔

میں نے ابن سالم علیہ الرحمہ کو یہ کہتے سنا کہ میں نے سہل بن عبداللہ سے کہا کہ آپ کی مراد تغیّر و اضطراب سے اپنے حال کا کمزور ہو جانا ہے۔ یہ بتائیے کہ حال کس طرح قوی ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا: مجھ پر واردات بھی ہوتی ہیں میں انھیں اپنے حال کی قوت سے برداشت کر لیتا ہوں یہی وجہ ہے کہ واردات کتنی بھی قوی کیوں نہ ہوں اس کو متغیّر نہیں کر سکتیں۔

اسی ضمن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا قول علم تصوف میں ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ قول آپ نے اس موقع پر کہا جب انھوں نے ایک شخص کو قرآن پاک کی تلاوت کے دوران روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

"ہماری حالت بھی ایسی ہی تھی یہاں تک کہ بعد میں ہمارے دل سخت ہو گئے۔" یعنے مضبوط اور ثابت قدم ہو گئے۔ لہٰذا ایسی حالت میں سماع سے ان میں کوئی تغیّر نہ پیدا ہوتا کیونکہ ان کی حالت سماع سے پہلے اور بعد میں یکساں ہوتی تھی۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ میری حالت نماز سے پہلے اور نماز کے دوران ایک جیسی رہتی ہے۔ کیونکہ ان کا قلب پہلے سے ہی صاف، حاضر اور اللہ کی طرف لگا ہوا ہوتا ہے اور یہی کیفیت نماز کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا نماز کے دوران انھیں تغیّر کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور ان کی کیفیت نماز میں بھی وہی رہتی ہے جو نماز سے قبل ہوتی ہے۔

اسی اصول کو بنیاد بناتے ہوئے ان کی سماع کے دوران وہی کیفیت ہوتی ہے جو اس سے پہلے ہوتی ہے اس طرح ان کا سماع اور وجد مسلسل رہتا ہے ان کی تشنگی جاری رہتی ہے اور ان کی سیری ہمیشہ متصل رہتی ہے۔ جب ان کی سیری میں اضافہ ہوتا ہے تو تشنگی بھی بڑھتی ہے اور اس طرح ان کا تعلق ہمیشہ اللہ کے ساتھ قائم رہتا ہے۔

احمد بن علی الکرجی المعروف بہ الوجیہی کہتے ہیں: صوفیہ کی ایک جماعت حسن قزاز علیہ الرحمہ کے گھر میں موجود تھی اور قوال بھی تھے جو گاتے جاتے تھے اور وہ سب وجد کرتے جاتے تھے کہ اتنے میں ممشاد علیہ الرحمہ وہاں آ نکلے جب ان کی نظر ان پر پڑی تو سب خاموش ہو گئے۔ ممشاد علیہ الرحمہ نے کہا: کیا بات! تم سب خاموش کیوں ہو گئے۔ اسی حالت پر

پر لوٹ جاؤ جس پر تھے۔ اگر دنیا کے تمام ساز بھی چھیڑ دیئے جائیں تو یہ میرے دل کو میرے رب سے غافل نہیں کر سکتے۔

ممشاد علیہ الرحمۃ کی جو کیفیت بیان ہوئی ہے وہ بھی کچھ عجیب نہیں کیونکہ اہلِ کمال کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ کسی خارجی واردات کے لیے ان کے اندر کوئی توجہ موجود ہی نہیں ہوتی اور ان کے طبائع اور بشریت میں سے اگر کوئی حاسہ باقی بھی ہوتا ہے تو بدلا ہوا اور نہایت آراستہ کہ نغمات و ترنم سے یا خوش الحانیوں سے کوئی لذت حاصل نہیں کرتا کیونکہ ایسے لوگوں کے غم جدا اور ان کے باطن پاک ہوتے ہیں ان پر لوگوں سے ملنا، ظلماتِ نفس اور حواس کی کدورتیں اثر انداز ہی نہیں ہو سکتیں اور یہ مقام اللہ ہی جاہے جس کو عطا کرے۔

ابو القاسم علیہ الرحمۃ سے کہا گیا کہ آپ قصائد بھی سنتے ہیں اور اپنے مریدین کے ساتھ سماع میں وجد کی حالت میں حرکت بھی کرتے رہتے ہیں مگر اس وقت بالکل ساکت کیوں ہیں؟ اس پر حضرت جنید علیہ الرحمۃ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً	اور تو دیکھے گا پہاڑوں کو خیال کرے گا کہ
وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ	وہ جمے ہوئے ہیں اور وہ چلتے ہوں گے
اللّٰهِ الَّذِيْ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ[1]	بادلوں کی چال۔ یہ کام ہے اللہ کا جس نے حکمت سے بنائی ہر چیز۔

گویا انھوں نے اس آیت کریمہ سے اس طرف اشارہ کیا کہ تم تو میرے ظاہری سکون اور طمانیت کو دیکھ رہے ہو مگر یہ نہیں جانتے کہ میرا دل اس وقت کس حال میں ہے۔ یہ کیفیت بھی سماع میں اہل کمال ہی کا وصف ہے۔

صوفیہ اور محافلِ سماع

اس طرح کے باکمال صوفیہ کم ہی محافلِ سماع میں جاتے ہیں اور اگر جاتے ہیں تو اس کی

---

[1] النمل: ۸۸۔

بھی مختلف وجوہات ہیں۔ بعض اوقات تو وہ اپنے کسی بھائی (صوفی) سے تعاون کی خاطر ایسا کرتے ہیں اور کبھی اس لیے کہ وہ اپنی علمی وجاہت اور علم تصوف میں تبحر کی بنا پر چلے جاتے ہیں تاکہ وہ وہاں جا کر محفل سماع کے آداب اور شرائط سے لوگوں کو آگاہ کریں اور بعض مرتبہ تو اپنے مشرب سے ہٹ کر دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی محفلِ سماع میں چلے جاتے ہیں فقط ان کا دل رکھنے کے لیے اور اخلاقاً مگر ایسی صورت میں اگرچہ وہ بظاہر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوتے ہیں مگر بباطن ان سے جدا۔

۷۶

ذکر، وعظ اور اقوال سننے کا بیان

ابوبکر زقاق علیہ الرحمہ کے حوالے سے مجھ تک یہ بات ابوبکر محمد بن داؤد دینوری الدقی علیہ الرحمہ کے ذریعے پہنچی۔ زقاق کہتے ہیں کہ میں نے جنید علیہ الرحمۃ سے توحید کے بارے میں ایک گفتگو سنی جس نے چالیس برس تک مجھے متاثر کئے رکھا اور اس کے بعد بھی ایک بیہوشی کی سی کیفیت جاری رہی۔

جعفر خلدی علیہ الرحمۃ کا کہنا ہے کہ خراسان کا ایک باشندہ ابوالقاسم جنید علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے ابوالقاسم! کس وقت بندے کے لیے اس کی تعریف اور تنقیص یکساں ہو جاتی ہے؟ جنید علیہ الرحمۃ کے ہاں بیٹھے کچھ مشائخ میں سے ایک نے جواب دیا جب بندے کو اسپتال داخل کیا جائے اور اسے دو ہتھکڑیاں پہنا دی جائیں۔ اس پر ابوالقاسم نے اس شیخ سے کہا یہ تمہارا معاملہ نہیں اور اس شخص کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: اس بندے کے لیے تعریف و تنقیص برابر ہو جاتی ہے جب اُسے یہ مکمل یقین ہو جائے کہ وہ مخلوق ہے۔ یہ سن کر اس شخص نے ایک چیخ ماری اور وہاں سے چل دیا۔

یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ دانش مندی اللہ کے عساکر میں سے ایک فوج ہے جس کے ذریعے وہ اولیاء کرام کے دلوں کو تقویت بخشتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بات جب دل سے نکلتی ہے تو دل میں اتر جاتی ہے اور جب فقط زبان سے ادا ہوتی ہے تو کانوں سے آگے نہیں بڑھتی۔

الغرض اس طرح کے واقعات بے شمار ہیں کہ لوگوں نے کوئی ذکر، وعظ یا اچھی بات سنی اور ان کے باطن میں ایک وجد اور سوزش کی سی حالت پیدا ہو گئی۔

کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس کی آنکھیں تمہیں اس کی باتوں سے دور نہیں لے جاتیں اس کی باتوں سے تمہیں نصیحت نہیں مل سکتی۔

ابو عثمان حیری علیہ الرحمۃ کا قول ہے: ایک دانش مند کا فعل جو وہ ہزار آدمیوں کے سامنے پیش کرے وہ ہزار آدمیوں کے ایک آدمی کو پند و نصیحت کرنے سے کہیں زیادہ نفع بخش ہے۔

غیب سے جو واردات و اثرات سنے یا دیکھے جاتے ہیں دلوں پر بہت قوی اثر مرتب کرتے ہیں بشرطیکہ دل پاک اور ان سے ہم آہنگ ہوں وگرنہ بصورت دیگر یہ اثر کمزور ہوتا ہے۔ مگر اہل استقامت و اہلِ صدق و کمال اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ وہ اس مقام سے گذر چکے ہوتے ہیں۔ اور احساسِ تمیز سے مبرّا ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے وہ ان اثرات سے متغیر نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض اوقات ان کے اذکار کی تجدید کر دی جاتی ہے جن کے ساتھ وہ سنتے ہیں اور ان کی روحانیت کی تجدید کر دی جاتی ہے جب وہ حکمت کی باتیں سنتے ہیں۔

الغرض صوفیہ کے سماع کے بارے میں ہم نے جو کچھ بیان کیا اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ جو کچھ قرآن کریم سے یا قصائد و ابیات وغیرہ کی صورت میں سنتے ہیں اس سے ان کی مراد فقط حسنِ نغمہ اور خوش آوازی سے تلذذ نہیں ہوتا بلکہ رقت ہیجان اور وجد کی کیفیات تو ان کے باطن میں خوش الحانیوں اور نغمگیوں کے بغیر بھی موجود ہوتی ہیں جب کہ سکون و طمانیت کی کیفیت آوازوں اور نغموں کے ہوتے ہوئے بھی ان کے اندر موجود ہوتی ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جو کچھ بھی سنتے ہیں اس سے ان کی کیفیت وجد کو تقویت ملتی ہے۔

۷۷

سماع سے متعلق کچھ اور باتیں

ہم اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ سماع کا سارا دارو مدار سننے والوں کی اندرونی کیفیات پر ہے کہ وہ کس طرح سے اسے سنتے ہیں اور اس سے ان کی باطنی روحانی ہم آہنگی ہے کہ نہیں۔ جب وہ کوئی کلام سنتے ہیں اور وہ ان کے وقت اور حال سے موافقت رکھتا ہو تو اس سے ان کے باطنی اسرار اور ضمیر کو تقویت ملتی ہے۔ ایسے میں وہ جو کچھ کہتے ہیں، اپنے وجد کی بنا پر کہتے ہیں۔ اور جو اشارہ کرتے ہیں اپنے ارادے اور صدق کی بنا پر کرتے ہیں۔ ان کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ شاعر یا کہنے والے کی اپنے کلام سے کیا مراد ہے۔

قاری کی غفلت انھیں کسی طرح بھی پریشان نہیں کر سکتی کیونکہ وہ خود ہوشیار رہتے ہیں اور انھیں ذاکر کی پراگندگی سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود اپنے حواس جمع رکھتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کے احوال ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے اوقات باہم مشابہ ہو جاتے ہیں اور دونوں کے ارادے ایک سے، ایسے میں حال قوی تر، وقت خالص تر اور اسباب پوشیدہ تر ہوتے ہیں۔ اور جب اللہ کی توجہ اور توفیق ان کے شامل حال ہو تو وہ جملہ حالات میں لغزشوں سے محفوظ اور اسباب سے مبرا ہوتے ہیں۔

اب اسی ضمن میں چند حکایات بیان کی جاتی ہیں:

محمد بن سروق بغدادی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں : میں اپنے دورِ جاہلیت میں ایک رات نشے کی حالت میں باہر نکلا اور شعر گانے لگا ؎

بطیزناباذ کرمٍ ما مررت بہ
الا تعجبت ممن یشرب الماء

ترجمہ : طیزناباذ کے مقام پر انگور کے باغ ہیں۔ اور میں جب بھی وہاں سے گذرا ہوں تو مجھے اس بات نے حیران کر دیا کہ وہاں کے لوگ پھر بھی پانی پیتے ہیں۔

میں یہ شعر گا ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں کسی کی آواز پڑی جو اسی بحر میں یہ گیت گا رہا تھا ؎

وفی جھنم ماءٌ ما تجرّعہٗ
حلق فابقی لہ فی الجوف امعآءَ

ترجمہ : جہنم میں ایسا پانی ہے جو حلق سے اترتے ہی پیٹ میں انتڑیوں کو تباہ کر دیتا ہے۔

یہی شعر میری توبہ اور علم تصوف و عبادت کی طرف متوجہ ہونے کا سبب بنا۔

یہاں اس بات کو دیکھئے کہ جب اللہ کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی تو اس کے اندر سے باطل کا صفایا ہو گیا۔ اور اس کا باطل ہی اس کے لیے اللہ کی توفیق کے ذریعے نجات کا سبب بن گیا۔

ابوالحسن بن رزعانؒ کہتے ہیں کہ میں ایک شخص کے ساتھ بصرہ کے باغات میں سے گذر رہا تھا کہ میں نے کسی کو طنبور پر یہ شعر گاتے ہوئے سنا ؎

یاصباح الوجوہ ما تنصفونا
طول ذاالدھر کلکم تظلمونا
کان فی واجب الحقوق علیکم
اذ بلیغا بحبکم تنصفونا

ترجمہ : اے حسین چہرے رکھنے والو ! جو انصاف تم ہمارے ساتھ ایک طویل عرصہ

سے کر رہے ہو وہ دراصل تم سب ہمارے ساتھ ظلم کر رہے ہو۔ حق تو یہ تھا کہ جب
ہم تمہاری محبت کی آزمائش میں ڈالے گئے تو ہمارے ساتھ انصاف کرتے۔
یہ اشعار سن کر میرے ساتھی نے ایک چیخ ماری اور کہنے والے سے کہا کیا ہوتا اگر تم
اس طرح کہتے ؎

یاصباح الوجوہ سوف تموتو
ن وتبلی خدودکم والعیونا
وتصیرون بعد ذلك رسمًا
فاعلموا ذاك انّ ذاك یقینًا

ترجمہ: اے خوبرو! عنقریب تم مرجاؤ گے تمہارے رخسار اور تمہاری آنکھیں
بوسیدہ ہو جائیں گی۔
اور اس کے بعد تم فقط ایک نشان بن کر رہ جاؤ گے۔ اور یہ جان لو کہ یہ ایک
یقینی امر ہے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ابوالحسنؒ کے ساتھی نے جو کچھ کہا وہ ان کے باطنی احساسات
کے عین مطابق تھا اور اول الذکر اشعار کے قائل کے موضوعِ سخن نے انھیں اس وجہ سے متاثر
نہیں کیا کہ ان کے اپنے قلب پر حقائق کا غلبہ تھا اور ان کا باطن وجد سے معمور تھا۔
ارشاد باری تعالٰی ہے:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ [1] — اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ہلاک کی
خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر
چھپی تدبیر والا ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ سے کسی شخص نے مذکورہ بالا آیت کریمہ کی وضاحت چاہتے ہوئے
پوچھا: مجھے ان کے مکر کا علم تو ہے کہ انھوں نے ایسا کیا مگر ان کے ساتھ اللہ کے مکر کرنے کا

---

[1] : آلِ عمران: ۵۴

کیا مفہوم ہے؟ آپ نے جواب دیا: اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے ان کو اسی حالت پر چھوڑ دیا جس پر وہ تھے۔ اگر وہ بدلنا چاہتا تو ان کی حالت بدل جاتی۔ ابوبکر شبلی کو اس کے بعد یوں لگا کہ جیسے سائل کو تشفی نہیں ہوئی۔ تب آپ نے اس سے کہا کیا تمھیں معلوم نہیں کہ فلاں طنبور بجانے والی اسی موضوع پر کہتی ہے ؎

ویقبح من سواك الفعل عندی

وتفعله فیحسن منك ذاكا

ترجمہ: تیرے بغیر مجھے جو کام بُرا لگتا ہے اسے جب تو انجام دیتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔

دیکھئے کہ شبلیؒ کا اشارہ اس طنبور بجانے والی کے ارادے سے ہٹ کر کس طرف ہے اور شبلی علیہ الرحمۃ کا یہ مثال پیش کرنا مصداق ہے اس حدیث کا کہ "دانائی کی بات مومن کی گم شدہ متاع ہے"

یہاں تک مجھے معلوم ہوا اوپر کے واقعے میں شبلیؒ سے سوال کرنے والے ابو عبداللہ بن خفیف علیہ الرحمہ تھے۔

۷۸

وہ صوفیا جو سماع، قرآن کو گانے کے انداز میں پڑھنے اشعار و قصائد اور وجد و رقص کو صحیح نہیں سمجھتے

سماع، قرآن کریم کو گانے کے انداز میں قرأت کرنے، اشعار و قصائد پڑھنے اور بتکلف وجد و رقص کرنے کی محفلوں میں شرکت کرنے کو ناپسند کرنے کی مختلف وجوہات ہیں۔ کچھ لوگ اسے ائمہ متقدمین یا علماء تابعین سے منقولہ ان روایات کے زیر اثر ناپسند کرتے ہیں جن کی رو سے وہ خود اسے ناپسند کرتے تھے۔ اور ان کی اتباع کی خاطر اسے مکروہ جانا کیونکہ ان کی حیثیت اسلام میں قابلِ تقلید ہے۔

بعض صوفیہ کرام نے اسے فقط مریدین اور مبتدیوں کے لیے ناپسند گردانا کیونکہ ان کے لیے اس میں یہ خدشہ موجود ہے کہ مبادا وہ اس سے لذاتِ نفسانی میں پڑ کر سب کچھ کھو بیٹھیں۔

ایک اور طائفہ صوفیہ کا کہنا ہے کہ ہم اسے اس لیے پسند کرتے ہیں کہ اسے دو طرح کے لوگ اختیار کرتے ہیں ایک وہ جو لہو و لعب کے عادی ہو چکے ہیں دوسرے وہ جو بلند احوال کے حامل، مقاماتِ ارفع پر فائز، ریاضات و مجاہدات سے نفس کو مارے ہوئے، دنیا سے منہ پھیر لینے والے اور اللہ کی جانب کاملاً مشغول ہونے والے ہوتے ہیں۔ اب جب کہ ہمارا تعلق نہ اول الذکر گروہ سے ہے اور نہ ہم ثانی الذکر کے مقام پر فائز ہیں تو بہتر یہی ہے کہ سماع سے دامن بچائیں طاعات و فرائض کی طرف توجہ اور

محرّمات سے اجتناب نے ہمیں سماع سے دور رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

احمد بن علی الوجیہی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ میں نے ابو علی علیہ الرحمۃ رودباری سے سنا وہ فرماتے تھے:

ہم اس سماع کے بارے میں جس مقام تک آ پہنچے ہیں اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے ہم تلوار کی دھار پر ہیں اگر جھک گئے تو آگ ٹھکانا ہے۔

جعفر الخلدی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ جنید علیہ الرحمۃ نے کہا کہ میں ایک دن سری سقطی علیہ الرحمۃ کے پاس گیا تو انھوں نے پوچھا: تمھارے ساتھیوں کا کیا حال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عاشق ایک طویل بیماری کا مریض ہوتا ہے۔ اگر میں چاہتا تو اس چیز کا ضرور اظہار کرتا جو میرے اندر موجود ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ ان کے اندر (جذبۂ عشق) بہت زیادہ موجود تھا مگر وہ اسے پوشیدہ رکھتے تھے کیونکہ انھیں خوفِ الٰہی دامنگیر تھا۔

ایک اور طائفۂ صوفیہ کی نظر میں سماع کو اس لیے ناپسند کیا گیا کہ ان کے مطابق عامۃ النّاس کو طریق اور مقاصدِ صوفیہ کے مطابق سماع کرنے کا علم نہیں ہوتا۔ اور اس طرح بسا اوقات ایسے لوگ اصول و شرائط سماع میں غلطی کر جاتے ہیں۔

مذکورہ طائفۂ صوفیہ نے عوام الناس کی اصلاح، خواص کو بچانے اور وقت جیسی نعمت، جو چلی جائے تو پھر حاصل نہیں ہوتی، کو ضائع ہونے سے بچانے کی خاطر سماع کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

ایک گروہِ صوفیہ نے تو سماع کو اس لیے بھی ناپسند کیا کہ اس میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر بُرے لوگوں کی صحبت میں شامل ہو جاتا ہے اور نیکی و سلامتی کا حصول اس کے پیشِ نظر نہیں رہ جاتا۔

بعض صوفیہ نے سماع کو اس لیے بھی ناپسند کیا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا:

"بہترین مسلمان لایعنی فعل سے دُور رہتا ہے"

اسی حدیث کے زیرِ اثر ان کا یہ کہنا ہے کہ سماع اختیار کرنے کا چونکہ ہمیں حکم ہی نہیں دیا گیا ہے اور نہ ہی سماع زادِ قبر کا کام دیتا ہے لہٰذا یہ لایعنی افعال میں سے ہے۔

ایک اور جماعتِ صوفیہ کے مطابق سماع اس لیے ناپسندیدہ ہے کہ صوفیا صاحبِ کمال اور باطنی طور پر اس قدر آسودہ اور مطمئن ہوتے ہیں کہ کسی بیرونی سماع کے لیے ان کے پاس گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

۷۹

حقیقتِ وجد

اہل تصوف کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وجد کیا ہے؟
عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں وجد کی کوئی تعریف بیان نہیں کی جاسکتی کیونکہ پختہ ایمان رکھنے والے مومنوں کے نزدیک یہ اللہ کے اسرار میں سے ایک ہے۔
جنید علیہ الرحمۃ کا قول ہے: میرے خیال میں وجد اللہ تعالیٰ کے قول:
"وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا"[1] اور اپنا سب کیا انھوں نے سامنے پایا۔
کے مطابق وجد بلا کسی ارادہ و کوشش کے کسی شے کو پا لینے کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیت میں لفظ وجدوا کا معنی بلا ارادہ و کوشش کے پا لینے کا ہے۔
اسی طرح ذیل کی آیت میں بھی "تجدوہ" کا یہی مذکورۃ الصدر معنی ہے۔
قول باری تعالیٰ ہے:
وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ[2] اور اپنی جانوں کے لیے جو بھلائی آگے بھیجو گے اسے اللہ کے یہاں پاؤ گے۔
ایک اور آیت میں یَجِدْهُ کا معنی بھی بغیر کوشش و ارادے کے پانا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:
حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا[3] یہاں تک جب اس کے پاس آیا تو اُسے کچھ نہ پایا۔

---
[1] الکہف: ۴۹ [2] البقرۃ: ۱۱۰ [3] النور: ۳۹

گویا ہر وہ کیفیت مسرت والم جو قلب پر بغیر ارادے و کوشش کے طاری ہو اسے وجد کہتے ہیں۔

قلوب کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ وہ بصیرت رکھتے ہیں اور یہی بصیرت قلوب کے لیے وجد ہے جیسا کہ قرآنِ کریم ارشاد فرماتا ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ[1]	تو یہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

الغرض اس طرح ان دونوں آیات سے یہ واضح ہو گیا کہ تو نے کیا پایا اور کیا نہ پایا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وجد مکاشفاتِ حق کا نام ہے آپ دیکھتے نہیں کہ ایک شخص جو چپ چاپ ساکن بیٹھا ہوتا ہے کہ حرکت کرنے لگتا ہے اور اس کے منہ سے آہیں اور چیخیں نکلنے لگتی ہیں۔ مگر جو شخص اول الذکر سے زیادہ قوی ہوتا ہے وہ ساکن و ساکت رہتا ہے۔

قولِ خداوندی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ[2]	کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں۔

بعض شیوخ علیہم الرحمۃ کا کہنا ہے کہ وجد دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وجدِ الملک اور دوسرا وجد اللقاء اور یہ دونوں اقسام قرآن کریم ہی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: فمن لم يجد (لم يملك) اور "ووجدوا ما عملوا حاضرة" (اى لقوا)۔

کچھ اور صوفیہ نے بھی اسی طرح کی دو اقسام بیان کی ہیں:

ابوالحسن حصری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: لوگ چار قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ مدعی ۲۔ معترض ۳۔ مستحق، جو اپنی حقیقت کو پا کر اس پر اکتفا کرے

---

[1] الحج: ۴۶ [2] الحج: ۳۵

۴- واجد جو خود سے گذر گیا ہو۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ فرماتے تھے: ہر وجد جس کی سند قرآن و سنت سے نہ ملے باطل ہے۔

ابوسعید احمد بن بشر بن زیاد بن الاعرابی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: وجد کا آغاز یہ ہے کہ حجاب اٹھ جائے۔

مشاہدۂ رقیب، حضورِ فہم، ملاحظۂ غیب، محادثۂ سِر اور فنارِ نفس حاصل ہو جاتے۔

ابوسعید کا ایک اور قول: وجد خصوصی درجات میں سے پہلا درجہ ہے اور تصدیق غیب کو کہتے ہیں جس کا مزا جو چکھ لے اور جس کا نور جس کے قلب کو منور کر دے اس سے ہر شک و ریب رخصت ہو جاتا ہے۔ آپ ہی نے یہ بھی فرمایا کہ وجد کے سامنے جو چیز حجاب بنتی ہے وہ دنیوی علائق اور آثارِ نفس ہیں اور جب نفس ان تمام آلائشوں اور اسباب سے پاک ہو تو قلب مشاہدہ کرتا ہے باطن پاکیزہ ہوتا ہے اور بندہ وہ کچھ دیکھ لیتا ہے جس سے اس کا قلب خالی تھا۔ اور یہی وجد ہے۔

○

وجد کرنے والوں کی صفات

اللہ جل ذکرہ نے فرمایا :

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ [1]

اللہ تعالیٰ نے اتاری سب سے اچھی کتاب کہ اوّل سے آخر تک ایک سی ہے دوہرے بیاں والی اس سے بال کھڑے ہوتے ہیں ان کے بدن پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کی کھالیں اور دل نرم پڑتے ہیں یاد خدا کی طرف رغبت میں۔

مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ وجد کرنے والوں کی صفات میں سے ہے۔

ارشاد فرمایا :

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ [2]   ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں۔

---

[1] : الزمر : ۲۳   [2] : الحج : ۳۵

وَجَل (ڈر) صفاتِ واجدین میں سے ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی :

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا [۱]	تو کیسی ہوگی جب ہم ہر امت سے گواہ لائیں گے اور اے محبوب! (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمھیں ان سب پر گواہ و نگہبان بنا کر لائیں گے۔

اور اس کے بعد آپؐ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ کیفیت بھی صفاتِ واجدین میں سے ہے۔

اس بارے میں واقعات بکثرت ملتے ہیں جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ الغرض، آہ و بکا، چیخ و پکار، کپکپانا، فریاد کرنا اور غشی طاری ہونا یہ سب صفاتِ واجدین میں سے ہیں۔

وجد کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں :

واجد، یعنے حقیقتاً وجد کرنے والا اور

متواجد، یعنے بتکلف وجد کرنے والا۔

جہاں تک واجدین کا تعلق ہے تو ان کی تین اصناف ہیں :

پہلی صنف کے واجدین کا وَجد ٹھیک رہتا ہے مگر اس وقت متغیر ہو جاتا ہے جب بشری عادات اور خواہشاتِ نفس اس کے سامنے آجاتی ہیں۔

دوسری صنف کے واجدین کا وجد اس وقت متاثر ہوتا ہے جب وہ سماع کے لطف و نشاط میں منہمک ہو جاتے ہیں۔

تیسری صنف کے واجدین کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کا وجد مسلسل رہتا ہے،

---

[۱] : النسآء : ۴۱

کیونکہ یہ لوگ اپنے وجد میں فانی ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ خود باقی نہیں رہتے صرف ان کا وجد ہی رہتا ہے۔ اس لحاظ سے انھیں کسی چیز کے وجود کا احساس ہی نہیں رہتا۔

اسی طرح بتکلف وجد کرنے والوں یعنے متواجدین کی بھی تین اصناف ہیں:

پہلی صنف: یہ لوگ تکلف اور نقل سے کام لیتے ہیں۔ یہ خوش طبعی کی خاطر ایسا کرتے ہیں اور ہلکے قسم کے ہوتے ہیں۔

دوسری صنف: یہ وہ لوگ ہیں جو دنیوی علائق کو چھوڑ کر بلند احوال کا دعوی کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسا کرنا ان کے لیے اچھا نہیں تاہم اس لحاظ سے ان کا تواجد بہتر بھی ہے کہ وہ اسے اس وقت اختیار کرتے ہیں جب کہ انھوں نے دنیوی اشیاء و اسباب کو پس پشت ڈال دیا ہوتا ہے۔ اور ان کو جو تواجد حاصل ہوتا ہے اس کی ساری مسرت اور لطف بہر حال قطعِ آسائش دنیوی کے بعد ہی ہوتا ہے۔

اور اس بتکلف وجد اختیار کرنے یعنے تواجد کو جس نے تصوف سے خارج سمجھا اس نے غلطی کی کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"روؤ! اگر رونا نہیں آتا تو کوشش کر کے بتکلف روؤ۔"

گویا تواجد اور وجد کی حیثیت وہی ہے جو حدیث نبوی میں تباکی (بتکلف رونا) اور بکار (واقعتاً رونا) کی ہے۔

تیسری صنف: اس میں وہ کمزور صوفیہ شامل ہوتے ہیں جو حرکت کرتے وقت اپنی اندرونی کیفیات و جذبات کو ضبط نہ کرتے ہوئے بے قابو ہو جاتے ہیں اور اپنا بوجھ اتارنے کے لیے تکلفانہ وَجد اُن سے سرزد ہو جاتا ہے۔

عیسیٰ القصارؒ علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: میں نے حسین ابن منصور حلاجؒ کو اس وقت جبکہ انھیں قتل کرنے کے لیے قید سے نکالا گیا یہ آخری الفاظ کہتے سنا:

"وجد کرنے والے کا مقصد خدائے واحد کو یکتا سمجھنا ہے۔" بغداد کے تمام مشائخ نے منصور حلاج کے ان الفاظ کو سراہا۔

ابو یعقوب نہر جوری علیہ الرحمۃ وجد کرنے والے (واجد) کے وجد کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے بارے میں کہتے ہیں :

صحیح وجد وہ ہے جسے قلوبِ واجدین قبول کر لیں اور غیر صحیح وجد وہ ہے جس کو واجدین کے دل قبول نہ کریں اور وجد کرنے والوں کے ساتھی اس سے زِچ ہوں ۔

○

۸۱

راست بازمشائخ کا تواجد

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ نے ایک روز اپنی مجلس میں تواجد (بتکلف وجد کرنا) اختیار کیا اور اسی حالت میں کہا: ہائے افسوس! وہ نہیں جانتا کہ میرے دل میں اس کے سوا کیا کچھ ہے۔ کسی نے پوچھا کیا کچھ ہے؟ جواب دیا سب کچھ ہے۔

شبلیؒ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ انھوں نے تواجد کی کیفیت میں اپنا ہاتھ دیوار پر مارا کہ ہاتھ زخمی ہوگیا۔ ایک طبیب کو ان کے علاج کے لیے لایا گیا۔ آپ نے طبیب سے کہا: تجھ پر افسوس تو کونسا شاہد لے کر میرے پاس آیا ہے۔

طبیب نے کہا: میں تو آپ کے ہاتھ کا علاج کرنے آیا ہوں۔ آپ نے طبیب کو تھپیڑ مارا اور دھتکار دیا۔ اس کے بعد ایک اور نرم خو طبیب کو لایا گیا۔ آپ نے اس سے بھی سوال کیا کہ میرے پاس کونسا شاہد لے کر آئے ہو؟ طبیب نے کہا: تیرے شاہد کو لے کر آیا ہوں۔ اس کے بعد شبلی علیہ الرحمۃ نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا۔ طبیب نے زخم کو چیرا اور وہ خاموش رہے۔ جب طبیب نے دوا نکالی اور ہاتھ پر لگانے لگا تو شبلی علیہ الرحمۃ نے چیخ ماری اور تواجد کی حالت میں زخم پر انگلیاں رکھ کر کہنے لگے ؎

انبتت صبابتکم قرحۃ علی کبدی

بتّ من تفجعکم کالاسیر فی الصفد

ترجمہ: تیری محبت نے میرے کلیجے میں ناسور بنا دیا ہے۔ میں نے تیرے غم زدہ ہونے کے باعث رات ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے قیدی کی مانند کاٹ دی۔

کہتے ہیں کہ ابوالحسین نوری علیہ الرحمتہ مشائخ کی ایک جماعت کے ساتھ کسی دعوت میں تشریف فرما تھے کہ تصوّف کے مسائل پر بات چھڑ گئی۔ ابوالحسین پہلے تو خاموش رہے اور پھر یہ اشعار انھیں سناتے ہے

رب ورقاء هتوفٍ فی الضحیٰ

ذات شجو صدحت فی فنن

ترجمہ: اکثر دوپہر کے وقت کوئی دردمند فاختہ ٹہنیوں میں درد بھری آواز سے چیختی ہے۔

فبکائی ربما ارقها

وبکاها ربما ارقنی

ترجمہ: بعض اوقات میری آہ و بکا اسے رلاتی ہے اور بعض اوقات اس کی چیخ و پکار مجھے۔

هی ان تشکو فلا افهمها

واذا اشکو فلا تفهمنی

ترجمہ: اگر وہ شکوہ کرتی ہے تو میں اسے نہیں سمجھتا اور اگر میں نالہ کرتا ہوں تو وہ نہیں جانتی۔

غیرانی بالجوی اعرفها

وهی ایضا بالجوی تعرفنی

ترجمہ: سوائے اس کے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو سوزش عشق کے حوالہ سے جانتے پہچانتے ہیں۔

نوری علیہ الرحمتہ نے یہ شعر سناتے تو ساری محفل تواجد میں جھوم اٹھی۔

ایک صوفی نے کہا کہ برسوں سے میری یہ خواہش ہے کہ کسی واجد سے بحالت وجد محبت کی ایک بات سن لوں۔

کہتے ہیں کہ ابوسعید خراز علیہ الرحمتہ موت کا ذکر سنتے ہی بہت زیادہ تواجد کرتے تھے۔ ان کے اس انداز کے بارے میں جنید علیہ الرحمتہ سے پوچھا گیا تو فرمایا: عارف کو یہ

یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جن ناخوش گوار حالات سے دوچار کرتا ہے وہ نہ تو ناراضگی کی بنیاد پر اور نہ ہی سزا کے طور پر ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی صنعتوں اور تمام ناخوشگوار حالات میں بھی اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان خلوصِ محبت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس پر جو کچھ بھی حالات نازل کیے جاتے ہیں ان سے اس کی روح کو اپنے لیے منتخب کرنا ہوتا ہے۔ جب عارف پر یہ حقیقت جو بیان کی گئی منکشف کر دی جاتی ہے تو پھر یہ بات تعجب خیز نہیں رہ جاتی کہ اس کی روح اللہ کی طرف پرواز کرتی ہے تو اس میں جذبۂ اشتیاق موجزن ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ صوفی موت کے ذکر پر تواجد کرتا ہے۔ ایک وجہ ذکرِ موت پر تواجد کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صوفی کو اپنا مقصد سامنے دکھائی دینے لگتا ہے لہٰذا وہ تواجد کرتا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ جس طرح چاہے اپنے دوستوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔

کسی شیخ سے تواجد اور وجد میں فرق واضح کرنے کے لیے کہا گیا تو فرمایا: وجد غیب کے صحراؤں اور حقیقت کے بے نقاب ہو جانے سے عبارت ہے جب کہ تواجد کا تعلق اکتساب سے ہے۔ اور یہ بشری اوصاف سے متعلق ہوتا ہے۔

جو لوگ تواجد کرنے والے کے وجد میں خامی کے باعث اسے ناپسند کرتے ہیں وہ ابو عثمان حیری الواعظ کے اس واقعہ کو بطور سند پیش کرتے ہیں:

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک شخص جو تواجد کر رہا تھا سے انھوں نے کہا: اگر تو اپنے وجد میں صادق ہے تو تو نے اللہ کے راز کو افشا کیا اور اگر تو کاذب ہے تو تو نے شرک کیا۔

۸۴

غلبۂ وجد کی قوت

ایک روز سری سقطی علیہ الرحمۃ کے ہاں قوی اذکار میں تیز تر قسم کے وجدوں کا ذکر ہو رہا تھا کہ انھوں نے فرمایا کہ اگر کسی کو گہرا وجد ہو جائے اور اس کے چہرے پر تلوار کا وار کر دیا جائے تو بھی اسے اس کا احساس تک نہ ہو گا۔

ابو القاسم جنید علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ یہ کیفیت اس وقت میرے اندر بھی موجود تھی اگر ایسا واقعتہً نہ ہوتا تو میں اسی وقت سری سقطیؒ کی بات کا انکار کر دیتا۔

جنید علیہ الرحمۃ کہا کرتے تھے: جب کسی کا وجد قوی ہو تو وہ اس شخص سے کہیں کامل ہوتا ہے جسے علم تصوف پر دسترس حاصل ہو۔ آپ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ جس کے پاس فضیلتِ علمی ہو اسے وجد کی خامیاں نقصان نہیں پہنچاتیں۔ اور فضیلتِ علمی زیادہ مکمل ہوتی ہے فضیلتِ وجد سے۔

جعفر خلدی علیہ الرحمۃ نے کہا کہ جنید علیہ الرحمۃ کہا کرتے تھے: وجد میں غلبہ کے بعد تحمّل زیادہ مکمل ہوتا ہے وجد میں غلبہ سے۔

اور وجد میں غلبہ زیادہ مکمل ہے غلبہ سے پہلے تحمل اختیار کرنے سے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ ترتیب کیسے قائم کی تو فرمایا: تحمل کرنے والا قہر کے بعد تحمّل پر غلبہ حاصل کرنے کے باعث مکمل ترین ہوتا ہے۔ اور مغلوب اپنے نفس پر تحمّل پا نے کے بعد مکمل ترین ہوتا ہے۔

میرے نزدیک جنید علیہ الرحمۃ کے بیان کی وضاحت اس طرح ہے کہ جو شخص متحمل ہو وجود کے غلبہ اور واردات کی قوت کے بعد وہ کامل ہے اس کی نسبت جس پر غلبۂ وجود اور قوتِ واردات غالب آجائیں اور اس کے ظاہری صفات سے اس کا صاف پتہ چلتا ہو۔

واردات کی قوت اور دل کی حالت سے مطابقت رکھنے کے باعث غلبۂ وجد کی کیفیت والا زیادہ کامل ہے اس ساکن رہنے والے کی حالت سے جس پر واردات کا نزول ہوتا ہے اور نہ کوئی کیفیت اس کے قلب میں گذر پاتی ہے۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ کو وجد کی حالت میں اس قدر تقویت حاصل ہو جاتی تھی کہ چودہ یا پندرہ دن تک بغیر کھائے پیئے گذار دیتے، شدید سردی کے باوجود ان کے جسم سے پسینہ بہتا رہتا۔ اور انھوں نے ایک قمیض پہنی ہوتی تھی۔

جب آپ سے اس کے بارے سوال کیا جاتا تو کہتے: مجھ سے سوال مت کرو کیونکہ اس وقت تم میری باتوں کو سمجھ نہیں سکتے۔

میں نے ابو عمرو بن علوان علیہ الرحمۃ سے اور انھوں نے جنید علیہ الرحمۃ کو یہ کہتے سنا کہ شبلی علیہ الرحمۃ حالتِ سُکر میں رہتے تھے اگر وہ ہوش میں آتے تو ان سے استفادہ کیا جاسکتا تھا۔

جنید علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: میں نے سری سقطی علیہ الرحمۃ کے سامنے محبت کا تذکرہ کیا تو انھوں نے اپنے بازو کی جلد کو کھینچا اور کہا: اگر میں یہ کہوں کہ یہ چمڑا اس کی محبت میں خشک ہو گیا ہے تو میں سچا ہوں اور یہ کہنے کے بعد ان پر غنودگی سی طاری ہو گئی، پھر ان کا چہرہ مثلِ قمر دمکنے لگا اور وہ اس قدر خوب صورت ہو گئے کہ حاضرین میں سے کوئی ان کے حسن پر نظر جمانے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے ہم نے ان کے چہرۂ مبارک کو ڈھانپ دیا۔

عمرو بن عثمان مکّی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: وہ وجد جو قلب میں پیدا ہو اور اسے روحانی قوتوں سے معمور کر دے حتّٰی کہ قلب پہلے کے تمام حالات سے خالی ہو جائے اور اُسے ایک ایسا حال عطا کر دیا جائے جو باقی تمام احوال سے علیحدہ ہو تو وہ بندے کو اس مقام پر

فائز کر دیتا ہے کہ وہ غیر اللہ کے احساس تک سے خالی ہو کر مکمل طور پر فقط حق کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

ابو عثمان المزینؒ یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

فسکر الوجد فی معناہ صحو

وصحو الوجد سکر فی الوصال

ترجمہ: وجد میں حالتِ سکر کا طاری ہونا ہوش میں آنے کے مترادف ہے اور وجد میں باہوش ہونا، وصل میں سکر کا طاری ہونا ہے۔

○

۸۳

وجد میں ساکن اور متحرک رہنے والے

ابو سعید بن الاعرابی علیہ الرحمۃ کتاب الوجد میں لکھتے ہیں :

"ایک سوال کرنے والے نے پوچھا کہ وجد میں کامل ترین شخص کون ہے حرکت کرنے والا یا ساکن رہنے والا؟ صوفیہ کرام کی رائے میں سکون و تمکین سے رہنا کہیں افضل ہے حرکت کرنے سے یا جوش و جذبے میں آنے سے۔

ابو سعید نے جواب دیتے ہوئے لکھا ہے :

"بلاشبہ واردات اذکار سے ہوتی ہیں اور ان میں سے بعض واردات ایسی ہوتی ہیں جو موجبِ سکون ہوتی ہیں لہٰذا ایسے میں ساکن رہنا ہی افضل ہے حرکت سے۔

اور بعض واردات ایسی ہوتی ہیں جو موجب حرکت ہوتی ہیں اس لیے متحرک رہنا افضل ہو جاتا ہے ساکن رہنے سے۔ کیونکہ اس طرح کی واردات کے مزاج میں قہر یعنی غلبہ ہوتا ہے۔ اب اگر وہ اس غلبہ پر قائم نہ رہا تو واردات ضعیف ہوں گے اور اگر واردات ضعیف نہ ہوں تو حرکت ضروری ہے۔"

واردات، علوم و اذکار سے پیدا ہوتی ہیں اور ان سے وَجد پیدا ہوتا ہے اور

واجد ان کا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔

میں نے ایک جماعتِ صوفیہ کو دیکھا جو وجد میں اہل سکون کو اس لیے ترجیح دیتی ہے کہ ان کی عقلیں بڑی اور قوی ہوتی ہیں ان پر جو کچھ واردات ہوں ان کو سمجھتی اور ان پر استقامت رکھتی ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بھی درست ہے مگر بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کچھ واردات اس قدر قوی نوری اور مضبوط برہان والی ہوتی ہیں کہ عقلیں ان کو سمجھنے سے قاصر ہوتی ہیں ایسے میں جس وجد میں انسان متحرک ہو جائے تو بلا شبہ ایسی حرکت، ساکن رہنے سے افضل ہے۔

ابوسعید ابن الاعرابی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: کچھ واردات اس طرح کی ہوتی ہیں جو عقل کے مطابق ہوتی ہیں وہ انہیں سمجھتی ہے لہٰذا تمکن اور سکون پیدا ہوتا ہے اور حرکت نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے ساکن رہنے والوں کو جن لوگوں نے افضل قرار دیا وہ فضیلت عقل کی بنا پر اور جنھوں نے وجد میں متحرک رہنے والوں کو افضل قرار دیا ان کے پیشِ نظر وہ قوی واردات تھیں جو عقل کی قوتِ ادراک سے بالا ہیں۔

اگر دو عقلیں ایک جیسی ہوں ان میں سے کوئی افضل بھی نہ ہو تو ایسی حالت میں ساکن کو متحرک پر فضیلت ہوگی۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ دو عقلیں، دو آدمی یا دو واردات باہم یکساں ہوں اہل تصوف اس یکسانیت کا انکار کرتے ہیں۔ الغرض جب یکسانیت ٹھہری تو ہم پھر اسی بات کی طرف آتے ہیں جو ہم پہلے کہہ آئے ہیں، یعنی متحرک کا ساکن یا ساکن کا متحرک سے افضل ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ وارد ہونے والا حال مختلف ہے اس لیے کہ یہی حال کہیں باعثِ حرکت ہے تو کہیں موجبِ سکون۔ اور واجدین اپنے مشاہدات اور مکاشفات میں یکساں نہیں ہوتے۔ گویا فضیلت حرکت و سکون کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان واردات پر ہے جن کو جانے بغیر ہم کسی ایک کے افضل ہونے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ سب باتیں اہلِ احوال کے لیے تھیں جہاں تک اہلِ سُکر کا تعلق ہے یہ کلام ان سے متعلق نہیں۔

(۸۴)

ابوسعیدؒ بن الاعرابی کی تالیف ـــ کتاب الوجد کی تلخیص

ابوسعید بن الاعرابی علیہ الرحمۃ نے کہا: وجد مندرجہ ذیل احوال کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ بے قرار کر دینے والا بیان، پریشان کن خوف، لغزش پر مواخذہ، کسی فائدے کی طرف خوب صورت کلام کے ذریعے اشارہ، غائب کا شوق، کھو دینے پر ندامت، ماضی کا غم، حصول اور اپنے باطن کے ساتھ سرگوشی کرنا۔

باطن سے سرگوشی کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ظاہر کا ظاہر، باطن کا باطن، غیب کا غیب اور سر کا سر کے ساتھ مقابلہ کیا جاتے۔ اور یہ کہ اپنے حقوق و فرائض کو جان لیا جائے تاکہ تو اس میں کوشش کرے اور اس کے بعد تیرے لیے قدم کے بغیر ثابت قدمی اور ذکر کے بغیر ذکر لکھ دیا جائے کیونکہ اللہ تعالٰی ہی نعمتوں کا مالک اور عطا کرنے والا ہے وہی نعمتوں پر توفیقِ شکر عطا کرنے والا اور تجھے ان کے حصول پہ مائل کرنے والا ہے لہٰذا وہی ان میں سے تجھیں درجہ دینے والا ہے۔ اور بے شک تمام امور کا مرجع اسی کی ذاتِ والاصفات ہے۔

ابوسعید بن الاعرابی علیہ الرحمہ کہتے ہیں: وجد، خوشیوں سے ہمکنار ہونے اور مزید سے آگاہ ہونے کو کہتے ہیں۔ وجد کی یہ لذتیں تھوڑی ہوں تو صبر نہیں آتا اور زیادہ ہوں تو سنبھالی نہیں جاتیں۔ گمان و خیال اس سے قریب ہیں اور برانگیختہ ہونا مسلسل۔ یہی وجہ ہے کہ پشیمانی سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ سب گنوا دینے کا بھی

خدشہ ہوتا ہے۔

آہ و بکار وجد کے آنے سے پہلے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا کیونکہ وجد طاری ہونے سے پہلے تو موجود ہی نہیں ہوتا۔ اور وجد سے انس نہیں پیدا ہو سکتا کیونکہ وہ واقع ہوتے ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ وجد میں غشی، لرزہ، اعضاء کا زوال اور عقل پر غلبہ اسی صورت میں ہوتا ہے کہ واردات قوی ترین اور مؤثر ترین ہوتی ہیں۔

کیفیت وجد کے تیزی سے آنے اور بہ عجلت تمام رخصت ہونے میں ایک نکتۂ دقیقہ اور اللہ کی نعمت پوشیدہ ہے وہ اس طرح کہ اگر اللہ جل جلالہٗ اپنے اولیاء کو نہ بچاتا اور ہر قلب پر مالا یطاق کیفیتِ وجد کو دیر تک طاری رہنے دیتا تو عقلیں بکھر جاتیں اور جانیں تلف ہو جاتیں۔

وجد اس دنیا میں کشف نہیں بلکہ مشاہدۂ قلب، توہّم حق اور ظنِ یقین ہے۔ پس وہ اس کا مشاہدہ نشاطِ یقین اور خلوصِ ذکر کے ساتھ کرتا ہے کیونکہ وہ نیند میں گویا جاگا ہوا ہوتا ہے اور جب وہ بے ہوشی میں ہوش میں آتا ہے۔ تو جو اس نے پایا ہوا ہوتا ہے اسے کھو چکا ہوتا ہے۔ اور اس کے پاس فقط اس کا علم ہی باقی رہ جاتا ہے۔ جس سے اس کی روح متمتع ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے یقین کے بڑھ جانے سے بھی مستفید ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ بندے کے قرب و وجد کے مطابق ہوتا ہے اور اسی قدر ہوتا ہے جس قدر اس کا رب اسے دکھانا چاہتا ہے۔

واجدین میں سے کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو وجد میں ثابت قدم ہوتے ہیں اور جو کچھ وجد میں سے انھوں نے حاصل کیا ہوتا ہے۔ وہ ان کی تمکین کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جو وجد کی کیفیات کو بیان کرتے ہیں اور دوسروں کے لیے ان کا بیان حجت ہوتا ہے۔ اور اگر یہ لوگ دوسروں کو غلطی کا مرتکب ہونے سے بچانے کے لیے انھیں صحیح احوال نہ بتاتے تو ان کی کیفیات سلب ہو جاتیں۔ بعض اوقات ان پر وجد کسی کلام کے سنتے وقت اس پر غور کرنے سے پہلے ہی طاری ہو جاتا ہے اور وہ اس خیال سے نہیں بچ سکتے کہ یہ وجد طبعی اثرات کے نتیجہ میں طاری ہوا ہے اور اس لحاظ سے ان پر وجد حقیقی و غیر حقیقی میں

امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ایسے وجد میں انھیں رقت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد کیفیت میں اضافہ بھی محسوس ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے خالق کی معرفت کا مدعی ہو اسے نہیں چاہیئے کہ وہ اس کے سوا کسی اور سے سکون و مسرت پائے یا کسی ناقص سے دل لگائے یا کسی زائل ہونے والے سے خیالات کے سلسلے کو جوڑے۔ اگرچہ اس کے لیے ایسا کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ان چیزوں میں بظاہر مشابہت بھی پائی جاتی ہے اس لیے اہل نظر صوفیہ نے اس التباس کو باعتبار فضیلت اس طرح واضح کیا ہے کہ قلوب اپنے ظن و گمان سے متصور کرتے ہیں نہ متروک و مہمل، محفوظ کے برابر ہو سکتا ہے۔ نہ مصنوعی چیز، سرچشمے سے آتی ہوئی چیز کے برابر ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی فکر سے حاصل ہونے والی بات ذکر سے حاصل ہونے والی بات کے برابر ہو سکتی ہے۔

بعض اوقات تمیز کے باوجود بھی متفرق چیزوں میں فرق واضح نہیں ہو پاتا اس کی وجہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ اور جب یہ کمزوری زائل ہو جائے تو فرق واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فکر کے ذریعے متمیز شے ذکر کے ذریعے چاہی گئی شے کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہی صاحب اختیار و ضبط اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے۔ جس پر وجد و فریفتگی کا غلبہ ہو مگر ہر واجد کی یہ صفت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کے احوال یکساں نہیں ہوتے۔ واجدین میں سے کسی کا وجد تو علم کے باعث ہوتا ہے۔ بعض کا علم کے ساتھ اور بعض کا وجد خالصتاً علم ہی ہوتا ہے۔

وہ وجد جس کا تعلق اصل ثبات سے ہے۔ وہ حرکت کے بجائے سکون اختیار کر کے حرکت کو ترک کرنے والوں میں پایا جاتا ہے۔ خلوت سے دوری اس لیے کہ مانوس رہنے کی حالت نے انھیں وحشت سے دور کر دیا ہوتا ہے اور قرب نے ان کو مسافت سے علیحدہ کر رکھا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اہلِ وجد پر کوئی ایسی کیفیت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ لوگ اپنے وجود میں بڑھ جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان کا اپنی صفاتِ بشری کی طرف لوٹنا ان کے لیے باقی رہتا ہے اور اپنی صفاتِ بشری کے مطابق ہی وہ غذا اور عورت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور اس ضرورت سے وہ پریشان ہو جاتے ہیں کیونکہ اسے وہ اپنے وجد کے لیے نقص کے قائم مقام سمجھتے ہیں۔ اور ایک عرصے

تک خوف کا شکار رہتے ہیں۔ اسی دوران کھوئی ہوئی کیفیت کو پانے کی طلب انھیں ایک ایسی پریشانی سے دوچار کر دیتی ہے۔ اور وہ ہر شے کے بارے میں یہی خیال کرتے ہیں کہ وہ انھیں گوہر مراد تک پہنچا دے گی۔ اور ان کے احساس پر تمیز اس قدر غالب آ جاتی ہے کہ وہ جلد بازی میں دوڑنے لگتے ہیں اور جہاں کہیں سراب دکھائی پڑتا ہے اسے پانی سمجھ بیٹھتے ہیں اور جہاں کہیں پانی دیکھتے ہیں اسے سراب سمجھ بیٹھتے ہیں کیونکہ طمع کا غلبہ ہوتا ہے وہ ناک کی سیدھ میں چلے جا رہے ہوتے ہیں اور ہر وادی میں چکر کاٹتے ہیں اور ہر چمکنے والے کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ ان کا سیلاب ان کی بارش سے بڑھ جاتا ہے اور ذکر فکر سے آگے نکل جاتا ہے۔ ہر سبب کے آگے سر خم کر دیتے ہیں۔ اس سے مدد نہیں لیتے۔ طمع ان کی نظروں کو اوپر اٹھائے رکھتا ہے اور ناامیدی ان کو روکتی ہے ان کی ناامیدی جاری نہیں رہتی کہ وہ لوٹ جائیں اور نہ طمع واقعتاً طمع ہوتی ہے کہ وہ تلف ہو جائیں۔ ان کی مثال ان دیوانوں کی سی ہوتی ہے جو محبوب کی خاطر اپنی زندگی تک کو قربان کر دیتے ہیں اگر انھیں یہ خیال لاحق ہو جائے کہ محبوب لق و دق صحرا میں ہے تو وہ اس کی طرف چل پڑیں یا یہ وہم پڑھ جائے کہ وہ سمندر کے پار ہے تو اسے عبور کر لیں یا بھڑکتی آگ کے ورے ہے تو اس میں بے خطر کود پڑیں اُس پتنگے کی مانند جو جہاں کہیں آگ روشن دیکھتا ہے اُس میں کود پڑتا ہے۔

کیا تو نے انھیں نہیں دیکھا کہ وہ جنگلوں، صحراؤں اور موت کی گھاٹیوں میں پریشان حال چکر کاٹتے پھرتے ہیں کہ انھیں ٹھکانا ملتا ہے اور نہ کوئی پناہ۔ ایسے خطرات سے اگر وہ محفوظ رہ سکتے ہیں تو اپنی نیت اور ارادے کی صداقت اور شریعت کی اتباع کے ذریعے۔

جس شخص نے ظاہری علوم "شریعت" سے دوری اختیار کی وہ لغزشوں سے بچ نہیں سکتا اور جس شخص نے شریعت کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کی تو وہ سلامتی سے دور خطرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔

ہم نے سطور بالا میں جو کچھ علوم وجد سے متعلق باتیں کیں، اشارے بیان کیے یا

دلیلیں قائم کیں وہ اس کے ظاہر سے تعلق رکھتی تھیں جہاں تک اس کے دوسرے رخ کا تعلق ہے تو اس کا علم اللہ کے پاس ہے وہی اس کو اپنے بندوں پر عیاں کرتا ہے۔ وہ لوگ جو اس کے لطف سے محفوظ ہوتے ہیں اور جنھیں اللہ اس سے متمتع فرماتا ہے وہ اس کو جانتے ہیں مگر بیان نہیں کر سکتے۔ وہ ظاہراً بھی جانتے ہیں اور باطناً بھی۔ اور یہی وہ غیب ہے جس سے اللہ تعالیٰ مومنین کو متصف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ[1] وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں۔

گویا وہ مومنین اس کے غیب میں غائب ہیں اور اگرچہ وہ غائب ہے مگر انھیں شک و ریب دامنگیر نہیں ہوتا۔

اگر کوئی سوال کرے کہ وجد کی مزید کوئی تعریف بیان کی جائے تو افسوس ہے اس پر کہ کس طرح اس کی کوئی صفت یا تعریف بیان کی جائے جو خود اپنی صفت آپ ہے اُسے جس نے پا لیا اس نے جان لیا اور جس نے نہیں جانا اس نے انکار کیا۔ وہ فقط ذوق سے محسوس ہوتا ہے۔ وہ غالب ہے، موجود ہے، مفقود ہے اور اپنے انوار کے ساتھ اپنے نور سے حجاب میں ہے، اپنی صفات کے ساتھ پوشیدہ ہے اپنے ادراک سے۔ اور اپنی ذات سے اپنے اسماء کے ساتھ محجوب ہے۔ ذات سے میری مراد وجد یقین ایمان اور حقائق ہیں۔ اسی طرح محبت، شوق اور قرب اس کے وصف کو تو بیان کیا جاتا ہے مگر اس کی حقیقت یا کُنہ تک، پہنچنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ صرف وہی اس کو جان سکتے ہیں جنھوں نے اس کا ذوق پایا، لوگ اس کے اوصاف تو بیان کرتے ہیں مگر اسے سمجھ نہیں سکتے۔ اپنے تئیں اس کے بارے میں کچھ کہتے ہیں تاکہ اپنی وحشت کو انس سے بدل سکیں۔ وہ جس قدر اس کے بارے میں بیان کرتے ہیں اسی قدر اس کی حقیقت سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی زبان گنگ ہونا اس کے بارے میں کچھ کہنے سے زیادہ بلیغ ہے۔

---

[1] : البقرۃ : ۳

اہل وجد کو اس بارے میں فقط اسی قدر معلوم ہوتا ہے جس قدر انہیں بتایا جاتا ہے۔ اور ان کا خود کو اس کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر بتانا ہی ان کے علم کی دلیل ہے۔ اور اس سے متعلق کچھ کہنے سے عاجز ہونا ان کی گویائی ہے۔ الغرض ان کا کلام سے عجز، بلاغت ہے اور لکنت ان کی فصاحت۔

اس لیے جو شخص اس کی حقیقت کے بارے میں سوال کرتا ہے تو یہ اس کی جہالت کی دلیل ہے۔ اور ایک عالم کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ ہر سائل کے سوال کا جواب دے کیونکہ اللہ تعالٰے نے علماء کو اس کا پابند بنایا ہے کہ وہ علم کو اس کے اہل سے نہ چھپائیں جیسا کہ اس نے علماء کو اس بات کا بھی پابند بنایا کہ وہ نااہل سے علم کی حفاظت کریں۔ اور ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کے علم حاصل کرنے کے اہل شک کرنے والے نہیں ہوتے کہ بلا وجہ کوئی سوال پوچھیں۔

جب کہ ان احوال کی انتہا نہیں لہٰذا ہم نے ان کا بیان یہیں چھوڑ دیا۔ اگر مزید جاری رکھتے تو یہ سلسلہ لامتناہی ہے، یہ معارف ہیں جن کا شمار نہیں۔ اور ان کا اکتساب طاقتِ بشری سے باہر ہے بلکہ یہ قول باری تعالیٰ میں داخل ہیں جیسا کہ فرمایا:

وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ[1] اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

الغرض یہ اس کے کچھ عطیات تھے جن کا ذکر ہو چکا اور ان کا سلسلہ بے نہایت ہے اور ان کی توصیف بیان نہیں کی جا سکتی۔ اور کیسے ان واردات وکیفیات کا ذکر ہو جن سے وہ اپنے اولیاء کو ہر دم اور ہر آن نوازتا رہتا ہے۔ یہ جو کچھ احوال ہم نے یہاں بیان کیے وہ بہر طور بہت کم ہیں اور اللہ کے فضل و کرم ہی سے معلوم ہوتے جیسا کہ قول خداوندی ہے:

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ[2] اس سے غائب نہیں ذرہ بھر کوئی چیز۔

اگرچہ یہ احوال انسانی اکتساب سے باہر ہیں تاہم ان میں کچھ بہترین عمل کرنے کے نتیجے میں عطا ہوتے ہیں۔ جو شخص اللہ سے مزید احوال کا طالب ہو وہ اپنے بنیادی سرمایے

---

[1] ق: ۳۵ [2] السبا: ۳

کو مستحکم کر لیتا ہے جو مزید کے حصول کا موجب بنتا ہے۔ جس نے اس میں تجاوز سے کام لیا بعید نہیں کہ اس کا بنیادی سرمایہ ہی ضبط کر لیا جائے کیونکہ اس نے اس سرمایے کی خاطر خواہ حفاظت نہیں کی اور اس لیے بھی کہ نفس پر توقف اختیار کر لینے سے ہجوم[1] منقطع ہو جاتا ہے اور ہجوم، علم کے بغیر ایک واضح غلطی ہے۔ اگر توقف نفس اختیار کرنے کی طرف عدم توجہی قوی ہو تو بسا اوقات ہجوم کا حاصل ہونا بہت ممکن ہوتا ہے۔

جسے اصل کی تلاش ہو اور وہ اس میں استحکام سے پہلے فرع کی طرف رجوع کرنے کی غلطی کرے تو یہ ایسا اقدام ہے کہ جس کے نتیجے میں وہ لغزشوں سے نہیں بچ سکتا۔

الغرض یہ تھی ابن الاعرابیؒ کی کتاب الوجد کی تلخیص جسے میں نے اللہ تعالےٰ کی توفیق سے پیش کیا۔

---

[1] کوشش کیے بغیر واردات کا قلب پر قوت سے نازل ہونا ہجوم کہلاتا ہے۔ (مترجم)

۸۵

تحقیقِ آیات و کرامات

آیات و کرامات کا مفہوم اور بعض اہلِ کرامت کا ذکر

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ آیات اللہ تعالےٰ کے لیے معجزات انبیاؑ علیہم السلام کے لیے اور کرامات اولیاء علیہ الرحمۃ اور نیک عمل مسلمانوں کے لیے ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ جس شخص نے چالیس دن دنیا سے صدق و اخلاص کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کی اس سے کرامات کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ اور جس سے کرامت ظاہر نہ ہوئی گویا اس کی کنارہ کشی میں صدق و اخلاص ہی نہ تھا۔

جنید علیہ الرحمۃ نے فرمایا: جو کرامات کی باتیں کرتا ہے مگر خود اس سے ان کا ظہور نہیں ہوتا اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بھوسہ چباتا ہے۔

سہل ابن عبداللہ علیہ الرحمۃ سے چالیس روز تک کنارہ کشی کرنے والے کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے تو فرمایا: وہ جو چاہے جیسے چاہے اور جہاں سے چاہے حاصل کر لیتا ہے۔

میں نے ابن سالم علیہ الرحمۃ کو کہتے سنا کہ ایمان کے چار ارکان ہیں: پہلا رکن ایمان دوسرا رکن ایمان باللہ، تیسرا رکن حرکت و قوت سے براءت ظاہر کرنا اور چوتھا رکن جملہ کاموں میں اللہ سے مدد مانگنا ہے۔ کہتے ہیں کہ ابن سالم علیہ الرحمۃ سے کسی نے پوچھا کہ ایمان باللہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟ تو فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ تو ایمان رکھے

اور تیرا دل اس بات کا انکار نہ کرے کہ اگر اللہ کا کوئی بندہ مشرق میں ہو اور وہ اسے قدرت عطا فرماتے تو وہی شخص اک پہلو بدلے اور خود کو مغرب میں پاتے۔

انوکھی ضیافت

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ اپنے پاس بیٹھنے والے ایک نوجوان سے کہا کرتے تھے اگر تو آج کے بعد درندوں سے ڈرا تو میری صحبت ترک کر دینا۔

میں تستر میں سہل علیہ الرحمۃ کے گھر میں کچھ لوگوں کے ساتھ داخل ہوا تو وہاں ایک کمرہ دیکھا جسے درندوں کا کمرہ کہا جاتا تھا ہم نے اس کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ جنگل کے درندے سہل بن عبداللہ ؒ کے پاس آتے ہیں اور وہ انھیں اسی کمرے میں گوشت کھلا کر رخصت کر دیتے ہیں۔ میں نے تُستر کے کسی شخص کو بھی اس واقعے کا انکار کرتے نہیں پایا۔

نگاہِ کیمیا اثر

ابوالحسین بصری علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: عبادان کے ایک ویرانے میں سیاہ رنگت کا ایک فقیر رہتا تھا میں کچھ چیزیں اس کے لیے لے کر گیا۔ اس کے پاس پہنچ کر میں نے اسے بلایا اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو مسکرایا اور زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا میں نے جب زمین پر نگاہ ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ زمین سونا بن کر چمک رہی ہے۔ پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوتے کہا: لاؤ! جو لائے ہو۔ اور میں جو کچھ اس کے لیے لایا تھا اس کے ہاتھ میں تھما کر وہاں سے واپس بھاگا۔

ابو سلیمان خواصؒ اور اُن کا گدھا

میں نے ابو عبداللہ حسین بن احمد الرازی علیہ الرحمۃ سے اور انھوں نے ابو سلیمان خواص علیہ الرحمۃ کو یہ کہتے سنا کہ میں ایک روز اپنے گدھے پر سوار تھا راستے میں ایک

مکھی اس کو بار بار تنگ کرتی تو وہ سر ہلانے لگتا اور میں ایک لکڑی سے اسے سر پہ مارتا جاتا تھا کہ گدھے نے سر اٹھا کر کہا: مارو کہ تم اپنے ہی سر کو مار رہے ہو۔ ابو عبداللہؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سلیمان علیہ الرحمۃ سے پوچھا کہ کیا یہ واقعہ تمھارے ساتھ پیش آیا، تو انھوں نے کہا: بالکل اسی طرح پیش آیا جس طرح تم مجھ سے سن رہے ہو۔

علم کی فضیلت

احمد بن عطا، رودباریؒ فرماتے ہیں کہ طہارت کے مسئلہ میں میرا اپنا ایک مسلک تھا ایک رات میں وضو کر رہا تھا کہ ایک چوتھائی رات وضو ہی میں گذر گئی مگر میرے دل کو اطمینان حاصل نہ ہوا آخر میں رونے لگا اور اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا: یا ربّ! عفو! کہ اتنے میں غیب سے آواز آئی کہ یا ابا عبداللہ! عفو علم میں ہے۔

گمشدہ چیز کو پانے کی ایک مجرب دُعا

جعفر خلدی علیہ الرحمۃ ایک روز دجلہ میں ایک کشتی میں سوار ہوئے، ملاح کو کرایہ دینے کے لیے اپنا رومال کھولا جس میں ایک نگینہ بھی تھا جو دریا میں گر پڑا، انھیں گمشدہ چیز کو پانے کی ایک مجرب دعا یاد تھی اس کا ورد شروع کر دیا یہاں تک کہ ایک روز اوراق الٹتے ہوئے وہ نگینہ انھیں ان میں پڑا مل گیا۔ وہ دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ يَا جَامِعَ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيْهِ اِجْمَعْ عَلَيَّ ضَالَّتِيْ۔

"اے میرے رب! اے لوگوں کو اس دن جمع کرنے والے جس میں کوئی شک نہیں میری گم شدہ چیز مجھے عطا فرما۔"

مجھے ابو الطیب عکیؒ علیہ الرحمۃ نے ان لوگوں کی ایک طویل فہرست دکھائی جنھوں نے مذکورہ بالا دعا کو کامیاب طور پر آزمایا اور اپنی گم شدہ اشیاء بہت قلیل مدت میں پالیں۔

اولیاء اللہ سینوں کے بھید جانتے ہیں

حمزہ بن عبداللہ علوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں : ابو الخیر تینانی علیہ الرحمۃ کے پاس گیا اور جانے سے پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ سلام کہہ کے رخصت ہوں گا کھانا تناول نہیں کروں گا الغرض میں گیا ، سلام کیا اور رخصت ہو کر باہر آ گیا ۔ جب اس قریہ سے دور نکل آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عبداللہ علویؒ کھانا لے کر میرے سامنے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں اے نوجوان ! یہ کھانا کھا لو کیونکہ اب تو تم اپنا عزم پورا کر چکے ہو ۔

سطور گذشتہ میں جن مردانِ خدا کا ذکر آیا ہے وہ تمام اپنی دیانت اور سچائی کے لیے مشہور تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے علاقے میں احکام دین کے بارے میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا تھا ۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو اخبار و آثار بیان کیے مسلمانوں نے ان کی تصدیق کی ۔ لہٰذا جو واقعات ان کے بارے میں بیان کیے گئے وہ بلاشبہ ان میں سچے تھے ۔

○

۸۶

انکارِ کراماتِ اولیأ پر اہلِ ظاہر کے دلائل، کراماتِ اولیأ کے جواز پر دلائل اور اس سلسلے میں انبیاء و اولیاء کا باہمی فرق

اہلِ ظاہر کا کہنا ہے کہ کرامات انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگوں سے صادر نہیں ہو سکتیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام ہی اس سے مخصوص ہیں۔ اور آیات و معجزات و کرامات ایک ہیں معجزات اس لیے کہا جاتا ہے کہ لوگ اس کے صادر کرنے سے عاجز ہوتے ہیں، اس لیے جس نے معجزات یا کرامات میں سے کوئی کرامت انبیاء کے علاوہ کسی اور کے لیے ثابت کی تو اس نے انبیاء علیہم السلام اور غیر انبیاء کو یکساں کر دیا اور دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں رہنے دیا۔

جن لوگوں نے کراماتِ اولیاء سے انکار کیا ان کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ کہیں معجزاتِ انبیاء علیہم السلام میں کوئی شک یا خامی نہ واقع ہو جاتے مگر ان سے اس بارے میں کچھ غلطی ہو گئی کیونکہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام میں کرامات و معجزات کی بنا پر کئی وجوہ سے فرق موجود ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنے معجزات کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہیں اور اس کے ذریعے لوگوں کو قائل کرنے اور اللہ کی طرف بلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں جب کہ اولیاء کرام اپنی کرامات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنے معجزات کو مشرکین کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے ہیں جب کہ اولیاء کرام اپنی کرامات کو خود اپنی ذات کے خلاف اپنے عقیدہ کو تقویت

دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

کرامات اور تادیبِ نفس

میں نے ابن سالم علیہ الرحمۃ سے سوال کیا کہ جب اولیاء کرام اپنی مرضی کے مطابق دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں تو اس سے ان کو کون سی عزّت دی جا سکتی ہے کہ ان سے یہ کرامت ظاہر ہو جائے کہ پتھر ان کے لیے سونا بن جائے۔ انھوں نے جواب دیا: انھیں کرامات اس لیے نہیں عطا کی جاتیں کہ وہ دنیا کی قدر جانیں بلکہ اس لیے انھیں کرامات عطا کی جاتی ہیں کہ وہ اس کے ذریعے اپنے نفس کے خلاف دلیل قائم کر سکیں کہ جو ذات ان کے لیے پتھر کو سونا بنا سکتی ہے کیا وہ انھیں غیب سے رزق نہیں عطا کر سکتی اور اس طرح ان کے اندر رزق کے ختم ہونے یا کم ہو جانے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا مزید یہ کہ ان کے باطن کی تربیت و تادیب بھی ہو جاتی ہے۔ اسی ضمن میں ابن سالم علیہ الرحمۃ نے ہم سے یہ حکایت بھی بیان کی کہ بصرہ میں ایک شخص اسحاق بن احمد نام کا رہتا تھا۔ یہ شخص دنیا کا پرستار تھا۔ اچانک اس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر توبہ کی اور سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ کی صحبت اختیار کر لی۔ ایک روز اس نے سہل علیہ الرحمۃ سے کہا: اے ابا محمد! میرا نفس گذارے کی خوراک وغیرہ کے ختم ہونے کے بارے میں ہر وقت فکرمند رہتا ہے۔ سہل علیہ الرحمۃ نے اس سے کہا: یہ پتھر لو اور اپنے رب کو پکارو کہ وہ اسے تیرے لیے طعام میں بدل دے تاکہ تو اُسے کھائے۔ اس شخص نے کہا: اس میں میرے لیے نمونہ کون ہے۔ سہل علیہ الرحمۃ نے فرمایا: تیرے لیے اس میں ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بطور مثال موجود ہے۔ جب انھوں نے کہا تھا:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ (البقرۃ: ۲۶۰)	اور جب عرض کی ابراہیمؑ نے اے رب! میرے! مجھے دکھادے تو کیونکر مردے جلائے گا فرمایا کیا تجھے یقین نہیں عرض کی یقین کیوں نہیں مگر یہ چاہتا ہوں کہ دل کو قرار آجائے۔

مفہوم یہ ہے کہ نفس اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے کیونکہ اس کی جبلت شک کرنا ہے۔ گویا ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا کہ مجھے دکھا دے کہ نفس کس طرح مطمئن ہوتا ہے کیونکہ میں تو ایمان رکھتا ہوں مگر نفس دیکھے بغیر مطمئن نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالٰے اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور ان کے نفس کی تادیب و تہذیب کے لیے کرتا ہے یہیں پہ انبیاء و اولیاء میں فرق قائم ہو جاتا ہے کیونکہ انبیاء کو معجزہ عطا کیا جاتا ہے تاکہ وہ اسے توحیدِ الٰہی پہ اقرار اور اسلام کی طرف دعوت دینے کے لیے بطورِ حجت پیش کر سکیں۔

تیسری وجہ انبیاء و اولیاء میں فرق واضح کرنے کی یہ ہے کہ جب بھی انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں اضافہ کیا جاتا ہے تو وہ ان کے قلوب کو اور زیادہ ثابت قدم و مطمئن کر دیتا ہے جیسا کہ ہمارے نبی فخرِ رسل علیہ التحیۃ والسلام کو وہ تمام کچھ عطا ہوا تھا جو دوسرے انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوا تھا۔ مگر انھیں پھر کچھ ایسے معجزات بھی عطا کیے گئے جو کسی اور کو نہیں ملے جیسے معراج، شقِ قمر اور انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا تفصیل اس کی بڑی طولانی ہے مگر ہم مختصراً یہ کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے اضافۂ معجزات باعثِ تکمیلِ فضیلت ہوتا ہے جب کہ اولیاء کرام کے لیے جب کرامات میں اضافہ کیا جاتا ہے تو ان کا خوف بڑھ جاتا ہے کہ کہیں اللہ تعالٰے ان سے ناراض نہ ہو گیا ہو اور اس طرح کہیں اس کی نظر میں وہ گر نہ جائیں۔

○

کراماتِ اولیائے کے ثبوت پر دلائل اور کرامات کو انبیائے کے لیے مخصوص سمجھنے والوں کی خامی

اس ضمن میں ہماری دلیل کتاب وسنت سے ہے۔

قول باری تعالیٰ ہے:

وَهُزِّيٓ إِلَيۡكِ بِجِذۡعِ ٱلنَّخۡلَةِ تُسَٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبٗا جَنِيّٗا[1]

اور کھجور کی جڑ پکڑ کر اپنی طرف ہلا تجھ پر تازہ پکی کھجوریں گریں گی۔

دوسری دلیل وہ حدیث ہے جس میں جریج راہب اور ایک شیرخوار بچے کے کلام کرنے کا قصہ مذکور ہے حالانکہ جریج نبی نہیں تھے۔

تیسری دلیل حدیثِ غار ہے جس کے مطابق تین شخص سفر کر رہے تھے کہ رات پڑ گئی اور وہ ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے۔ ... الخ

ایک اور روایت میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص جا رہا تھا اور اس کے ہمراہ ایک گائے بھی تھی۔ اور وہ گائے پر سوار ہو گیا تو گائے نے کہا: اے خدا کے بندے! ہم سواری کے لیے نہیں پیدا کی گئیں بلکہ کھیتی باڑی کے لیے۔ سب نے سبحان اللہ کہا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں، ابوبکرؓ اور عمرؓ

---

[1] : مریم : ۲۵

اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس موقع پر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما لوگوں میں شامل نہیں تھے اور یہ ذکر بھی نہیں کیا گیا تھا کہ گائے پر سوار ہونے والا نبی تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے شک میری امت میں ایسے لوگ موجود ہیں جن سے اللہ تعالٰی نے گفتگو فرمائی اور بلاشبہ عمر بن خطاب ان میں سے ہیں، اور کسی غیر نبی کا مکلّم محدث ہونا ان تمام کرامات سے اولیٰ ہے جو جملہ اولیاء، ابدالوں اور صالحین کو عطا کی گئیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک روایت ہے کہ انھوں نے اپنے خطبۂ جمعہ میں فرمایا: اے ساریہ! پہاڑ کی طرف۔ تو ان کی آواز نہاوند کے دروازے پر لشکر نے سن لی۔ اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا سے متعلق کئی کرامات روایات میں مذکور ہیں۔

صحابۂ کرام سے متعلق کئی روایات میں ان کی کرامات کا تذکرہ موجود ہے جیسے ایک روایت ہے کہ اُسید بن حُضیر اور عتاب بن بشیر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سے رخصت ہو کر نکلے تو اس وقت تاریک رات تھی۔ ایسے میں ان میں سے ایک کا عصا مثلِ چراغ روشن ہو کر انھیں راستہ دکھاتا رہا۔

تسبیحِ جام

ابودردا اور سلمان فارسی رضی اللہ تعالٰی عنہما کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ان کے درمیان ایک پیالہ پڑا تھا کہ وہ اچانک تسبیح بیان کرنے لگا اور اس کی تسبیح ان دونوں نے سنی۔

پانی پر چل پڑے اور درندوں نے رستہ دیا

علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک غزوہ پر روانہ فرمایا، یہ صحابی جب چلے تو ان کی راہ میں ایک جگہ سمندر کا کچھ حصہ آتا تھا انھوں نے اللہ تعالٰی سے اسم ذات کے وسیلے سے دعا کی اور وہ

پانی پر چل پڑے۔ اسی طرح ان کے راستے میں درندے آئے تو انھوں نے دعا کی اور درندوں نے راستہ دے دیا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو راستے میں کچھ لوگ درندے کے خوف سے کھڑے ہوئے نظر آئے آپ نے درندے کو راستے سے ہٹادیا اور فرمایا:

"انسان پر وہی کچھ مسلط کیا جاتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہے اگر وہ فقط اللہ سے خوف رکھے تو کوئی چیز اسے نہیں ڈرا سکتی۔"

ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کئی گرد آلود جسم والے اور بکھرے بالوں والے تن پہ چیتھڑے پہنے ہوئے ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر وہ اللہ کی قسم کھا کر کچھ کہہ دیں تو اللہ اسے پورا کر دیتا ہے اور براء بن مالک رض انہی میں سے ہیں۔"

کرامات میں سے اس سے بڑھ کر مکمل کرامت کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بندۂ خدا قسم کھا کر کچھ کہے اور خدا اس کے کہے کو پورا کر دکھائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ[1]
اور تمھارے رب نے فرمایا مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔

ان تمام روایات کے علاوہ اور بھی کئی صحیح اسانید والی روایات ہیں جن کے لیے طوالت کے باعث یہاں گنجائش نہیں۔ ہاں علماء کرام نے ان پر مبنی کئی کتابیں مرتب کی ہیں۔

احادیث مبارکہ میں عامر بن عبد القیس، حسن بن ابی الحسن البصری، مسلم بن یسار، ثابت البنانی، صالح المرّی، بکر بن عبد اللہ المزنی، اویس قرنی، ہرم بن حیان، ابو مسلم الخولانی، صلۃ بن اشیم، ربیع بن خثیم، داؤد الطائی، مطرف بن عبد اللہ بن الشخیر،

---

[1] : المومن : ۶۰

سعید بن المسیب، عطاء السلمی، اور دیگر کئی تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین سے متعلق کرامات پر مبنی کئی روایات ہیں اور یہ روایات اس قدر صحیح اور متواتر ہیں کہ اہل روایت کے مطابق ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ان کے علاوہ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جس میں مالک بن دینار، فرقد السنجی، عتبۃ الغلام، حبیب العجمی، محمد بن واسع، رابعہ العدویہ، عبدالواحد بن زید اور ایوب السختیانی کے اسماء شامل ہیں۔ ان تمام سے علماء نے کرامات کے واقعات روایت کیے ہیں۔ اور کچھ تو ان میں سے مثلاً ایوب السختیانی علیہ الرحمہ، سفیان الثوری علیہ الرحمۃ اور حماد بن زید علیہ الرحمۃ ایسے ثقہ ائمہ دین ہیں کہ ان کی روایات کو کسی طرح رد نہیں کیا جاسکتا۔ حدود اللہ، احکام حلال و حرام اور دین کے دیگر مسائل میں ہم ان کے اقوال و روایات کا تو کسی طرح انکار نہیں کرتے اور ان میں ہم ان کی روایت کو صحیح مانتے ہیں پھر ہم کس طرح ان کی ان روایات کا انکار کر سکتے ہیں جن کا تعلق کراماتِ اولیاء سے ہے۔

میں نے اہلِ علم کے ایک گروہ کو دیکھا کہ انھوں نے کراماتِ اولیاء سے متعلق ایک ہزار حکایات اور ایک ہزار روایات سے زیادہ مواد جمع کیا۔ ہم کس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام کے تمام واقعات غلط ہیں۔ اگر ان تمام میں سے ایک بھی صحیح ہو تو یہ تمام کے صحیح ہونے کی دلیل ہے کیونکہ ایک ہی موضوع سے متعلق روایات میں زیادہ اور کم کی تو بات ہی نہیں ہوتی۔

سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز

جو یہ دلیل بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جن لوگوں سے کرامات ظاہر ہوئی تھیں وہ دراصل اس وقت کے نبی کے لیے ایک اعزاز تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو کرامات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ظاہر ہوئیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اللہ کی جانب سے ایک اعزاز تھا ہم اس بات میں اس قدر اضافہ کرتے ہیں کہ نہ صرف صحابہ کرام بلکہ تابعین اور ان کے بعد

قیامت تک جو کرامات بھی دنیا میں صالح لوگوں سے ظاہر ہوں گی وہ رہتی دنیا تک سید دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے ایک شاندار اعزاز رہے گا۔

امتِ مسلمہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کرامات کو حال، مرتبہ اور شرف نہیں سمجھتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ اصفیاء کے لیے بجائے امتحان و آزمائش کے ہے اور جو شخص اس سے خوش ہو جائے یا مطمئن ہو جائے وہ طبقۂ خواص میں شمار نہیں ہوتا۔ انھیں یہ خوف بھی رہتا ہے کہ کرامات ان کے لیے درجات میں کمی کا باعث بنتی ہیں۔

○

۸۸

کرامات میں خواص کا مقام اور بعض اہلِ کرامت کا خوفِ فتنہ کے باعث کرامت سے اظہارِ ناپسندگی

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ کرامات تو وقت کے ساتھ گذر جاتی ہیں لہذا سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ برائی کو نیکی سے بدلا جائے۔

ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: ابتدا میں مجھے اللہ تعالٰی نے آیات و کرامات دکھائیں، مگر میں نے ان کی جانب توجہ نہ دی۔ اس کے نتیجے میں مجھے معرفت عطا کی گئی۔

کہتے ہیں کہ ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص ایک رات میں مکّہ پہنچ جاتا ہے۔ اس پر انھوں نے جواب دیا: شیطان بھی ایک ہی لحظے میں مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتا ہے اور وہ بدستور ملعون رہتا ہے۔

کسی اور شخص نے ان سے کہا کہ فلاں پانی پر چلتا ہے۔ آپ نے کہا: مچھلیوں کا پانی میں ہونا اور پرندوں کا ہوا میں اڑنا اس سے کہیں زیادہ حیران کن ہے۔

میں نے طیفور بن عیسٰی سے انھوں نے موسٰی بن عیسٰی سے انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے کہا کہ ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: اگر کوئی شخص اپنا مصلٰی پانی پر بچھا دے اور ہوا میں چہل قدمی کرے تو اس سے مرعوب مت ہو جاؤ بلکہ یہ دیکھو کہ امر و نہی کی پابندی وہ کہاں تک کرتا ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ نے فرمایا: خواص کے قلوب اللہ تعالٰی سے اس وقت حجاب

میں رہتے ہیں جب وہ نعمتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں عطا، وبخشش سے تلذذ حاصل کرتے ہیں اور کرامات پر خوش ہوتے ہیں۔

مجھے ابن سالم نے اور انھیں ان کے والد نے بتایا کہ ایک شخص سہل بن عبداللہؒ کی صحبت میں رہتا تھا۔ ایک روز اس نے سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ سے کہا: اے ابو محمدؒ! بعض اوقات میں وضو کرتا ہوں تو جو پانی میرے ہاتھوں سے بہتا ہے وہ سونے اور چاندی کی سلاخیں بن جاتا ہے۔ سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ نے اسے کہا: تو نے نہیں دیکھا کہ جب بچہ رونے لگتا ہے، تو اس کے ہاتھ میں جھنجھنا تھما دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس سے کھیلنے میں مشغول ہو جائے۔ اب غور کر لو کہ تم کیا کر رہے ہو؟

ابو حمزہؒ سے متعلق ایک واقعہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ایک دروازے کو کھولنے کے لیے جمع تھے مگر دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ ابو حمزہؒ آئے اور انھوں نے کہا: ایک طرف ہٹ جاؤ۔ پھر قفل کو پکڑ کر ہلانے لگے اور قفل کھل گیا۔

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ ایک رات کو دجلہ پر گئے تو دیکھا کہ دریا کے دونوں کنارے ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر انھوں نے خدا کے حضور عرض کی: تیری عزت وجلال کی قسم! میں اسے کشتی ہی سے عبور کروں گا۔

ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں، میرے پاس ابو علی سندھی علیہ الرحمۃ تشریف لائے اور یہ ان کے استاذ تھے۔ ان کے پاس ایک تھیلی تھی جو انھوں نے میرے سامنے الٹا دی۔ اور اس میں سے جواہرات نکلے میں نے پوچھا کہ یہ کہاں سے ملے۔ انھوں نے کہا: میں یہاں ایک وادی میں پہنچا تو یہ جواہرات زمین پر پڑے چمک رہے تھے، میں نے اٹھا لیے۔ میں نے پوچھا: جب آپ وادی میں پہنچے تو آپ کی کیفیت کیا تھی؟ کہا: میری کیفیت اس وقت تھوڑے وقت کے لیے اس کیفیت سے کٹ چکی تھی جو وادی میں داخل ہونے سے قبل تھی۔

یہاں اس واقعے میں نتیجہ خیز بات یہ ہے کہ جس وقت ان کی کیفیت میں کمزوری واقع ہوئی اسی وقت اسے جواہر میں مشغول کر دیا گیا۔

محمد بن یوسف البنآ کا بیان ہے کہ ابو تراب نخشبی علیہ الرحمۃ صاحب کرامت بزرگ تھے۔ ایک سال میں نے ان کے ہمراہ سفر کیا۔ ہمارے ساتھ چالیس اشخاص اور بھی تھے جن کے ساتھ وہ مہربانی سے پیش آتے تھے۔ ابو تراب نے انھیں راستہ دکھانے میں ان کی راہنمائی کی۔ دوران سفر ہم راستہ بھول گئے تو ہمارے ساتھ سوائے ایک دبلے پتلے نوجوان کے کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ اس وقت ابو تراب نے کہا: ان تمام میں سے مضبوط ایمان والا یہی نوجوان ہے۔ ہم نے سفر جاری رکھا تا آنکہ ہمیں کھانا کھانے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ ابو تراب علیہ الرحمۃ تھوڑی دیر کے لیے راستے سے ہٹ کر ایک طرف کو گئے اور واپس آئے تو کیلے کا ایک گچھا ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے وہ گچھا ہمارے سامنے رکھ دیا حالانکہ اس وقت ہم ریت کے ٹیلوں کے وسط میں تھے۔ ابو تراب نے اس نوجوان کو وہ کیلے کھلانے کی بڑی کوشش کی مگر اس نے نہیں کھائے۔ ہم نے اس سے کہا کیا وجہ ہے کیوں نہیں کھاتے؟ اس نے جواب دیا: میں نے اپنے رب کے ساتھ یہ پیمان باندھا ہے کہ جو چیز بھی مجھے معلوم ہو جائے اسے ترک کر دوں گا۔ آپ بھی اب میرے لیے معلوم ہیں لہٰذا میں آج سے آپ کی صحبت ترک کرتا ہوں۔

محمد بن یوسف نے کہا کہ میں نے ابو تراب علیہ الرحمۃ سے کہا اگر چاہو تو کوشش کر کے اسے روک لو اور چاہو تو اسے چھوڑ دو۔ ابو تراب علیہ الرحمۃ نے نوجوان سے کہا: جو چاہو کرو۔

بے مثال پرہیز گاری

میں نے ابن سالم علیہ الرحمۃ سے سنا انھوں نے کہا کہ جب اسحاق بن احمد علیہ الرحمۃ کا انتقال ہوا اس وقت سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ ان کی عبادت گاہ میں داخل ہوتے وہاں انھوں نے ایک ٹوکری میں دو بوتلیں پڑی پائیں۔ ایک بوتل میں سرخ رنگ کی کوئی چیز تھی اور دوسری میں زرد رنگ کی۔ اس کے علاوہ چاندی اور سونے کے دو ٹکڑے بھی وہاں پڑے تھے۔ ابن سالم علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ سہل نے میرے والد کو حکم دیا کہ

وہ دونوں ٹکڑے دجلہ میں پھینک دے۔ پھر انھوں نے دونوں بوتلوں میں موجود مواد میں مٹی ملا دی۔ اور اسحاق بن احمد پر اس وقت قرضہ بھی واجب الادا تھا۔ ابن سالم علیہ الرحمۃ نے کہا کہ میرے والد نے کہا کہ میں نے سہل علیہ الرحمۃ سے پوچھا کہ بوتلوں میں کیا چیز تھی؟ سہل علیہ الرحمۃ نے کہا: جو سُرخ مواد تھا اگر اسے ایک درہم برابر تانبے کی مثقالوں پر ڈال دیا جاتا تو وہ سونے میں تبدیل ہو جاتیں۔ اور جو زرد رنگ کا مواد تھا اگر اسے ایک درہم برابر مقدار میں تانبے کی مثقالوں پر ڈال دیا جاتا تو وہ چاندی بن جاتیں۔ اور جو دو ٹکڑے انھوں نے سونے اور چاندی میں تبدیل کیے تھے وہ بطور تجربے کے تھے۔ میں نے پوچھا: وہ کیا چیز تھی جس نے انھیں سونا چاندی بنا کر اپنا قرض چکانے سے روکے رکھا؟ سہلؒ نے کہا: اے دوست! اسے اپنے ایمان کا ڈر تھا۔

راقم السطور نے ابن سالم علیہ الرحمۃ سے کہا کہ کیا یہ زیادہ بہتر نہ تھا کہ سہل بن عبداللہؒ ان سونے اور چاندی کے دو ٹکڑوں کو ضائع کرانے کے بجائے ان میں سے اسحاق بن احمدؒ کا قرض ادا کر دیتے۔ ابن سالمؒ نے مجھے جواب دیا کہ سہل بن عبداللہؒ اسحاق بن احمدؒ سے بھی بڑھ کر اپنے ایمان پر ڈرتے تھے۔ اور پھر مزید کہا کہ انھیں ایسا کرنے سے ورع نے روک لیا تھا۔ کیونکہ اس طرح بنائے ہوئے سونے یا چاندی کی اصلیت ستّر برس کے بعد بدل جاتی ہے۔

مشابہتِ فرعون سے احتراز

ابو حفصؒ یا کسی اور شیخ کے بارے میں حکایت بیان کی جاتی ہے کہ وہ تشریف فرما تھے اور ان کے مریدین ان کے گرد بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک ہرن پہاڑ سے اتر کر ان کے قریب آیا اور بیٹھ گیا۔ ابو حفص یا شیخ علیہ الرحمۃ یہ دیکھ کر رونے لگے۔ اور ہرن کو چھوڑ دیا۔ مریدین نے سبب پوچھا، جواب دیا: تم لوگ میرے پاس بیٹھے تھے اور میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر ایک بکری میرے پاس ہوتی تو تمھارے لیے ذبح کرتا۔ مگر جب یہ ہرن آ کر میرے پاس بیٹھ گیا تو مجھے اپنا یہ فعل فرعون سے مشابہ معلوم ہوا کہ اس نے بھی

اللہ تعالٰی سے عرض کیا تھا کہ اس کے پاس دریائے نیل بہاتے، تو اللہ تعالٰی نے اس کے لیے ایسا ہی کر دیا۔ اسی لیے مجھے رونا آیا اور میں نے اللہ سے درخواست کی وہ مجھے میری اس خواہش پہ درگذر فرمائے۔

کسی شیخ کا کہنا ہے کہ ایک شخص کی اس بات سے متعجب مت ہو جاؤ کہ اس نے جیب میں کچھ بھی نہیں ڈالا تھا مگر ہاتھ اس میں داخل کیا تو جو کچھ چاہتا تھا نکال لیا۔ بلکہ کسی شخص کی اس بات سے ضرور متعجب ہو جاؤ کہ اس کی جیب میں کوئی چیز موجود تھی اور اس نے اس میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا اور اس کے باوجود وہ متغیر نہیں ہوا۔

ابن عطا کا بیان ہے کہ میں نے ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ کو یہ کہتے سنا: میرے ذہن میں کرامات کے بارے میں کچھ شک سا تھا لہٰذا میں نے بچوں سے مچھلی پکڑنے کی چھڑی لی اور دو کشتیوں کے درمیان کھڑے ہو کر کہا: تیرے جلال کی قسم! اگر آج میرے لیے تین رطل وزنی مچھلی نہ نکلی تو میں اس پانی میں ڈوب کر مر جاؤں گا۔ اور اتنے میں تین رطل کی مچھلی میرے لیے نکلی۔ یہ بات جنید علیہ الرحمۃ تک پہنچی تو انھوں نے کہا: وہ اس لائق تھا کہ اس کے لیے اژدھا نکلتا اور اسے ڈس لیتا یعنے اگر اسے سانپ ڈس لیتا تو دین کے معاملے میں یہ اس کے لیے مچھلی حاصل کرنے سے زیادہ نفع بخش تھا کیونکہ مچھلی پا لینے میں فتنہ تھا جب کہ سانپ کے ڈسنے میں تطہیر اور کفارہ تھا۔

یحیٰی بن معاذ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: جب تو کسی شخص کو دیکھے کہ وہ کرامات کی طرف اشارہ کرتا ہے تو جان لو کہ اس کا طریق ابدال کا ہے اور جو نعمتوں کی طرف اشارہ کرے تو اس کا طریق اہل محبت کا ہے اور اس کا درجہ ماقبل سے اعلیٰ ہے۔ اسی طرح جو ذکر کی طرف اشارہ کرے اور اللہ کے ذکر سے ہر وقت متعلق رہے تو جان لو کہ اس کا طریق عارفین کا ہے اور یہ تمام احوال سے درجے کے اعتبار سے اعلیٰ ہے۔

۸۹

صوفیہ کا تربیتِ مریدین کے لیے اظہارِ کرامات

مجھے جعفر خلدی علیہ الرحمۃ نے بتایا کہ ان سے جنید علیہ الرحمۃ نے کہا: میں ایک دن سری سقطی علیہ الرحمۃ کے پاس گیا تو انھوں نے کہا:

میں تمھیں ایک چڑیا کے بارے میں حیران کن بات بتاتا ہوں کہ وہ روزانہ آتی ہے اور اس برآمدے میں اتر جاتی ہے۔ میں اس کے لیے ایک لقمہ لے کر اپنی ہتھیلی پہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہوں تو وہ میری انگلیوں کے پوروں پر بیٹھ کر کھاتی رہتی ہے۔

پھر ایک وقت یہ بھی آیا کہ وہ آئی میں نے ہتھیلی پہ لقمے کو اس کے لیے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھا مگر اس بار وہ میری انگلیوں پہ آ کر نہیں بیٹھی۔ میں نے سوچا کہ آخر کیا سبب ہے اس کو مجھ سے نفرت کیوں ہو گئی تب مجھے یاد آیا کہ میں نے اس روز مسالہ دار کھانا کھایا تھا۔ اور میں نے اس روز سے مسالہ دار کھانے سے توبہ کر لی۔ تب وہ آ کر میرے ہاتھ پر بیٹھی اور لقمے کے ٹکڑے کھا کر اڑ گئی۔

عجیب و غریب بدرقہ

ابو محمد مرتعش علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ ابراہیم خواص علیہ الرحمۃ نے کہا: میں کئی دنوں تک جنگل میں بھٹکتا رہا کہ میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی اس نے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ اس نے کہا: آپ راستہ بھٹک چکے ہیں؟ ہاں! اس نے کہا: کیا میں آپ کو راستہ بتا نہ دوں! میں نے کہا: کیوں نہیں۔

پھر وہ چند قدم تک میرے آگے ہو لیا اور اچانک غائب ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ میں راستے پر آ گیا تھا۔ جب سے میں اس شخص سے جدا ہوا ہوں اس دن سے نہ کبھی میں راستہ بھولا ہوں اور نہ ہی کبھی سفر میں مجھے بھوک پیاس محسوس ہوئی۔

جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

ایک دفعہ ابو حفص علیہ الرحمۃ (نیشاپوری) میرے پاس آئے جب کہ ان کے ہمراہ لوگوں کی ایک جماعت اور عبداللہ الرباطی علیہ الرحمۃ بھی تھے۔ ان لوگوں میں ایک شخص نہایت نیک اور کم گو تھا۔ اسی شخص نے ایک روز ابو حفص علیہ الرحمۃ سے کہا کہ متقدمین میں سے ایسے لوگ تھے جنھوں نے واضح کرامات دکھائیں مگر آپ نے کبھی کوئی ایسی کرامت نہیں دکھائی۔ ابو حفص علیہ الرحمۃ نے اس شخص سے کہا: آؤ! پھر وہ اسے لوہاروں کے بازار لے گئے وہاں انھوں نے ایک لوہار کی بھٹی میں سے گرم سرخ لوہے کو ہاتھ سے پکڑ کر نکالا جو ان کے ہاتھ میں فوراً ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے اس شخص سے کہا کہ تمھارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ کسی نے ان سے کرامت ظاہر کرنے کا سبب پوچھا تو فرمایا: وہ اپنے حال کو پانے ہی والا تھا لہٰذا مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں اس کا حال متغیر نہ ہو جائے۔ اسی لیے اس کے لیے کرامت ظاہر کی۔ میرے پیش نظر اس کے حال کا تحفظ اس کے ایمان میں اضافہ اور اس کے ساتھ مہربانی کا سلوک تھا۔

ابراہیم بن شیبان علیہ الرحمۃ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ آغازِ عمر میں ابوعبداللہ
ی علیہ الرحمۃ کی صحبت میں رہتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک روز شیخ مغربی نے
ایک جگہ سے پانی لانے کو بھیجا۔ اور میں ان کے لیے پانی لانے کے لیے اس
م پر پہنچا تو ایک تنگ سے راستے میں میرا آمنا سامنا ایک جنگلی درندے سے ہو گیا
ی کے لیے آرہا تھا۔ کبھی میں مزاحمت کرتا اور کبھی وہ درندہ تاآنکہ میں اس سے آگے
لکہ اس سے پہلے پانی پر پہنچ گیا۔

احمد بن محمد سلمی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ میں ذوالنون مصری علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر
میں نے ان کے سامنے سونے کا ایک طشت اور اس کے ارد گرد آگ اور عنبر کو جلتے
ے دیکھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا، تم ان لوگوں میں سے ہو جو بادشاہوں پہ ان کے
ے دنوں میں داخل ہوتے ہیں۔ پھر انھوں نے مجھے ایک درہم عطا کیا جسے خرچ کر کے میں
پہنچا۔

ذوالنون علیہ الرحمۃ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بعض اوقات چوپایوں کی طرح
د پہچانتے تھے۔

ب سے بندوبستِ طعام

ابوسعید خراز علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کا میرے ساتھ اس طرح کا
لہ تھا کہ ہر تین دن کے بعد مجھے کھلا دیا کرتا تھا۔ میں ایک بار ایک جنگل میں داخل ہوا
جھے تین دن گذر گئے مگر کھانے کو کچھ نہ ملا۔ چوتھے روز مجھے ضعف محسوس ہونے لگا اور
جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا کہ اچانک غیب سے ندا سنتا ہوں کہ اے ابوسعید!
ں کونسی چیز زیادہ پسند ہے، اسباب یا طاقت۔ اس کے جواب میں نے چیخ کر کہا کہ
ں، طاقت چاہیئے۔ اس کے بعد میں اسی وقت اٹھا اور مسلسل بارہ دن تک چلتا رہا مگر
ئی تکلیف محسوس نہیں کی۔

ابوعمر انماطی کہتے ہیں کہ میں اپنے استاد کے ہمراہ ایک جنگل میں جا رہا تھا کہ

اچانک بارش نے آلیا اور ہم ایک مسجد میں داخل ہو گئے تاکہ بارش سے امن میں رہیں۔ مسجد کی چھت میں شگاف تھا اور میرے استاذ چھت پہ چڑھ گئے تاکہ اس کی مرمت کرلیں اور ہمارے پاس ایک لکڑی تھی جسے ہم دیوار پر رکھنے لگے مگر وہ چھوٹی نکلی۔ میرے استاذ نے کہا: اسے کھینچو؟ میں نے کھینچی، تو وہ اتنی لمبی ہو گئی کہ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پہنچ گئی۔

عمر علیہ الرحمۃ نے کہا: میں خیر النّساج کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہا: اے شیخ! میں نے کل آپ کو دیکھا تھا کہ آپ نے دو درہم میں سوت بیچا، میں آپ کے پیچھے ہو لیا اور آپ کے تہبند سے وہ دونوں درہم کھول لیے مگر میرے ہاتھ کی مٹھی بند ہو گئی جو کھلتی نہیں۔ شیخ مسکرائے اور اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا تو اس کا ہاتھ کھل گیا۔ پھر فرمایا: جاؤ! ان سے اپنے بچوں کے لیے کچھ خرید لو۔ اور اس طرح کی حرکت پھر نہ کرنا۔

○

۹۰

خواص صوفیہ کے کرامات سے بڑھ کر لطیف احوال

فاقے سے تقویت اور شکم سیری سے ضعف

میں نے طلحہ العصائدی البصریؒ سے بصرہ میں سنا انھوں نے کہا کہ میں نے المغنیؒ جو سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ کے مرید تھے، کو یہ کہتے سنا کہ سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ ستر دن تک بغیر طعام کے صبر کر لیتے تھے۔ جب وہ کچھ کھا لیتے تو ضعف ہو جاتا اور کچھ نہ کھاتے تو تقویت مل جاتی۔

ابو حارث الاولاسی علیہ الرحمۃ نے کہا کہ تیس برس تک میری زبان میرے باطن سے سنتی رہی اس کے بعد حالت بدلی اور اگلے تیس برس تک میرا باطن میری زبان سے سنتا رہا۔

ابوالحسن المزینؒ نے کہا کہ ابو عبید السبری رمضان کی پہلی تاریخ کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے اور اپنی بیوی سے کہتے کہ دروازے کو مٹی سے لیپ دو۔ اور ہر رات میرے لیے ایک روٹی کھڑکی میں ڈال دیا کرو۔ جب عید کا دن آتا تو وہ دروازہ کھولتے اور ان کی بیوی کمرے میں داخل ہوتیں تو دیکھتیں کہ تیس روٹیاں ایک کونے میں ڈھیر ہیں نہ انھوں نے کچھ کھایا پیا ہوتا اور نہ ہی ان سے نماز کی رکعت قضا ہوئی ہوتی۔

ابوبکر الکتانی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: جب بھی میں نے کسی شے کو اپنے دل میں بطور

امانت رکھا ہے تو اس نے خیانت کی ہے۔

مفہومِ اُمن

ابو حمزہ الصوفی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میرے ہاں خراسان سے ایک شخص آیا اور مجھ سے پوچھا: اُمن کیا ہے؟ میں نے اس سے کہا: میں ایک شخص کو جانتا ہوں کہ اگر اس کے دائیں ہاتھ جنگلی درندے ہوں اور بائیں جانب چمڑے کا تکیہ تو وہ یہ فرق نہیں کر سکے گا کہ کس پر تکیہ لگائے۔ اس نے کہا: یہ تو علم تھا، حقیقت پیش کرو۔ میں جواباً خاموش ہو گیا پھر اس نے کہا: سن، اے بدبخت! میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں کہ اگر وہ مغرب سے مشرق کی طرف روانہ ہو تو اس کے باطن میں تغیّر پیدا نہ ہو۔ ابو حمزہ علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ اس کے بعد چالیس دن رات تک نہ میں نے کچھ کھایا پیا اور نہ ہی سویا۔ حتّٰی کہ مجھ پر اس کے قول کا مطلب واضح ہو گیا۔

دل کی باتیں جان لینے والا نوجوانؒ اور جنید بغدادیؒ

ابو عمر بن علوانؒ کہتے ہیں کہ ایک نوجوان جنید علیہ الرحمۃ کی صحبت میں رہا کرتا تھا۔ اس کا قلب اس قدر ہوشیار تھا کہ اکثر و بیشتر لوگوں کے دل کے راز بیان کر دیتا۔ جنید علیہ الرحمۃ کو یہ بات بتائی گئی تو انھوں نے اسے بلا کر پوچھا: یہ مجھے تمھارے بارے میں کیا خبر پہنچی ہے نوجوان نے کہا: میں اور تو نہیں جانتا مگر یہ ہے کہ آپ جو چاہیں اپنے دل میں سوچ لیں۔ جنید علیہ الرحمۃ نے کہا: میں نے سوچ لیا۔ نوجوان نے کہا: فلاں فلاں بات۔ جنید علیہ الرحمۃ نے کہا: بالکل نہیں۔ نوجوان نے کہا: دوسری بار سوچیے۔ جنید علیہ الرحمۃ نے کہا: سوچ لیا۔ نوجوان نے کہا: فلاں فلاں بات۔ جنید علیہ الرحمۃ نے کہا: بالکل نہیں۔ نوجوان نے کہا: تیسری بار سوچیے۔ جنید علیہ الرحمۃ نے کہا: سوچ لیا۔ نوجوان نے کہا: فلاں فلاں بات۔ جنید علیہ الرحمۃ نے کہا: بالکل نہیں۔ نوجوان نے کہا: واللہ! یہ عجیب بات ہے میں آپ کو بھی سچا سمجھتا ہوں اور اپنے دل کو بھی خوب جانتا ہوں اور آپ مسلسل نفی میں جواب دے

رہے ہیں آخر یہ بات کیا ہے۔ یہ سن کر جنید علیہ الرحمۃ مسکرائے اور کہنے لگے : میرے بھائی تم ہر بار سچے تھے مگر میں نفی میں جواب دے کر تمھارا امتحان لے رہا تھا کہ یہ کیفیت و کمال جو تمھیں حاصل ہے اس سے کہیں تمھارا حال تو متغیر نہیں ہو جاتا۔

لقمۂ حرام اور حارث المحاسبیؒ

جعفر خلدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ انھوں نے جنید علیہ الرحمۃ سے سنا اور انھوں نے فرمایا : حارث المحاسبی علیہ الرحمۃ میرے گھر تشریف لائے اور میرے ہاں کوئی ایسی اچھی چیز نہیں تھی جو میں انھیں کھلاتا۔ میں اپنے چچا کے گھر چلا گیا اور وہاں سے کھانا لے آیا۔ میں نے ایک لقمہ اٹھایا انھوں نے منہ کھولا میں نے ان کے منہ میں نوالہ رکھا اور وہ اُسے منہ میں ادھر اُدھر ہلاتے رہے مگر نگلتے نہ تھے۔ پھر اٹھے اور لقمہ باہر دہلیز پر ڈال دیا۔ میں ان کے پیچھے چلا گیا اور ان سے پوچھا : آپ نے لقمہ نگلا نہیں اور دہلیز پر منہ سے نکال کر پھینک دیا۔ انھوں نے کہا : ہاں ، بیٹے یہ اس لیے کہ میرا اپنے رب کے ساتھ یہ عہد ہے کہ جو چیز حرام ہو گی میں اسے نہیں نگل سکوں گا۔ میں نے اپنا منہ اس لیے کھولا تھا تاکہ تم خوش ہو جاؤ حالانکہ میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس نوالے کو نگل لیتا لہٰذا میں اٹھا اور اسے دہلیز پر ڈال آیا۔

ابو جعفر الحداد علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ ابو تراب علیہ الرحمۃ ایک جنگل میں مجھ سے ملے جب کہ میں ایک تالاب کے کنارے اس حالت میں بیٹھا تھا کہ سولہ دن سے نہ کچھ کھایا تھا اور نہ ہی اس تالاب سے پانی پیا تھا۔ انھوں نے پوچھا : یہاں کس لیے بیٹھے ہو؟ میں نے کہا : میں علم اور یقین کے درمیان منتظر بیٹھا ہوں کہ کون غالب آتا ہے تاکہ میں اس کے ساتھ ہو جاؤں ، انھوں نے کہا : عنقریب نتیجہ تمھارے سامنے آجائے گا۔

ابو عبداللہ حصری علیہ الرحمۃ نے کہا : میں نے صوفیہ میں سے ایک شخص دیکھا جس نے سات برس بغیر کھائے گذار دیئے۔ اور میں نے ایک شخص کو دیکھا جس نے سات برس بغیر کچھ پیئے گذار دیئے۔ اور میں نے ایک شخص دیکھا جس نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو

اس کا ہاتھ وہیں سوکھ گیا کیونکہ کھانا مشکوک تھا۔

جعفر المبرقع علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ میں نے تیس برس ہوتے اللہ کے ساتھ اس خوف سے کوئی عہد نہیں کیا کہ مبادا ٹوٹ جائے اور مجھ پر جھوٹ کا الزام - لگ جائے۔

ابوبکر زقاق علیہ الرحمۃ نے فرمایا: ہم اسماعیل سلمی کے ہمراہ سفر کر رہے تھے کہ وہ پہاڑ کی چوٹی سے گرے اور ان کی پنڈلی کی نلی ٹوٹ گئی۔ اس پر انھوں نے کہا: تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ غمگین مت ہو کیونکہ یہ پنڈلی ہے جو مٹی سے بنی ہے جب سوکھ جائے گی تو ہم اسے درست کر دیں گے۔

(۹۱)

اصطلاحاتِ صوفیہ اور ان کی تشریحات

اَلحَقُّ بِالحَقِ لِلحَقِ

اس اصطلاح میں تینوں جگہ حق سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ[1] اور اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا۔

ابو صالح علیہ الرحمۃ نے آیت کریمہ میں حق کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے اللہ تعالیٰ مراد ہے۔

ابو سعید خرّاز علیہ الرحمۃ نے اپنی کسی گفتگو میں کہا کہ بندہ حق کے ساتھ موقوف ہے، حق کے ذریعے موقوف ہے اور حق کے لیے موقوف ہے حق سے ان کی مراد اللہ ہے۔

مِنہُ، بِہٖ اور لہٗ

اور یہی تشریح منہ، بہٖ اور لہٗ کی ہے کہ اس میں "ہ" کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے۔ اس طرح ہم یوں کہیں گے کہ من اللہ، باللہ، للہ، بعض اوقات اس سے مراد

---

[1] : المومنون: ۷۱

خود بندہ بھی ہوتا ہے جیسے من العبد، بالعبد اور للعبد اور جیساکہ ابو یزید علیہ الرحمۃ نے کہا کہ مجھ سے ابو علی سندی نے کہا: میں ایک ایسے حال میں تھا جو مجھ سے میرے لیے اور میرے ساتھ قائم تھا اس کے بعد میں ایک ایسے حال پر فائز ہوا کہ جو اس سے اس کے لیے اور اس کے ساتھ تھا۔

یہاں مفہوم یہی نکلتا ہے کہ بندہ اپنے افعال کو دیکھ رہا ہے لہٰذا وہ اپنے افعال کو خود اپنی ذات سے منسوب کرتا ہے مگر جب اس کے قلب پر انوارِ معرفت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ جملہ اشیاء کو اللہ سے قائم اللہ کے لیے معلوم اور اسی کے لیے لوٹنے والی پاتا ہے۔

حال

ایک ایسی وارداتِ قلبی ہے جو بندے پر ایک خاص وقت میں وارد ہوتی ہے پھر دل میں قرار پکڑتی ہے جب کہ دل میں رضا اور سب کچھ اللہ کے سپرد کر دینے کی صفات موجود ہوں۔ سالک اس کے لیے صفاء باطن پیدا کرتا ہے اور پھر یہ حال زائل ہو جاتا ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ کے مطابق حال کی تعریف یہ ہے: حال صفائے اذکار کے ساتھ باطن میں وارد ہوتا ہے اور زایل نہیں ہوتا اگر زائل ہو جائے تو حال نہیں کہلاتا۔

مقام

مقام کی یہ خصوصیت ہے کہ بندہ اپنے مخصوص احوال میں اس پر فائز ہوتا ہے جیسے مقام صابرین و متوکلین جو کہ بندے کا ظاہری و باطنی مقام ہے اس کے مجاہدات و معاملات اور ارادات کے مطابق جب بندہ کسی حال میں مکمل ہو تو وہی اس کا مقام ہوتا ہے جس سے وہ اگلے مقام کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے جیساکہ ہم احوال و مقامات کے باب میں اس کا ذکر کر آئے ہیں۔

مکان

یہ اہل کمال و استقامت اور تصوف میں منتہی صوفیہ کا حصہ ہے۔ جب بندہ اپنے

احوال میں کامل ہو جاتا ہے تو اسے ایک مستقل مکان عطا کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس نے احوال و مقامات طے کر لیے ہوتے ہیں لہٰذا وہ بالآخر صاحبِ مکان ہو جاتا ہے۔

کسی نے کہا ہے ؎

مکانك من قلبی هو القلب کلہ

فلیس لشیءٍ منہ غیرك موضعُ

میرے دل میں تیرا مقام یہ ہے کہ سارا دل ہی تیرا مکان ہے اس میں تیرے سوا کسی اور کے لیے جگہ ہی نہیں۔

مشاہدہ

قدرتِ حق کی نشانیاں دیکھ کر قلب میں حضورِ حق کا پیدا ہونا اور باہم قریب آنے کا نام مشاہدہ ہے۔ مکاشفہ اور مشاہدہ دونوں معنی میں ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ مگر کشف معنی کے اعتبار سے زیادہ مکمل ہے۔

عمرو بن عثمان مکّی علیہ الرحمۃ نے کہا: مشاہدہ کا آغاز یہ ہے کہ زوائد یقین، کواشفِ حضور کے ساتھ چمکتے ہیں اور وہ غیب کے ڈھانپ لینے سے مستثنٰی نہیں ہوتے۔ الغرض مشاہدہ دوام محاضرہ کو کہتے ہیں جسے قلب طلب کرتا ہے جب اسے غیوب ڈھانپ لیتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِیْدٌ [1]	بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جو دل رکھتا ہو یا کان لگائے اور متوجہ ہو۔

شہید سے مراد حاضر ہے۔

---

[1] ق: ۳۷

لوائح

لوائح وہ انوارِ ذاتیہ ہیں جو باطن پر چمکتے ہیں تاکہ سالک کی بلندی میں اضافہ ہو اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتا رہے۔

جنید علیہ الرحمۃ نے کہا: وہ لوگ کامیاب رہے جنھیں مختصر راستے کی طرف رہنمائی کی گئی اور وہ سرگوشی کرنے سے قریب تر ہو گئے جس کے ذریعے انھوں نے فہمِ خطاب کو سمجھنے میں تیزی حاصل کر لی۔

ارشادِ خداوندی ہے:

وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ [1]	اور دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف۔

پھر عقلیں اس کے نزدیک اپنے اپنے مقام کے مطابق حُسنِ توجہ کے ساتھ متوجہ ہو گئیں۔

لوامع

اس اصطلاح کا معنیٰ لوائح سے قریب ہے۔ لوامع دراصل لوامعِ برق یعنی بجلی کے بار بار چمکنے سے ماخوذ ہے کہ جب بادلوں میں بجلی چمکتی ہے تو پیاسا یہ سمجھتا ہے کہ بارش ہوگی۔

عمرو بن عثمان مکّی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے خالص و پاکیزہ خیال میں اس طرح ورود فرماتا ہے کہ جیسے بجلی یکے بعد دیگرے چمکتی ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے اولیاء کے قلوب کے لیے معرفت کی یہ روشنیاں دکھاتا ہے تاکہ قلوب ایمان بالغیب رکھتے ہوئے اصل کے متعلق کوئی خیال نہ باندھیں۔ اور یہ معرفت کی بجلیوں کی چمک اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ نفس اس نور کا توہم کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ اس کا توہم کرے تو یہ سلسلہ فوراً منقطع ہو جاتا ہے۔

---

[1]: آل عمران: ۱۳۳

کہنے والے نے کہا ہے:

ع واغتر ذو طمع بلمع سراب

(اور طمع رکھنے والا سراب کی چمک سے دھوکا کھا گیا)

الحقّ

حق سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے جیسا کہ قرآن مجید شاہد ہے:

اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ[1] کہ اللہ ہی صریح حق ہے۔

حقوق

اس کے معنی میں احوال، مقامات، معارف، ارادات، معاملات اور عبادات شامل ہیں۔

طیالسی رازی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: جب حقوق ظاہر ہوتے ہیں تو حظوظ غائب ہو جاتے ہیں اور جب حظوظ ظاہر ہوتے ہیں تو حقوق غائب ہو جاتے ہیں۔ اور حظوظ کا معنی حظوظ نفس ہے۔ اور بشریت حقوق کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

تحقیق

بندے کا حقیقت کو پانے کے لیے اپنی کوشش و قوت کو استعمال کرنا تحقیق ہے۔

ذوالنون علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: میں ایک دانشور سے ملا تو اس سے پوچھا کہ سالک راستے میں تنگ درے کے اندر کیوں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ دانشور نے کہا: تصدیق کے ستونوں کے کمزور ہونے اور قلوب کے تحقیق پر دسترس حاصل کرنے میں ضعف کے باعث ایسا ہوتا ہے۔

---

[1] : النور: ۲۵

تحقق

اس کا معنی بھی تحقیق کا ہے اور دونوں میں وہی فرق ہے جو تعلیم و تعلم میں ہے۔

حقیقت

حقیقت اسم ہے اور حقائق، حقیقت کی جمع ہے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ قلوب پر ایمان رکھتے ہوں اس کے روبرو ہمیشہ قائم کھڑے رہیں اگر قلوب میں کوئی شک یا خیال اس کے بارے میں جس پر وہ ایمان رکھتے ہوں، داخل ہو جائے حالانکہ اس کے حضور قائم کھڑے ہوں تو ایمان باطل ہو جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ تمھارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ حارثہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں نے اپنے نفس کو دنیا سے کنارہ کش کر لیا، میں رات کو جاگتا رہا اور دن کو پیاسا رہا۔ میری حالت اب ایسی ہے کہ گویا میں اپنے رب کے عرش کو ظاہر ظہور دیکھتا ہوں۔

حدیث میں حارثہ رضی اللہ عنہ نے جس طرح کے مشاہدے کی بات کی اس سے ان کی مراد اپنے مشاہدۂ قلب اور اللہ کے حضور دائمی وقوف تھا گویا ان کا مشاہدہ آنکھوں سے دیکھنے کے برابر تھا۔

جنید علیہ الرحمۃ کا قول ہے: حقائق نے اس بات کو ناپسند کیا کہ وہ قلوب کے لیے برائے وضاحت کسی قول کا سہارا لیں۔

الخصوص

الخصوص سے مراد مخصوص صوفیہ ہیں اور یہ وہ صوفیہ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عام مومنین کے مقابلے میں حقائق، احوال اور مقامات عطا کر کے مخصوص ٹھہرایا۔

خصوص الخصوص

توحید میں تفرید و تجرید کے حامل ہوتے ہیں یعنی وہ صوفیہ جنھوں نے احوال و مقامات کو طے کیا اور ان کے حصول و عبور میں واقع ہونے والے صحراؤں سے گذر گئے۔

قولِ باری تعالیٰ ہے :

وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ [۱]	اور ان میں کوئی میانہ چال پر ہے اور ان میں کوئی وہ جو اللہ کے حکم سے بھلائیوں میں سبقت لے گیا۔

آیتِ مبارکہ میں مقتصد سے مراد خصوص (یعنے خاص صوفیہ) اور سابق سے مراد خصوص الخصوص (یعنی خاص الخواص) ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ مجھ سے جنید علیہ الرحمۃ نے فرمایا: اے ابوبکر! اس بات کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے کہ خصوص الخصوص اہلِ عموم ہیں اور پھر خود ہی فرمایا: اللہ کی طرف اشارہ کرنے میں خصوص الخصوص بھی اہلِ عموم ہیں۔

اشارہ

اشارہ یہ ہے کہ جسے متکلم، تکلم کے ساتھ بیان نہ کر سکے کیونکہ یہ معنی کے اعتبار سے نہایت لطیف ہوتا ہے۔

ابوعلی رودباری علیہ الرحمۃ نے کہا: ہمارا یہ علم تصوف محض اشارہ ہے جب عبارت بن جائے تو غائب ہو جاتا ہے۔

ایماء

ایماء، کسی عضو کی حرکت کے ساتھ اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔

---

[۱]: فاطر: ۳۲

جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں : میں نے ابن الکرینی علیہ الرحمۃ کے سر کے پاس بیٹھ کر اپنے سر کے ساتھ زمین کی طرف اشارہ کیا۔ تو انھوں نے کہا : دوری میں آسمان کی طرف اشارہ کیا تو کہنے لگے : دوری یعنی جس قدر بندہ اس کی طرف اشارہ کرے وہ دور ہی ہے۔
شبلی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں : جس نے اس کی طرف ایما ، یعنی کسی عضو کے ساتھ اشارہ کیا ، اس کی مثال بت کے پجاری کی سی ہے۔ کیونکہ ایما رفقط اصنام کی طرف ہی ہوتا ہے۔
اسی ضمن میں کسی نے کہا ہے ؎

ولی عند اللقآء وفیہ عتب

بایماء الجفون الی الجفون

ترجمہ : میرے لیے وصل کے قریب اور وصل کے دوران آنکھوں سے آنکھوں کی طرف اشارہ کرنے میں ملامت ہے یعنی ایسا کرنا میرے لیے کوئی اچھا امر نہیں۔

فابھت خیفۃً و اذوب خوفاً

و افنی عن حراك او سکون

ترجمہ : وصل کے دوران مجھے خوف سے مبہوت کیا جاتا ہے ، میں ڈر سے پگھلنے لگتا ہوں۔ اور حرکت و سکون سے بھی جاتا رہتا ہوں۔

رمز

ظاہری کلام میں پوشیدہ مفہوم کو رمز کہتے ہیں اس پر صرف اس کے اہل صوفیہ ہی کو دسترس حاصل ہوتی ہے۔
قناد علیہ الرحمۃ نے کہا ؎

اذ انطقوا اعجزك مرمی رموزھم

وان سکتوا ھیھات منك اتصالہ

ترجمہ : جب وہ بولیں گے تو ان کے رموز کا مقصد و مطلب تم پر واضح ہو گا اور اگر وہ خاموش ہو گئے تو تجھ سے ان کے رموز کے مطالب کا تسلسل دور چلا جائے گا۔

کسی نامعلوم صوفی کا قول ہے: جو ہمارے مشائخ کے رموز کو جاننا چاہتا ہے تو اسے ان کے مکتوبات و مراسلات پڑھنے چاہئیں نہ کہ ان کی تصنیفات۔ کیونکہ ان کے رموز مراسلات اور مکتوبات میں ہوتے ہیں، ان کی تصنیفات میں نہیں۔

صفائ

صفاتِ خلقیہ اور احساسِ فعل کے امتزاج سے پاک کیفیت کو صفار کہتے ہیں۔

جریری علیہ الرحمۃ کا قول ہے: صفار کی جو کیفیت حاصل ہو اسے صفار سمجھنا زیادتی ہے کیونکہ ایسا کرنے میں صفاتِ خلقیہ اور احساس فعل دونوں شامل ہوتے ہیں۔

ابن عطار علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: تم صفار عبودیت کے دھوکے میں نہ آجانا کیونکہ ایسا کرنے میں ربوبیت کو فراموش کر دینے کا خدشہ موجود ہے۔ اور اس میں احساسِ فعل اور صفاتِ خلقیہ بھی موجود ہیں۔

محمد بن علی ابوبکر کتانی علیہ الرحمۃ صفا کے بارے میں فرماتے ہیں: صفا مذموم افعال کو زائل کر دیتا ہے۔ اور صفار الصفار کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ احوال و مقامات سے گزار کر نہایات تک پہنچا دیتا ہے۔

صفار الصفار

حق کا حق کے ساتھ بلا علت مشاہدہ کرنے کے لیے موجودات کے اسرار کو ظاہر کرنے کا نام صفا الصفار ہے۔

کسی نے کہا ہے ؎

صفو الصفاء فی صفوہ اذعان　　　وصفاءہ فی کونہ ایقان

من بان بینٌ ما ابان بہ لہ　　　حق البیان بواضح البتیان

ھذا حقیقۃ وجد من وجدہ

ولو جدہ ھل فوق ذالک بیان

ترجمہ : صفوالصفاء اللہ کی صفا کا اقرار اور صفاء وجود حق کا یقین کرنا۔

جو خود ظاہر ہوا اس نے وہ کچھ واضح کر دیا جس نے اس کے لیے اس کے
ذریعے بیان کرنے کا حق بھرپور توضیح کے ساتھ ظاہر کر دیا۔
یہ اس کے اپنے وجد کو پانے کی حقیقت ہے۔ اور اس کے وجد کے لیے
کیا اس سے بڑھ کر کوئی بیان ہو سکتا ہے۔

زوائد

زواید، ایمان بالغیب اور یقین میں ہونے والے اضافوں کو کہتے ہیں۔ جب کبھی ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے، تو احوال، مقامات، ارادات اور معاملات میں صدق و یقین بھی بڑھتا ہے۔

عمرو بن عثمان مکّی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: جب یقین کے زوائد (اضافے) کو اشف حضور کے ساتھ دل کی پوشیدگی سے روشن ہوتے ہیں تو غیوب انھیں نہیں چھپاتے۔

فوائد

فوائد، ان تحائف کو کہتے ہیں جو اللہ کی جانب سے اس کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو بوقت حاضری، آسودگی و آسائش حاصل کرنے کے لیے عطا کیے جاتے ہیں۔

ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمۃ کا قول ہے: میں نے دیکھا ہے کہ فوائدرات کے اندھیرے میں وارد ہوتے ہیں۔

شاہد

شاہد وہ ہے جو تمہیں وہ کچھ دکھاتا ہے جو تجھ سے غائب ہوتا ہے یعنے تیرے قلب کو اس غیب کے پانے کے لیے حاضر کرتا ہے۔

کسی نے کہا ہے ؎

وفی کل شیٍٔ لہ شاھد
یدل علی انہ واحد

ترجمہ: ہر شے میں اس کے لیے ایک شاہد موجود ہے جو اس بات کی دلیل پیش کرتا ہے کہ وہ ایک ہے۔

شاھد بمعنی حاضر بھی ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ "شاہد" سے متعلق فرماتے ہیں: شاہد حق تیرے ضمیر و باطن میں موجود اس سے باخبر ہے۔

مشہود

جو کچھ شاہد دکھاتا ہے وہ مشہود ہے۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: شاہد حق ہے اور مشہود کائنات۔

اللہ جل شانہٗ کا فرمان ہے:

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ۔ [1] اور قسم ہے اس دن کی جو گواہ ہے اور اس دن کی جس میں حاضر ہوتے ہیں۔

موجود اور مفقود

موجود و مفقود دو متضاد اسم ہیں۔ موجود وہ ہے جو عالم عدم سے عالم وجود میں آیا۔ اور مفقود وہ ہے جو عالم وجود سے عالم عدم میں آیا۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمۃ نے کہا: مفقود کا غم نہ کر کیونکہ کوئی موجود بندہ اس کا ذکر کرتا ہی رہتا ہے۔

---

[1] البروج: ۳

معدوم

جس کا نہ کوئی وجود ہو اور نہ ہی ممکن ہو۔ اگر تو کوئی چیز کھو بیٹھے جس کا وجود ممکن ہو تو وہ چیز مفقود کہلائے گی معدوم نہیں۔

کسی عارف کا قول ہے: عالم عدم کے دو کناروں کے درمیان موجود ہے۔ پہلے بھی وہ معدوم تھا اور آخر کار پھر معدوم ہو جائے گا۔ عارف اس کے عدم کا مشاہدہ کرتا ہے اور ایسے میں وہ معرفتِ خالق کو پا لیتا ہے۔

جمع

جمع ایک مجمل لفظ ہے اس سے وہ اشارہ عبارت ہے جو بندہ حق کی طرف کون و خلق کے بغیر کرے۔ کیونکہ کون و خلق دونوں تخلیق کیے گئے ہیں اور خود اپنی ذات میں قائم نہیں بلکہ عدم کے دو کناروں کے درمیان موجود ہیں۔

تفرقہ

یہ بھی ایک مجمل لفظ ہے جو ایک ایسے اشارے سے عبارت ہے جو بندہ، کون و خلق کی طرف کرتا ہے۔

تفرقہ و جمع دونوں لازم و ملزوم ہیں، جس نے تفرقہ کی جانب جمع کے بغیر اشارہ کیا اس نے باری تعالیٰ کا انکار کیا۔ اور جس نے جمع کی طرف، بلا تفرقہ اشارہ کیا وہ قادرِ مطلق عزوجل کی قدرت کا منکر ہوا۔

اور جس نے دونوں کو باہم اکٹھا کیا اس نے توحید کو پا لیا۔

کسی نے کہا ہے ؎

جمعت و فرقت عنی بہ

و فرد التواصل مثنی العدد

ترجمہ: میں اکٹھا ہوا پھر خود سے جدا ہوا اس کے ساتھ ہو کر۔ گویا ہم دونوں کا وصل میں ایک ہونا گنتی کے لحاظ سے دو ہے۔ یعنی بظاہر گننے میں دو ہیں مگر بوقت وصل ایک ہیں۔

یعنی جمع میں ایک ہے اور تفرقہ میں دو۔

غیبت

حضورِ حق و مشاہدۂ حق میں مشغول رہتے ہوئے قلب کا خلق کے مشاہدے سے اس طرح دور رہنا کہ بندے کے ظاہر میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو غیبت کہلاتا ہے۔

غَشْیۃ

قلب پر جو کچھ واردات ہوتی ہیں ان سے اس کا بے خبر رہنا اور اس کا مظاہرہ بندے کے ظاہر پر ہونا غشیت ہے۔

حضور

خالص یقین کے ساتھ قلب کا اس غائب کے لیے حاضر رہنا جو اس کے عیان سے غائب ہو حضور کہلاتا ہے۔ اگر اس طرح کی کیفیت سالک کو حاصل ہو تو غائب بھی اس کے لیے حاضر کے مانند ہے۔

کسی نے کہا ہے:

ع انت وان غیبت عنی سیدی کالحاضر

ترجمہ: میرے سردار اچھا ہے تجھے مجھ سے غائب بھی کر دیا گیا ہو تب بھی میرے لیے بمنزلہ حاضر کے ہے۔

ابوالحسن نوریؒ کا شعر ہے ~ اذا تغیبت بدا

وان بدا غیبنی

ترجمہ: جب میں غائب ہوتا ہوں تب وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ ظاہر ہوتا ہے تو مجھے غائب کر دیتا ہے۔

صحو و سکر

صحو و سکر معنی کے لحاظ سے غیبت و حضور کے معنی سے قریب ہیں۔ اگر فرق ہے تو اس قدر کہ صحو و سکر، غیبت و حضور سے زیادہ قوی مکمل اور غالب ہوتا ہے۔ صحو و سکر سے متعلق کسی نے یہ اشعار کہے ہیں ؎

فحالان لی حالان صحوٌ و سکرۃٌ　　فلا زلت فی حالیّ اصحو و اسکر

کفاک بان الصحو اوجد کابتی　　فکیف بحال السکر و السکر اجدد

جحدت الھوی ان کنت مذ جعل الھوی　　عیونک لی عینا تغض و تبصر

نظرت الی شیءٍ سواک دانما

اری غیرنا احلام نوم یقدد

ترجمہ: تیری دو حالتیں ہیں ایک صحو اور دوسری سکر، اور میں ہمیشہ ان دونوں حالتوں میں یعنی صحو و سکر ہی میں رہتا ہوں۔

تیرے لیے یہی کافی ہے کہ حالتِ صحو نے مجھے شکستہ حال بنا دیا اگر ایسا ہے تو پھر حالتِ سکر میں کیا عالم ہو گا، اور سکر کی کیفیت ہی زیادہ مناسب ہوتی ہے۔

اگر میں نے اس وقت سے جب کہ محبت نے تیری آنکھوں کو میرے لیے ایسی آنکھ بنا دیا جو کبھی دیکھتی اور کبھی نہیں دیکھتی، تیرے سوا کسی اور طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہوتا تو میں محبت ہی سے دستبردار ہو جاتا۔

کیونکہ میں تمھارے اور اپنے سوا ہر شے کو خواب و خیال تصور کرتا ہوں۔

سکر اور غشیت میں فرق

سکر و غشیت میں فرق یہ ہے کہ سکر انسانی طبیعت سے نہیں پیدا ہوتا اس کے

طاری ہونے سے طبعیت یا حواس میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا جب کہ غشیت کے طاری ہونے کا تعلق انسانی طبعیت سے ہے اور اس کے طاری ہونے سے طبعیت اور حواس میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور طہارت باطل ہو جاتی ہے۔
غشیت ہمیشہ نہیں رہتی جب کہ سکر ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

صحو و حضور میں فرق

صحو حادث ہے اور حضور دائمی۔

صفو الوجد

صفو الوجد (خالص وجد) یہ ہے کہ وجودِ حق کے بغیر کوئی اور وجد کی حالت میں سامنے نہ ہو۔
جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

تحقق صفو الوجد منا فما لنا
علینا سوانا من رقیب تخبر

ترجمہ: ہمارے وجد کا خالص ہونا اس بات سے ہی ثابت ہو گیا کہ ہمارے لیے ہمارے اپنے نفس کے علاوہ کوئی جانچ پرکھ کرنے والا اور آگاہ کرنے والا نہیں۔

ہجوم و غلبات

ہجوم و غلبات باہم قریب المعنٰی ہیں۔ ہجوم، صاحبِ غلبات کا فعل ہے۔ یہ اس وقت واقع ہوتا ہے جب قوتِ رغبت ہو اور خواہشات و اسبابِ نفس کا اس میں کوئی دخل نہ ہو۔
اگر ایسے میں طالب کو مطلوب تک پہنچنے کے کچھ مزید آثار معلوم ہو جائیں تو چاہے درمیان میں سمندر ہو یا کوئی چٹیل میدان ہو وہ اسے غلباتِ ارادہ و قوتِ طلب رکھتے ہوئے

عبور کرے گا۔ اگر اسے آگ بھی راستے میں حائل دکھائی دے گی تو وہ جان و روح کی پرواہ کیے بغیر اس میں کود پڑے گا چاہے اس سے وہ مطلوب تک پہنچے یا نہ پہنچے۔

فنا اور بقار

فنار اور بقار کا ذکر ان سے متعلق باب میں بھی ہم کر آئے ہیں۔

فنار کا مفہوم صفاتِ نفس، بخل اور آسائش طلبی کو اپنے حال میں فنا کر دینا ہے اور بقاؔ اسی حالت پر باقی رہنے کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ فنار کی اک تعریف یہ ہے کہ بندے کا اپنے افعال کو افعالِ حق میں فنا کر دینے اور خود اپنی ذات کو فنا کر کے ذاتِ حق کے ساتھ قائم رہنے کو بھی فنار کہتے ہیں اور بقا اللہ کی ذات میں اپنی ذات کو گم کر کے اسی کے ساتھ قائم رہنے پر باقی رہنے کو کہتے ہیں۔

مبتدی

سیر الی اللہ کرنے والوں کے راستوں کو پوری قوتِ عزم کے ساتھ، طے کرنے کے عمل کو شروع کرنے والے کو مبتدی کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ان راستوں کے آداب کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اور خدمت و تسلیم کے جذبے کے ساتھ ان راستوں کے آغاز و انجام سے خبر رکھنے والے سے سیکھنے کے لیے خود کو وقف کر دیتا ہے۔

مُرید

جس بندے کی ابتدار صحیح ثابت ہو چکی ہو، وہ سیر الی اللہ کرنے والوں کے زمرے میں اسم[1] کے ساتھ شامل ہو گیا ہو، قلوبِ صادقین اس کے ارادے کی صحت کی گواہی

---

[1] تصوف کی رو سے اسم کسی ایسی عبارت یا لفظ کو کہتے ہیں جس سے حق تعالیٰ کی جانب باعتبارِ ذات یا صفت اشارہ کیا جاتے۔ (مترجم)

دیں اور اس کے بعد وہ حال و مقام پر دھیان نہیں دیتا بلکہ وہ اپنے سفرِ وصل میں اپنے ارادے کی پاکیزگی کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے۔

مُراد

ایسا عارف جس کا اپنا کوئی ارادہ باقی نہ رہے اور وہ اشیاء تک پہنچ گیا ہو، اس نے تمام احوال و مقامات اور مقاصد و ارادات طے کر لئے ہوں وہ مراد کہلاتا ہے۔ اس سے وہی کچھ چاہا جاتا ہے جو کچھ اللہ چاہتا ہے اور وہ خود جو کچھ ارادہ کرتا ہے وہ ارادۂ خداوندی ہوتا ہے۔

وجد

وجد، قلوب پر بلا ارادہ، صفاء ذکر کے ذریعے طاری ہونے والی اس کیفیت کو کہتے ہیں جو پہلے مفقود ہوتی ہے۔

تواجد و تساکر

تواجد و تساکر قریب المعنیٰ ہیں۔ تواجد و تساکر سے مراد بندے کا وَجد و سکر کی حالت کو بتکلف طاری کرنا اور سچے اہلِ وجد و سکر سے مشابہت پیدا کرنا ہے۔

وقت

اصطلاح صوفیہ میں وقت سے مراد ماضی و مستقبل کا درمیانی زمانہ یعنی زمانہ حال ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں : وقت قیمتی ہے۔ جب ہاتھ سے نکل جائے تو حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی وقت سانسوں کی طرح ہے کہ مستقبل و ماضی کی صورت میں ہوتی ہیں اور اگر وہ سانسیں جو بغیر یادِ خدا کے گذر جائیں پھر حاصل نہیں ہو سکتیں۔

البادیٔ

البادی، اس حالت کو کہتے ہیں جو قلب پر بندے کے حال کے مطابق ظاہر ہوتی ہے جب بادیٔ الحق کا ظہور ہوتا ہے تو وہ غیرِ حق ہر شے کو ختم کر دیتی ہے۔
ابراہیم خواص علیہ الرحمۃ نے فرمایا: جب بادیٔ الحق ظاہر ہوتا ہے تو ہر ظاہر ہونے والی حالت کو فنا کر دیتا ہے۔

وارد

جب مذکورۃ الصدر بادیٔ ظاہر ہو جائے تو اس کے بعد جو کیفیت قلوب پر وارد ہوتی ہے وہ وارد کہلاتی ہے۔ یہ کیفیت اپنے ورود کے بعد قلوب پر پوری طرح چھا جاتی ہے۔ 'وارد' ایک عمل ہے جب کہ بادی اس سے خالی ہوتا ہے۔ کیونکہ بوادیٔ دراصل واردات کے مبادیات میں سے ہیں۔
ذوالنون علیہ الرحمۃ نے فرمایا: وارِدِ حق آیا اور قلوب کو بے قرار کر گیا۔

خاطر

یہ وہ اچھے خیالات ہوتے ہیں جو غیب سے باطن پر نازل ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی باقاعدہ آغاز نہیں ہوتا۔ جب قلب میں آ جائے تو باقی نہیں رہتا بلکہ اس کی جگہ ایک اور خاطر لے لیتا ہے۔

واقع

عالمِ غیب سے کوئی ایسا خطاب جو قلب پر وارد ہو تو باقی رہے زائل نہ ہو، واقع کہلاتا ہے۔
میں نے ابوالطیب شیرازی سے سنا، انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے مشائخ میں سے ایک شیخ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: میں امید رکھتا ہوں کہ اس کا جواب واقع ہو جائے۔

خیر النسّاج علیہ الرحمۃ کے دروازے پر جنید علیہ الرحمۃ آتے تو اس سے پہلے خیر النساج کے قلب میں یہ خیال کئی بار آتا رہا کہ دروازے پہ جنید علیہ الرحمۃ ہیں۔ اور جب وہ دروازے پر آئے تو جنید علیہ الرحمۃ نے ان سے کہا، کیا آپ اپنے دل میں پیدا ہونے والے پہلے خیال کے مطابق دروازے پر نہیں آئے؟

کہتے ہیں کہ خاطر صحیح یعنی سچا خیال وہی ہوتا ہے جو پہلا ہو۔ خاطر کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق ضمیر سے نہیں ہوتا اور خاطر بھی ایک غلبہ ہے جو دل پر چھا جاتا ہے۔

قادح

قادح مفہوم کے اعتبار سے خاطر کے بہت قریب ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ خاطر دلِ بیدار رکھنے والوں کے لیے ہے جب کہ قادح اہل غفلت سے متعلق ہے۔ جب قلب سے غفلت کے بادل چھٹ جاتے ہیں تو اس میں قادح ذکر ایک آگ روشن کرتا ہے۔ اصطلاح قادح "قدح النار بالزناد" (اس نے چقماق سے آگ نکالی) اور قادح آگ روشن کرنے والے کو کہتے ہیں۔

کسی نے کہا ہے۔ ع

یا قادح النار بالزناد

(اے چقماق سے آگ نکالنے والے۔)

کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ جسے حقیقت کی آگ نے روشن کیا وہ اس شئے کے برابر نہیں جسے بشریت نے ساکن کر دیا۔

عارض

عارض اس وسوسے کو کہتے ہیں جو قلب وضمیر پر دشمن، نفس اور خواہشات کے ذریعے اثر انداز ہوتا ہے۔ اللہ تعالے نے مذکورہ دشمنانِ قلب وضمیر کے لیے خاطر، قادح، بادیٔ اور وارد کے استثنار کے ساتھ ایک ہی راستہ چھوڑا ہے اور وہ ہے عارض۔

ابو عبداللہ قریشیؒ نے کہا ہے ؎

یعارضنی الواشون قلبی بکلّما
یُقَلْقِلہ فی سرہ والعلانیہ

(چغل خور ہر اس چیز کے ساتھ میرے قلب کی مخالفت کرتے ہیں جو قلب کو پوشیدہ اور ظاہر طور پر پریشان کرے)۔

قبض و بسط

قبض و بسط دو بلند احوال ہیں جو اہلِ معرفت ہی کا حصہ ہیں۔ جب اللہ تعالےٰ انھیں حالتِ قبض میں مبتلا فرماتا ہے تو مباح اشیاء، گفتگو اور کھانے پینے کے اختیار کرنے سے متنفر کر دیتا ہے۔ اور جب انھیں حالت بسط کی طرف لوٹاتا ہے تو پھر سے انھیں سب مباحات کے اختیار کرنے کی طرف لے آتا ہے۔ اور ان میں ان کی حفاظت بھی فرماتا ہے۔

الغرض قبض، حال ہے فقط عارف کا کہ جس میں سوائے معرفتِ حق تعالےٰ کے کسی اور شے کو کوئی دخل نہیں اور بسط بھی عارف کا حال ہوتا ہے جسے اللہ نے کشادگی عطا فرمائی ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ ہی اس کی حفاظت فرمائے۔ اس لیے خلق ان سے سیکھتی ہے۔

فرمانِ اللہ جل شانہٗ ہے :

وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُطُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ [1] — اور اللہ تنگی اور کشائش کرتا ہے اور تمہیں اسی کی طرف پھر جانا۔

جنید علیہ الرحمۃ قبض و بسط کے معنی میں فرماتے ہیں : قبض بمنزلہ خوف اور بسط بمنزلہ رجاء ہے۔ رجاء طاعت کی جانب بسط پیدا کرتا ہے یعنے طاعت کے سما جانے کے لیے گنجائش پیدا کرتا ہے اور خوفِ معصیت سے روکتا ہے۔

کسی نے قبض میں مبتلا عارف اور بسط میں مبتلا عارف کی وضاحت کرتے ہوئے یہ

---

[1] : البقرۃ : ۲۴۵

اشعار کہے ہیں ؎

معارف الحق تحویہا اذا نشرت — ثلثة بعدھا الارواح تختلس

فعارف بحظوظ الحق لیس لہ — عنہ سواہ ولامنہ لہ نفس

وعارف بولاءِ الملیک معترف — یحثہ الوجد ماولیّ لہ الغَلَس

وعارف غاب عنہ العرف فاعتسفت — منہ السرائر مطویّ الذّری شرس

حتی استکان وغاب الوعب فی مہل — فطار شَیْئان عنہ النطقّ والخرس

اغاثہ الحق عما دونہ فلہ
منہ الیہ سرار وَحُیُہا خَنِس

(ترجمہ اشعار: معارفِ حق تین ہیں ان کے بعد ارواح کو قبض کر لیا جاتا ہے۔
ایک عارف وہ ہوتا ہے جس کی کوئی سانس اپنے لیے نہیں ہوتی بلکہ ہر سانس حق تعالےٰ کے لیے وقف ہوتی ہے۔
دوسرا وہ عارف جو اللہ تعالےٰ کی بادشاہی کا معترف ہوتا ہے اور اسے وجد ایسے حال کی جانب جانے پر ابھارتا ہے جس میں اللہؔ اس کی حفاظت فرماتا ہے۔
تیسری قسم میں وہ عارف آتا ہے جس سے اس کی تمام عادات وغیرہ غائب ہو جاتیں ہیں۔
اس کے سرائر اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں مزاج کا چڑچڑا اور بدخلق ہو جاتا ہے۔
حتیٰ کہ وہ مطیع وعاجز ہو جاتا ہے، مشکل، آسانی میں بدل جاتی ہے، اور اس سے دو چیزوں کا احساس غائب ہو جاتا ہے ایک گویائی دوسری بے زبانی، (یعنی ان کے لیے بولنا نہ بولنا برابر ہوتا ہے)۔
اللہ تعالےٰ اس کی مدد فرماتا ہے اور اس کی اپنے رب کے ساتھ ایسی پوشیدہ گفتگو ہوتی ہے جس کی رمز پوشیدہ ہوتی ہے۔)

مذکورہ بالا اشعار میں عارفین کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے عارفین اپنے لیے ایک سانس بھی نہیں لیتے۔

دوسری قسم کے عارفین وہ ہیں جنھیں وجد ایک ایسے حال تک پہنچا دیتا ہے کہ اس پر فائز رہنے میں اللہ تعالٰے ان کی حفاظت فرماتا ہے۔

تیسری قسم کے عارفین وہ ہیں جن سے ان کی عادات چھوٹ جاتی ہیں اور ان کے نزدیک گویائی و خاموشی میں فرق نہیں رہتا۔ اللہ کا ان پر کرم اور توجہ رہتی ہے۔ اگر خاموش رہیں تو اللہ کے لیے اور بولیں تو اسی کی ثنا میں بولتے ہیں۔

یاد رہے کہ غیبت، حضور، صحو، سکر، وجد، ہجوم، غلبات، فنا اور بقا، یہ تمام ذکر اللہ میں ثابت قدم قلوب کے احوال ہیں۔

ماخوذ اور مستلب

ماخوذ اور مستلب (سلب کیا گیا) ہم معنی ہیں مگر ماخوذ، کیفیت کے اعتبار سے زیادہ مکمل ہے۔ مستلب و ماخوذ سے وہ بندے مراد لیے جاتے ہیں جن کے بارے میں حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ مخبوط الحواس ہو گئے ہیں حالانکہ ایسا نہیں بلکہ ان کے قلوب عظمتِ خداوندی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی عقلیں جاتی رہیں۔

ایک اور حدیث:

فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"بندہ اس وقت تک ایمان کی حقیقت کو نہیں پہنچتا جب تک لوگ اسے دیوانہ نہ سمجھنے لگیں۔"

حضرت حسن بصری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: میں جب صاحبِ مجاہدہ کو دیکھتا تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ گدھے والا ہے جس کا گدھا گم ہو گیا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا تھا کہ اس میں شدید والہانہ پن ہوتا تھا۔

ایسے بندے جو ماخوذ و مستلب کے ذیل میں آتے ہیں ان سے متعلق اخبار و روایات بکثرت ہیں۔

کسی نے اس ضمن میں کہا ہے ؎

فلا تلمنی علی ما کان من قلقی

انی بحبك ماخوذ و مستلب

(مجھے میرے قلق و اضطراب پر ملامت نہ کر کہ میں تیری محبت میں ماخوذ اور مستلب ہوں)

دہشت

دہشت ایک حملہ ہے جو محب کی عقل پر محبوب سے حالتِ یاس میں ملنے پر ہوتا ہے، اور جس کے گذر جانے پر محب کو کوئی آفت لاحق نہیں ہوتی۔

کسی نامعلوم صوفی نے کہا ہے: اے اللہ! تو دنیا میں دکھائی نہیں دیتا لہٰذا مجھے اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز عطا فرما کہ جس سے میرے دل کو تسکین حاصل ہو۔ کہتے ہیں کہ یہ کہہ کر ان پر غشی طاری ہو گئی اور جب ہوش میں آئے تو کہا: سبحان اللہ! پوچھا گیا کہ آپ نے سبحان اللہ کس بات پر کہا؟ کہنے لگے اللہ نے اپنے دیدار کے بدلے سکونِ قلب عطا کر دیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا دیدار کا کوئی بدل ہو سکتا ہے؟ اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اے میرے رب! میں تیری محبت سے دہشت زدہ ہو گیا اور مجھے یہ ضبط ہی نہ رہا کہ کیا کہہ گیا۔

کسی کا شعر ہے ؎

ان من اهواه قد ادهشنی

لاخلوت الدهر من ذاك الدهش

(جس کی محبت نے مجھے دہشت میں ڈال دیا اس خوف سے میں نے دہر کو خالی نہیں پایا۔)

شبلی علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے: ہر شئے تجھ سے دہشت میں ہے۔

حیرت

حیرت اچانک طاری ہونے والی کیفیت ہے جو قلبِ عارفین پر تامل، حضور اور غور و فکر

کرنے کے وقت وارد ہوتی ہے۔ اور انھیں تامل حضور اور غور و فکر سے دور لے جاتی ہے۔

واسطی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: اچانک طاری ہونے والی حیرت، حیرت سے منہ پھیر کر حاصل ہونے والے سکون سے کہیں بلند رتبہ ہے۔

تحیّر

تحیّر ایک ایسی کیفیت ہے جو عارفین کے قلوب کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب وہ اپنے مقصود و مطلوب کے وصول میں یاس و امید کی درمیانی حالت میں ہوں۔ اور ایسی حالت انھیں پانے کی آس نہیں دلاتی کہ وہ پُر امید ہو سکیں اور نہ ہی طلب سے انھیں مایوس کرتی ہے کہ وہ اُسے چھوڑ کر آرام کریں ایسے میں ان کی جو کیفیت ہوتی ہے وہی تحیّر ہے۔

کسی شیخ سے پوچھا گیا کہ معرفت کیا ہے؟ انھوں نے کہا: تحیّر پھر اتصال پھر احتیاج اور پھر حیرت۔

کسی نے کہا ہے ؎

قد تحیرت فیک خذ بیدی

یا دلیلاً لمن تحیر فیک

(اے اس شخص کے رہنما! جو تیری ذات کی معرفت حاصل کرتے میں تحیّر میں پڑ گیا میں بھی تجھ سے تحیّر میں پڑ گیا میرا ہاتھ پکڑ۔)

طوالع

طوالع، انوار توحید ہیں جو اہل معرفت کے دلوں پر ظاہر ہو کر چمکتے ہیں اور دل میں موجود انوار پر ان کا غلبہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ ماند پڑ جاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے چڑھتا سورج، ستاروں کو باوجودیکہ وہ موجود ہوتے ہیں، اپنی غالب روشنی سے ماند کر دیتا ہے۔

حسین بن منصور حلاج علیہ الرحمۃ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

ے

قد تجلت طوالع زاهرات

یتشعشعن فی لوامع برق

خصنی واحدی بتوحید صدق

ما الیھا من المسالک طرق

(چمکتے ہوئے طوالع (پہلی رات کے چاند) ظاہر ہو گئے ہیں، اور بجلی کی روشنیوں میں ان کی روشنی پھیل جاتی ہے۔
مجھے میرے واحد نے توحیدِ حقیقی کے ساتھ مختص کیا ہے جس کی طرف کوئی راستہ ہی نہیں جاتا)۔

طوارق

جو کچھ معانی بذریعہ سماعت اہلِ حقیقت کے دلوں پر ان کے حقائق کی تجدید کے لیے نازل ہوتے ہیں طوارق کہلاتے ہیں۔
ایک شیخ کا قول ہے کہ اہلِ حقائق کے علوم میں سے معلومات میری سماعت میں اترتی ہیں تو میں انھیں اس وقت تک دل میں جگہ نہیں دیتا جب تک انھیں قرآن وسنت پر پرکھ نہ لوں۔ لغوی اعتبار سے طوارق جمع ہے طارق کی اور طارق رات کو آنے والے کو کہتے ہیں۔
روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دُعا فرمایا کرتے تھے:

اعوذ بک من شر طوارق اللیل والنہار الا طارقا یطرق بخیر۔
(میں تجھ سے رات اور دن کو آنے والوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں سوائے اس کے جو بھلائی کے ساتھ آئے)۔

کشف

جو چیز فہم سے پوشیدہ ہو اور اسے بندے پر اس طرح ظاہر کر دیا جائے کہ جیسے عینی مشاہدہ ہو، کشف کہلاتا ہے۔

ابو محمد جریری علیہ الرحمۃ نے فرمایا: جس نے اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو تقویٰ و توجہ سے نہ نبھایا وہ کشف و مشاہدہ سے دور رہا۔

نوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: مکاشفاتِ عیون متعلق ہیں دیکھنے سے اور مکاشفاتِ قلوب کا تعلق اتصال سے ہے۔

شطح

ایسا کلام جسے زبان، وجد کی حالت میں بیان کرتی ہے یہ کلام اپنے سرچشمے سے ظاہر ہوتا ہے اور دعویٰ سے قریب ہوتا ہے۔ مگر یہ کہ اس کا کہنے والا مستلب اور محفوظ ہو۔

ابو حمزہؒ نے کہا کہ مجھ سے خراسان کے ایک شخص نے پوچھا، امن کیا ہے؟ میں نے کہا، میں اس شخص کو جانتا ہوں کہ اگر اس کے بائیں درندے ہوں اور دائیں جانب تکیہ تو اسے یہ تمیز نہیں رہتی کہ دونوں میں سے کس پر ٹیک لگائے۔ یہ سن کر خراسانی شخص نے کہا: یہ تو شطح تھی کوئی علم کی بات کہو۔

ایک شیخ سے جب کوئی شخص ایسا مسئلہ پوچھتا جس میں دعویٰ ہوتا تو کہتے میں زبان کی شطح سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

جنید علیہ الرحمۃ نے شطحیات ابو یزید علیہ الرحمۃ کی باقاعدہ تفسیر بیان کی ہے۔ اگر ان کے نزدیک ابو یزید کی شطحیات میں کوئی کمزوری یا علت ہوتی تو وہ ہرگز ان کی وضاحت نہ کرتے۔

اسی ضمن میں قناد علیہ الرحمۃ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

شطح الحقیقة و الاحوال بینهما
شطح لذا البین یزهو بین هاتین
فالحال کالحال فی التلوین شاطحها
والعین تدنی الی شطح اللقائین

ترجمہ اشعار: حقیقت و احوال کی شطح ان دونوں یعنی حقیقت و احوال کے درمیان فصل ہے۔ اور اسی فصل کی شطح حقیقت و احوال کے درمیان چمک رہی ہے۔

پس حال اس حال کی طرح ہے کہ اس کا شاطع حالتِ تلوین میں ہوتا ہے اور آنکھ حقیقت و احوال کے درمیان موجود شطح کے قریب لے جاتی ہے ۔)

الصّول

مریدین و متوسط سالکین کا اپنے ساتھیوں کے احوال کے بارے میں زبان کھولنا صول کہلاتا ہے اور یہ ایک مذموم فعل ہے ۔

ابو علی رودباری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں : کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تو اپنے دل میں اللہ کے ساتھ خیانت کرے ۔ اور یہ خیال کرے کہ جو اس نے تجھے عطا کیا ہے کسی اور کو نہیں عطا کیا ۔ اور اس طرح تو اس شخص پر زبان سے حملہ کرے جو اپنا حال تجھے بتانے پر اللہ سے شرماتا ہو ۔

کسی پر حملہ کرنے یعنی زبان درازی کرنے سے نفرت کرو کیونکہ اپنے سے اوپر کے شخص پر زبان سے حملہ کیا تو یہ بد تہذیبی ہے ، اگر اپنے سے نیچے کے آدمی کے ساتھ ایسا کیا تو یہ قلتِ معرفت کی دلیل ہے ۔ اور اپنے جیسے سے یہی معاملہ کیا تو یہ سوءِ ادبی ہے ۔

جو صادقین و کاملین ہوتے ہیں وہ اگر کچھ کہتے بھی ہیں تو اپنے رب سے کہہ دیتے ہیں اور یہ ان کے ماسوا اللہ پر تکیہ نہ کرنے کی دلیل ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے : " اے اللہ ! میں تیرے ذریعے ہی حملہ کرتا ہوں اور تیرے ذریعے ہی متحرک رہتا ہوں "

ابراہیم خواص علیہ الرحمۃ نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے : " پھر میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ ہی کے ذریعے حملہ کرتا ہوں "

کسی کا شعر ہے ؎

وکیف یطیب العیش من بعد من بہ

علی نائبات الدھر کنت اصول

(اس شخص کے بعد میری زندگی میں کیا لطف رہ جاتا ہے جس کے ذریعے میں زمانے کے

مصائب پر حملہ آور ہوتا تھا)

ذہاب

ذہاب بمعنی غیبت کے ہے۔ لیکن ذہاب کی کیفیت غیبت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ذہاب سے مراد قلب کا مشاہدۂ حقیقت کر لینے کے بعد محسوسات کی حس سے جاتے رہنا ہے۔ پھر وہ اپنے ذہاب کی کیفیت کے احساس سے بھی مبرا ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس مبرّا ہونے سے بھی مبرّا ہو جاتا ہے۔ الغرض ذہابات کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ نے ابو یزید علیہ الرحمۃ کے قول "لیس بلیس" کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: لیس بلیس ہر شے کے احساس سے مبرا ہو جانے اور پھر مبرا ہو جانے کی کیفیت سے بھی بری ہو جانے کو کہتے ہیں، یعنی دیکھنے والا بھی نہ اشیاء باقی نہ ہوں گی تو ان کا احساس بھی نہ رہے گا۔ اس کیفیت کو صوفیہ فناء بھی کہتے ہیں۔ الغرض فناء سے فناء ہو جانے یا گم ہو جانے کی کیفیت کو بھی گم کر دینے کو ذہاب عن الذہاب کہتے ہیں۔

نَفَس

صوفیہ کی اصطلاح میں نفس وہ ہے جو سوزشِ قلب کو فرحت و سکون بخش دے۔

کسی شیخ کا قول ہے، نفس اللہ کی جانب سے چلنے والی وہ بادِ نسیم ہے جو باعثِ راحت اور اللہ کی آگ پر غالب آ جاتی ہے اور یہی مفہوم تنفس کا بھی ہے۔

اسی ضمن میں ذوالنون مصری علیہ الرحمۃ کے دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

من لاذ باللہ نجا باللہ — وسرّه مرّ قضاء اللہ

للہ انفاس جرت للہ — لا حول لی فیھا بغیر اللہ

ترجمہ اشعار: جس نے اللہ کی پناہ لی وہ اللہ کے ذریعے نجات پا گیا اور اللہ کی قضا کے پورا ہونے نے اسے مسرور کر دیا۔

ہر سانس اللہ ہی کے لیے اور اسی کی خاطر جاری ہے۔ میری ہر سانس میں اسی کی

قوت موجود ہے)۔

نفس سے مراد بندے کی سانس بھی ہے۔ جنید علیہ الرحمۃ؛ اللہ تعالٰی نے بندے کو وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ہر سانس کی حفاظت کا پابند کیا ہے۔

کسی کا شعر ہے ؎

وما تنفست الا کنت مع نفسی

تجری بک الروح منی فی مجاریہا

ترجمہ شعر: میری ہر سانس میں تو ہی بستا ہے اور میری نس نس میں تو ہی روح بن کر جاری و ساری ہے۔

حسّ

حس ایک علامت ہے جو نفس سے متعلق ہے۔

عمرو مکّی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: جس نے کہا کہ میں غلبۂ وجد کے وقت حس نہیں رکھتا تو اس نے غلط کہا کیونکہ اسے کیفیتِ احساس کے مفقود ہونے کا احساس بھی قوتِ حس ہی سے ہو سکتا ہے پانا یا گم کرنا دونوں محسوسات میں سے ہیں اور حس ہی کے ذریعے محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

توحیدِ عامہ

توحید عامہ سے مراد اقرارِ لسانی اور زبان نے ذاتِ واحد عزوجل کے اثبات پر اس کے تمام اسماء صفات کے ساتھ جو اقرار کیا ہو اس کی قلبی تحقیق ہے اور یہ تحقیق اس طرح ہو کہ اللہ نے جس کو ثابت رکھا اس کا اثبات کرے اور اس نے جس کی نفی کی اس کی نفی کرے اور اس کے ساتھ اللہ نے جو کچھ اپنے لیے ثابت قرار دیا ہو اس کا بھی اثبات کرے اور اس نے جو کچھ اپنی ذات سے منفی قرار دیا ہو اس کی نفی کرے۔

توحیدِ خاصہ

اس کی تفصیل باب توحید میں گذر چکی ہے۔ بہرحال مختصراً یہ کہ توحید خاصہ وحدانیت خداوندی

کی عظمت کو پانے اور اس کے قرب کی حقیقت کو اس طرح حاصل کرنے کو کہتے ہیں کہ بندے کی حس اور حرکت اللہ کی مرضی کے تابع ہو۔

کہتے ہیں کہ ابو بکر شبلی علیہ الرحمۃ ایک شخص سے توحید کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو اس شخص نے کہا: یہ تو آپ کی توحید تھی مگر جو کچھ میرے پاس ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ ابن شبلی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ تو اپنی ذات کو۔ اس کے لیے ہی مختص کر دے۔ پھر تجھے وہ اپنی توحید کا مشاہدہ اس طرح کرائے کہ تجھے اس مشاہدے سے بھی بے خبر کر دے۔ یہی توحید خاص کی صفت ہے۔

تفرید

تفرید، اللہ تعالےٰ کو حدوث سے بالکل علیحدہ ماننے اور حقائق فردانیت کے ساتھ اسے قدیم جاننے کو کہتے ہیں۔

کسی نے کہا ہے کہ موحدین کی تعداد مومنین میں زیادہ ہوتی ہے۔ مگر مفرّدین کی تعداد موحدین سے کم ہوتی ہے۔

حسین بن منصور علیہ الرحمۃ نے اپنی شہادت کے وقت یہ لفظ کہے تھے: واجد کو یہی کافی ہے کہ وہ خدائے واحد عز و جل کو یکتا مانے۔

تجرید

تجرید سے مراد قلوب کا شواہد الوہیت کے مشاہدے کے لیے کدورتِ بشریت سے خالی ہو جانا ہے۔

کسی شیخ نے تجرید کے بارے میں کہا: اللہ تعالےٰ کو ماسوا اللہ سے یکتا و منفرد ماننا اور بندے کا ہر اس مشاہدے میں محو ہو جانا جو اسے کرایا جائے، تجرید کہلاتا ہے۔

تجرید، تفرید اور توحید اگرچہ باعتبار معنیٰ یکساں ہیں تاہم صوفیہ ان کو اپنے اپنے انداز میں مختلف طور پر بیان کرتے ہیں اور ان کی تفصیل واجدین کے حقائق اور اشارات کی مقدار کے مطابق ہوتی ہے۔

کسی نے کہا ہے ؎

حقیقۃ الحق حق لیس یعرفہ

الا المجرد منہ حق تجرید

ترجمہ: حقیقتِ حق ایک ایسی حقیقت ہے جسے صرف صاحبِ تجرید جیسا کہ تجرید کو جاننے کا حق ہے جان سکتا ہے۔

الھمّ المفرد اور السّر المجرّد

الھمّ المفرد اور السر المجرد دونوں اصطلاحات ہم معنیٰ ہیں۔ مفہوم دونوں کا یہ ہے کہ بندے کا ھمّ یعنی ارادہ اور سرّ یعنے باطن جب تمام اشغال سے مجرد ہو اور خدائے ذوالجلال کے مراقبہ میں منفرد ہو تو ایسے میں نہ تو اس میں کوئی خیال مخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اسباب اس کے لیے توجہ، قرب اور اتصال سے مانع ہو سکتے ہیں۔

جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: مجھ سے ابراہیم آجری علیہ الرحمۃ نے کہا: اے نوجوان! اگر ایک لمحے کے لیے بھی تو اللہ کی جانب ارادہ کرے تو یہ تیرے لیے اس چیز سے بھی کہیں بہتر ہے جس پر سورج طلوع ہو۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ نے کسی شخص سے کہا: وارفتۂ عزائم فضائے عدم میں ہوتا ہے۔ تیرا ارادہ جو شیلے شخص کا ارادہ ہے جب کہ میرا ارادہ وارفتۂ محبت کا ارادہ ہے۔

محادثۃ

بندے اور خدا کا باہم ہمکلام ہونا صدیقین کا وصف ہے۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمۃ سے صدیقین کے آخری مقام کے بلند ترین حال کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے: وہ طلوع ہونے والے اور اللہ سے ہمکلامی کے شرف سے مشرف ہوتے ہیں۔

سید الکونین صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: "بے شک میری امت میں

وہ بھی ہیں جن سے اللہ تعالٰی نے ہمکلام ہوتا ہے اور عمرؓ انہی میں سے ایک ہیں"

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: اللہ تعالٰی نے خلق کو اس لیے پیدا فرمایا کہ وہ ان سے پوشیدہ کلام فرمائے اور اللہ سے ہم کلام ہوں۔ اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ میں نے تمھیں اس لیے پیدا کیا کہ مجھ سے چھپ چھپ کر ہمکلام ہوا کرو اگر ایسا نہ کرو تو مجھ سے ظاہراً کلام کرو اگر یہ بھی نہ کرو تو مجھ سے سرگوشی کرو اور اگر ایسا بھی نہ کرو تو مجھ سے ہی سنو۔

مناجاۃ

وہ رازدارانہ گفتگو جو بندے اور خالق کے درمیان خلوصِ ذکر کے ساتھ ہوتی ہے۔

ابو عمرو بن علوان علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ میں جنید علیہ الرحمۃ کو ایک رات صبح تک یہ مناجات کرتے سنا کہ یا الٰہی! اے میرے مالک! تو مجھے خود سے جدا کرنا چاہتا ہے یا تو مجھے ترکِ ہیہات میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے ابو عمرو سے پوچھا کہ یہاں ہیہات سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے فرمایا: تمکین۔

مُسامرۃ

بندے کو پوشیدہ طور پر اسرارِ غیبی کے بارے میں جو خطاب ہوتا ہے اسے مسامرۃ کہتے ہیں۔

ابو علی رودباری کا ایک شعر اسی ضمن میں ملاحظہ ہو ؎

سامرت صفو صبابتی اشجانها

حرق الهوی و غلیلها نیرانها

ترجمہ: میں نے اپنے خلوصِ محبت سے رات کے وقت یہ بات چیت کی کہ اس کے غم سوزشِ عشق اور اس کی گرمی، اس کی آگ ہے۔

کسی شیخ نے کہا کہ مسامرہ کمالِ پوشیدگی کے ساتھ خطاب کو دائم باقی رکھنا ہے۔

رؤیۃ القلوب

دل کا حقائقِ ایمان کے ساتھ انوارِ یقین کے ذریعے غیب میں پوشیدہ اسرار کا دیکھنا رؤیتِ قلوب کہلاتا ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ کیا آپ اللہ کو دیکھتے ہیں ؟ تو فرمایا، ہم کیونکر اس کی عبادت کرتے ہیں اگر اسے دیکھتے نہیں ، اور فرمایا : اسے آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ یعنی اس دنیا میں آنکھوں نے عیاں نہیں دیکھا بلکہ قلوب نے حقائقِ ایمان کے ساتھ اسے دیکھا۔

ارشادِ خداوندی ہے :

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی [1] دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا۔

قرآن کریم کی اس آیت سے ثابت ہوا کہ دنیا میں قلب کے ذریعے رؤیتِ باری تعالیٰ ممکن ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا "اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو یا اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے "

اسم

اسم کا ان الفاظ پر اطلاق ہوتا ہے جن کے ذریعے اللہ کی طرف اشارہ کیا جائے مگر ان الفاظ کے ساقط ہونے سے ان کا معنی مسمّٰی سے الگ نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے : لوگوں کے پاس اللہ کی جانب سے فقط اس کا نام ہی ہے۔

اور وہ یہ بھی کہا کرتے تھے : لاؤ ! اس شخص کو جو اللہ کا نام الفاظ میں واجب

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ اللہ کی طرف اشارہ کرنے پر اس شعر سے استدلال کرتے تھے۔

اذا ام طفل مسها جوع طفلها

غذته باسم الطفل فاستعصم الطفل

---

[1] : النجم : ۱۱

ترجمہ: جب بچے کی ماں کو بچے کی بھوک کا علم ہوتا ہے تو وہ بچے کا نام لے کر اسے غذا دیتی ہے اور بچہ قوی ہو جاتا ہے۔

ابو بکر شبلی علیہ الرحمۃ کہا کرتے تھے: میں ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جس نے اللہ کا نام پکارا ہو اور وہ جو کچھ کہتا ہو اسے ثابت کرتا ہو۔ آپ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ لوگ علم میں بھٹک گئے، علم اسم میں بھٹک گیا اور اسم ذات میں گم۔

رسم

رسم سے مراد خلق کے ظاہری اوصاف و افعال ہیں جو غلبۂ حق کے ظہور سے مٹ جاتے ہیں۔

جنید علیہ الرحمۃ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس کا اسم غائب ہو گیا ہو، اس کے اوصاف نہ رہے ہوں اور اس کے افعال باقی نہ رہے ہوں۔ آپ نے فرمایا: ہاں! اس وقت ایسا ہوتا ہے جب بندے کو یہ مشاہدہ ہو جائے کہ اللہ کی اپنی ذات کے ساتھ اور اپنے لیے اپنی سلطنت میں قائم ہے۔ گویا رسوم کے مٹنے کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ بندے سے متعلق علم اور فعل اس وقت باقی ہی نہ رہے جب وہ یہ دیکھ لے کہ اللہ قائم بالذات ہے۔

کسی نے کہا ہے ؎

برسومٍ دارساتٍ و طلل

(مٹے ہوتے نشانات اور ٹیلوں کے پاس۔)

وسم

وسم سے مراد اصطلاحِ صوفیہ میں وہ کچھ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے بارے میں اپنے قدیمی علم میں جس طرح چاہا ان سے متعلق کر دیا ہے اور اس کے بعد اس میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں۔ اور نہ ہی کسی کو اس کا علم ہے۔

احمد بن عطا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ دو قسم کے وسم ہوتے ہیں جو مقبول اور مردود بندوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہ دونوں ازل سے ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔

رَوح اور تَروّح

روح اور تروح سے مراد وہ بادِ نسیم ہے جس سے اہلِ حقیقت کے دلوں کو مہکایا جاتا ہے اور جو اعمال انھوں نے نہایت احسن انداز سے انجام دیئے ہوتے ہیں ان سے تھکاوٹ کے بعد انھیں آرام بہم پہنچایا جاتا ہے۔

یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمۃ نے فرمایا، حکمت (دانشمندی) اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جسے اللہ جل جلالہ عارفین کے قلوب پر نازل فرماتا ہے تاکہ اس کے ذریعے وہ دنیا کی آگ سے راحت پائیں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ ولی اللہ کی روح عالمِ قدس میں اپنے مولا کی حضوری میں مشغول رہتی ہے۔

سفیان علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ عارفین کے دلوں کی جولاں گاہ ایک آسمانی باغ میں ہے جس سے آگے حجاباتِ رب شروع ہو جاتے ہیں عارفین کے قلوب آسمانی باغ میں جمع ہوتے ہیں اور مقامِ قرب میں محبتِ الٰہی کے ثمر چنتے ہیں۔

نعت

نعت سے مراد یہ ہے کہ نَعت بیان کرنے والے اپنے منعوت (جس کی نعت بیان کی گئی ہو) کے احکام و اوصاف کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ نعت اور وصف دونوں ہم معنی ہوں مگر یہ فرق ضرور ہے کہ وصف، مجمل اور نعت مفصل ہوتی ہے وصف کے بیان میں جامعیت ہوتی ہے جب کہ نعت میں ہر جز کو جدا جدا بیان کیا جاتا ہے۔

صفت

صفت کو موصوف سے الگ نہیں کیا جا سکتا اسے موصوف کہا جا سکتا ہے اور نہ غیر موصوف۔

ذات

ذات کی تعریف یہ ہے کہ یہ قائم بالذات ہوتی ہے جب کہ اسم، نعت اور صفت ذات کی علامتیں ہیں، اسم، نعت اور صفت کا تعلق فقط صاحبِ ذات سے ہوتا ہے جسے مسمّٰی کہا جاتا ہے۔ یہی مسمّٰی موصوف و منعوف ہوتا ہے جیسا کہ "قادر" اللہ تعالیٰ کے اسمار میں سے ایک اسم ہے۔ اسی طرح قدرت اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور تقدیر اللہ تعالیٰ کی نعوت میں سے ایک نعت ہے۔ اسی طرح متکلم بھی اسمار الٰہی میں سے ایک اسم ہے اور کلام صفاتِ الٰہیہ میں سے ایک صفت ہے۔ اور غفران (بخشش) نعوتِ الٰہیہ میں سے ایک نعت ہے۔

خلق اور خالق

واسطی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: خلق کے پاس سوائے اللہ کے اسم صفت اور نعت کے کچھ بھی نہیں، خلق اس کے اسمار کے ذریعے اس کی نعوت سے اور نعوت کے ذریعے اس کی صفات سے اور صفات کے ذریعے اس کی ذات سے حجاب میں رہتی ہے۔

جب بھی بندہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر، تقدیر، فضل اور بخشش کا ذکر کرتا ہے تو وہ دراصل اس کی نعوت کا ذکر کر رہا ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعے اس کی تعریف بیان کر رہا ہوتا ہے اور جب وہ اس کے علم، قدرت، کلام اور مشیت کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس کی صفات بیان کر رہا ہوتا ہے گویا اس نے اس کی صفات ہی کے ذریعے اس کا وصف بیان کیا۔

ابو عبداللہ قرشی علیہ الرحمۃ کے دو اشعار سے

اذا طلعت شمس علیك بنورها
وانت خلیط للشعاع المباشر
بعید من الذات العزیز مكانها
ولم تعر من نعت لنفسك قاهر

ترجمہ: (۱) جب تجھ پر آفتاب اپنی روشنی کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور تم اس کی مانوس
کرن کے ساتھی ہوتے ہو۔
(۲) تو اس آفتاب کا مقام ذاتِ عزیزیہ سے دور ہوتا اور وہ تیرے غالب نفس کی
نعت سے خالی نہیں ہوتا۔

حجاب

ایک ایسی رکاوٹ جو طالب اور مطلوب کے درمیان واقع ہو حجاب کہلاتی ہے۔
سری سقطی علیہ الرحمۃ کہا کرتے تھے: یارب! جب بھی تو مجھے عذاب میں مبتلا کرنا چاہے
تو حجاب واقع کرنے کے عذاب میں مبتلا نہ کرنا۔
محمد بن علی الکتانی علیہ الرحمۃ نے کہا: ثواب پر نظر رکھنا حجاب در حجاب ہے اور حجاب
کا احساس رکھنا پسندیدگی و شوق سے حجاب میں رہنے کے مترادف ہے۔
کتانی کے قول کی وضاحت یہ ہے کہ بندے کا ثواب کے حاصل ہونے سے متعلق
سوچنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اور حجاب کا احساس رکھنے سے یہ مراد ہے کہ ایسا عمل بندے
کے لیے اپنے عمل سے لگن اور شوق کے حصول میں ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔

دعویٰ

نفس کا خود سے وہ کچھ منسوب کرنا جو اس میں نہیں دعویٰ کہلاتا ہے۔
سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان دبیز ترین پردہ
دعویٰ ہے اور کہا ہے:

ولما ادعیت الحب قالت کذبتنی
فمالی اری الاعضاء منك کواسیا

ترجمہ: جب میں نے محبت کا دعویٰ کیا تو اس نے کہا تو نے مجھ سے متعلق جھوٹا دعویٰ کیا
کیونکہ یہ کیا بات ہے کہ میں تیرے اعضاء کو پر گوشت دیکھتی ہوں۔

ابو عمرو زجاجی علیہ الرحمۃ کہا کرتے تھے : جس کے ہاں دعوے نہیں اس میں کوئی حقیقت ہی نہیں۔

مذکورہ بالا قول سے ابو عمرو کی مراد یہ تھی کہ نفس خود سے وہ طاعات منسوب کرے جو اس کے اندر موجود نہ ہوں اور نہ ہی اپنے دعویٰ پر کوئی گواہی رکھتی ہو۔

اختیار

اختیار اشارہ ہے اس چیز کی طرف جو اللہ عزوجل بندے کے لیے منتخب فرماتا ہے اور بندہ اسے عنایتِ خداوندی کے ساتھ اپنے لیے اختیار کر لیتا ہے گویا کہ وہ جو کچھ اختیار کرتا ہے اختیار خداوندی کے ساتھ نہ کہ اپنے اختیار سے اختیار کرتا ہے۔

یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمۃ نے فرمایا : جب تک بندہ معرفت حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس سے یہی کہا جاتا ہے کہ تو خود نہ منتخب کر کیونکہ تو اس وقت تک اختیار کا امین نہیں ہو سکتا جب تک معرفت حاصل نہ کرے۔ اور جب بندہ معرفت پا لیتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے چاہو تو چن لو اور چاہو تو نہ چنو کیونکہ اگر تو نے کچھ منتخب کیا تو ہمارے اختیار کے ساتھ اور منتخب نہ کیا تو بھی ہمارے اختیار کے ساتھ۔ الغرض تو اپنے اختیار و عدم اختیار میں ہمارے اختیار کے ساتھ منسلک ہے۔

اختبار

حق تعالیٰ کا صادقین کا اس غرض سے امتحان لینا کہ اس کے ذریعے وہ مخصوصین کی جگہوں کو پر کرے اور اس امتحان سے وہ ان کے صدق کو ظاہر کر کے مؤمنین پر اپنی حجت قائم کر دے تاکہ مبتدی سالکین ان سے سیکھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"اخبر من تقلہ "

حدیث کی شرح یہ ہے کہ جس کو چاہو آزما کر امتحان لو تاکہ تم اسے آزما کر اس کے اندر پوشیدہ سچائی کو سامنے لے آؤ۔

البلاء

بندے کی حقیقتِ حال کو جاننے کے لیے آزمائش کے طور پر عذاب میں مبتلا کرنے کے ذریعے اس کا امتحان لینا البلاء کہلاتا ہے۔

ابومحمد جریری علیہ الرحمۃ کا قول ہے: انسان وہیں ہے جہاں آزمائش ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "ہم پیغمبروں کی جماعت دیگر لوگوں سے زیادہ آزمائشوں سے دوچار ہوتی ہے۔"

کسی نے بلاء کے بارے میں یہ اشعار کہے ہیں ؎

دائرات البلاء علی تدور	والی ماتری علی تشور
ما اری للبلاء بلاء سوای	وبلائی علی البلاء کدود
فانا محنة البلاء وبلائی	حاصن للبلاء علیه غیور
یا بلائی علی البلاء لا تعدی	کن به مالکاً رحیماً غفوراً

یا معین البلاء علی اعنی

فی البلاء فالبلاء علی سعیر

ترجمہ اشعار: مجھ پر ابتلاء کے مصائب چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اور کب تک مجھ پر حملہ کرتے رہیں گے۔

مجھے آزمائش کے لیے اپنے سوا کوئی آزمائش نظر نہیں آتی۔ اور میری آزمائش کو آزمائش پر غصہ ہے۔

میں آزمائش وابتلا کے لیے آزمائش ہوں اور میری آزمائش ہی اس آزمائش کی محافظ، اس پر غیرت کرنے والی ہے۔

اے میری آزمائش! تو آزمائش پر زیادتی نہ کر، اس کے لیے رحم وبخشش کرنے والا بن جا۔

اے آزمائش میں مدد کرنے والے! ابتلاء کے دور میں میری اعانت فرما کیونکہ

آزمائش میرے لیے آگ کا بھڑکتا شعلہ ہے۔

اللسان

علم حقائق کے بیان کرنے کو لسان کہتے ہیں۔

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ نے جنید علیہ الرحمۃ کو ایک خط میں تحریر کیا: میرے سردار! آپ کو علمِ بلاء میں لسان حاصل ہے یعنی اسے بیان کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ اور اسی طرح آپ کو علم بلاء البلاء میں بھی دسترس حاصل ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ سے لسانِ علم اور لسان حقیقت کے درمیانی فرق کو واضح کرنے کے لیے کہا گیا تو فرمایا: لسان (بیان) علم ہم تک واسطے سے پہنچتا ہے جب کہ لسانِ (بیان) حقیقت بلاواسطہ ہم تک پہنچتا ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ لسان الحق کسے کہتے ہیں؟ تو فرمایا: جس تک خلق کی رسائی نہ ہو۔

واضح رہے کہ شبلی کے قول میں لسان سے مراد بیان علم اور عبارت میں کسی مفہوم کو واضح کرنا ہے۔

السّرّ

سرّ، وجود و عدم کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے مگر معنوی طور پر موجود ہوتا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ سرّ وہ ہے جسے حق تعالے نے غائب رکھا ہو اور خلق اس کو نہ جان سکے۔ سرِ خلق یہ ہے کہ اس پر حق تعالے بلاواسطہ مطلع ہو۔ اور سرّ حق پر صرف حق تعالے ہی مطلع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سرّ السر ہوتا ہے جس کا احساس سرّ بھی نہیں کر سکتا ہے اگر ایسا ہو تو وہ سرّ نہیں کہلاتا ہے۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ نے کہا: نفس کے لیے بھی ایک سرّ ہوتا ہے جسے اللہ تعالے نے فقط فرعون کی زبان پر جاری کیا تھا تو کہا تھا:

"انا دبکم الاعلیٰ"

کسی نے کہا ہے ؎

یا سر السر یدق حتی
یخفی علی دھم کل حی
وظاھر باطن تجلی
من کل شی لکل شیٔ

ترجمہ: اے سر السر! جو اس قدر دقیق ہو جاتا ہے کہ ہر ذی رُوح کے وہم و گمان سے بھی پوشیدہ ہو جاتا ہے۔

یہ ظاہراً و باطناً موجود رہتا ہے اور ہر شے سے ہر شے کے لیے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

عقد

عقد کا تعلق باطن سے ہے اور یہ اس عہد کو کہتے ہیں جو بندہ اپنے قلب میں اپنے رب اور اپنے درمیان ٹھہراتا ہے کہ وہ فلاں کام کرے گا اور فلاں کام نہیں کرے گا۔

قول باری تعالٰے ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ[1] — اے ایمان والو! اپنے قول پورے کرو۔

ایک مرد دانا سے دریافت کیا گیا کہ تو نے اپنے رب کو کس طرح پہچانا؟ اس نے جواب دیا: میں نے اسے مشکلات کے حل ہو جانے اور ارادوں کے ٹوٹ جانے سے پہچانا۔

محمد بن یعقوب فرجی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس برس سے اللہ اور اپنے درمیان فقط اس خوف سے کوئی عہد قائم نہیں کیا کہ مبادا وہ اسے فسخ فرما دے اور اس طرح میں کہیں اپنی زبان سے ہی جھوٹا نہ ہو جاؤں۔

کہا جاتا ہے کہ خاص و عام میں فرق یہ ہے کہ عامۃ المومنین پر اللہ تعالٰے نے واجب

---

[1] المائدۃ: ۱

کردیا ہے کہ وہ اپنے عہدوں کو اس وقت پورا کریں جب کہ وہ ان کا اقرار اپنی زبان سے کریں۔ اور خاص مومنین پر ایفائے عہد کا پورا کرنا اس طرح لازم ہے کہ وہ اس وقت عہد کو پورا کریں جب انھوں نے دل میں عہد باندھا ہو۔

الھمّ

ہمؔ کو واحد استعمال کرنے میں یہ اشارہ پوشیدہ ہے کہ سالک اپنے تمام ہموم یعنی ارادوں کو یکجا کر کے ایک ہی ارادے میں ضم کر دے۔

ابوسعید خراز علیہ الرحمہ نے فرمایا: اپنے ھم (ارادے) کو اللہ تعالٰی کے سامنے اکٹھا کر دے۔

کسی اور شیخ کا قول ہے: بندے کو چاہیئے کہ اس کا ارادہ اس کے قدموں کے نیچے ہو یعنی نہ تو وہ حالتِ ماضی کا ارادہ کرے اور نہ مستقبل کا بلکہ موجودہ کیفیت کے وقت ہی سے متعلق رہے۔

اللحظ

لحظ سے مراد دِل کی آنکھوں کا ان زوایدِ یقین کا مشاہدہ کرنا کہ جن پر بندہ غیب کے ساتھ ایمان لا چکا ہو۔

ابوعلی رودباری علیہ الرحمۃ کے چند اشعار اسی ضمن میں ملاحظہ ہوں ؎

لاحظته فرآنی فی ملاحظتی ۔۔۔ فغبت عن رؤیتی منی بمعناه

وصادفت همتی لطف المخفی بها ۔۔۔ تمکنت من تکن دون منشاه

فلا الی احدٍ همی ولا فطنی ۔۔۔ ولا الی راحةٍ اسلو فانساه

الله یعلم انی لست اذکره

وکیف اذکره اذ لست انساه

ترجمہ: (۱) میں نے اسے چشمِ دل سے دیکھا اور اس نے میرے اس دیکھنے کو بھی دیکھا۔ اور اس طرح میں اس کے مدلول و مقصود کے ساتھ تو اپنی رؤیت سے بھی غائب ہوا۔

(۲) میرا مقصد و ارادہ اتفاقاً ایک مخفی لطف و کرم سے منسلک ہو گیا۔ اور اس لطفِ خفی کے ساتھ پوشیدہ طور پر اللہ کی رضا سے قریب قرار پا لیا۔

(۳) کسی کی طرف نہ تو میرا قصد ہے نہ کسی کی طرف میرا ادراک متوجہ ہے اور نہ ہی میں کسی آزمائش سے مطمئن ہوتا ہوں کہ اسے بھول جاؤں۔

(۴) اللہ تعالےٰ جانتا ہے کہ میں اسے یاد نہیں کرتا اور میں اسے یاد بھی کیسے کروں جب کہ میں نے اسے بھلایا ہی نہیں۔

محوْ

کسی شئے کا اس طرح فنا ہو جانا کہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے محو کہلاتا ہے۔ اگر کوئی نشان باقی رہ جائے وہ طمس کہلائے گا۔

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ نے کہا: خاص و عام دونوں جامۂ عبودیت میں رہتے ہیں مگر جو ان میں سے ارفع ہوتا ہے اسے اللہ تعالےٰ اپنے قرب کی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس کے نفس سے دیگر تمام مشغولیات و مصروفیات کو مٹا دیتا ہے۔ پھر اسے مقام قرب میں ثبات عطا فرماتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۝[1] — اللہ تعالےٰ جو چاہے مٹاتا اور ثابت کرتا ہے۔

اللہ کا اپنا قرب عطا فرمانا، اس سے مراد یہ ہے کہ بندوں کو اللہ تعالےٰ اپنے قرب سے نواز کر اپنے پاس اکٹھا کر لیتا ہے، اس کے نفس کو احساسِ افعال سے عاری کر کے اسے اپنے ساتھ ثابت کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے افعال و حرکات میں اللہ ہی کو محرک سمجھے۔

۱۔ الرعد: ۳۹

محق

محق، محو کا ہم معنیٰ ہے مگر اس قدر فرق ہے کہ محق مٹ جانے اور فنا ہو جانے کے اعتبار سے محو سے کسی قدر آگے ہے۔

ایک شخص نے ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے میں آپ کو پریشان دیکھ رہا ہوں۔ کیا وہ آپ کے ساتھ اور آپ اس کے ساتھ نہیں ہیں؟ شبلی علیہ الرحمۃ نے جواب دیا اگر میں اس کے ساتھ ہوتا تو میں موجود ہوتا بلکہ میں تو اس کی ذات میں محو ہو چکا ہوں یعنی نہ میں ہوں اور نہ مجھ سے متعلق کوئی شے موجود ہے بلکہ ہر شے اسی سے اسی کے لیے اور اس کے ساتھ ہے جیسا کسی نے کہا ہے ؎

کل لہ دبہ و منہ فأین لی
شی فاوثرہ فطاح لسانھا

ترجمہ: ہر شے اسی کے لیے اسی کے ساتھ اور اسی سے ہے پھر میرے لیے کوئی شے کہاں ہے کہ میں اس کو اپنے لیے پسند کروں۔

اثر

زائل ہونے والی شے کا باقی رہنے والا نشان اثر کہلاتا ہے۔ کسی کا قول ہے کہ جسے دیکھنے سے محروم رکھا گیا وہ اکثر ہی سے مانوس ہو گیا اور جس نے اثر کو کھو دیا وہ ذکر میں مشغول ہو گیا۔ کہنے والے نے کہا ہے ؎

فما عندی لکم اثر
ولم اسمع لکم خبر

ترجمہ: میرے پاس نہ تمہارا کوئی نشان ہے اور نہ ہی میں نے تمہارے بارے میں کوئی خبر سنی ہے۔

کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ کے محل پر یہ شعر لکھا تھا ؎

ان آثارنا تدل علینا

فانظروا بعدنا الی الآثار

ترجمہ: ہمارے آثار ہی ہمارا پتہ دیں گے لہٰذا ہمارے بعد ہمارے آثار کو ہی دیکھو۔

خواص علیہ الرحمۃ نے کہا: خدا تعالیٰ کو تمام اشیا سے یکتا جاننا یہ ہے کہ بندہ ان تمام آثارِ اشیاء کو اس سے علیحدہ جانے جو نفس سے ملحق کرتا ہے۔ آپ نے یہ شعر بھی کہا ہے

لو ان دونك بحر الصين معترضا

لخلت ذاك سرابا ذاهب الاثر

ترجمہ: اگر تجھ سے پہلے دریائے چین بھی حائل ہوتا تو میں اسے ایک مٹ جانے والا سراب (محض سمجھتا)۔

کون

کون ایک جامع و مجمل لفظ ہے ان تمام مخلوقات کے لیے جسے موجدِ اعلیٰ عزّ و جل نے کاف اور نون کے درمیان پیدا فرمایا۔

بون

بَون کا معنی جدائی و علیحدگی ہے۔ کون اور بون دونوں کے معنی کو جنید علیہ الرحمۃ نے بڑی خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: موحدین انھیں کہتے ہیں جو موجود ہوتے ہیں بغیر وجود کے اور وہ علیحدہ ہوتے ہیں بلا جدائی کے۔ یعنی وہ اشیاء میں ہوتے ہیں اس طرح کہ گویا نہیں ہیں اور ان سے علیحدہ ہوتے ہیں اس طرح گویا کہ جدا نہیں۔ کیونکہ ان کا اشیاء کے ساتھ موجود ہونا ان کی شخصیتوں کے ساتھ ہونا اور ان کا اشیاء سے جدا ہونا ان کے باطن سے متعلق ہے

لقد تاه فی تيه التوحد وحده

وغاب بعز منك حين طلبته

ترجمہ: بلاشبہ وہ میدانِ توحید میں اکیلا بھٹکتا پھرا۔ اور جب تو نے اسے طلب کیا تو وہ تیری

عظمت وعزت کے ساتھ غائب ہو گیا۔

ظهرت لمن اثبته بعد بونه
فکان بلا کون کانک کنته

ترجمہ، تو اس کے لیے ظاہر ہوا ہے تو نے اس کی علیحدگی کے بعد ثابت کر دیا۔ تو گویا وہ موجود ہو گیا بغیر ہونے کے جیسے تو ہی اسے وجود میں لے آیا۔

وصل

وصل کا مفہوم ہے غائب سے لاحق ہو جانا۔

یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمۃ نے فرمایا؛ جس نے جب تک عرش کے نیچے کی اشیاء سے آنکھیں بند نہیں کیں وہ عرش کے اوپر جو کچھ ہے اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی اس نے خالق عرش کے وصل تک رسائی حاصل نہ کی۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کا قول ہے؛ جس نے یہ خیال کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا ہوا ہے اس کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔

بعض صوفیہ نے کہا؛ اصول کو ضائع کرنے کے باعث انھیں وصل نصیب نہیں ہوا۔

ووصلکم هجر وودکم قلی
وقربکم بعد وسلمکم حرب

ترجمہ؛ تیرا وصل وجُدائی ہے، تیری محبت بغض ہے تیرا قرب دُوری ہے اور تیری صلح جنگ ہے۔

فصل

کسی پسندیدہ امید کی گئی شے کا حاصل نہ کر سکنا فصل ہے۔

کسی نے کہا؛ جس نے یہ خیال کیا یا گمان کیا کہ اسے وصل حاصل ہوا اسے یقین کر لینا چاہیئے کہ وہ جدا ہو گیا۔

کسی اور نے کہا: تیرے وصل کی خوشی جدائی کے غم سے مربوط ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے

ع فلا وصل ولا فصل ولا یاس ولا طمع

(نہ وصل ہے نہ جدائی نہ یاس ہے نہ طمع)

اصل

اصل سے اضافہ ہوتا ہے۔ اصل الاصول ہدایت ہے اور اس کے بعد اصول، جیسے دین کے اصول یعنی، توحید، معرفت، ایمان، یقین، صدق اور اخلاص۔

فرع

فرع اصل سے بڑھتی ہے اور جب فرع سے مزید فروع نکلتی ہیں تو وہ قائم مقام اصل کے ہو جاتی ہے۔ الغرض اصل ان اضافوں کے لیے جو فروع کہلاتی ہیں بمنزلہ حجت ہے۔ اور یہ فروع اپنے اصول کی طرف لوٹتی ہیں۔

ہدایت اصل ہے اور توحید، معرفت، ایمان، صدق اور اخلاص اس پر اضافے ہیں۔ اور احوال، مقامات، اعمال اور طاعات ان اصول پر اضافے ہیں یعنے ان کی فروع ہیں۔ اسی طرح یہی فروع پھر مزید فروع کے پیدا ہونے کا سبب بننے کے باعث اصول کہلاتی ہیں۔

عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمتہ نے فرمایا: ہمارا اصول کو مان لینا ہمارے لیے کوتاہی و کمی پر دلیل و حجت قائم کر دیتا ہے۔

اسی طرح اصول پر ایمان و اقرار کے بعد ان کا انکار کرنے کے سلسلے میں بھی ہمارے اوپر حجت قائم ہو جاتی ہے۔

کسی عالم دین کا قول ہے کہ جس امر کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت دی وہ اصل ہے اور جو امور اس اصل سے بڑھیں وہ فروع ہیں اور یہ اپنے اصل کی طرف لوٹائی گئی ہیں۔

طمس

کسی واضح شے کے بیان کا محو ہو جانا طمس کہلاتا ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ نے ابو بکر الکسائی علیہ الرحمۃ کو ایک خط لکھا: آپ پوشیدہ راستوں اور ماند پڑے ہوئے ستاروں میں ہیں۔

اللہ تعالٰی نے فرمایا:

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ [1] پھر جب تارے محو کر دیئے جائیں۔

یہاں طمست سے مراد ستاروں کی روشنی کا جاتے رہنا ہے۔

عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: تو اس وقت تک حقیقتِ حق تعالٰی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک ان محو ہو جانے والے راستوں پر نہ چلے۔ یعنی تو ان احوال تک نہ پہنچ جائے جن تک تمہارے علاوہ کوئی اور نہ پہنچ سکا ہو اور ان کا نشان باقی نہ ہو۔

الرمس اور الدمس

دمس کا معنیٰ دفن کرنا ہے اسی لیے قبرستان کو دیماس کہتے ہیں۔

جنید علیہ الرحمۃ نے یحییٰ بن معاذ کو ایک خط میں لکھا: پھر اپنے دل میں موجود ہر شے کے غلبہ کو قبر میں دفن کر دو اور اس قبر کو بھی غیب کی پوشیدگی میں دفن کر دو یہاں تک کہ اس شے کا مخفی ہونا بھی اس سے مخفی کر دو پھر اس کی طرف اشارہ کی نسبت کو بھی اس سے علیحدہ کر دو۔

یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جنید علیہ الرحمۃ کی اس تحریر میں حقیقتِ توحید کی جانب اشارہ ہے یعنی بندہ صفات و افعالِ بشریت سے بالکل فانی ہو جائے۔ اور گویا کہ وہ ہے مگر نہیں ہے۔

سہل علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: جب تو اپنے نفس کو تحت الثریٰ میں دفن کر دیتا ہے تو تیرا قلب عرش سے اوپر پہنچ جاتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تو اپنے نفس کو چھوڑ دے اور اس کی

---

[1] : المرسلٰت : ۸

مخالفت کرے۔

قصم

قَصْم کا معنی ہے توڑنا۔

ابوبکر زقاق علیہ الرحمۃ نے کہا: اگر گناہ میں نے خود اختیار کیے ہوتے تو مجھے اس کا کوئی رنج نہ پہنچتا کیونکہ یہ امر میرے مطابق ہوتا۔ مگر کیا کروں کہ میری کمر تو اس وقت توڑ دی گئی جب خود گناہ ہوں، نے میری جانب سبقت کی۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: تمام امور اپنے حقائق کے اعتبار سے زمانوں پر غالب آئے تو جس نے زمانوں کو قدیم جانا اس کے لیے زمانوں کا مقابلہ ٹوٹ گیا۔

سبب

سبب سے مراد واسطہ ہے۔ اور اسباب کا مفہوم اللہ تعالٰے اور خلق کے درمیان واسطے ہیں۔

احمد بن عطا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: جس نے سبب میں مسبب کی صنعت کا مشاہدہ کیا اسے اس مشاہدے نے مسبب تک رسائی کے قابل بنا دیا، کیونکہ جس نے سبب کا مشاہدہ کر لیا اس کا قلب اسباب کی زینت و زیبائش سے معمور ہو گیا۔ اور جس نے طاعات سے غافل کر دینے والے اسباب کو جان لیا وہ ان سے الگ ہو گیا اور اعمال صالح کی جانب لے جانے والے اسباب سے تعلق جوڑ لیا۔

اسی ضمن میں ابو علی رودباری علیہ الرحمۃ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

من لم یکن بک فانیا عن حبہ — وعن الھوی والانس بالاحباب

او تیمتہ صبابۃ جمعت لہ — ما کان مفترقا من الاسباب

فکانہ بین المراتب واقف

لمنال حظ او لحسن مآب

ترجمہ: جو تیرے ساتھ اپنی محبت، خواہشات اور دوستوں کی الفت کو ترک کرے فانی نہ ہو چکا ہو۔

یا اسے محبت نے ذلیل و خوار کر کے اس کے لیے وہ اسباب اکٹھے کر دیئے ہوں جو اس سے جدا تھے۔

تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مراتب کے بیچ کوئی حصہ پانے اور اچھے ٹھکانے کے حصول کے لیے کھڑا ہو۔

نسبت

یہ اس حال کو کہتے ہیں جس سے کوئی شخص اس وقت باخبر ہوتا ہے جب وہ اس سے خود کو منسوب کرے۔

جعفر طیالسی علیہ الرحمۃ نے کہا ہے: نسبت دو طرح کی ہے ایک نسبتِ حظوظ اور دوسری نسبت حقوق، جب اوصافِ بشری غائب ہوں تو حقیقت ظاہر ہوتی ہے اور جب اوصافِ بشری ظاہر ہوں تو حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔

قتادہ علیہ الرحمۃ سے پوچھا گیا کہ مسافر کون ہے؟ آپ نے کہا: جس کے لیے دنیا میں کوئی رشتہ دار نہ ہو۔

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: جو کچھ آنکھیں دیکھتی ہیں وہ علم سے منسوب ہوتا ہے اور جو کچھ قلوب جانتے ہیں اس کی نسبت یقین سے ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ نسبت کا معنیٰ ہے اقرار کرنا۔

عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمۃ نے کہا: اسرار کے پوشیدہ ہونے کی صفت یہ ہے کہ نہ تو وہ احساس میں قائم ہوں اور نہ ہی وہ نسبت میں ظاہر ہوں۔

صاحبِ قلب ہونا

قلب میں جو علم اکٹھا ہوتا ہے اس کا زبان و بیان اور فصاحت سے ظاہر نہ کرنا صاحبِ قلب

ہونا کہلاتا ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے، اہلِ خراساں اصحابِ قلب ہیں۔

ربُّ حال

ربُّ حال کا معنی یہ ہے کہ فلاں شخص محبت، خوف، رجاء اور شوق وغیرہ جیسے احوال سے مربوط ہے اور جب ان احوال میں سے کوئی حال اس پر غالب ہو تو ایسے شخص کو ربّ حال (حال کی پرورش کرنے والا) کہتے ہیں۔

صاحبِ مقام

جو شخص قاصدین و طالبین کے مقامات مثلاً توبہ، ورع، زہد اور صبر وغیرہ میں سے کسی مقام کے لیے جانا جائے تو اسے صاحبِ مقام کہتے ہیں۔

جنید علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: بندہ معرفت کی حقیقت اور صفائ توحید تک احوال و مقامات کو عبور کرنے کی صورت ہی میں رسائی حاصل کرتا ہے۔

کسی شیخ کا قول ہے کہ میں ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کے پاس کئی بار حاضر ہوا اور ہر مرتبہ اُنھیں مقامات و احوال کے بارے میں گفتگو کرتے سنا۔

بے نفس ہونا

بے نفس وہ شخص ہوتا ہے جس پر نفس کی ۔۔رات غالب نہ آسکیں اور عاداتِ نفس یہ ہیں غصہ، تکبر، حرص، طمع اور حسد۔ جب بندہ مذکورہ آفات سے محفوظ ہو تو سمجھ لو کہ وہ بے نفس ہے۔

ابوسعید خراز علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ جس بندے نے اللہ کی طرف رجوع کیا اس کا اللہ سے تعلق پیدا ہوگیا اور وہ قربِ اللہ کے مقام میں ٹھہرا تو اس نے اللہ کے سوا سب کچھ بھلا دیا۔ جب آپ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے اور کدھر جا رہا ہے تو اس کے پاس سوائے ' اللہ ' کہنے کے کوئی جواب نہ ہوگا۔ اور اس کی وجہ اس کے قلب میں وہ تعظیم خداوندی ہے جو اس

نے پالی ہے۔

صاحبِ اشارہ

اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندے کی گفتگو باریک نکات اشارات اور علمِ معارف پر مبنی ہو۔ ابو علی رودباری رحؒ نے کہا ہے

فان تحقق صفو الوجد مشتملاً

علی الاشارات لم یلوی علی احدٍ

ترجمہ: اگر وجد کا خالص ہونا مشتمل بر اشارات ثابت ہو جائے تو اس کو کسی سے کوئی طمع نہیں رہتی۔

انا بلا انا ونحن بلا نحن

بندے کا اپنے افعال میں افعال ہی سے علیحدہ ہونے کے لیے انا بلا انا ونحن بلا نحن کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

ابو سعید خراز علیہ الرحمۃ سے اس قول خداوندی کا مفہوم پوچھا گیا:

وَمَا بِكُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ[1] — اور تمھارے پاس جو نعمت ہے سب اللہ کی طرف سے ہے۔

آپ نے جواباً فرمایا: اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے انھیں ان کے افعال میں افعال سے جدا کر دیا ہے۔

انا انت وانت انا

اس قول کی تشریح کو شبلی علیہ الرحمۃ کی اس گفتگو سے سمجھیں جس میں انھوں نے فرمایا: اے ساتھیو! وہ مجنونِ بنی عامر تھا جس سے لیلیٰ کے بارے میں پوچھا جاتا تو کہتا: میں لیلیٰ ہوں۔

---

[1] : النحل: ۵۳۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لیلیٰ کے ساتھ لیلیٰ سے خود غائب ہو جاتا اور صرف لیلیٰ کا نظارہ ہی باقی رہ جاتا۔ اور اس کے ساتھ وہ ماسوا لیلیٰ ہر شے سے بھی غائب ہو جاتا اور ہر شے کو لیلیٰ ہی کے ذریعے دیکھتا تھا۔

کوئی شخص کس طرح کسی کی محبت کا دعویٰ کرنے کا حقدار ہو سکتا ہے جب کہ وہ ٹھیک حالت میں اپنی عادات وافعال کو پوری طرح انجام دے رہا ہو۔

افسوس تو اس شخص پر ہے کہ جس نے اپنے اوصاف وعادات کو نہ ترک کیا اور نہ ہی خود سے ایک ذرے کو بھی علیحدہ کیا۔ ایسے میں وہ کس طرح دعوائے محبت کرنے کا سزاوار ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بات یہ بھی ہے کہ معبود عزوجل کے عشق میں مقدور بھر کوشش کرنا لوگوں کے نزدیک کوئی بلند رتبہ بات ہی نہیں۔

من تو شدم

شبلی علیہ الرحمۃ نے ایک اور موقع پر فرمایا: دو محبت کرنے والے کسی سمندر میں کشتی میں سفر کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک پانی میں گر کر ڈوب گیا۔ یہ دیکھ کر دوسرے نے بھی پانی میں چھلانگ لگا دی۔ غوطہ خوروں نے دونوں کو پانی سے صحیح سالم نکال لیا تو ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: میں تو پانی میں گر گیا تھا مگر تم نے خود کو کیوں پانی میں ڈال دیا۔ اس پر اس نے جواب دیا: میں تمہارے ساتھ اپنے سے غائب تھا میں نے یہ سمجھا تھا کہ میں، تُو تھا۔

کوئی لڑکا شبلی علیہ الرحمۃ کی مجلس میں موجود تھا اس نے آپ سے کہا: اے ابوبکر! اس نے مجھے مجھ سے حاصل کر لیا، مجھے مجھ سے غائب کر دیا اور مجھے میری ہی طرف لوٹا دیا۔ گویا کہ میں بغیر اپنی ذات کے وجود کے ہوں۔

شبلی علیہ الرحمۃ نے اس سے فرمایا: تجھ پر افسوس ہے تو نے یہ کیفیت کہاں سے پائی؟ تجھے خدا اندھا کرے۔

لڑکے نے جواب دیا: میرے لیے کہاں سے کوئی شے ہے جو میں اس میں اندھا ہو جاؤں۔

یہ کہہ کر وہ لڑکا شبلیؒ کی مجلس سے بھاگ گیا۔

کسی نے کہا ہے ؎

ذکرنا وما کنا نسینا فنذکر

ولکن نسیم القرب یبدو فیبھو

فافنی بہ عنی وابقی بہ لہ

اذ الحق عنہ مخبر ومعبر

ترجمہ: ہم نے اسے یاد رکھا اور بھلایا ہی نہیں اور اس کا ذکر کرتے ہی رہتے مگر نسیم قرب ظاہر ہوئی اور غالب آگئی۔

پھر میں اس کے ساتھ خود سے فانی ہوگیا اور اس کے لیے اسی کے ساتھ باقی ہوگیا یہاں تک کہ حق اپنی ہی خبر دینے والا اور اپنی ہی بات کرنے والا ہے۔

کسی اور نے کہا ہے ؎

انا من اھوی ومن اھوی انا

فاذا ابصرتنی ابصرتنا

نحن روحان معاً فی جسد

البس اللہ علینا البدنا

ترجمہ: میں کون ہوں؟ محبوب! اور محبوب کون ہے؟ میں ہوں۔ تو نے جب مجھے دیکھا تو تُو نے (در اصل) ہم دونوں کو دیکھا۔

ہم دو روحیں ہیں ایک جسم میں۔ اللہ نے ہمیں لباسِ جسم پہنا دیا۔

من و تُو کی اسی یکتائی سے متعلق دو اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

یا منیۃ المتمنی

افنیتنی بک عنی

ادنیتنی منک حتی

ظننت انک انی

ترجمہ: اے تمنائی کی تمنا! تو نے مجھے اپنے ساتھ خود سے فنا کر دیا۔ تو نے مجھے خود سے

اس قدر قریب کر دیا کہ میں سمجھا شاید تو میں ہوں۔

یہ روداد تو تھی مخلوق سے مخلوق کی محبت کی تو اس کی محبت کا عالم کیا ہوگا جو رگِ جاں سے قریب تر کی محبت کا دعویدار ہو۔

ہُوَ بِلا ہُو

ھُوَ بلا ھُوَ دراصل اشارہ ہے اللہ کو یکتا و متفرد جاننے کی طرف۔ مفہوم یہ ہوا کہ وہ ہے کہنے والے کے وہ کہے بغیر۔ اور وہ ہے بغیر کاتب کے لفظ لکھنے کے اور وہ یعنی ہُوَ موجود ہے بغیر ان دو حرفوں ہا اور واؤ کے مجموعے کے۔

جنید علیہ الرحمۃ نے توحید سے متعلق فرمایا: توحید کی تعریف یہ ہے کہ اس کا حکم جاری و ساری ہے، اس کا غلبہ بہ تفیف پر چھایا ہوا ہے، توحید ظاہر ہوئی تو غالب آگئی، پوشیدہ ہوئی تو حجاب بن چلی گئی۔ حملہ آور ہوئی تو ہلاک کر دیا، وہ۔ وہ ہے مگر بغیر لفظ وہ کہنے کے۔ وہ ظاہر ہوتی ہے تو ہر وہ شے جو اس پر ظاہر ہو اسے ہلاک کر دیتی ہے اور جو شے بھی اس کی طرف اشارہ کرے اسے فنا کر دیتی ہے اس کے قریب والا اس سے دور ہے اور اس سے دور اس کے قریب ہے۔ اور اس کے قریب والا شک میں مبتلا ہے۔

قطعِ علائق

علائق سے مراد وہ اسباب ہیں جو بندے سے لگ کر اس کو مشغول کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اسے اللہ عزوجل سے دور لے جاتے ہیں۔

ابوسعید خراز علیہ الرحمۃ نے فرمایا: اہلِ توحید نے علائق یعنی اسباب کو چھوڑ دیا محبوبِ حقیقی جل ذکرہ کی محبت میں مشغول ہو کر خلائق سے جدا ہو گئے آرام و آسائش کو ترک کر دیا، ہر مانوس سے نفرت کرنے لگے، اور پسندیدہ شے سے ناگواری ظاہر کی۔

بَادِی بِلا بَادِی

بادی سے مراد اہلِ معرفت کے دلوں پر ظاہر ہونے والے احوال، انوار اور صفائے اذکار ہے

اور جب بِلا بادی کہا جاتا ہے تو اس سے اشارہ مقصود ہوتا ہے کہ بادی (ظاہر ہونے والے) سے مراد ظاہر کرنے والا ہے جو قلوب پر احوال و انوار کو ظاہر کرتا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ[1]

خواص علیہ الرحمۃ اپنی کتاب "معرفۃ المعرفۃ" میں لکھتے ہیں کہ جب حق ظاہر ہوتا ہے تو وہ بغیر ظاہر ہونے والے کے ظاہر ہوتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی اور ظاہر ہونے والا حال یا کیفیت فنا ہو جاتی ہے اور یہ مشاہدۂ حق کے ان سے قریب ہونے کی بنا پر ہوتا ہے۔

التحلّی

التحلّی سے مراد صادقین کے ساتھ اقوال اور اظہارِ اعمال کے لحاظ سے مشابہت پیدا کرنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ایمان تحلّی یعنی ظاہری آراستگی اور ارادہ و خواہش ظاہر کرنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں ثابت و جاگزین ہو۔ اور اعمال اس کی تصدیق کریں۔

کسی نے کہا ہے ؎

من تحلّی بغیر ما هو فیه

فضحته شواهد الامتحان

ترجمہ: جس نے خود کو اس چیز سے آراستہ کیا جو اس میں موجود نہیں تو شواہدِ امتحان نے اسے رسوا کیا۔

تجلّی

حق تعالےٰ کے انوار کا اس کی طرف آنے والے سالکین کے دلوں پر چمکنا تجلّی کہلاتا ہے۔

---

[1] البروج: ۱۳

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ نے فرمایا: اللہ تعالٰی اپنے خلق کے لیے اپنے خلق کے ساتھ ظاہر ہوا اور اسی طرح ان سے پوشیدہ ہوا۔

واسطی علیہ الرحمۃ نے قولِ باری تعالٰے:

ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ[1] وہ دن ہے ہار والوں کی ہار کھلنے کا۔

کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: اہلِ حق کا تغابن (خسارہ، ہار) ان کی کیفیت فنا، رؤیت اور تجلی کے مطابق ہوتا ہے۔

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ نے کہا: انوار و احوال کی تجلی سے خوبیوں کو حسن ملتا ہے اور ان کے پوشیدہ رہنے سے خوبیاں قبیح ہو جاتی ہیں۔

کسی نے کہا ہے ؎

قد تجلی لقلبہ منہ نور

فاستضائت بہ من الظلمات

ترجمہ: اس کے قلب پر نورِ حق تعالٰے نے جب ظہور کیا تو تاریک دل روشن ہو گیا۔

تخلّی

ظاہر و باطن میں موجود حق سے دوسری طرف متوجہ کرنے والے عوارض سے علیحدگی اختیار کرنے کو تخلّی کہتے ہیں۔ گویا تخلّی میں خلوت، عزلت اور وحدت کو لازماً اختیار کرنا ہوتا ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ کا قول ہے: محفوظ قلوب کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کی حفاظت کرنے والا ان کا رب عزوجل انھیں غیر سے گفتگو کرنے سے کنارہ کش ہونے سے مانع نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ان کے بارے میں بخل سے کام لیتا ہے اور اس لیے کہ وہ ان قلوب پر رحم کرتے ہوئے انھیں صفاء اور دیگر اوصاف سے نوازے۔

یہ بھی اس شخص کی بعض صفات جو اللہ تعالٰے بندے کو دیگر تمام اشیاء، جو اس کے اور

---

[1] التغابن: ۹

بندے کے مابین حائل ہوتی ہیں، سے علیحدہ ہو جانے پر عطا فرماتا ہے۔

یوسف بن الحسین علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ تخلّی سے مراد عزلت (علیحدہ ہو جانا) ہے کیونکہ بندہ اپنے نفس پر قدرت نہیں رکھتا اور کمزور ہو جاتا ہے تو وہ اپنے نفس سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے رب کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔

کسی نے کہا ہے ؎

ان قلبَ الفتی وبو عاش دھرا

فی الھوی لا یکاد ان یتخلّی

ترجمہ: بلاشبہ نوجوان کا دل اگر محبت میں ایک طویل زمانہ گذار دے پھر بھی وہ اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوتا۔

العلّۃ

علت کنایہ ہے اس شے سے جو نہ تھی اور واقع ہو گئی۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ خلق کی تعریف یہ ہے کہ تابعداری اس کے وجود کا سبب ہے اور اس کا موجود ہونا اس کی علت۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمۃ نے فرمایا: ہر شے کی علت اس کی صنعت ہے مگر اس کی صنعت کی کوئی علت نہیں۔

میرے نزدیک ذوالنون علیہ الرحمۃ کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ ہر پیدا کردہ شے میں نقصان کا ہونا موجود ہونے والا ہے کیونکہ وہ نہیں تھا اور ہو گیا مگر صانع کی صنعت میں مصنوعات کے لیے کوئی علت نہیں۔

کسی نے کہا ہے ع

یا شفائیَ من السقام و ان کنت علتی

(اے بیماری سے میرے لیے شفا! اگرچہ تو ہی میری بیماری ہے)

اَزل

اس کا معنیٰ وہی ہے جو قدیم کا ہے۔ کیونکہ قدیم کو ازل سے موسوم کیا جاتا ہے جب کہ باریٔ (پیدا کرنے والا) کو اس سے موسوم نہیں کیا جاتا۔ اور کہا جاتا ہے کہ فلاں شئے فلاں شے سے بہت پہلے ہے۔

ازل اور ازلیت فقط اللہ کے لیے ہے سوائے اس کے ان صفات سے کسی اور کو موسوم نہیں کیا جاسکتا۔

ازل اللہ تعالےٰ کے اسمائے اولیت میں سے ایک اسم ہے پس وہ اللہ ہے جو سب سے اوّل قدیم اور لم یزل ولا یزال ہے۔ اور ازلیۃ اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔

متقدمین میں سے کسی نے کہا ہے کہ حق اللہ تعالےٰ جن اشیاء میں زوال پذیر نہیں تھا وہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ وہ جن اشیاء میں نہ تو زوال پذیر ہے اور نہ ہوگا۔ بعض صوفیہ نے تو اس قول کی تعریف کی کیونکہ اس میں حق تعالیٰ سے تغیر کی صفت کی نفی ہے اس لیے کہ وہ اپنے تمام اسماء و افعال میں لازوال ہے۔ مگر بعض صوفیہ نے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس قول سے کہنے والے نے اشیاء کو قدیم جانا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اسماءِ فعل اور اسماء ذات میں فرق ہے اور اسی طرح صفاتِ فعل اور صفاتِ ذات میں بھی فرق ہے۔

ابد اور ابدیت

اللہ تعالےٰ کی نعوت میں سے ایک نعت ہے۔ ازلیت اور ابدیت میں فرق یہ ہے کہ ازلیت کا آغاز نہیں ہوتا جب کہ ابدیت کا کوئی انجام نہیں ہوتا۔

واسطی علیہ الرحمۃ ابد کی تعریف میں کہتے ہیں: ابد، عدد میں انقطاع واقع ہونے کو ترک کر دینے کی جانب اشارہ ہے اور اس طرح اوقات کو دوام میں ہٹا دینے کی طرف اشارہ ہے۔

مزید کہا کہ وسم اور رسم دونوں صفات ہیں جو ہمیشہ کے لیے ازل سے جاری ہیں۔

کسی اور نے یہ کہا ہے کہ ازل، قِدَم اور ابد، حقیقتِ احدیت سے دور نہیں کی جاسکتیں،

کیونکہ یہی وہ اشارات ہیں جن کے ذریعے وہ خلق کو خود سے آگاہی عطا فرماتا ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کے بارے میں کہتے ہیں کہ انھوں نے کہا: پاک ہے وہ ذات جو اس وقت بھی موجود تھی جب کہ مکاں، زماں، اوقات، دھر، ابد، ازل، اول اور آخر موجود نہیں تھے۔ اور اس نے اشیا کو اس طرح پیدا فرمایا کہ وہ ان سے غافل نہیں، ان سے اس کو کوئی اعانت نہیں ملتی اور اس نے ان پر جو کچھ عائد کیا وہ اس میں نازل ہے۔

عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمۃ نے کہا: پاک ہے وہ بے نیاز جو قدیم ہے ازل سے اور ابد کی ہمیشگی میں لازوال ہے۔

وقتی مُسَرمَد

وقتی مسرمد سے مراد وہ حال ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان قائم ہوتا ہے اور کسی وقت بھی بدلتا نہیں۔ اور یہ حال واجد کا کلام ہے جس کے ذریعے وہ اس کے سر کی خبر دیتا ہے صفات کی نہیں۔ کیونکہ صفات تغیر کے وجود کا باعث ہیں۔ اور اگر یہ صفات متغیر نہ ہوں تو متغیر ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کے عدم تغیر کی صورت میں انھیں اس حالت سے متغیر کر دیا جاتا ہے جو ان کی جبلت میں موجود ہو۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

تسرمد وقتی فیك وهو مسرمد

وافنیتنی عنی فصرت مجردا

ترجمہ: میرا وقت تیرے ساتھ متعلق ہو کر دائمی ہو گیا۔ اور تو نے مجھے خود میری ذات سے اس طرح فنا کر دیا کہ میں مجرد رہ گیا۔

بحری بلا شاطی ؑ

بحری بلا شاطی (میرا دریا بے کنار ہے) کا معنی وہی ہے جو وقتی مسرمد کا ہے۔ اور یہ الفاظ پہلی بار ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ نے اس وقت کہے تھے جب ایک روز انھوں نے اثنائے کلام میں

فرمایا کہ تمھارے اوقات محدود ہیں جب کہ میرے وقت کے دو کنارے نہیں، اور میرا دریا بے کنارہ (بحری بلا شاطیٰ) ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کے قول کی تشریح یہ ہے کہ انھیں اللہ تعالےٰ نے جس حال پر فائز کر رکھا تھا اس کی کیفیت ایسی تھی کہ جو اپنی وسعت کے اعتبار سے بے نہایت تھا۔ اور اس طرح کی وسعت ولامحدودیت کو اسی طرح کے جملے سے ہی واضح کیا جاسکتا تھا جو انھوں نے فرمایا، یعنی بَحرِی بِلَاشَاطی۔

ارشادِ باری تعالےٰ ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا [1]	تم فرمادو! اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہی ہو تو ضرور سمندر ختم ہو جائے گا اور میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی اگرچہ ہم ویسا ہی اور اس کی مدد کو لے آئیں۔

مذکورہ آیت مبارکہ میں کلماتِ رب کے لامتناہی ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ ذات جو ان سے متصف ہے وہ خود لامتناہی ہے۔

کسی کا قول ہے کہ جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ اس سے محبت کر بیٹھا اور جو اس سے محبت کر بیٹھا وہ بحرِ غم میں ڈوب گیا۔

کسی اور نے کہا ہے ؎

لو ان دونك بحر الصين معترضا
لخلت ذاك سرابا ذاهب الاثر

ترجمہ: اگر تیرے وصل میں میرے سامنے بحرِ چین بھی حائل ہوتا تو میں اسے سرابِ فانی تصور کرتا۔

---

[1]: الکہف: ۱۰۹

نحن مُسَیّرون

نَحنُ مُسَیّرُون کہنے سے صوفیہ کی مراد قلوب کا ایک حال سے دوسرے حال اور ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہونے کے لیے چلنا مراد ہے۔

یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں : زاہد پیدل چلتا ہے تو عارف ہوا پر اڑتا ہے۔ یعنی وہ احوال و مقامات میں سفر کرنے میں نہایت تیز رفتار ہوتا ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ نے کہا ؎

لست من جملة المحبين ان لم
اجعل القلب بيته والمقاما
وطوافي اخالـه السير منه
وهو ركني اذا اردت استلاما

ترجمہ : میں زمرہ عشاق میں ہی شامل نہیں اگر میں نے اپنے دل کو اس کا گھر اور اس کا مقام نہیں بنایا۔

میں طوافِ کعبہ کو اسی کی طرف چلنے کے قائم مقام سمجھتا ہوں اور جب میں رکن کو بوسہ دیتا ہوں تو اسی کی ذات ہی میرے لیے رکن ہوتی ہے۔

تلوین

تلوین کا مفہوم بندے کے احوال کا مختلف ہونا ہے۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ حقیقت کی علامت تلوین ہے کیونکہ تلوین قدرتِ قادر کا ظہور ہے اور اسی سے غیرت حاصل ہوتی ہے۔

تلوین کا معنی تغیر ہے اس لیے جس نے تلوینِ صفات اور تغیرِ احوال کی طرف اشارہ کیا اس نے یہ کہا کہ حقیقت کی علامت تلوین کا رفع ہو جانا ہے اور جس نے تلوینِ قلوب، اسرارِ پاکیزہ اور تلوین کے نتیجے میں قلوب پر ہیبت طاری ہونے کے بعد واردات کی تلوین کی جانب

اشارہ کیا تو انھوں نے یہ کہا کہ علامتِ حقیقت تلوین ہے کیونکہ وہ اللہ کی جانب ہر سیر کرنے میں اپنے قلوب میں تلوینِ واردات کی کثرت پاتے ہیں۔ جہاں تک تلوینِ صفات کا تعلق ہے تو اس کا بیان اس شعر میں موجود ہے ؎

کل یوم تتلون

غیر هذا بك اجمل

(تو ہر روز رنگ بدلتا ہے یہ تجھے زیب نہیں دیتا۔)

واسطی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: جس نے اس کے اخلاق کو اپنا لیا اس کی طبیعت میں تلوین کے آثار ظاہر ہی نہیں ہوتے۔

کسی نے متیرین کے بارے میں یہ دو شعر کہے ہیں ؎

(۱) نهاجرت فؤادی فلم ینزجر

ویطلب شیئاً ومنه یفر

(۲) یسیر الی الحق مستظهرا

وانّی علیه شفیق حذر

ترجمہ: (۱) میں نے اپنے دل کو روکا مگر وہ نہیں رکا اور وہ کوئی شے طلب بھی کرتا ہے اور اس سے دور بھی بھاگتا ہے۔

(۲) وہ حق کی طرف بے تابی سے محبت طلب کرنے جاتا ہے مگر مجھے اس کے بارے میں ڈر بھی رہتا ہے۔ اور اس پر ترس بھی آتا ہے۔

بذل المہج

اس ترکیب کا معنیٰ بندے کا اپنی تمام تر محبوب چیزوں کو قربان کر کے اللہ کی طرف اپنی مقدور بھر توجہ صرف کرنا ہے۔

خواص علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: اللہ کی طرف توجہ کرنے والا ہر بندہ جب اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کی توجہ میں مقاماتِ استراحت قائم ہوں تو اس کی توجہ ختم نہیں ہوتی۔

کسی نے کہا ہے ؎

یا ملیح الدل و الغنج

لك سلطان على المهج

(اے خوبصورت نازو انداز والے تجھے روحوں پر غلبہ حاصل ہے)

میرے نزدیک "مہج" (واحد "مہجۃ" بمعنے روح، زندگی) سے جان و مال اور اولاد جیسی تمام محبوب چیزیں مراد ہیں۔

تلف

تلف بمعنے طبعی موت ہے۔

ابو حمزہ علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ میں ایک کنوئیں میں گر گیا اور لوگوں نے اسے اوپر سے بند کر دیا۔ میں نے یہ یقین کر لیا کہ اب بچنا مشکل ہے اور مایوس ہو کر سر رکھ دیا، اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک درندہ کنوئیں میں داخل ہوا، میں اس کی ٹانگ سے چمٹ گیا اس نے مجھے کنوئیں سے باہر نکال لیا۔ اس کے بعد غیب سے آواز آئی کہ اے ابو حمزہ! کس اچھے انداز میں ہم نے تمھیں موت سے موت کے ذریعے بچا لیا۔ ابو حمزہ علیہ الرحمۃ نے اس موقع پر اشعار کہے تھے جن میں سے دو ہدیۂ قارئین ہیں ؎

(۱) اراك دبی من هيبتی لك وحشه

فتؤنسنی باللطف منك وبالعطف

(۲) وتحيی محبّاً انت فی الحب حتفه

وذی عجب كون الحياة مع الحتف

ترجمہ: (۱) میں تجھے دیکھتا ہوں اور تیری ہیبت کے ذریعے وحشت سے دوچار ہو جاتا ہوں۔ تو مجھے تو لطف و مہربانی سے نوازتا ہے۔

(۲) جو محب، محبت میں مر جاتا ہے اسے تو زندہ کرتا ہے اور زندگی کا موت کے ساتھ وابستہ ہونا کس قدر تعجب انگیز ہے۔

جریری علیہ الرحمۃ کا قول ہے: جس شخص کو علمِ توحید کے شواہد کا علم نہ ہوا سے وسوکر وفریب وادیٔ موت میں پہنچا دیتا ہے۔

اللجاء

اللجاء (پناہ لینا) سے مُراد ہے صدقِ فقر و رجاء کے ساتھ قلوب کا اللہ کی طرف مائل ہو جانا۔

واسطی علیہ الرحمۃ کا قول ہے: جو بندہ فقط موت کے وقت صدقِ فقر اور توجہ الی اللہ پر فائز ہو اس پر دائمی ذلت باقی رہتی ہے۔

ارشادِ باری تعالٰے ہے:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ	اور یوں عرض کرو کہ اے میرے رب!
وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ [1]	مجھے سچی طرح داخل کر اور سچی طرح باہر لے جا۔

قرآنِ کریم کے مندرجہ بالا کلماتِ مبارکہ کی کسی اہلِ علم نے یہ تشریح کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حضور صدقِ فقر کے ساتھ صدقِ لجاء کا اظہار کیا۔ اور صدقِ لجاء کے ساتھ ہی سرائر مرتب ہوتے ہیں۔

انزعاج

کسی مقصد کے حصول کی خاطر دل کا خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر دھڑکنا انزعاج کہلاتا ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: تم اس کی خدمت میں اپنے بھیدوں کو پیش کیوں نہیں کرتے، تم وہ چیز بھی کیوں اس کے سامنے نہیں رکھتے جس سے قلب بے قرار ہو جاتے ہیں، تم اس کی طرف کوشش کر کے اس کی آزمائشوں سے مانوس ہو کر اور اس کی بخششوں پر خوش ہو کر

---

[1] : بنی اسرائیل : ۸۰

بڑھتے کیوں نہیں ؟

غالباً ابراہیم الخواص علیہ الرحمۃ سے کہا گیا کہ آپ کے مریدین کہتے ہیں کہ ہم جب کوئی چیز لینا چاہتے ہیں تو اپنے رب سے لیتے ہیں مگر ہم نے انھیں ہمیشہ لوگوں ہی سے چیزیں لیتے دیکھا ہے۔ آپ نے جواب دیا وہ کون ہے جو لوگوں کے دلوں کو بے چین کرتا ہے اور وہ انھیں بلا مانگے دے دیتے ہیں۔

جذب الارواح

جذب الارواح، بلندیٔ قلوب، مشاہدۂ اسرار، مناجات، مخاطبت اور اس طرح کی دوسری اصطلاحات سے مراد بندے پر توفیق عنایت اور قلوب پر انوار ہدایت کا قرب و بُعد اور صدق و صفا کی مقدار کے مطابق نازل ہونا ہے۔

ابو سعید خراز علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے دوستوں کی ارواح کو اپنی طرف بلا لیتا ہے پھر انھیں اپنے ذکر اور حصولِ قرب کی لذتوں سے بہرہ ور فرماتا ہے۔ اور وہ ان کے اجسام کو ہر شے کی لذت عطا فرماتا ہے گویا ان کے جسموں کی زندگی، جانداروں کی زندگی جیسی ہوتی ہے اور ان کے ارواح کی زندگی، اللہ والوں کی زندگی ہوتی ہے۔

واسطی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: بے شک اللہ نے صوفیہ کو اپنے لطف و کرم سے اس طرح نوازا ہے کہ ان کے قلوب کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ اور آپ نے مزید کہا کہ جب اللہ تعالےٰ روحوں کو جسموں سے کھینچ لیتا ہے تو جسموں میں عقول و صفات بدستور باقی رہ جاتی ہیں کیونکہ اللہ نے انھیں شرطِ عقول کے ساتھ ڈھانپ رکھا ہے۔ اور بندوں کو اس نے اس سے مایوس کر دیا کہ انھیں اپنے سرائر کے سوا کوئی اور شے حاصل ہو۔

قولِ خداوندی ہے:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔[1]	تم فرماؤ! اللہ ہی کے فضل اور اسی کی رحمت اسی پر چاہیئے کہ خوشی کریں، وہ ان کی سب دھن دولت سے بہتر ہے۔

---

[1] یونس: ۵۸

الوطر

وَطَر سے مراد وہ خواہش اور پسندیدہ و بہتر منفعت کا حصول ہے جو بشری و نفسانی صفات سے مبرا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں اپنے وطن میں متمکن ہے اور اپنے وَطَر میں بلند۔

کسی نے کہا ہے ؎

ترحلت یالیلی ولما اقض اوطاری

وما زلت محزونا احن الی داری

ترجمہ: اے لیلیٰ میں کوچ کر گیا مگر میں نے اپنی آرزوئیں پوری نہیں کیں۔ اور میں برابر مغموم اپنے گھر کا مشتاق رہوں گا۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمۃ نے کہا ؎

(١) اموت وماتت الیک صبابتی

ولا قضیت عن ورد حبك اوطاری

(٢) منای المُنی کل المُنی انت لی مُنیً

وانت الغنا کل الغنا عند اقتاری

ترجمہ: (١) میں مر جاؤں گا اور تیرے لیے میری محبت بھی مر جائے گی۔ اور میں نے تیری محبت کے گھاٹ سے اپنی خواہشیں پوری نہیں کیں۔

(٢) میری تمام آرزوں کی جگہ فقط ایک تو ہی ہے جو میری آرزو ہے۔ اور تو ہی میری امیری و ثروت ہے جب کہ میں تنگدست ہوتا ہوں۔

کسی دانشور سے پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک کونسی جگہ رہنے کے لیے بہت بہتر ہے؟ اس نے جواب دیا: کسی کے لیے سب سے بہتر رہنے کی جگہ وہ ہے جہاں وہ جو آرزو کرے پوری ہو۔

الوَطَن

اصطلاح صوفیہ میں وطن سے مراد بندے کا وہ مقام ہے جہاں اس کا حال ختم ہو اور اسے

قرار حاصل ہو یوں بھی کہتے ہیں کہ فلاں نے فلاں حال اور فلاں مقام میں قرار حاصل کیا۔

جنید علیہ الرحمۃ نے فرمایا: اللہ کے ایسے بندے ہوتے ہیں جو وطنوں پر پہنچنے کے بعد اللہ کے بخشے ہوئے سواری کے جانوروں پر سوار ہو کر اس کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے ہیں۔

ابوالحسین نوری کے چند اشعار ؎

(۱) اما تری هیمنی
سردنی عن وطنی

(۲) اذا تغیبت بدا
وان بدا غیبنی

ترجمہ: (۱) کیا تو نہیں دیکھتا کہ اس نے مجھے فریفتہ کرکے مجھے میرے وطن سے بھگا دیا۔

(۲) جب میں غائب ہو جاتا ہوں تو وہ ظاہر ہو جاتا ہے اور اگر وہ ظاہر ہو تو مجھے غائب کر دیتا ہے۔

ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ایمان، یقین سے افضل ہے، کیونکہ ایمان وطنات سے عبارت ہے جب کہ یقین خطرات سے۔ اور یہ کہ ابوسلیمان علیہ الرحمۃ نے جس قدر اپنے یقین کا مشاہدہ کیا تھا اسی قدر انھوں نے اس کے بارے میں کہا۔ اور یہ کہ انھوں نے گویا یقین سے اپنی اجنبیت کا اظہار بھی کیا، کیونکہ یقین، قلب میں معرفت کا قرار پکڑنے سے پیدا ہوتا ہے اور اسی کے مطابق مختلف لوگ مختلف درجاتِ یقین پر فائز ہوتے ہیں۔

الشرّود

منازلاتِ حقائق اور حقوق سے لازم رہنے سے صفات کے علیحدہ ہونے کو "شرود" کہتے ہیں۔

ابن الاعرابی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ "مشرّدین" ہر وادی میں بغیر کسی مقصد کے پھرتے ہیں اور ہر چمکنے والی شے کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔

واسطی علیہ الرحمۃ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بندے کو تربیتِ احوال کی غذا عطا کی اور

اسے اعمال میں مشاہدے سے نوازا لہٰذا اس پر واجب ہے کہ وہ زندگی میں صدقِ فقر اور صدقِ لجاء اختیار کرے تاکہ اس پر شرود حملہ نہ کر سکے۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شرود کی ذلتیں اٹھاتا پھرے اور لوگوں سے مدد مانگتا پھرے۔ اگر اسے اپنے احوال میں صدقِ وجد کی کیفیت حاصل ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ شرود سے مامون نہ رہے۔

قصود

قصد کی جمع ہے یعنے سچے ارادے۔ اور سچی نیّتیں جو اللہ کی طرف رجوع ہونے پر مبنی ہوں۔

احمد بن عطار علیہ الرحمۃ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کہا: جس نے حق کے علاوہ کسی اور کا ارادہ کیا وہ حق کی نگاہوں میں حد درجہ گر گیا۔

واسطی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: مختلف ارادوں کے خیالات دل میں لانا معبود کا انکار ہے۔ اور جو مقصود کو پیش نظر رکھتا ہو وہ ارادوں کو کب دیکھتا ہے۔

واسطی علیہ الرحمۃ کے قول کی وضاحت یہ ہے کہ جو بندہ اپنے ارادے میں مقصود کو مطمحِ نظر بنائے ہوئے ہو اسے ارادوں کا احساس تک نہیں رہتا۔

اِصْطِنَاع

اِصطِنَاع ایک ایسا مرتبہ ہے جس پر فقط انبیاء علیہم السلام اور صدیقین رضوان اللہ علیہم اجمعین فائز ہوتے ہیں۔

بعض صوفیہ کہتے ہیں کہ اصطناع کے مرتبہ پر فقط موسیٰ علیہ السلام فائز تھے کیونکہ ان کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي [1] میں نے تجھے خاص اپنے لیے بنایا۔

جب کہ کچھ صوفیہ یہ کہتے ہیں کہ اصطناع فقط انبیاء علیہم السلام ہی کا حصہ ہے۔

---

[1] طٰہٰ: ۴۱

ابوسعید خراز علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: اللہ کی طرف سے جو پہلی چیز ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ اس نے بندوں کو ان کے نفوس میں پوشیدہ کر دیا پھر ان کے نفوس میں فنا کر دیا۔ اور انھیں اپنے لیے تیار کیا اور یہ توحید کے دائمی ظہور کے لحاظ سے توحید میں داخل ہونے کے لیے پہلا قدم ہے۔

کسی شیخ سے مندرجہ ذیل آیات کی وضاحت پوچھی گئی:

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۔[1]	اور میں نے تجھے خاص اپنے لیے بنایا۔
وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِي ۔[2]	اور اس لیے کہ تو میری نگاہ کے سامنے تیار ہو۔

تو فرمایا: اس درجہ تک پہنچنے کے لیے جو محنت و جانفشانی کرنا پڑتی ہے اس سے نہ تو کوئی نبی بچ سکا اور نہ ہی کوئی ولی۔

اصطفاء

اصطفاء کا معنی ہے چن لینا، منتخب کر لینا۔ یہ اسم مشترک ہے۔

قولِ خداوندی ہے:

وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ ۔[3]	اور ہم نے انھیں چن لیا اور سیدھی راہ دکھائی۔

اور فرمایا:

وَاللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ ۔[4]	اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے رسول اور آدمیوں میں سے۔

واسطی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: اس نے تجھے خود شروع فرمایا، اپنے لیے منتخب کیا پس جس نے اس مقام پر غرور و فخر کیا تو اس نے جو کچھ کیا وہ خطرے میں پڑ گیا اور جس نے اس کی طرف پوری

---

[1]: طٰہٰ: ۴۱ [2]: طٰہٰ: ۳۹

[3]: الانعام: ۸۷ [4]: الحج: ۷۵

توجہ کی اسے اس مقام سے ہدایت ملی۔

مسخ

مسخ کا معنی اصطلاحِ صوفیہ میں قلوب کا مسخ ہو جانا ہے۔ یہ کیفیت ان کی ہوتی ہے جو اس کے در سے دھتکارے گئے ہوں حالانکہ پہلے ان کے قلوب متوجہ الی اللہ تھے مگر انھیں اعراض کرنے کے سبب مسخ کر دیا گیا اور ان کی توجہ حظوظ کی بجائے حقوق کی طرف لگا دی گئی۔ اگر کوئی کہے کہ فلاں کو مسخ کر دیا گیا تو مراد یہ ہوگی کہ اس نے اپنے قلب کے ساتھ اعراض کیا۔

لطیفہ

لطیفہ ایک اشارہ ہے جو فہم میں روشن اور ذہن میں چمکتا ہے اسے باریکی مفہوم کی وجہ سے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ابو سعید ابن الاعرابی کہتے ہیں: حق تعالےٰ تجھے اپنے پاس سے ایک لطیفہ عطا کرنا چاہتے ہیں جس کے ذریعے تو اس کی مرضی کے مطابق اس کا ادراک حاصل کر لے۔

ابو حمزہ صوفی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: تو نے میرے معاملے میں میرے ساتھ تلطف کیا تو نے میرے غائب کے لیے حاضر کو ظاہر فرمایا، بلاشبہ لطف کا حصول لطف سے ہی ہوتا ہے۔

امتحان

امتحان سے مراد آزمائش ہے اللہ کی جانب سے جو اللہ کی طرف بڑھنے والے قلوب پر ڈالی جاتی ہے۔ اور یہ آزمائش اس طرح ہوتی ہے کہ قلوب ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔

خیر النسّاج علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: میں ایک مسجد میں داخل ہوا تو میرے مریدین میں سے ایک نوجوان مجھ سے کہنے لگا: اے شیخ! مجھ پر کرم کرو کیونکہ میری آزمائش بڑی ہے۔ میں نے پوچھا آزمائش کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے آزمائش کو کھو دیا اور عافیت سے ہوں اور آپ جانتے ہیں

کہ یہ ایک بڑی آزمائش ہے۔

امتحان تین طرح کا ہوتا ہے، ایک سزا کی صورت میں دوسرا کفارہ اور کسی چیز سے آزمانے کی صورت میں جب کہ تیسرا درجات میں بلندی کی صورت میں ہوتا ہے۔

حَدَث

یہ اسم ہے اس شے کے لیے جو موجود نہ تھی اور ہو گی۔

صوفیہ کا بیان ہے کہ جب اللہ تعالےٰ عوام الناس کو تنبیہ کرنا چاہتا ہے تو اپنی نشانیوں میں سے کوئی نشانی پیدا فرماتا ہے۔ اور جب خواص کو متنبہ کرنا چاہتا ہے تو ان کے قلوب سے نئی پیدا شدہ اشیاء کا ذکر زائل فرما دیتا ہے۔

الکُلّیۃ

کلیّۃ کسی شے کی اس مجموعی شکل کو کہتے ہیں کہ اس میں کچھ باقی نہ رہے یعنے تمام کا تمام۔

جب کوئی شخص لفظ کُل استعمال کرے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس میں کچھ بھی باقی نہیں تاہم معنی کے لحاظ سے باقی رہنا برقرار رہتا ہے۔

کسی صوفی کا قول ہے کہ کوئی بندہ پوری طرح عبودیت پہ فائز نہیں ہوتا بلکہ اس میں سے کچھ پہلو غیر اللہ کے لیے باقی رہتے ہیں۔

کسی اور صوفی کا قول ہے کہ اگر تو اللہ کے حضور تمام کا تمام حاضر ہو تو وہ کل الکل کے ساتھ تیری طرف بڑھے گا۔

کسی کا شعر ہے ؎

بل کل ما کل من کلی علیك کما
بکل کلك کلی کان منشاهٗ

ترجمہ: تیرے لیے میرے وجود کا پوری طرح حاضر ہونے کا مقصد و مطلب یہ ہے کہ گویا تو اپنے کل الکل کے ساتھ میرے کل کی طرف بڑھتا ہے۔

تلبیس

کسی شئے کو اس کی ضد کے اوصاف کے ساتھ آراستہ کرنا تلبیس کہلاتا ہے۔

واسطی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں تلبیس عین ربوبیت ہے۔ یعنی وہ مومن کو کافر اور کافر کو مومن کے لباس میں ظاہر فرماتا ہے۔

قول باری تعالےٰ ہے:

وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ۔ [1] اور ان پر وہی شبہ رکھتے ہیں جس میں اب پڑے ہیں۔

جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: وہ التباس سے ملا ہوا اور احساس میں متلوّن انداز سے شامل ہے۔

قناد علیہ الرحمۃ کا ایک شعر اسی ضمن میں ملاحظہ ہو ؎

بنا یکشف التلبیس فی کل ماکر

اذا طاح فی الدعوی وطاح انتحاله

ترجمہ: ہم پر ہر دھوکہ دینے والے کے بارے میں اس وقت دھوکہ دہی کا انکشاف کیا جاتا ہے جب وہ اپنے دعوے میں گمراہ ہو جاتے اور وہ کسی کی شئے کو اپنے ظاہر کرنے میں ناکام ہو جائے۔

شرب

ارواح و اسرار پاکیزہ کا وارد ہونے والے کرامات کا استقبال کرنا اور ان کرامات سے لطف نعمت حاصل کرنے کو شرب سے مشابہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایسی کیفیت میں بندہ پر قرب مولیٰ کے انوار مشاہدہ وارد ہوتے ہیں تو وہ ان سے خوشی حاصل کرتا اور نعمت کا لطف اٹھاتا ہے۔

ذوالنون علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ان کے قلوب بحر محبت پر وارد ہوتے اور اس میں سے چلو

---

[1] الانعام: ۹

بھر بھر کر دلوں کو خطرے میں ڈال کر سیراب ہوئے تو لقاءِ محبوب میں حائل ہر مشکل ان پہ آسان ہو گئی اور ہر رکاوٹ دور ہو گئی۔

شربت کاساً علی ذکراك صافیة
فما یعلّل فیك القلب تعلیل
فما وجدت لشیءٍ عنك لی شغلا
لاعشت ان قلت انی عنك مشغول

ترجمہ: میں نے تیری یاد میں کئی پاکیزہ پیالے نوش کیے۔ اس لیے اب تیری (محبت) میں قلب کو کوئی علت لاحق نہیں ہو سکتی۔

اب تیرے سوا کسی اور شے کی طرف میرا کوئی میلان نہیں۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ میں تجھ سے بے توجہ ہوں تو زندہ ہی نہ رہوں۔

ذوق

ذوق شرب کی ابتدا ہے۔

ذوالنون علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: جب اللہ نے یہ ارادہ فرمایا کہ وہ اپنے بندوں کو اپنی محبت کے جام پلائے تو انھیں اپنی محبت کی لذتوں کا مزا چکھایا اور انھیں اس کی حلاوت سے نوازا۔

اسی سلسلہ میں کسی نے کہا ہے ؎

یقولون شکلی ومن لم یزق
مراق الاحبہ لم شکل

ترجمہ: وہ کہتے ہیں کہ ان کی مثال بچہ گم کر دینے والی عورت کی سی ہے یعنی وہ اس کی طرح بے قرار ہیں۔ مگر اس نے تو بچہ گم ہی نہیں کیا یعنے وہ تو بے قرار ہی نہیں ہوا جس نے دوستوں کی جدائی کے صدمے ہی نہ اٹھائے ہوں۔

عین

عین اشارہ ہے اس شئے کی ذات کی طرف جس سے اشیاء ظاہر ہوں ۔
واسطی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں : ایک گروہ صوفیہ جو اس بحث میں الجھا تھا کہ مصادر کلام کہاں ہیں کہ وراء اشارہ وہ عین پر پہنچ گئے اور اس نے انھیں بحث و طلب سے ہی بے نیاز کر دیا ۔
جنید علیہ الرحمۃ کا بیان ہے کہ ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ کے حالات و واقعات اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ عین الجمع تک رسائی حاصل کر چکے تھے اور یہ عین الجمع اسمار توحید میں سے ایک اسم ہے جس کی اپنی خصوصیات ہیں جن سے اس پر فائز صوفیہ ہی باخبر ہوتے ہیں ۔
ابو الحسین نوری علیہ الرحمۃ کا ایک شعر ہے

مضی الجمیع فلا عین ولا اثر
مضی عاد وفقدان الالی ارم

ترجمہ : سب کچھ گذر گیا اور نہ کوئی عین رہا نہ کوئی نشان قوم عاد اور ان کی قدیم جنت بھی معدوم ہو گئی ۔

اصطلام

اصطلام خصوصیت ہے ایسے غلبہ کی جو عقلوں پر وارد ہو کر انھیں اپنے غلبہ و قوت کے ساتھ سلب کر لیتی ہے ۔
کسی نے کہا ہے کہ قلوب دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کو آزمایا گیا ہوتا ہے اور دوسرے وہ جن کو اصطلام لاحق ہو چکا ہوتا ہے ۔ اگر اصطلام واقع ہو تو قلوب جاتے رہتے ہیں ۔
کسی نے کہا ہے

اذا ما بدت لی تعاظمتها
فاصدر فی حال من لم یرد
فیصطلم الکل منی بها
ویحجب عنی بها ما اجد

ترجمہ : جب میری محبوبہ میرے سامنے ظاہر ہوتی ہے تو میں اسے اس قدر عظیم سمجھنے لگتا ہوں کہ اس شخص کی طرح واپس ہونے لگتا ہوں جو آیا ہی نہیں۔

اور میری یہ کیفیت ہوتی ہے کہ مجھ سے سب کچھ چھن جاتا ہے اور مجھ سے وہ سب کچھ پوشیدہ کر لیا جاتا ہے جو میں نے پا لیا ہوتا ہے۔

حرّیت

حریت سے اشارہ کیا جاتا ہے اللہ کی عبودیت اختیار کرنے کی نہایت پا لینے کی طرف۔ وہ اس طرح کہ مخلوقات میں سے کوئی تجھ پر غالب نہ آ سکے اور تو جب اللہ کی بندگی اختیار کرے تو تُو پہلے سے آزاد ہو۔ جیسا کہ بشر بن حارث حافی علیہ الرحمۃ نے سری سقطی علیہ الرحمۃ سے کہا : اللہ تعالےٰ نے تجھے آزاد پیدا فرمایا لہٰذا اسی طرح رہ جس طرح اس نے تجھے پیدا فرمایا، لہٰذا تو اپنے متعلقین و رفقاء سے سفر ہو کر حضر دور رہ۔ اللہ تعالےٰ کے لیے تمام اعمال انجام دو اور لوگوں کو خود سے دُور چھوڑ دو۔

جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں : عارف کا آخری مقامِ حریت ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ کوئی بندہ اللہ کا سچا بندہ نہیں بن سکتا جب تک وہ غیر اللہ کا غلام بنا رہے۔

رَیْن

رین (زنگ) سے مراد وہ زنگ ہے جو دلوں کو لگ جاتی ہے۔

قول باری تعالیٰ ہے :

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ [1]

کوئی نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دی ہے ان کی کمائیوں نے۔

---

[1] : التطفیف ۱۴

کسی عالم کا قول ہے کہ حجاباتِ قلب تین قسم کے ہوتے ہیں :

(۱) مُہر کی صورت میں اور یہ کُفار کے دلوں پر لگی ہوتی ہے ۔

(۲) زنگ اور قساوت کی صورت میں اس کا تعلق قلوبِ منافقین سے ہے ۔

(۳) زنگ اور حجاب کی صورت میں اس کا تعلق قلوبِ مومنین سے ہے ۔

ابن الجلاّء علیہ الرحمۃ سے پوچھا گیا کہ ان کے والد کا نام جلاّر کیونکر پڑا ؟ انھوں نے جواب دیا :
ان کا نام جلاّر اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ لوہے کو صیقل کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ جب قلوب پر گفتگو کرتے تھے تو ان سے گناہوں کا زنگ اتار دیتے تھے ۔

غَیْن

غین (بادل ، تیرگی) کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت اسی ضمن میں مروی ہے جو کہ ضعیف ہے ۔ روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"البتہ میرے دل پر بادل چھا جاتے ہیں تو میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں
اور دن میں ستّر بار اس کے حضور توبہ کرتا ہوں ۔"

شارحین نے کہا کہ بادل جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ اطہر پر چھا جاتا تھا ، اس کی مثال اس آئینہ کی سی ہے جس پر دیکھنے والے کی سانس سے بادل سا چھا جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد وہ بادل چھٹ کر آئینہ پھر سے صاف اور روشن ہو جاتا ہے ۔

بعض صوفیہ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ نبی کا قلب اس طرح کے کسی غلبۂ خلق سے متاثر ہو کیونکہ نبی کا قلب رویت سے مخصوص ہے ۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی [1] دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا ۔

---

[1] : النجم : ۱۱

کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ سیدِ دو عالم علیہ التحیۃ والسلام کے قلبِ اطہر کے بارے میں کچھ بیان کرے یا اسے کسی شئے سے مثال دے یا اسے کسی طرح کی خفی یا جلی علت کا حامل قرار دے۔

ابو علی رودباری علیہ الرحمۃ نے قلب پر بادل چھا جانے کے بارے میں یہ اشعار کہے ہیں :

(۱) الغین یحبس عن تحصیل بستبہٖ

لقلب لابس حق بان عن علله

(۲) فان تراءت بسبق الحق رؤیتها

کان التغیّن فی التصریف عن ثقله

(۳) لکننی قلت مالاحت طوالعه

من المؤمل تنبیه الی امله

(۴) والشوب منه علی معنی الوفاق وما

تبدی سرایرها غینا لمحتمله

(۱) غین (قلب پر چھانے والا بادل) حق کی صحبت میں رہنے والے اس قلب پر چھا جانے سے روک دیا جاتا ہے جو علتوں سے علیحدہ ہو گیا ہو۔

(۲) اور اگر ان علتوں کا سامنا سبقتِ حق کے ساتھ ہو جائے تو قلب پر بادل کا چھا جانا اپنے بوجھوں سے پھر جاتے۔

(۳) لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ مقصد و مراد سے جو انوارِ توحید چمکتے ہیں وہ اس کی آرزو کو بیدار کرنے کا سبب ہوتے ہیں۔

(۴) اس سے واپس ہونا اس سے ملنے کے مترادف ہے اور اس کے سرائر، صاحبِ سرائر کے لیے کوئی چھا جانے والا بادل ظاہر نہیں کرتے۔

الوسائط

وسائط سے مراد وہ اسبابِ دنیا و آخرت ہیں جو بندے اور اللہ جل شانہ کے درمیان واقع

ہوتے ہیں۔

کسی شیخ سے وسائط کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: وسائط تین طرح کے ہوتے ہیں: وسائط مواصلات، وسائطِ متصلات اور وسائط منفصلات۔

وسائطِ مواصلات سے مراد حق تعالیٰ کی طرف جانے کے راستے کے صحراء متصلات سے مراد عبادات اور منفصلات سے مراد خواہشاتِ نفس ہیں۔

ابو علی رودباری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: اللہ وہ پاک ذات ہے جس نے وسائط یعنے اسباب کو عارفین کے لیے رحمت بنایا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے اس تک رسائی حاصل کر سکیں۔

○

۹۲

شطحیات و کلماتِ صوفیہ جو بظاہر قبیح مگر دراصل صحیح ہیں

معنیٔ شطحیات اور منکرینِ شطحیات کی تردید

شطح کی جمع شطحیات ہے۔ اور شطح سے مراد وہ عجیب و غریب عبارات ہیں جو صوفیۂ کرام سے وجد و مستی کی انتہائی کیفیت میں صادر ہوتی ہیں۔

لغتِ عرب میں شطح کا معنی حرکت ہے جیسے کہا جاتا ہے، شَطَحَ یَشْطَحُ یعنے حرکت کرنا، اور آٹے کے گودام کو مشطاح کہتے ہیں جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

قف بشط الفرات مشرعة الخیل قبیل الطریق بالمشطاح

بالطواحین من حجارة بطریق بدیر الغزلان دیر الملاح

واذا لاح بالمسناة ظبی قد کساه الاشراق ضوء الصباح

فاقر ذاك الغزال منی سلاماً

کل صاح صالح لفلاح

ترجمہ: فرات کے کنارے گھوڑوں کے گھاٹ، آٹے کے گودام کی طرف جانے والے رستے سے کچھ پہلے، پادری کی قبر کے نزدیک آٹے کی چکیوں اور ہرنیوں کی خانقاہ جو کہ حسیناؤں کی خانقاہ ہے کے پاس ٹھہر جا!

اور جب پانی کے بند کے پاس کوئی ہرنی جسے حسن نے صبح کی روشنی اوڑھا رکھی ہو ظاہر ہو۔ تو اس ہرنی سے میرا سلام کہو جب بھی کوئی بہتری کی جانب پکارے۔

آٹے کے گودام کو مشطاح اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں آٹے کو چھاننے کے لیے کثرت سے ہلاتے رہتے ہیں اور بعض اوقات آٹا چھانتے وقت پہلوؤں سے آٹا گرتا بھی رہتا ہے۔ لہٰذا لفظ شطح حرکت سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ شطح واجدین کے قوی وجد کی حالت میں ان کے اسرار کی حرکت کے نتیجے میں صادر ہونے والے اس کلام کو کہتے ہیں جو سننے والے کو بظاہر عجیب سا لگتا ہے۔ اور شطح میں بیان کی گئی بات کا انکار کرنے والا یا اس پر اعتراض کرنے والا مفتون و ہلاکت میں پڑنے والا ہے۔ اور جو اسے سن کر کسی ایسے شخص سے رجوع کرے جو اس کا علم رکھتا ہو اور اس طرح وہ انکار اور اس پر بحث کرنے کو ہی ختم کر دے تو ایسا شخص بلاشبہ نجات پانے والا اور صالح ہے۔

اور شطح کی کیفیت تو ایسی ہوتی ہے جیسا کہ کسی تنگ نہر میں جب پانی چھوڑ دیا جائے تو پانی اس کے کناروں سے باہر نکل پڑے تو ایسے میں کہا جاتا ہے: شَطَحَ الْمَاءُ فِي النَّهْرِ۔ اسی طرح ایک مبتدی صوفی جو بحالتِ وجد اپنے وجد کو اس قدر قوی پاتا ہے کہ وہ اپنے قلب پر وارد ہونے والے انوارِ حقائق کے غلبہ کا متحمل نہیں ہو سکتا تو یہ انوار اس کی زبان پر پھیل جاتے ہیں اور وہ ان کے بارے میں ایسی عجیب و غریب اور پیچیدہ گفتگو کرتا ہے کہ سننے والے کی سمجھ سے بالا ہوتا ہے۔ ہاں وہ لوگ اسے سمجھتے ہیں جو اس کا علم رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر ایسا کلام اہلِ اصطلاح کے ہاں شطح کہلایا جانے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کے قلوب کھول دیئے ہیں، انھیں بلندی کی طرف جانے والے درجات کی طرف بڑھنے کی اجازت دے دی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے منتخب بندوں کو اپنی طرف آنے، متوجہ ہونے اور مراتبِ خواص پر مطلع ہونے کی صلاحیت بخش دی، لہٰذا ان منتخب اولیاء میں سے ہر ایک اس حقیقت کو بیان کرتا ہے جسے وہ پا لیتا ہے۔ وہ اپنے حال اور قلب پر وارد ہونے والے انوار و حقائق ہی سے متعلق گفتگو کو زبان پر لاتا ہے، کیونکہ وہ اپنے ارادوں سے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہو جاتے ہیں اور وہ اس مقام پر ہوتے ہیں جہاں تمام احوال و مقامات اور راستے آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ [۱] — اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے۔

اور فرمایا:

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ [۲] — اور ان میں ایک دوسرے پر درجوں بلندی دی۔

اور فرمایا:

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ [۳] — دیکھو! ہم نے ان میں ایک کو ایک پر کیسی بڑائی دی۔

کسی کو یہ نہیں چاہئے کہ وہ اللہ کے اولیاء کے بارے میں زبانِ غیبت کھولے اور خود اپنے قیاس ان کے کلام سے مطالب اخذ کرے کیونکہ اولیاء اللہ اپنے اوقات میں مختلف اور احوال میں ایک دوسرے کے مقابلے میں فضیلت رکھتے ہیں اس طرح وہ احوال میں باہم ایک جیسے بھی ہوتے ہیں۔ اب اگر ان میں سے کوئی اپنے ساتھیوں سے زیادہ صاحبِ فضیلت ہو اور وسعتِ معرفت کا حامل ہو تو وہ اس بات کا اہل ہے کہ شطحیاتِ صوفیہ سے متعلق گفتگو کرے یا ان کے درست و نادرست ہونے کے بارے میں کچھ کہے اور اگر کوئی شخص ایسے صاحبِ مقامِ صوفیہ کے راستے پر چلا ہی نہ ہو تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ صوفیہ کے اس طرح کے کلمات سے انکار کو جانے دے اور انھیں اللہ پر چھوڑ دے۔ اس کے علاوہ اگر اس نے صوفیہ سے متعلق کوئی غلط ریمارکس دیئے ہوں تو ان کے غلط ہونے کا اعتراف کرے۔

○

---

۱ : یوسف : ۷۶ ۲ : الزخرف : ۳۲ ۳ : بنی اسرائیل : ۲۱

۹۳

تشریح علوم، علما کی علمی مشکلات اور ان کی صحت پر دلائل

واضح رہے کہ علم پر مکمل عبور کسی ذہن کو حاصل نہیں کیونکہ علم انسانی اذہان سے کہیں وسیع تر ہے اس سلسلے میں موسیٰ و خضر علیہما السلام کے واقعے کو ذہن میں رکھنا چاہیئے جب کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے صفت جلال، اپنے ساتھ کلام کرنے، نبوت، وحی اور رسالت جیسے مناصب سے نوازا تھا۔ اور اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں اپنے نبی صادق صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی زبان سے یہ کہا کہ موسےٰ علیہ السلام اللہ تعالےٰ کے بندوں میں سے کسی بندے کے علم کے جاننے سے عاجز تھے۔ جیسا کہ قول باری تعالےٰ ہے:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا [1]	تو ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ پایا جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی۔

یہاں تک کہ انھوں نے اس بندے سے کہا:

هَلْ أَتَّبِعُكَ [2]	کیا میں تمھارے ساتھ رہوں۔

اس طرح گویا موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص کو شرافت و علمیت کی تائید کی اور اس بات کا بھی اقرار کر لیا کہ وہ ان کی باتوں کا انکار نہیں کریں گے حالانکہ وہ شخص یعنی خضر علیہ السلام نبوت، رسالت اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ کلام کرنے کی فضیلت کے لحاظ سے کسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے درجے

---

[1] : الکہف : ۶۵ [2] : الکہف : ۶۶

کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اگر تم وہ کچھ جان لو جس کا علم مجھے ہے تو البتہ روؤ گے زیادہ اور ہنسو گے کم، تم عورتوں سے لذت یاب نہ ہو سکو گے، نہ ہی تم اپنے بچھونوں پر آرام کر سکو گے، اور بلند جگہوں پر جا جا کر بلند آواز سے اللہ کے حضور میں دعائیں مانگو گے کہ خدا کی قسم! اگر میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹا جاتا تو یہ میرے لیے بہتر ہوتا۔"

اس حدیث کو اسرائیل نے ابراہیم بن مہاجر سے انھوں نے مجاہد سے انھوں نے مورّق سے انھوں نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا۔

اس حدیث نبوی میں ذیل کی آیت مبارکہ کی تصدیق اور اس کے لیے دلیل موجود ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

يَآ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ [1]

اے رسول! پہنچا دو جو کچھ اتارا تمھیں تمھارے رب کی طرف سے۔

آیت مبارکہ میں ما انزل الیك فرمایا، یہ نہیں فرمایا: ما تعرّفنا به الیك۔

قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "اگر تم وہ کچھ جان لو جو میں جانتا ہوں۔۔۔ الخ" کی تشریح یہ ہے کہ اگر وہ علوم جو وہ جانتے تھے انھیں لوگوں تک پہنچانے اور پھیلانے کا حکم ہوتا تو وہ ضرور ان کو لوگوں تک پہنچاتے۔ اور اگر لوگوں کے لیے ان کا جاننا مفید ہوتا تو وہ ضرور انھیں سکھاتے۔

علومِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

کیونکہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ختم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تین قسم کے علوم عطا فرمائے:

---

[1] المائدہ: ۶۷

ایک علم جو خاص و عام یعنے ہر ایک کے لیے واضح ہے۔ اور یہ علم حدودِ الہٰی، اور امر و نہی پر مشتمل ہے۔

دوسرا علم جو صرف صحابہ کرامؓ کو دیا گیا یعنے وہ علم جو حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ جانتے تھے حتیٰ کہ عمر الخطاب رضی اللہ عنہ اپنی عظمت و فضیلت کے باوجود ان سے دریافت فرمایا کہ اے حذیفہ! کیا میں منافقین میں سے ہوں؟ اسی طرح حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے علم کے ستّر باب سکھائے۔ جنھیں میرے بغیر کوئی اور نہیں جانتا۔

صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم و رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے جس کو بھی کوئی مشکل درپیش ہوتی تو وہ اس کے حل کے لیے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرتے۔

تیسرا علم وہ ہے جو فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کو عطا فرمایا گیا اور اس میں کوئی اور ان کا شریک نہیں، وہ وہی علم جس کی طرف آپ نے لو تعلمون ما اعلم کہہ کر اشارہ فرمایا۔

اسی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی کو بھی یہ خیال نہیں رکھنا چاہیئے کہ وہ تمام علوم کو جانتا ہے اور اس طرح وہ مخصوصین کے کلام میں اپنی رائے سے غلطیاں نکالے، انھیں کافر و زندیق کہے حالانکہ وہ خود ان کے احوال و مقامات کی رفعتوں سے بے خبر ہو۔

علومِ شریعت کی اقسام

علومِ شریعت کی چار اقسام ہیں:

قسم اول، علم روایت و آثار و اخبار پر مشتمل ہے اس علم کو ثقہ راوی ثقہ راویوں سے نقل کرتے ہیں۔

قسم دوم، علم درایت ہے۔ یہ فقہ و احکام پر مبنی ہے۔ اور علماء و فقہاء میں متداول ہے۔

قسم سوم، علمِ قیاس جو غور و خوض اور مخالفین کے خلاف دلائل لانے پر مشتمل ہے۔

یہ اہلِ بدعت و گمراہی کے خلاف حجت ثابت کر کے دین کی نصرت کا علم کہلاتا ہے۔

قسم چہارم، یہ وہ علم ہے جو تمام سے افضل ہے کیونکہ یہ علم، حقائق، انوار و تجلیات کے نزول، مجاہدات و ریاضات، خلوص زطاعات، معاملہ باللہ، اللہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے، ہر وقت اسی کی طرف بڑھنے، ارادوں کی سچائی خواہشات و آفات سے باطن کی صفائی، خالق سماوات پر اکتفار، مخالفت نفس کر کے اسے مار دینے، احوال و مقامات میں صدق برتنے، خلوتوں اور جلوتوں میں ظاہراً اور باطناً دونوں طرح سے اللہ کے حضور حسن ادب سے رہنے، غلبۂ حاجات کے وقت فقط گذارہ کرنے پر اکتفا کرنے، دنیا سے منہ موڑ لینے، دنیا میں موجود اشیاء کو بلندیٔ درجات اور کرامات تک پہنچنے کے لیے ترک کر دینے پر مشتمل ہے۔

جو شخص علمِ روایت میں غلطی کرے تو وہ اپنی غلطی کے بارے میں اہل روایت سے نہیں پوچھتا اور درایت میں غلطی کرنے والا کبھی اہلِ روایت سے رجوع نہیں کرتا اور جو قیاس و نظر کے علم میں غلطی کرتا ہے وہ اہلِ روایت و درایت سے سوال نہیں کرتا اور جو علم حقائق و احوال میں الجھ جائے وہ اپنی الجھن کو کسی اور سے نہیں پوچھتا بلکہ یہ تمام لوگ اپنے اپنے مسائل متعلقہ علم کے ماہرین و علماء سے سمجھتے ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ یہ مندرجہ بالا تمام علوم آپ کو اہلِ حقائق کے ہاں تو مل جائیں گے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ علم حقائق آپ کو فقط ماہرینِ علومِ شریعت کے ہاں مل سکے۔ ہاں ان میں جس کو اللہ چاہے عطا فرما دے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ علم حقائق تمام علوم کا پھل اور ان کا انجام ہے اور غایت جملہ علوم خود علم حقائق کی غایت ہے۔ جو اس تک رسائی حاصل کرے وہ ایک بحرِ بیکراں میں غوطہ زن ہو جاتا ہے اور اس علم حقائق میں علمِ قلوب، علمِ معارف، علمِ اسرار، علمِ باطن، علمِ تصوف علمِ احوال اور علمِ معاملات شامل ہیں۔

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ	تم فرما دو! اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے
رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ	لیے سیاہی ہو تو ضرور سمندر ختم ہو جائے گا
كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ	اور میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی اگرچہ

مِـدَادًا ۱؎ ہم ویسا ہی اور اس کی مدد کو لے آئیں۔

کیا آپ نہیں جانتے کہ علمِ تصوف کے علما، باقی تین علومِ شریعت کے علما، کے علوم کا انکار نہیں کرتے مگر باقی تینوں علوم شریعت کے علما، اہلِ تصوف کے علوم کا انکار کرتے ہیں ہاں جسے اللہ چاہے وہ انکار نہیں کرتا۔

ان علومِ مذکورہ میں سے جو بھی اپنے اپنے علم میں مہارتِ تامہ حاصل کرے تو وہ اپنے ساتھیوں کے لیے امام ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر مسئلے کو اسی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص میں یہ چاروں مذکورہ علوم جمع ہو جائیں تو وہ امام کامل، قطب، حجتِ الٰہی، اور راہِ راست کی جانب بلانے والا کہلاتا ہے جیسا کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کمیل بن زیاد سے ایک گفتگو کے دوران فرمایا، زمین اللہ کی حجتوں کو قائم کرنے والے سے خالی نہیں ہوتی تاکہ کہیں اس کی نشانیاں اور حجت باطل نہ ہو جائے۔ ایسے لوگ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے بہت کم ہوتے ہیں مگر قدر و منزلت کے اعتبار سے عند اللہ بلند مرتبہ ہوتے ہیں۔

اب ہم شطح اور شطحیات سے متعلق بحث کی طرف آتے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ شطحیات کا صدور اہلِ کمال سے بہت کم ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے معانی میں متمکن ہوتے ہیں۔ شطح کا صدور زیادہ تر مبتدی ہی سے ہوتا ہے کیونکہ وہ نہایات و غایات اور کمال کی طرف بڑھنے والا ہوتا ہے۔

○

۱؎ : الکہف : ۱۰۹

۹۴

شطحیات ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ
مع
تفسیر جنید بغدادی علیہ الرحمۃ

جنید بغدادی علیہ الرحمۃ نے ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ کی شطحیات میں سے بہت کم کی تفسیر بیان کی ہے مگر دانشمند کم ہی سے زیادہ پر دلیل لا سکتا ہے۔

یہ بات میرے لیے محال ہے کہ میں جنید علیہ الرحمۃ کی تشریحات کو نظر انداز کر کے اپنی تشریحات پیش کروں۔

جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ابو یزید بسطامی سے متعلق بیان کردہ شطحیات مختلف انداز کی ہیں اور ان کے نقل کرنے والے بھی متفرق انداز سے نقل کرتے ہیں اور یہ شاید اس وجہ سے کہ یہ شطحیات مختلف احوال و مقامات میں کہی گئی ہیں۔ الغرض ہر بیان کرنے والا اپنے طریقے کے مطابق ضبط کرتا ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ نے ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ کے کلام کی شرح کی ہے تو اس وجہ سے کہ وہ خود بلند مقام اور کامل بصیرت کے حامل تھے دوسرے یہ کہ جس دریا سے سیراب ہوئے تھے وہ فقط انہی کا حصہ تھا۔

انھوں نے فرمایا: میں نے یہ دیکھا کہ ابو یزید بسطامی کے کلام کا مقصد و منتہیٰ بہت دور ہوتا ہے، یعنی ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اسے بہت کم کوئی سمجھ سکتا ہے صرف وہی شخص ان کے کلام سے پورا مفہوم اخذ کر سکتا ہے جو اس کے معانی کو جانتا ہو۔ اور اگر کوئی اس صلاحیت سے عاری ہو تو اس نے جو کچھ سنا اور سمجھا وہ قابل قبول نہیں۔

جنید علیہ الرحمۃ نے کہا کہ ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ کا کلام اپنی قوت، گہرائی اور بلند معانی کے اعتبار سے ایک ایسے دریا سے سیراب ہوتا ہے کہ جو انہی کا حصہ ہے اور میں نے ان کے حال میں ایک ایسا بعید مفہوم و مطلوب پایا ہے کہ کم ہی کوئی اس کے بارے میں سن کر سمجھ سکے گا یا اس کی کوئی تعبیر کر سکے گا کیونکہ ان کا متحمل تو وہی ہو سکے گا جو اس کے معانی کو سمجھے گا اور جو ان کو سمجھنے یا برداشت کرنے کی استعداد نہیں رکھتا اس کے لیے یہ سب کچھ بے معنی ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ میں نے ابو یزید بسطامی کی شطحیات کو جس انداز میں پایا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ ایسے رموز و معانی پا لیے تھے جن میں وہ مستغرق ہو چکے تھے۔ اور حقیقت حق میں وارد ہونے سے پہلے اس میں فنا ہو گئے۔ اور یہ حقیقتِ حق ایسے معانی پر مبنی ہے کہ جس نے ان کو کئی مرتبہ مستغرق کیا اور یہ معانی خود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

جنیدؒ کہتے ہیں کہ جہاں تک ابو یزیدؒ کے حال کے ابتدائی مراحل ہیں تو وہ اس لحاظ سے مضبوط و محکم ہیں اور وہ ان مراحل کی انتہا کو پہنچے۔ آپ نے علمِ توحید سے متعلق صحیح حقائق بیان کئے مگر یہ سب کچھ ابتدائی حالات میں تھا کہ جن میں توحید کے مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں۔

میں ابو یزید بسطامیؒ کی جن شطحیات و کلمات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اگرچہ وہ کتابوں میں موجود نہیں کیونکہ علماء کے نزدیک ان کا تعلق مشہور و معروف علم سے نہیں، تاہم میں نے دیکھا کہ لوگوں نے ان کے معانی پر کافی غور و خوض کیا، ایک انھیں اپنے باطل نظریات کے لیے حجت بناتا ہے تو دوسرا ان کے کہنے والے کو کافر سمجھتا ہے حالانکہ یہ سب لوگ ابو یزیدؒ کے کلمات کی غلط تشریحات میں غلطاں رہے بلاشبہ اللہ ہی راہِ صواب دکھانے والا ہے۔

۹۵

ابویزید بسطامیؒ کی ایک شطح اور اس کی تشریح

لوگوں میں ابویزید بسطامی علیہ الرحمۃ سے متعلق یہ حکایت بہت مشہور ہے اور میں یہ نہیں جانتا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے یا غلط۔ بہر حال حکایت یوں ہے: ابو یزید نے کہا کہ ایک مرتبہ اللہ نے مجھے اوپر لے جا کر اپنے سامنے بٹھا دیا اور مجھ سے فرمایا: اے ابا یزید! میری مخلوق کی یہ خواہش ہے کہ تجھے دیکھیں۔ میں نے عرض کیا: مجھے اپنی وحدانیت سے آراستہ فرما دے، اپنی انانیت کا لباس مجھے پہنا دے۔ اور مجھے اپنی احدیت سے قریب کر دے تاکہ جب تیری مخلوق مجھے دیکھے تو وہ کہہ اٹھے کہ ہم نے خدا کو دیکھ لیا۔ ایسے میں گویا وہاں میری جگہ تو ہی ہوگا اور میرا وجود ہی نہ ہوگا۔

اگر مذکورہ واقعہ صحیح ہے تو اس کی توضیح جنید علیہ الرحمۃ اپنی کتاب "تفسیر کلام ابی یزید" میں ان الفاظ میں کرتے ہیں: ابو یزید علیہ الرحمۃ کو حقیقتِ توحید کے کمال تک رسائی حاصل کرنے کے سلسلے میں اللہ کے ایک و منفرد ہونے کے حقائق سے ملبوس نہیں کیا گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اللہ سے اس کے عطا کرنے کی درخواست کی ورنہ ان حقائق سے بہرہ ور ہونے کی صورت میں ایسا سوال کبھی نہ کرتے۔

اور اس طرح کا سوال کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس کیفیت سے قریب تھے جو وہاں تھی نہ کہ وہ کسی ایسے مقام سے قریب تھے جس میں امکان و استمکان کا وجود ہوتا ہے۔ اور ابویزیدؒ کے یہ الفاظ کہ "مجھے لباس پہنا دے اپنی انانیت کا، مجھے آراستہ کر دے اپنی وحدانیت سے اور

مجھے اپنی احدیت سے قریب کر دے"، تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی مطالبہ کیا وہ ان کے روحانی ظرف کے مطابق تھا۔ اور انھیں اسی قدر معرفت حاصل ہوئی جس کا انھوں نے اظہار کیا تھا۔

یہاں ہم یہ کہتے ہیں کہ جنید علیہ الرحمۃ نے ابویزید کے قول کی اسی قدر تشریح کی جس قدر کہ الفاظ میں اشارات موجود تھے۔ مگر انھوں نے ان کے بارے میں لوگوں کے الزامات اور تنقیدات کا جواب دیا، بہرحال اس کے بارے میں ہم کچھ عرض کرتے ہیں اور وہ یہ کہ ان کے قول اللہ نے اوپر لے جا کر مجھے اپنے پاس بٹھا دیا" سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے مجھے مشاہدہ کرایا اور میرے دل کو اس مشاہدے کے لیے حاضر فرمایا کیونکہ تمام خلق اللہ کے سامنے ہے ان پر ایک سانس یا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرتا کہ جس میں وہ تمام ایک دوسرے سے مشاہدے کے اعتبار سے مختلف نہ ہوں۔

ایک اور حدیث نبوی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو کہتے کہ میں خدائے جبار کے سامنے کھڑا ہوں۔

اور ابویزید علیہ الرحمۃ کا قول ہے" اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے کہا"، تو اس میں شب و روز میں اللہ کے حضور مشاہدہ قلب کے ساتھ صفاتِ ذکر اور مناجات اسرار کی طرف اشارہ ہے۔ ہماری اس تشریح پر اس طرح کی تمام عبارات کو قیاس کرتے جائیں کیونکہ اس طرح کی ہر عبارت اس سے کسی نہ کسی طرح متعلق ہے۔

اور یہ جان لو کہ جب بندے کو اپنے مالک کی قربت کا پختہ یقین ہو جائے اور وہ اپنے قلب کے ساتھ حضورِ خداوندی میں حاضر اپنے تمام خیالات وارادات کا محافظ رہے تو ہر خیال جو اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ دراصل اس سے اس کے قلب کے ذریعے اللہ کا خطاب ہوتا ہے۔

الغرض قلوب میں جو کچھ بھی حضور قلبی کے دوران واقع ہوتا ہے اس کا آغاز و انجام اللہ ہی کی جانب ہوتا ہے۔

کسی نے کہا ہے۔

مثلته المعنی فظل ندیمی

فتنعمت فاقداً للنعیم

مثلته حتی کانی اناجیه

بسرّی و سرّه المکتوم

ترجمہ : آرزوؤں نے اس کی شبیہ بنائی اور وہ میرا ندیم بنا گویا میں نے گمشدہ و پوشیدہ کو ہی اپنے لیے نعمت جانا۔

آرزوؤں نے اسے تصور میں اس طرح جگہ دی کہ میں گویا اپنے قلب سے اس کے پوشیدہ راز کے ساتھ سرگوشیاں کرتا ہوں۔

کسی اور نے کہا ہے سے

قال لی حین رُمتُہٗ

کل ذا قد علمته

لو بکی طول عمره

بدمٍ ما رحمته

ترجمہ : جب میں نے اس کی محبت کا ارادہ کیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔

اگر (عاشق) ساری زندگی خون کے آنسو روتا رہے تو بھی میں اس پر ترس نہ کروں۔

اوپر کے اشعار میں قلوب کی سرگوشیوں سے متعلق کہا گیا ہے اور اس طرح کے کئی اشعار اور بھی ہیں۔

ابو یزید علیہ الرحمۃ کے قول : "مجھے اپنی واحدنیت سے آراستہ کر، مجھے اپنی انانیت سے ملبوس فرما، اور مجھے اپنی احدیت سے قریب کر" سے مراد ابو یزید علیہ الرحمۃ کا اپنے حال سے تجریدِ توحید اور حقیقتِ تفرید کے آخری مقام کو پانے والوں کے احوال کی جانب منتقل ہونا ہے۔

اسی ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث ملاحظہ ہو:
آپ نے فرمایا "مفرّدین سبقت لے گئے"
عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مفرّدین کون ہیں۔ آپ نے فرمایا: دکھ اور خوشی دونوں حالتوں میں اللہ کی حمد کرنے والوں کو مفرّدین کہتے ہیں۔

ابویزید علیہ الرحمۃ کے قول: "مجھے اپنی انانیت کا لباس پہنا حتیٰ کہ تیری مخلوق مجھے دیکھے تو یہ کہے کہ اس نے تجھے دیکھ لیا اور وہاں گویا میں نہیں تو ہی ہے" کی تشریح یہ ہے کہ ابویزید (علیہ الرحمۃ) فنا ہو جائے اور پھر وہ اپنی فنا سے بھی فنا ہو جائے گویا اس کی جگہ حق اپنی وحدانیت کے ساتھ جلوہ گر ہو اور نہ کوئی خلق پہلے ہو اور نہ کوئی موجودات میں سے ہو۔ الغرض اس طرح کی تمام باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول سے مستفاد ہیں: اللہ تعالےٰ فرماتا ہے میرا بندہ برابر نوافل کے ذریعے مجھ سے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب وہ میری نظروں میں عزیز ہو جاتا ہے تو میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔

اسی ضمن میں چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

انا من اھوی ومن اھوی انا
فاذا ابصرتنی ابصرتنا
نحن روحان معاً فی جسد
البس اللہ علینا البدنا

ترجمہ: میں کون ہوں، محبوب! اور محبوب کون ہے؟ میں! اگر تو مجھ کو دیکھ لے تو گویا تو نے ہم دونوں کو دیکھ لیا۔

ہم دو روحیں ہیں جو ایک ساتھ ایک ہی جسم میں موجود ہیں۔ اللہ نے ہمیں جامۂ بدن پہنا دیا ہے۔

مذکورہ اشعار میں اگر مخلوق میں سے کسی فرد کی دوسرے فرد سے محبت میں فنا ہو جانے

کا یہ عالم ہے تو کہیے اللہ کے ساتھ محبت کرنے کا عالم کیا ہوگا۔

کسی مرد دانا کا قول ہے کہ دو محبت کرنے والے اس وقت تک محبت کی حقیقت کو نہیں پا سکتے جب تک ان میں سے ایک دوسرے کو اس طرح نہ پکارے کہ اے میں!

یہ بحث خاصی طولانی ہے اور اس ضمن میں سب کچھ تو نہیں کہا جا سکتا بہرحال مختصراً بیان ہو چکا ہے اللہ تعالٰے ہی توفیق دینے والا ہے۔

○

۹۶

ابویزید بسطامیؒ کی ایک اور شطح اور اس کی تشریح

ابویزید بسطامی علیہ الرحمۃ نے کہا: سب سے پہلے جب میں اس کی وحدانیت تک پہنچا تو پرندے کی شکل میں، جس کا جسم احدیت سے اور پر ہمیشہ قائم رہنے سے بنے ہوئے تھے۔ دس برس تک فضائے کیفیات میں محوِ پرواز رہنے کے بعد پھر ایک ایسی فضا میں پہنچا، جو پہلی فضا سے کروڑ گنا بڑی تھی، میں مسلسل اڑتا رہا یہاں تک کہ میدانِ ازلیت میں وارد ہوا۔ یہاں میں نے احدیت کا درخت دیکھا۔ اس کے بعد ابویزید علیہ الرحمۃ نے اس درخت کی زمین، جڑ، تنا، شاخوں اور پھل کا ذکر کیا اور اس کے بعد کہا: پھر میں نے دیکھا اور مجھے معلوم ہوا کہ سب کچھ دھوکہ ہے۔

جنید علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ ابویزید علیہ الرحمۃ کے قول: "سب سے پہلے جب میں اس کی وحدانیت تک پہنچا" سے مراد ان کا توحید کو پہلی بار مشاہدہ کرنا ہے۔ گویا انھوں نے وہی کچھ بیان کیا جو انھوں نے دیکھا۔ اور آخری حد کا ذکر اس وقت کیا جب وہ وہاں تک پہنچ گئے اور آخری حد پر پہنچ کر ہی انھوں نے اپنے ٹھکانے کا ذکر کیا اور یہ سب کچھ در اصل طالبینِ حقیقت کا راستہ ہے جو وہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے اور علمِ توحید کے حقائق کو پانے کے لیے طے کرتے ہیں۔ اور یہی راستہ ہی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے سلسلے میں ان سالکین کی نظر میں مقبول و محبوب ہے جو اس کے مشاہدات سے گذر چکے ہوتے ہیں۔

ابویزید علیہ الرحمۃ کا یہ قول: "اس فضائے کیفیت کی حیثیت کروڑ گنا بڑھ کر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی استطاعت بھر اس مقام کی وضاحت کرنا چاہی مگر وہ ان کی توضیحات

سے کہیں بڑھ کر نکلی۔ اسکے بعد انھوں نے وہ کچھ بیان کیا جو انھوں نے وہاں مشاہدہ کیا مگر یہی کچھ مطلوب و مقصود نہیں بلکہ اس راہ کے مشاہدات میں سے ایک ہے۔

الغرض جنید علیہ الرحمۃ نے جو کچھ شطحیات ابو یزید علیہ الرحمۃ سے متعلق وضاحتی انداز میں کہا وہ سمجھنے والوں کے لیے کافی ہے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ جنید علیہ الرحمۃ نے ابو یزید علیہ الرحمۃ کے قول پر کی جانے والی تنقید کا کوئی جواب نہیں دیا جب کہ اعتراض کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ انسان کے لیے یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ پرندہ بن کر اڑتا پھرے۔

اس بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ابو یزید علیہ الرحمۃ نے اڑنے سے ارادوں کی بلندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور دلوں کی پرواز مراد لی ہے۔ اور اس طرح کا مفہوم خود لغت میں موجود ہے جیسا کہ کوئی یہ کہے کہ قریب ہے کہ میں خوشی کے مارے اڑنے لگوں یا میرا دل اڑنے لگا۔ اور قریب ہے کہ میری عقل اڑ جائے، اسی مفہوم کے مطابق۔

یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمۃ نے کہا: زاہد چلتا ہے اور عارف اڑتا ہے۔ یعنی عارف اپنے مطلوب کی طرف جانے میں زاہد سے تیز رفتار ہوتا ہے۔ اور ایسا کہنا جائز ہے۔

اسی ضمن میں قرآن کریم کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ [1]	اور ہر انسان کی قسمت ہم نے اس کے گلے سے لگا دی۔

سعید بن جبیر اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ہر انسان کے ساتھ سعادت و شقاوت کو پہلے سے لاحق کر دیا ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے ؎

رب یوم کانه یوم بانوا
من دموع الفراق یوم مطیر

---

[1] بنی اسرائیل: ۱۴

(۲) لو ترانی رأیت یوم تولوا
جسداً واقفاً و قلبا یطیر

ترجمہ: جس روز وہ بچھڑے تو اس کے بعد کئی دن اس کے فراق میں اسی کوچ کے دن کی طرح آنسو بہاتے گذرتے۔

(۲) اگر تو مجھے اس روز دیکھتا جب انھوں نے کوچ کیا تو میرا جسم تو موجود تھا مگر میرا دل ان کے ساتھ ساتھ اڑتا تھا۔

ابو یزید علیہ الرحمۃ کے قول "اس پرندے کے پر اور جسم احدیت اور ہمیشہ قائم رہنے سے بنے ہیں" سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے مقصود و مطلوب کی جانب پرواز کرنے میں اپنی طاقت و اختیار سے بری ہے اور وہ ان الفاظ سے اپنی حرکت اور فعل کو ذات احد جو دائم ہے سے منسوب کرنا چاہتا ہے مگر اس کا اظہار کچھ عجیب و غریب الفاظ میں یعنی استعارۃً کرتا ہے۔ اور اس طرح کی مثالیں واجدین اور تصور خدا میں مستغرق صوفیہ کے کلام میں جا بجا موجود ہیں کیونکہ جب کوئی صوفی خدا کے ذکر میں مستغرق ہوتا ہے اور اس کے قلب پر ذکر محبوب ہی کا غلبہ ہوتا ہے تو ایسے میں وہ اپنے احوال کو صفات محبوب کے ذریعے بیان کرتا ہے جیسا کہ مجنون بنی عامر جب جنگلی درندوں کو دیکھتا تو انھیں بھی لیلیٰ کہہ کر پکارتا اگر پہاڑ و پر نظر ڈالتا تو انھیں لیلیٰ ہی کہتا اور لوگوں کو دیکھتا تو انھیں بھی لیلیٰ کا نام دیتا یہاں تک کہ جب اس سے پوچھا جاتا کہ تمھارا نام کیا ہے؟ اور حال کیسا ہے تو بھی جواباً لیلیٰ ہی کہتا۔

قیس العامری کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

(۱) امرّ علی الدیار دیار لیلیٰ
اقبل ذا الجدار و ذا الجدارا

(۲) وما حب الدیار شغفن قلبی
ولکن حب من سکن الدیارا

ترجمہ (۱) جب دیار لیلیٰ سے گذرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس دیوار کو۔

(۲) یہ دیار کی محبت نہیں کہ جس نے میرا دل موہ لیا ہے بلکہ اس کی محبت نے میرا دل لوٹ لیا ہے جو ان دیار کا مکین ہے۔

کسی اور کے شعر میں ؎

(۱) افتش سری عن هواكم فلا ارى
سواى و انّى عنك و الكنه اكبر

(۲) فان وجدت انی ففی الوجد انها
فان عبرت عنی فعنها نعبّر

ترجمہ: (۱) میں اپنے باطن سے تیری محبت کے بارے میں بحث کرتا ہوں مگر سوائے اپنے اور کچھ سجھائی نہیں دیتا تو تیرے بارے میں کیونکر جان سکتا ہوں کہ تیری حقیقت تو بہت بڑی ہے۔

(۲) اگر اس نے مجھے پالیا ہے تو کیسے کیونکہ موجود تو صرف وہ خود ہے اور اگر اس نے میرے بارے میں کچھ بیان کیا ہے تو در اصل اس نے اپنے ہی بارے میں کچھ بیان کیا ہے۔

الغرض اس طرح کی کئی مثالیں ہیں جو کہنے والوں نے بہت خوبی سے محبوب غیر حقیقی کے بارے میں خود کو مٹا کر کہی ہیں۔

ابو یزید علیہ الرحمۃ کے قول "دس برس ۔ ۔ ۔ ۔ الخ" اور "ایک کروڑ بار ۔ ۔ ۔ ۔ الخ" سے مراد جنید بغدادی علیہ الرحمۃ کے مطابق اللہ کی طرف جانے والے راستوں کے مقامات ہیں۔

ابو یزید علیہ الرحمۃ کے اس قول "یہ سب کچھ دھوکہ ہے" سے مراد حقائق تفرید اور تجرید توحید کا عرفان پا لینے کے بعد کون و مملکت کی طرف متوجہ ہونا فقط دھوکہ ہے۔ اور اسی بنیاد پر حضرت جنید علیہ الرحمۃ نے کہا اگر ابو یزید بسطامی اس مقام بلند پر فائز ہوتے جس کی طرف انھوں نے اپنے قول میں اشارہ کیا ہے تو وہ کبھی ابتدا، درمیانی مقام، جسم، پر، فضا اور میدان کا ذکر نہ کرتے بلکہ ابتدائی اور درمیانی مقام سے ہی نکل جاتے اور یہ جو انھوں نے کہا کہ میں نے جان لیا کہ یہ سب کچھ دھوکہ ہے تو یہ اس لیے کہ اہل نہایت کے ہاں اللہ کے سوا ہر شے کی طرف توجہ کرنا دھوکہ ہے۔ اور اگر کوئی اس بات کا انکار کرتا ہے تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پیش نظر رکھنا چاہیے کہ عربوں نے سب سے بڑھ کر جو سچ بات کی ہے وہ لبید کا یہ مصرع ہے۔ الا کل شئ ماخلا اللہ باطل۔

۹۷

ابو یزید بسطامی کا ایک قول اور اس کی تشریح

ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ سے یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کہا: میں میدانِ نفی میں وارد ہوا جس میں دس برس تک محوِ سفر رہا یہاں تک کہ میں نفی سے نفی کے ساتھ نفی میں داخل ہوا۔ اس کے بعد میں فنار کی منزل تک پہنچا اور یہی میدان توحید ہے۔ میں برابر نفی کے ساتھ فنا کی فضاؤں میں اڑتا رہا تا آنکہ فنار ہونے میں فنا ہوا اور جب فنا ہوا تو خود فنا ہونے سے فنا ہو گیا (یعنی فنار کا احساس بھی نہ رہا) پھر نفی میں نفی کے ساتھ اس کے فنا ہونے سے فنا ہوا۔ تب جا کر میں خلق کے عارف سے غائب ہو جانے اور عارف کے خلق سے غائب ہو جانے کے ساتھ توحید کے مقام تک رسائی حاصل کر سکا۔

جنید علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ یہ کیفیت جو اوپر مذکور ہے اور اس طرح کی دیگر کیفیات شاہد کے ادراک پانے سے متعلق ہیں اور غیب کے شواہد کا علم پاتے میں داخل ہیں۔ اور اس میں فنائی کے وہ معانی ہیں جن کا تعلق فنار کے فنار سے غائب ہونے سے ہے۔

ابو یزید علیہ الرحمۃ کے قول "میں نفی کے میدان میں وارد ہوا یہاں تک میں نفی سے نفی کے ساتھ نفی میں داخل ہوا" سے مراد یہ ہے کہ ایسا کہنا ابو یزید علیہ الرحمۃ کا حقیقتِ فنار تک پہلی رسائی تھی اور حاضر غائب ہر شے سے اس کا فانی ہونا تھا۔ اور فنار کے پہلی بار واقع ہونے کے ساتھ اس کے فنار کے آثار مٹ گئے۔ اور نفی کے ساتھ نفی ہونے سے مُراد تمام اشیار کا اس سے منفی ہونا اور خود منفی ہونے کے احساس کا بھی منفی ہو جاتا ہے۔ یعنی کوئی شے ایسی نہیں جو

محسوس کی جاسکتی ہو یا وہ موجود ہو گویا رسوم مٹ گئے اسمار کٹ گئے، مقاماتِ حضور غائب ہو گئے اور مشاہدہ سے متعلق ہر شے ختم ہو گئی پھر کوئی شے ایسی نہ رہی جسے پایا جاتا کوئی شے محسوس نہ ہوتی کہ اسے گم کیا جاتا اور نہ ہی کسی چیز کا کوئی نام رہا کہ اسے یاد رکھا جاتا۔ الغرض ہر شے ان سے پوری میں غائب ہو گئی اور وہ خود فنار میں ضائع ہو گئے۔ اور اس ضائع ہونے سے مراد نفی میں نفی کے ساتھ نفی ہونا ہے جو کہ ہر شے کے مفقود ہونے کی حقیقت ہے اس کے بعد فقدِ نفس ہوتا ہے اور مفقود ہونے کا مفقود ہونے میں مفقود ہو جانا، مٹ جانے میں غوطہ زن ہونا اور فنار کا فنار سے فنا ہو جانا یہ سب ایسے امور ہیں کہ جن کی نہ تو کوئی انتہار ہے اور نہ کوئی وقت کہ جسے محفوظ رکھا جاسکتا ہو۔

جنید علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ ابو یزید علیہ الرحمۃ کا یہ کہنا کہ "میں دس برس تک میدانِ نفی میں پرواز کرتا رہا" سے مراد ان کا وقت ہے اور اس کا کوئی معنیٰ نہیں کیونکہ ایسے حال میں اوقات غائب ہوتے ہیں اور جب وقت گذرے اور جو اس سے غائب ہو اس سے بھی غائب رہے تو ایسے میں دس برس، سو برس یا اس سے زیادہ۔

حضرت جنید علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ پھر ابو یزید بسطامیؒ نے کہا: "پھر میں توحید سے خلق کے عارف سے غائب ہونے اور عارف کے خلق سے غائب ہونے کی حالت میں شناسا ہوا۔ جب میں توحید سے آگاہ ہوا تو مجھ پر جملہ خلق کی اللہ سے غیبوبت اور اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوقات سے اپنی کبریائی میں علیحدہ و منفرد ہونا ثابت ہو گیا"، اس عبارت کی تشریح کے بارے میں جنیدؒ کہتے ہیں کہ یہ عبارت اپنے مطلب کے لحاظ سے خاصی واضح ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں۔

یہ تھیں وہ تشریحات جو جنیدؒ نے شطحیاتِ ابو یزید سے متعلق بیان کیں۔ مگر یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ جنید علیہ الرحمۃ نے جو تشریحات بیان کیں وہ بھی مشکل ہیں مگر اس کے لیے مشکل نہیں جو ان کا اہل ہو۔ کیونکہ ایسی باتیں اس شخص کے لیے دشوار فہم ہوتی ہیں جس نے علم میں تبحر حاصل نہ کیا ہو اور اللہ کی عظمت و کبریائی سے متعلق روایات اور کتابیں نہ پڑھی ہوں کہ جن کے ذریعے وہ ان علوم پر دلیل لا سکے جو کہ کتابوں کی صورت میں مدون نہ ہوں اور جن سے فقط اولیار اللہ اور خواص و مقربین کے سینے ہی مالا مال ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کے صاحبِ فہم علماء ہی یہ جانتے ہیں کہ

طرح فنا ہو گئی اور یہی وہ کیفیت جسے اہلِ معرفت کی زبان میں فنا کہا جاتا ہے۔ پھر فنا ہی فنا

ہر وہ شخص جس نے اپنے اس حال میں جو اللہ کے چاہنے والوں کا خاصہ ہے، اضافہ پایا تو پھر مسلسل ہر سانس اور ہر لمحہ اللہ کے ساتھ اس کے مخصوص حال میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور ہر سانس میں وہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ اور یہ سلسلہ لامتناہی چلتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے۔ اور ہر وہ حال جس سے وہ دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتا ہے تو پہلے حال سے اس کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے اور ان کے قول نفی اور فنا سے فنا ہو جانے، دور ہو جانے، دور ہو جانے سے بھی دور ہو جانے اور "میں گم ہوا پھر گم ہونے سے بھی گم ہو گیا" جیسی عبارات کا مفہوم بھی یہی ہے۔

اگرچہ ان کی عبارات مختلف ہیں مگر ان کے معانی متفقہ اور حقائق مرتب ہیں۔ اسی ضمن میں عبداللہ ابن عباسؓ کی وہ روایت ہے جو اس قولِ خداوندی سے متعلق ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ [۱]	پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور وہ دھواں تھا تو اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں حاضر ہو خوشی سے چاہے ناخوشی سے دونوں نے عرض کی ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوتے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ "فرشتوں نے کہا اے رب! اگر زمین و آسمان وہ کچھ نہ بننا چاہیں جو آپ ان کو بنانا چاہتے ہیں تو اللہ نے فرمایا: تو میں ان پر ایک ایسا چوپایہ اپنے چوپایوں میں سے مسلط کر دیتا جو ایک ہی لقمے میں ان کو نگل جاتا۔ فرشتوں نے عرض کیا، اے ہمارے رب! وہ چوپایہ کہاں ہے۔ فرمایا: میری چراگاہوں میں سے ایک چراگاہ میں۔ فرشتوں نے کہا: وہ چراگاہ کہاں ہے۔ فرمایا: میرے پوشیدہ اور دور از فہم علم میں۔

یہاں اس روایت میں دیکھئے کہ چوپایہ اور لقمہ میں آسمانوں اور زمین کا گم ہونا پوشیدہ ہے جب چراگاہ میں گم ہو جانے سے بھی گم ہو جانا مضمر ہے۔ اور گم ہو جانے میں قلوب عارفین کیلئے تنبیہ ہے لہٰذا جس نے اس تنبیہ کو اپنے قلب کے ساتھ مشاہدہ نہ کیا وہ کس طرح اپنے نفس،

---

[۱] حٰمٓ السجدہ: ۱۰

کائنات اور اللہ کی تمام مخلوقات کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بعض کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے کہ اللہ تعالٰے نے جہنم سے فرمایا کہ اگر تو نے وہ کچھ نہ کیا جس کا میں تمھیں حکم دیتا ہوں تو میں تمھیں اپنی بہت بڑی آگ سے جلا ڈالوں گا۔ کسی عارف سے اللہ کے قول "تو میں تمھیں اپنی بہت بڑی آگ سے جلا ڈالوں گا"، کا مفہوم پوچھا گیا تو کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالٰے جہنم پر اپنی محبت میں سے ایک ذرہ مسلط کرے گا تو جہنم کی حیثیت اس ذرے کے سامنے ایسی ہوگی کہ جتنے نانبائی کے تنور کی حیثیت پوری دنیا کی آگ کے سامنے ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی کمتر۔

ابو یزید بسطامیؒ کے قول "نفی سے نفی کے ساتھ نفی میں . . . الخ" سے وہ اپنی اس نفی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں وہ اس طرح منفی ہیں کہ جب کہ تمام اشیاء اپنے معانی اور وجود کے اعتبار سے اس حال میں کہ وہ اللہ کے لیے ہیں، اشباح ہیں اور یہ اشیاء اگرچہ ایجاد سے متعلق ہیں مگر اپنے حقائق کے لحاظ سے عدم ولاشی کے ساتھ مربوط ہیں۔ اور اہل حق کے لیے ان کے مشاہدے کے مطابق تقسیم شدہ مراتب ہیں۔

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ [1]	اور اللہ تنگی اور کشائش کرتا ہے اور تمھیں اسی کی طرف پھر جانا۔

---

[1] البقرة ۲: ۲۴۶

۹۸

صاحبِ کتابُ اللمع اور ابنِ سالم میں ابویزید بسطامیؒ کی شطحیات پر ایک مباحثہ

فرعون اور بایزید بسطامیؒ

میں نے ابن سالم علیہ الرحمۃ کو اپنی مجلس میں ایک روز یہ کہتے سنا کہ فرعون نے وہ کچھ نہیں کہا تھا، جو بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ نے کہا، کیونکہ فرعون نے یہ کہا تھا: اَنَا رَبُّکُمُ الاَعلیٰ جب کہ رب ایسا اسم ہے، جس سے مخلوق کو بھی موسوم کیا جاتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: فَلَانٌ رَبُّ دارٍ (فلاں گھر کا مالک ہے) وربُّ مَال (مال کا مالک) وربُّ بَیت۔ مگر بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ نے کہا: سُبحَانِی۔ حالانکہ سبحان اور سبّوح اللہ کے اسماء میں سے ہیں جن سے غیر اللہ کو موسوم کرنا جائز نہیں۔

میں نے ابن سالم علیہ الرحمۃ سے کہا کہ تیرا یہ کہنا: تیرے نزدیک یہ صحیح ہے کہ یہ قول ابویزیدؒ کا ہے۔ اور یہ بھی کہ ان کا ارادہ بھی "سبحانی" کہنے سے وہی تھا، جو "انا ربکم الاعلیٰ" کہنے سے فرعون کا تھا۔ اس پر ابنِ سالمؒ نے کہا۔ ان کی مراد اس سے کچھ ہو۔ بہر حال اس کے کہنے سے ان پر کفر لازم آتا ہے۔

میں نے کہا جب آپ کو ان کے خلاف یہ گواہی دینے کے لیے کہ سبحانی سے ان کی مراد کیا تھی معلومات ہی حاصل نہیں۔ تو آپ کا انھیں کافر قرار دینا باطل ٹھہرا کیونکہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ انھوں نے کچھ کلمات کہے ہوں۔ اور ان کے بعد "سبحانی" کہا ہو۔ یعنی یوں کہا ہو کہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : سُبحانی ، سُبحانی ۔
اگر ہم کسی کو یہ کہتے ہوئے سنیں :

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ[1] میرے سوا کوئی معبود نہیں تو مجھی کو پوجو۔

تو ہمیں یہ بات ہرگز نہیں کھٹکے گی۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی آیت تلاوت کر رہا ہے یا یہ کہ وہ اللہ کی وہی تعریف بیان کر رہا ہے جو اللہ نے خود اپنے لیے بیان فرمائی ہے۔ اس طرح اگر ہم ابو یزید بسطامی کو پیہم سبحانی سبحانی کہتے ہوئے سنیں تو ہمیں شک نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ اللہ کی تسبیح بیان کر رہے ہوتے تھے اور اس کا وصف خود اس کلام سے کر رہے ہوتے تھے جس میں اللہ نے اپنا وصف خود بیان کیا۔

جب معاملہ یہ ہے تو ہم نے جس قدر دلائل دیئے ان کے مطابق آپ کا ایک ایسے معروف زاہد و عارف کی تکفیر کرنا قطعاً محال ہے۔

میں نے خود ایک مرتبہ بسطام جا کر ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ کے اہل خاندان سے اس بات کی بابت پوچھا تو انھوں نے اس کا انکار کر گیا اور کہا ہم اس طرح کی کوئی بات نہیں جانتے۔

بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ کے مذکورہ قول "سبحانی" سے متعلق اگر کتابوں میں ذکر نہ ہوتا اور لوگوں کی زبانی یہ واقعہ مشہور نہ ہوتا تو میں ہرگز اس کی طرف دھیان نہ دیتا۔

میں نے ابن سالم علیہ الرحمۃ کو ایک اور موقع پر اپنی مجلس میں یہ کہتے سنا کہ بایزید علیہ الرحمۃ یہ بھی کہتے ہیں کہ "میں نے عرش کے سامنے یا اس کے نزدیک اپنا خیمہ گاڑ دیا" یہ کلمہ کفر ہے جو صرف کافر ہی کہتا ہے۔

ابن سالم علیہ الرحمۃ یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ بایزید علیہ الرحمۃ جب یہودیوں کے قبرستان سے گذرے تو کہا : یہ معذور ہیں اور جب مسلمانوں کے قبرستان سے گذرے تو کہا : یہ دھوکے میں ہیں۔

ابن سالم علیہ الرحمۃ جلیل القدر بزرگ ہونے کے باوجود بایزید علیہ الرحمۃ پر طعن کرنے میں زیادتی کر جاتے ہیں اور وہ ان کو صرف اس لیے کافر قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے مذکورہ بالا کلمات کہے۔

---

[1] : الانبیاء : ۲۵

میں نے ان سے کہا کہ اللہ آپ سے درگذر فرمائے ہمارے ہاں کے علماء آج بھی ان کے مزار سے برکت حاصل کرتے ہیں۔ اور وہ مشائخ متقدمین کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ وہ ان کے نزدیک جلیل القدر عبّاد، زہّاد اور اہلِ معرفت میں سے تھے۔ وہ یہ بھی ذکر کرتے تھے کہ ان کو اپنے ہم عصروں پر ورع، اجتہاد اور ذکر اللہ پر دوام رکھنے میں فوقیت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ ایک جماعت نے ان کے بارے میں یہ بیان کیا کہ ہم نے انھیں اس قدر ذکر الٰہی کرتے ہوئے دیکھا کہ تعظیم وخشیتِ خدا سے انھیں پیشاب کی جگہ خون آنے لگا۔ ان باتوں کے پیشِ نظر یہ کیسے جائز ہے کہ ہم ان کے بارے میں بیان کی جانے والی باتوں پر ان کی تکفیر کریں جب کہ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں کہ ایسا کہنے میں ان کی مراد کیا تھی یا کس سیاق میں انھوں نے ایسا کہا تھا اور نہ ہی ہمیں یہ علم ہے کہ یہ کلمات کہتے وقت ان پر کیا حال طاری تھا۔

کیا یہ ہمارے لیے درست ہے کہ ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ کے وجد حال اور وقت پہ فائز ہوئے بغیر ان کے بارے میں کوئی رائے دیں الّا یہ کہ ہم ان کے مقام پر فائز ہوں تو بات جچتی بھی ہے کیا اللہ تعالٰی نے مؤمنین سے یہ نہیں فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ[1]	اے ایمان والو! بہت گمانوں سے بچو بے شک کوئی گمان گناہ ہو جاتا ہے۔

الغرض یہ وہ گفتگو تھی، جو ابن سالم اور میرے درمیان بایزید بسطامیؒ سے متعلق روایات اور حکایات کے متعلق ہوئی۔

اگر ابویزیدؒ سے منسوب اس بیان کو صحیح مان لیا جائے کہ "میں نے عرش کے سامنے یا اس کے نزدیک اپنا خیمہ گاڑ دیا" تو یہ کوئی نہ معلوم یا عجیب کلام نہیں کیونکہ تمام خلق کائنات اور جملہ مخلوقات عرش کے نیچے اور اس کے سامنے ہے۔ ان کی مراد یہ تھی کہ میں نے اپنے خیمے کا رُخ رب العرش کی طرف کر دیا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ کائنات میں ایک قدم کی جگہ بھی ایسی نہیں، جو عرش کے سامنے

---

[1]: الحجرات: ۱۲

نہ ہو۔ لہٰذا معترض کے لیے ان کے اس کلام میں اعتراض کی گنجائش ہی نہیں۔

ابو یزید علیہ الرحمۃ سے متعلق یہ قول کہ قبرستانِ یہود سے گزرے تو کہا، "یہ معذور ہیں" سے مراد یہ ہے کہ جیسے وہ معذور ہیں کیونکہ جب بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ نے یہ دیکھا کہ ازل سے ان کے لیے شقاوت و بدبختی مقدر ہے تو کیونکہ وہ ایسا کوئی عمل کر سکتے تھے جو شقی لوگوں کا نہ ہوتا۔ تو گویا وہ معذور ہی تھے۔ اور اس لحاظ سے وہ معذور نہیں تھے کہ اللہ تعالےٰ نے ان کے اپنے ہی بیان کے مطابق اپنی کتابِ مقدس میں ان کی حالت یوں بیان فرمائی :

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ [1] — اور یہودی بولے عزیر (علیہ السلام) اللہ کا بیٹا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ أَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَأَحِبَّآؤُهٗ [2] — اور یہودی اور نصرانی بولے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے جو بھی فیصلہ فرمایا وہ اس میں عادل اور جو بھی اس نے تخلیق کیا اس میں حکیم ہے۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ [3] — اس سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرے اور ان سب سے سوال ہوگا۔

ابو یزید علیہ الرحمۃ کا قول کہ وہ جب مسلمانوں کے قبرستان سے گذرے تو کہا کہ "یہ دھوکے میں ہیں"، کے بارے میں یہ مان لیا جائے کہ واقعی انھوں نے ایسا کہا تھا تو بھی اس کی وجہ عامۃ المسلمین کا وہ مشہور خیال ہے جس کی بناء پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جو اعمال کیے ہیں ان کی وجہ سے وہ نجات پائیں گے اور کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس طرح کے خیال سے مبرّا ہوتے ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس کی وجہ سے انھوں نے مومنین کو مغرورین (دھوکے میں آئے ہوئے) سے موسوم کیا کیونکہ اگر خلق کے جملہ اعمال کو اللہ تعالےٰ کی نعمتوں، دولتِ ایمان، اور معرفتِ وحدانیت کے مقابل لایا جائے تو ان کی حیثیت کمزور دکھائی دے مخلوقات میں سے ہر ایک

---

[1] : التوبہ : ۳۰۔ [2] : المائدۃ : ۲۱۔ [3] : الانبیاء : ۲۳۔

کی ایک ایک سانس اور حرکت کی ابتداء و انتہا اسی سے اور اسی پر ہوتی ہے۔ جس نے فضل الٰہی اور اس کی وسعتِ رحمت کے بغیر یہ سمجھا کہ نجات پا جائے گا تو بلاشبہ وہ دھوکہ و ہلاکت میں پڑ گیا، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ سید الانبیاء اور امام الاتقیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ہم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جسے اس کے اعمال نجات دلا سکیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیا آپ بھی؟ فرمایا: میں بھی اس سے مستثنٰی نہیں ہاں اس صورت میں کہ میرا رب مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔

صوفیہ کرام پر علم الحقائق تک رسائی حاصل کئے بغیر معترض ہونا گمراہی ہے۔

الغرض وہ لوگ جن کے جوارح مضبوط اور علم و ادب سے مالا مال ہوں ان کے کسی قول یا واقعے پر بایں وجہ اعتراض کرنا کہ ان کے ادراک سے اس کا مفہوم باہر ہو، وہ بلاشبہ عالم کی لغزش، حکیم کی لایعنی بات اور عاقل کی کھلی ہوئی غلطی ہے اور بسا اوقات اسی طرح کسی حکیم کی حکمت کو غلط معانی پہنا دیئے جاتے ہیں کیونکہ ان کی حکمت کو کوئی ایسا شخص بیان کرتا ہے جو خود اس کے مفہوم سے بے خبر اور اس کا ادراک مراد متکلم سے دور رہتا ہے تو ایسے میں اصل مفہوم کا الٹ لوگوں کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے اور ایسے شخص کو متکلم میں غلطی دکھائی دیتی ہے جو خود اس حکمت کے مقصد سے نابلد اور معانی سے بے خبر ہوتا ہے۔ کیونکہ علوم کے سربستہ راز کو کسی سربستہ راز ہی کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ حکمت میں غلط معانی پہنانے کا عمل دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک حروف میں تحریف یہ آسان ترین طریق ہے، اور دوسرا طریق معانی میں تحریف کا ہے جیسے کوئی حکیم اپنے حال اور اوقات کے مطابق کچھ کہے مگر سننے والے کو اس جیسا حال اور وقت حاصل نہ ہو تو ایسے میں وہ اپنے مقام و احوال کے مطابق اس کی غلط تعبیر کرتے ہیں اور اس طرح غلطی کر کے ہلاکت میں پڑ جاتے ہیں۔

اکتسابِ فیض کا طریق

میں نے ابو عمرو بن علوان علیہ الرحمۃ کو یہ کہتے سنا کہ میں نے جنید علیہ الرحمۃ سے سنا اور انھوں نے فرمایا: میں نوعمر تھا کہ صوفیہ کرام کی صحبت میں بیٹھتا اور ان کی ایسی باتیں سنتا رہتا

جنھیں سمجھنا میرے بس سے باہر تھا۔ مگر اس کے باوجود انکار سے میرا دل ہمیشہ محفوظ رہا یہی وجہ ہے کہ میں نے ان سے فیض پایا۔

ذکر اور مذکور

میں نے سطور بالا میں جو کچھ بیان کیا اسے اس بات سے زیادہ تقویت ملتی ہے کہ ایک مرتبہ جب کہ میں ابن سالم علیہ الرحمۃ سے کلام بایزید پر بحث کے بعد ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو انھوں نے سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ سے متعلق یوں بیان کیا کہ سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ نے کہا: اللہ کا ذکر زبان سے کرنا ہذیان اور قلب میں ذکر الٰہی کو جاری رکھنا وسوسہ ہے۔ جب ابن سالم علیہ الرحمۃ سے اس قول کی تشریح کرنے کو کہا گیا تو انھوں نے کہا: سہل بن عبداللہؒ کی مراد یہ تھی کہ بندہ مذکور کے ساتھ قائم رہے نہ کہ ذکر کے ساتھ۔

ابن سالمؒ کے مرید خاص اور صاحب کتاب اللمع

ایک اور مجلس میں ابن سالمؒ نے سہل بن عبداللہؒ سے متعلق بیان کیا کہ انھوں نے کہا: میرا مولیٰ نہیں سوتا اور میں بھی نہیں سوتا۔ تب میں نے ابن سالمؒ کے ایک مرید خاص سے کہا کہ اگر ابن سالمؒ، سہل بن عبداللہؒ کی جانب بہت زیادہ مائل نہ ہوتے تو وہ ان کی بھی اسی طرح تغلیط و تکفیر کرتے جیسے انھوں نے بایزید بسطامیؒ کو اپنی تکفیر کا نشانہ بنایا تھا، کیونکہ سہل بن عبداللہؒ جو ابن سالمؒ کے امام اور ان کے نزدیک تمام لوگوں سے افضل ہیں، اگر ان کے وہ اقوال و کلمات جو ابن سالمؒ بیان کرتے ہیں کوئی ہدف تنقید بنانا چاہے تو بخوبی بنا سکتا ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ سہل بن عبداللہؒ کے اقوال کی کوئی ایسی تشریح ہو سکتی ہے جس پر ناقد تنقید نہ کر سکے تو پھر ایسی کوئی تشریح ابو یزید بسطامیؒ کے اقوال کے بارے میں کیوں نہیں روا رکھی جاتی تاکہ ان کے اقوال کو بھی سہل بن عبداللہ کے اقوال کی طرح ہدف تکفیر نہ بنایا جا سکے۔ میری یہ بات سن کر ابن سالمؒ کے مرید خاص پر مکمل سکوت طاری ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کی جانب سے عصمت و تائید، انوار نبوت، اللہ

سے ہمکلامی اور رسالت کے حامل نہ ہوتے تو وہ حضرت خضر علیہ السلام کے قتلِ نفس کرنے، جو کہ گناہِ کبیرہ میں سے بھی سب سے بڑا گناہ ہے، پر اعتراض نہ کرتے اور نہ ہی وہ یوں کہتے جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے:

"اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا" [1]	کیا تم نے ستھری جان بے کسی جان کے بدلے قتل کر دی بے شک تم نے بہت بُری بات کی۔

اور حضرت خضرؑ نے یوں جواب دیا:

اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا [2]	میں نے آپ سے نہ کہا تھا کہ آپ ہرگز میرے ساتھ نہ ٹھہر سکیں گے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواباً کہا:

اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِيْ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا [3]	اس کے بعد میں تم سے کچھ پوچھوں تو پھر میرے ساتھ نہ رہنا۔ بے شک میری طرف سے تمہارا عذر پورا ہو چکا۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ خود دیکھ لیا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے قتلِ نفس کیا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا اور اس کے لیے قصاص کا حکم دیا تو ان پر یہ لازم تھا کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام سے قصاص کا مطالبہ کرتے، ان سے علیحدہ ہو جاتے اور ان کی صحبت و مجلس میں بیٹھنے کو جائز نہ سمجھتے مگر اللہ کی طرف سے خصوصی توفیق و ہدایات کے حامل ہونے کی وجہ سے معاملے کی صورت بدل جاتی ہے۔

روزِ قیامت تک ہر ولی اور صدیق کا یہی شعار رہے گا مگر ان میں سے کوئی بھی درجۂ نبوت

---

[1]: الکہف : ۷۴

[2]: الکہف : ۷۵

[3]: الکہف : ۷۶

کو کبھی نہیں پہنچ سکتا۔

ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کبھی کسی دیوار کا سہارا نہیں لیا سوائے مسجد اور سرائے کی دیوار کے۔ اور یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے انھیں بجز روزِ عید کبھی روزے کے بغیر نہیں دیکھا یہاں تک کہ اسی حالت میں وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے، ان کے (زہد و عبادت) کے بارے میں اس طرح کی روایات بکثرت ملتی ہیں۔

۹۹

ملفوظاتِ ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ اور ان کی تشریح

تصرفِ اولیاء

مجھ سے ابوعبداللہ ابن جابان علیہ الرحمۃ نے کہا کہ میں ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں قحط سالی کے دوران حاضر ہوا انھیں سلام کیا اور جب رخصت ہونے کو اٹھا تو انھوں نے مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے فرمایا: جاؤ! میں تمہارے ساتھ ہوں جہاں کہیں بھی جاؤ تم میری حفاظت میں ہو۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالٰی تمھارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمھاری حفاظت کرے گا۔ ان کے مذکورہ قول میں نکتہ یہ ہے کہ قلب پر تجریدِ توحید اور حقیقتِ تفرید کے غلبہ سے وہ خود کو فانی اور لاشئی دیکھتے تھے اور جب صاحبِ وجد کی کیفیت یہ ہو تو وہ لفظ اَنَا (میں) سے اپنے وجد اور اس حال کو مراد لیتا ہے جو اس کے باطن پر چھا گیا ہوتا ہے اور ایسے میں اَنَا سے وہ اپنے مولٰی کے قرب کے مشاہدہ سے متعلق غالب آجانے والی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

میں نے حصری علیہ الرحمۃ سے سنا کہ شبلیؒ کہا کرتے تھے: میں نے اپنی ذلت کو یہود و نصارٰی کی ذلت کے مقابل رکھا تو میری ذلت ان کی ذلت سے بھی بڑھ کر نکلی۔

بشریت و لابشریت

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ مذکورہ دونوں اقوال میں باہمی تعارض ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ

دونوں روایات اپنی جگہ صحیح ہیں اور ان میں کوئی تعارض نہیں حقیقت یہ ہے کہ دونوں مختلف اوقات و احوال میں ان سے سرزد ہوئے پہلا قول جب انھوں نے ادا کیا تو خالصتاً صفار مشاہدہ کی بنا پر اور انھوں نے جو کہا محض خالص توحید کی حقیقت کو پا کر اور خود کو مٹا کر کہا مگر جونہی وہ دوسری حالت میں آئے یعنی خالص بشری حالت کی طرف لوٹے تو اپنی عاجزی و انکساری کی وجہ سے انھوں نے جو پایا وہی بیان کیا جیسا کہ یحییٰ بن معاذ رازی کہتے ہیں کہ بندہ جب اپنے رب کا ذکر کرتا ہے تو فخر کرتا ہے اور جب اپنے نفس کو یاد کرتا ہے تو فقیر و حقیر ہو جاتا ہے اور یہ نکتہ علومِ شرعی میں موجود ہے۔

مقامِ مصطفیٰ و انکسارِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سوائے اللہ کے مجھ میں کوئی اور شے نہیں سماتی، اور میں اولادِ آدم کا سردار ہوں مگر مجھے کوئی فخر نہیں۔

آپؐ سے ہی روایت ہے کہ مجھے یونس بن متی علیہ السلام پر فضیلت مت دو، میں تو اس عورت رضی اللہ عنہا کا بیٹا ہوں جو دھوپ میں سکھایا ہوا گوشت کھاتی تھی۔

ان دونوں روایتوں میں اوقات و احوال کے اعتبار سے کس قدر فرق ہے۔

سطورِ گذشتہ میں ہمارے موقف کی طرف شبلیؒ کے بارے میں یہ حکایت بھی اشارہ کرتی ہے کہ انھوں نے ایک شخص کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا لے کر کھا لیا۔ اور کہنے لگے کہ میرے نفس نے مجھ سے روٹی کا ٹکڑا طلب کیا، اور اگر میری روح عرش و کرسی کی طرف التفات کرتی تو جل جاتی۔ اس قول میں روح کے عرش و کرسی کی طرف ملتفت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر میری روح عرش و کرسی میں، وحدانیت یا قدیم ہونے کا تھوڑا سا اثر بھی قبول کر لیتی تو جل جاتی کیونکہ عرش و کرسی دونوں حادث و مخلوق ہیں کہ نہیں تھے اور پیدا ہو گئے۔

ابوبکر شبلیؒ سے ایک موقع پر ابو یزید بسطامیؒ کے اقوال کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: اگر بایزیدؒ آج موجود ہوتے تو ہمارے کسی بچے کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے اور کہا کہ اگر کوئی میری بات کو سمجھتا تو میں گلے میں زنار باندھ لیتا۔

میرے خیال میں شبلی علیہ الرحمۃ نے بھی بایزیدؒ کے بارے میں اسی جانب اشارہ کیا ہے جو

جنیدؒ نے بایزیدؒ سے متعلق کہا کہ ابو یزید بسطامیؒ باوجود اپنے بلند رتبے اور حال کے ابتدائی احوال سے آگے نہیں نکلے اور میں نے ان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں سنا جو ان کے کمال پر دلالت کرتا ہو۔

یہاں یہ بات اہم ہے کہ اس علمِ تصوف سے مخصوص لوگوں کو یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ اس کے احوال باقی تمام سے اعلیٰ و ارفع ہیں اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ اللہ ان پر غیرت کھاتا ہے دوسروں کے مقابلے میں تاکہ وہ کہیں ایک دوسرے میں ہی نہ کھو جائیں۔ آپ دیکھتے نہیں کہ ابو یزیدؒ نے ایسی باتیں کیں کہ جن کو سمجھنے سے ان کے ہم عصر لوگ قاصر رہے۔ مگر بعد میں جنیدؒ نے کہا کہ وہ ہدایت سے نہیں نکلے اور ہم نے ان سے ایک لفظ بھی ان کے کمال پر شاہد نہیں سنا۔ پھر شبلیؒ نے کہا کہ آج بایزیدؒ اگر یہاں ہوتے تو وہ ہمارے بچوں یعنی مریدوں کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے جبکہ کسی شیخ نے کہا کہ میں بیس برس تک شبلی کی خدمت میں رہا میں نے اس دوران کبھی ان سے توحید پر ایک لفظ تک نہیں سنا ان کی تمام تر گفتگو کا موضوع احوال و مقامات ہی رہتے تھے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا یہ صوفیہ عظام کے بلند معنیٰ اشارات و نکات میں سے بہت کم ہے کیونکہ حقیقتِ توحید کی نہ انتہا ہے اور نہ کوئی کنارا جب کہ ہر صاحبِ معرفت حقایق کے لیے سمندر میں غرق ہے کہ اس کی حد بیان کی جا سکتی ہے نہ اس کی انتہا معلوم کی جا سکتی ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

ابوبکر شبلیؒ کی ایک شطح کی تشریح

کسی صوفی نے کہا کہ میں ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں یہ کہتے ہوئے سُنا: اگر گذشتہ ایک یا دو ماہ سے میرے دل میں جبریل و میکائیل علیہما السلام کا خیال تک بھی آیا ہو تو اللہ تعالٰے زمین کو حکم دے دے کہ مجھے نگل لے۔

میں نے حصریؒ سے سنا کہ ان سے شبلی علیہ الرحمۃ کہا کرتے تھے اگر تیرے دل میں جبریل و میکائیل علیہما السلام کا خیال تک بھی گذرے تو تُو نے شرک کیا۔

صوفیہ کی ایک جماعت کو میں نے دیکھا کہ وہ جبریل و میکائیل علیہما السلام جیسے مقرب ملائکہ کے بارے میں اس طرح کی بات کو ناپسند کرتے تھے۔ اور ایک حدیث ہے کہ سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جبریل کو بوسیدہ کپڑے کی طرح دیکھا جس سے مجھے اس کی علمی فضیلت کا علم ہوا اور میں اپنے بارے میں اس سے ڈر گیا۔

اہلِ معرفت کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبریل علیہ السلام کو اپنے اوپر فضیلت دیتے تھے تو کسی کو ان کے بارے میں مذکورہ بالا انداز میں ذکر کرنا کیسے جائز ہے۔

ہم اس سلسلے میں یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ واجدین اور ذکر الٰہی میں محو ہو جانے والے شیوخ کرام کا کلام اکثر مجمل ہوتا ہے اسی وجہ سے اعتراض کرنے والوں کو طعن اور اعتراض کا موقع مل جاتا ہے کیونکہ مجمل کلام کا کچھ سیاق و سباق ہوتا ہے جو سننے والے تک نہیں پہنچ پاتا جب کہ کلام مفصل واضح اور صاف ہوتا ہے اور مجمل میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہاں شبلی علیہ الرحمۃ کا جو کلام بیان کیا گیا وہ مجمل ہے جس کا باقاعدہ ایک سیاق و سباق ہے جسے سامع جان لے تو

اسے ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ پر اعتراض کرنے کی ضرورت پیش ہی نہ آتی۔ اور اگر اس کلامِ مجمل کو سیاق و سباق کے بغیر دیکھا جائے تو پھر معترض کو اعتراض کا حق ہے کیونکہ ایسے میں وہ کلام غیر مفصل اور غیر واضح حالت میں ہوتا ہے۔

اولیاء اللہ پر بغیر سوچے سمجھے طعن و تشنیع گناہِ عظیم ہے

میں نے ابوبکر شبلیؒ کی جو روایت جبریل و میکائیل علیہما السلام کے بارے میں بیان کی اس کی مکمل تشریح سیاق و سباق کے ساتھ ابو محمد نساجؒ نے اس طرح سے کی ہے کہ سب اعتراضات صاف کر دیئے اور اس کے مفہوم کو پوری طرح واضح کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ابوبکر شبلیؒ سے جبرئیل علیہ السلام کی صورت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: میں نے ایک روایت سے یہ جانا ہے کہ جبریل علیہ السلام کو سات سو زبانوں پر عبور ہے اور سات سو ان کے پَر ہیں جن میں سے ایک کو پھیلا دے تو مشرق کو ڈھانپ لے اور دوسرا پَر پھیلا دے تو مغرب کو ڈھانپ لے الغرض تم ایسے فرشتے کے بارے میں کیا پوچھتے ہو کہ پوری دنیا اس کے پَروں میں غائب ہو جاتی ہے۔ پھر شبلیؒ نے اس شخص سے کہا کہ ہاں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جبریل کی حیثیت کرسی کے ایک پایہ کے سامنے ایسی ہے جیسے زرہ میں اس کا ایک حلقہ۔ پھر کرسی، جبریل، عرش اور تمام ملکوت جو اہلِ معرفت پر ظاہر ہوتے ہیں ایک بے آب و گیاہ میدان میں ریت کے ایک ٹیلے کی مانند ہیں پھر شبلی نے کہا: اے سائل! یہ وہ علوم ہیں جن کو اس نے ظاہر کیا کیا اجسام ان کے متحمل ہو سکتے ہیں یا طبائع ان کو برداشت کر سکتے ہیں یا عقل ان کا احاطہ کر سکتی ہے یا آنکھیں دیکھ سکتی ہیں یا کان ان کو سن سکتے ہیں۔ یہ وہ علوم ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی طرف اہلِ بصیرت کی رہنمائی فرماتا ہے۔

حق تعالٰی اپنی ایک ایسی مملکت پر غلبہ و حکمرانی رکھتا ہے، جو کہ غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کی وسعتوں میں سوائے اس کے کوئی اور نہیں سما سکتا۔ اگر وہ اپنے اس ملکِ غیب میں سے ایک ذرہ بھی غائب کر دے تو نہ روئے زمین پر بستیاں باقی رہیں نہ درخت پھلیں نہ دریا چلیں نہ رات تاریک ہو سکے اور نہ دن روشن ہو۔ مگر وہی علیم و حکیم ہے۔ اور وہ ان علوم کی طاقت نہیں رکھتے۔ اسی دوران ابوبکر شبلیؒ نے سائل سے فرمایا: اے سوال کرنے والے! تو نے مجھ سے جبریل علیہ السلام

اوران کے احوال کے متعلق پوچھا ہے تو اللہ تعالیٰ زمین کو حکم دے کہ وہ مجھے نگل لے اگر میں پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے ابجریل ومیکائیل کے ذکر کا خیال تک بھی دل میں لایا ہوں جب کلام یا گفتگو اس طرح کے سیاق وسباق کی محتاج ہو جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں تاکہ معنی واضح ہو سکے جب کہ اعتراض والزام لگانے والے کلام کے صرف آخری حصہ پہ ہی نظر رکھتے ہوئے اسے جوں کا توں ان لوگوں کی طرف منتقل کر دیتے جو انھیں سمجھ ہی نہیں پاتے تاکہ لوگ اپنی زبان اس کلام کے بارے میں کھولیں اور اولیاء اللہ پر اعتراض والزام تراشی سے کام لیں بلاشبہ ایسا عمل کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا ہے ۔

۱۰۱

ابوبکر شبلیؒ کے بعض اقوال پر اعتراضات

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کی جن باتوں پر اعتراض کیا جاتا تھا ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہ بعض اوقات قیمتی لباس پہنتے پھر اسے اتار کر نذر آتش کر دیتے۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے عنبر کا ٹکڑا لے کر اسے آگ پر رکھا پھر نفرت کا اظہار کرتے ہوئے گدھے کی دم کے نیچے تھوک دیا۔

وہ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر دنیا کسی بچے کے منہ میں ایک لقمہ ہوتی تو ہم اس بچے پر رحم کرتے۔

ایک اور صوفی کہتے ہیں کہ میں ان کے پاس گیا تو ان کے سامنے شکر اور بادام پڑے دیکھے جنھیں وہ جلا رہے تھے۔

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ دنیا اور آخرت دو لقمے ہوتی تو میں دونوں کو منہ میں ڈال لیتا اور اس طرح لوگوں کو دنیا و آخرت کے وسیلے سے محروم کر دیتا۔

ایک مرتبہ انھوں نے کچھ گھر کا سامان اور مالِ کثیر صرف کر کے خریدا اور کھڑے کھڑے سب کا سب لوگوں میں تقسیم کر دیا جب کہ آپ کے اپنے اہل و عیال بھی تھے مگر آپ نے ان کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اور اس طرح کے تمام واقعات شریعت مطہرہ کے سراسر منافی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر انھوں نے

کس کو اپنا امام سمجھتے ہوئے اس کی پیروی میں سارا مال و منال لوگوں میں تقسیم کر دیا اور اپنے اہل و عیال کے لیے کچھ نہ چھوڑا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس عمل میں ان کے امام سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہ تھے۔ جنھوں نے اپنی ساری ملکیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں پیش کر دیا۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اپنے عیال کے لیے کیا باقی چھوڑا؟ تو کہنے لگے: اللہ اور اس کا رسول۔ تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند نہیں فرمایا۔

ضیاعِ مال کی حقیقت

جہاں تک مال کے ضیاع کا تعلق ہے تو وہ معصیتِ خدا میں مال خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص معصیتِ خدا میں ایک دانق (درہم کا چوتھا حصہ) بھی خرچ کرے تو وہ ضیاعِ مال ہے جبکہ اللہ کی راہ میں خرچ کیے جانے والے ایک لاکھ درہم بھی ضیاعِ مال نہیں۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کا بعض اشیاء جلا دینے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اشیاء آپ کے قلب کو اللہ سے دور لے جاتی تھیں۔ اسی ضمن میں سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے قصے کو قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمٰنَ نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ [1]

اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو سلیمانؑ عطا فرمایا کیا اچھا بندہ بے شک وہ بہت رجوع لانے والا جب کہ اس پر پیش کیے گئے تیسرے پہر کو کہ روکیے تو تین پاؤں پر کھڑے ہوں چوتھے سم کا کنارہ زمین پر لگائے ہوئے اور چلائیے تو ہوا ہو جائیں تو سلیمانؑ نے کہا مجھے ان گھوڑوں کی محبت پسند آئی ہے اپنے رب کی یاد کے لیے پھر انھیں چلانے

---

[1] ص: ۳۱ - ۳۳

کا حکم دیا یہاں تک کہ نگاہ کے پردے
میں چھپ گئے پھر حکم دیا کہ انھیں میرے
پاس واپس لاؤ تو ان کی پنڈلیوں اور گردنوں
پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تین سو عربی النسل گھوڑے موجود تھے جن کی مثال نہ ان سے پہلے کسی حکمران کے پاس تھی اور نہ بعد کے کسی حکمران کے پاس ایسے گھوڑے موجود تھے۔ جب یہ گھوڑے ان کے سامنے لائے گئے تو ان کا دل ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور ان سے نماز عصر کا وقت جاتا رہا۔ ایسے موقع پر آپ نے کہا : ردوھا علی فطفق . . . الخ اور تمام گھوڑوں کی گردنیں کاٹ دیں۔ اللہ تعالےٰ نے انھیں اس کی جزا یوں دی کہ سورج کو ان کے لیے واپس کیا تاکہ پھر سے عصر کا وقت ہو جائے اور وہ نماز عصر ادا کر لیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اسی ضمن میں ایک حدیث روایت کی جاتی ہے کہ غزوۂ خندق کے روز آپ کی نمازِ عصر فوت ہو گئی تو آپ کو اس کا شدید رنج ہوا تو آپ نے فرمایا: انھوں نے نماز عصر سے ہماری توجہ کو ہٹا دیا خدا ان کے دلوں اور گھروں کو آگ سے بھرے حالانکہ ان (کفار) نے اس سے پہلے آپ کو شدید اذیتیں پہنچائی تھیں یعنی ضرب و شتم کیا اور آپ پر خون اور گندگی پھینکی مگر آپ نے سوائے اس قدر دعا کرنے کہ اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما کہ وہ جاہل ہیں، لیکن جب ان کے باعث ان کی نماز عصر کا وقت جاتا رہا تو آپ نے شدتِ ملال کی وجہ سے بد دعا فرمائی۔ یہ حدیث اپنے مضمون کے اعتبار سے حضرت سلیمانؑ کی روایت سے زیادہ مکمل ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو سورج نہ پلٹایا گیا جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ایسا کیا گیا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین حنیف کے ساتھ بھیجا گیا اور ان کے لیے قضائے صلوٰۃ کو معاف کر دیا گیا کیونکہ فرضِ جہاد نے انھیں فرض نماز کی ادائیگی سے باز رکھا۔ اور خندق کھودنا فرض جہاد سے ہے تو اسی خاطر ان کا فریضہ صلوٰۃ ان کے لیے معاف کر دیا گیا۔ جب کہ سلیمانؑ کو نماز کی ادائیگی سے نہ کسی فرض نے غافل رکھا اور کسی نفل عبادت نے اسی وجہ سے ان

کے لیے فریضہ صلوٰۃ معاف نہیں کیا گیا ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت معافی فرض کی صورت میں سورج کے پلٹائے جانے سے زیادہ کامل ہے۔ اگر سلیمان علیہ السلام کے لیے فرض نماز کو معاف کر دیا جاتا تو ان کے لیے سورج کو واپس نہ کیا جاتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ حقیقت ہر اس شے سے کسی طرح بھی چھٹکارا پانے کی پوری کوشش کرتے ہیں جو انہیں اللہ سے غافل کرے۔ اور ایسی چیزوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتے ہیں، وہ سوائے اللہ کے کسی اور شے کو اپنے اندر جگہ نہیں دیتے۔

جس نے یہ کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ دنیا ایک لقمہ ہوتی اور میں اسے یہودی کے منہ میں دے دیتا تو یہ کہنے والے کے نزدیک دنیا کی ذلت سے عبارت ہے۔

ذلتِ دنیا کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: دنیا ملعون ہے اور اس میں جو کچھ اسباب دنیوی ہے وہ بھی ملعون ہے۔

ایک اور روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اگر اللہ کے نزدیک اس دنیا کی قدر وقیمت مچھر کے ایک پَر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پینے دیتا۔

۱۰۲

کلام ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کی تشریح اور جنید بغدادیؒ سے ان کی گفتگو

بیان کیا جاتا ہے کہ ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ نے ایک روز اپنے مریدین سے فرمایا: اے جماعت!
میں لامحدودیت کی طرف جاتا ہوں مگر صرف محدودیت کو پاتا ہوں پھر میں دائیں اور بائیں
لامحدودیت کی تلاش میں جاتا ہوں مگر وہی محدودیت ہی سامنے ہوتی ہے، پھر میں واپس آتا ہوں
اور میں یہ سب کچھ اپنی چھوٹی انگلی کے ایک بال میں دیکھتا ہوں۔
شبلی علیہ الرحمۃ کا یہ قول ان کے مریدین نہ سمجھ سکے دراصل اس قول میں کون کی طرف اشارہ ہے
کیونکہ عرش و کرسی دونوں حادث اور محدود ہیں اور دنیا میں اس کے آگے کوئی حد نہیں اور نہ اس کے
تحت کوئی تحت ہے اس کی کوئی نہایت نہیں اور مخلوق میں سے کسی کو یہ قدرت نہیں کہ اس کو
دیکھ سکے یا اس کی صفت بیان کر سکے مگر صرف وہی صفت جو خود اللہ نے بیان فرمائی ہو اور اس کے
علم کا مخلوق احاطہ نہیں کر سکتی اس کے علم سے صرف اس کا خالق ہی باخبر ہے۔
شبلی علیہ الرحمۃ کا یہ کہنا کہ میں لوٹتا ہوں اور اس تمام کچھ کو اپنی چھوٹی انگلی کے ایک بال میں
دیکھتا ہوں، سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس تمام خلق کی تخلیق میں جو قدرتِ قادر کارفرما ہے وہی قدرت
میری چھوٹی انگلی کے ایک بال کی تخلیق میں بھی موجود ہے۔ اس قول کی ایک اور تشریح یہ ہے کہ کون اور
جملہ مخلوقات چاہے ان کا طول و عرض یا حجم کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ ان کے خالق کی کبریائی اور
صانع کی عظمت کے سامنے بالکل ویسے ہی ہے جیسے میری چھوٹی انگلی کا ایک بال یا اس سے

ابو بکر شبلی علیہ الرحمۃ نے ایک اور موقع پر کہا : اگر میں یہ کہوں تو بھی اللہ اور اگر وہ کہوں تو بھی اللہ اور بلاشبہ میں اس سے ایک ذرہ کا طالب ہوں۔

قول کے پہلے حصے سے اس آیت کی جانب اشارہ مقصود ہے۔

وَهُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا[1]   کہ وہ ان کے ساتھ ہے جہاں کہیں ہوں۔

یعنی اللہ تعالےٰ حاضر و ناظر ہے غائب نہیں وہ ہر مکان میں موجود ہے مگر نہ مکان اس میں سماتا ہے اور نہ مکان اس سے خالی رہتا ہے۔

قول کے دوسرے حصے میں اس طرف اشارہ ہے کہ خلق اللہ سے اس کے اسماء وصفات کے ساتھ محجوب ہے اور خلق کو جو کچھ بھی حاصل ہوتا ہے اس کے اسم و رسم کے سوا کچھ نہیں کیونکہ وہ اس سے آگے برداشت بھی نہیں کر سکتے۔

اسی سلسلے میں شبلی علیہ الرحمۃ کا ایک شعر ہے

فقلت الیس قد فضوا کتابی

فقال نعم فقلت فذاك حسبی

ترجمہ : تو میں نے کہا کیا انھوں نے میرے خط کی مہر کو توڑا ہے اس نے کہا : ہاں تب میں نے کہا یہی میرا حصہ ہے۔

ان کا ایک اور شعر ہے

الیس من السعادة ان داری

مجاورة لدارك فی البلاد

ترجمہ : کیا یہ سعادت نہیں کہ میرا گھر شہروں میں تیرے گھر کے پڑوس میں ہے۔

اور آپ نے یہ شعر پڑھے ہے

اظلت علینا منك یوما غمامة   اضائت لنا برقا و ابطی رشاشها

فلا غیمها یجلو فییأس طامع   ولا غیثها یأتی فیروی عطاشها

---

[1] : المجادلۃ : ۸

ترجمہ: تیری جانب سے ہم پر ایک روز بادل چھائے جن نے ہمارے لیے بجلیاں تو روشن کیں مگر بارش کو مؤخر کیا۔

اب نہ تو بادل چھٹتے ہیں کہ بارش کی طمع رکھنے والا مایوس ہو جائے اور نہ بارش برستی ہے کہ پیاسا سیراب ہو۔

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: میں تیس برس تک حدیث و فقہ کا مطالعہ کرتا رہا یہاں تک کہ صبح روشن ہوگئی۔ اس کے بعد میں اپنے ہر استاد کی خدمت میں گیا اور کہا کہ میں اللہ کو جاننے کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں مگر کسی نے بھی اس سلسلے میں مجھے کچھ نہ بتایا۔

صبح کے روشن ہونے سے ان کی مراد یہ تھی کہ پھر انوار حقیقت اور حقیقت فقہ و علم و معرفت کی طرف دعوت دینے کی منزل مجھ پر ظاہر ہوگئی۔

ان کے اس قول کہ اللہ کے جاننے کا علم لے آؤ کی تشریح یہ ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان ہر لحظہ اور ہر گھڑی میں واقع ہونے والے احوال کے جاننے کا علم لے آؤ۔

شبلیؒ نے جنیدؒ سے کہا: اے ابو القاسم! اس شخص کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جس کے لیے قولاً اور حقیقتاً اللہ کافی ہے۔ جنیدؒ نے جواب دیا: اے ابوبکر! آپ کے اور اکابر صوفیہ کے درمیان آپ کے اس سوال میں دس ہزار مقامات ہیں۔ جن میں سے پہلا مقام اس کو ختم کردینا ہے جسے آپ نے شروع کیا ہے۔

یہاں نکتہ یہ ہے کہ جنیدؒ شبلیؒ کے حال سے اپنے علم اور فضیلت تمکین کے باعث آگاہ تھے اسی لیے انھوں نے شبلیؒ پر اس مقام کو ظاہر کیا کیونکہ ان کو شبلیؒ سے دعویٰ کر بیٹھنے کا خطرہ تھا کیونکہ جس شخص کو قولاً و حقیقتاً اللہ کافی ہو اسے سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا جنیدؒ سے ان کا یہ سوال کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ البتہ اس مقام سے قریب تھے۔

میں نے ابن علوان علیہ الرحمۃ کو یہ کہتے سنا کہ جنیدؒ نے کہا: شبلی کو ان کے مقام پر ہی ٹھہرا دیا گیا جس سے وہ دور نہ ہوئے اور اگر وہ اس سے آگے نکل جاتے تو وہ امام بن جاتے۔

ابو عمرو علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ اکثر شبلیؒ جنیدؒ کے پاس جاتے تو ان سے کوئی سوال پوچھتے مگر جنیدؒ انھیں جواب نہ دیتے اور کہتے کہ اے ابوبکر! مجھے تمھارا اور تمھارے ثبات کا خدشہ رہتا ہے

کیونکہ اضطراب اتار چڑھاؤ، تیزی و گرمی اور شطح کی کیفیات متمکنین کے احوال میں سے نہیں بلکہ ان کا تعلق مبتدی اور صاحب ارادات لوگوں سے ہے۔

ابو بکر شبلی علیہ الرحمۃ بیان کرتے ہیں کہ جنیدؒ نے ان سے ایک روز کہا: اے ابو بکر! تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا: میں اللہ کہتا ہوں۔ جنیدؒ نے کہا: جاؤ! خدا تمہیں سلامت رکھے۔ یہ کہنے سے جنیدؒ کی مراد یہ تھی کہ تم عظیم خطرے میں ہو۔ کیونکہ اگر اللہ تعالے نے تمہیں اللہ کہنے میں ماسوا اللہ سے نہ بچایا تو تمہارا کیا حال ہوگا۔

ابو بکر شبلی علیہ الرحمۃ کہا کرتے تھے: ایک ہزار گذرے ہوئے برس اور ایک ہزار آنیوالے برس مل کر ایک وقت بنتا ہے اور تمہیں وسوسے گمراہ نہ کردیں وہ یہ بھی کہا کرتے کہ تمہارے اوقات منقطع ہیں جب کہ میرے وقت کا نہ آغاز نہ انجام۔

وہ بعض اوقات یہ شطح بھی بیان کرتے تھے: میں وقت ہوں، میرا وقت غالب ہے اور وقت میں سوائے میرے کوئی اور نہیں اور میں فانی ہوں۔

آپ یہ دو شعر بھی پڑھا کرتے تھے ؎

۱۔ مکین فی معامله مکین
امین الحق آمنه امین

۲۔ تعازز عزه فاعتز عزاً
نقد فات اليقين من اليقين

ترجمہ: (۱) وہ اپنے ساتھ معاملہ کرنے والے میں رہتا ہے۔ اور جو حق کا امین ہو تو اس لیے کہ خود امین یعنی اللہ نے اسے امن دیا۔

(۲) اس کی عزت اگر معزز ہوئی تو یہ گویا اس نے خود عزت کو قوی بنایا اور اس طرح یقین پر سے یقین جاتا رہا۔

بعض اوقات آپ یہ بھی کہا کرتے تھے: میں نے ہر عزت و وقار پر نظر کی مگر مجھے اپنی عزت سے بڑھ کر نظر آئی۔ اور میں نے ہر عزت والے کی عزت میں اپنی عزت دیکھی۔ اسکے بعد آپ

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا[1] — جسے عزت کی چاہ ہو تو عزت سب اللہ کے ہاتھ ہے۔

اور کہا کرتے تھے ؎

مَن اعتز بذی العز
فذو العز لہ عز

ترجمہ: جس نے صاحبِ عزت سے عزت پائی تو اس کے لیے وہ صاحبِ عزت ہی ساری عزت ہے۔

شبلی علیہ الرحمۃ کے قول میں 'وقت' سے دو سانسوں کے درمیانی سانس اور دل میں گزرنے والے دو خیالوں کے خیال کی جانب اشارہ ہے۔ اور اگر وہ اللہ کے ساتھ اور اسی کے لیے ہو تو وہ اس کا وقت ہے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وہ نفس ہے اور اگر یہ وقت ایک مرتبہ فوت ہو جائے تو پھر ہزار سال میں بھی اس پر تاسف کرتے ہوئے یہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یعنی چاہے ایک ہزار سال ماضی کے اور ہزار سال مستقبل کے ہوں تب بھی اس کا حصول ممکن نہیں۔ اور تجھ میں تمھاری دونوں سانسوں کے درمیان ایک سانس ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ تجھے چھوڑ نہ دے۔ اور صاحبِ عزت و غلبہ وہ ہے جسے اللہ اپنے ساتھ معزز بناتے تو پھر کوئی اور اس جیسا معزز نہ ہوگا اسی طرح ذلیل وہ ہے جسے اللہ خود سے غافل کر کے کسی اور کی جانب متوجہ کر دے تو کوئی اس جیسا ذلیل نہیں۔

شبلی علیہ الرحمۃ کا یہ قول کہ تمھیں اشباح (اجسام) دھوکہ نہ دیں، سے مراد یہ ہے کہ ماسوا اللہ ہر شئے اشباح میں شامل ہے اگر تو ان کی طرف متوجہ ہوا تو دھوکے میں آیا۔ اور ان کا یہ کہنا کہ میں فانی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قول میں 'انا' لفظاً آیا ہے جس سے واقعتاً ان کا اپنی طرف اشارہ نہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ میرے وقت کا نہ آغاز ہے نہ انجام، تو یہ اس لیے انھوں نے کہا کہ ہر شئے میں رخصت و معافی موجود ہے مگر وقت میں نہیں کیونکہ وقت میں ماسوا اللہ کی طرف

---

[1] فاطر: ۱۱

متوجہ ہونے میں کوئی رخصت و معافی نہیں چاہے ایک ہزار سال میں ایک لمحے کے لیے بھی کوئی غیر اللہ کی طرف متوجہ کیوں نہ ہو۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر تو مجھ میں اپنے سوا کسی اور کے لیے ادنیٰ سی توجہ بھی پائے تو مجھے اپنی آگ میں بھسم کر دے، اور کوئی معبود نہیں فقط تیری ہی ذات لائق عبادت ہے۔ یہ اور اس طرح کے تمام اقوال درحقیقت ابوبکر شبلیؒ کے غلبات وجد ہیں جن کو وہ اپنے وقت کے حسب حال بیان کرتے ہیں مگر ایسی کیفیات دائمی نہیں ہوتیں کیونکہ ان کا تعلق احوال سے ہے اور حال اس واردات قلبی کا نام ہے جو بندے پر وقتی طور پر وارد ہوتی ہے ہمیشہ کے لیے باقی نہیں رہتی اور اس کا دائمی یا مستقل نہ ہونا اولیاء کرام پر خصوصی مہربانی ہے۔ اگر ایسی کیفیت دائمی ہوتی تو اولیاء کرام اور خاصان خدا مذہبی شرعی اور سماجی و اخلاقی قوانین پر عمل کو ترک کر چکے ہوتے۔ اسی سلسلے میں آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر غور کرنا چاہیئے جب ان کی خدمت اقدس میں صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب ہم آپ کے حضور میں موجود رہتے ہیں تو آپ کے فرمودات سننے کی سعادت حاصل کرتے ہیں تو اس وقت ہمارے دل نرم پڑ جاتے ہیں۔ مگر جب آپ کی بارگاہ رحمت پناہ سے نکلتے ہیں تو پھر اہل و عیال کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں یہ سن کر سید دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اگر تم اسی حالت پر رہو جو میرے پاس بیٹھے ہوئے تمھاری ہوتی ہے تو ملائکہ تم سے مصافحہ کریں۔"

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: اگر میرے دل میں یہ خیال بھی گذرا ہوتا کہ جہنم اپنی آگ سے میرے جسم کے ایک بال کو جلا ڈالے گی تو میں مشرک ہوتا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ شبلیؒ نے درست کہا کیونکہ جہنم کو جلانے کی حیثیت حاصل نہیں بلکہ وہ خود اللہ تعالےٰ کے حکم کے تابع ہے اور اس میں شک نہیں کہ اہل دوزخ کو ان کے لیے مقررہ مقدار کے مطابق ہی جلانے کا عذاب دیا جاتا ہے۔

انھوں نے ایک مرتبہ یہ بھی کہا کہ میں جہنم کو کیا کروں جہنم تو وہ ہے جس میں تم رہتے ہو۔ یعنی اللہ سے جدا اور دور رہنا ہی دراصل بندے کے لیے سب سے بڑا عذاب اور جہنم ہے۔

الغرض جسے اللہ تعالےٰ نے اپنی جدائی کے عذاب میں ڈال دیا تو وہ عذاب سقر سے

کہیں بڑھ کر ہے۔

کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک قاری کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا:

قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ[1] رب فرمائے گا: دھتکارے پڑے رہو اس میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔

تو آپ نے کہا: کاش! میں ان میں سے ایک ہوتا۔ گویا یہاں شبلی نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جنھیں اللہ کی طرف سے جواب ملتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے فرمایا: کاش! میں ان میں سے ہوتا اور مجھے اللہ کی طرف سے جواب دیا جاتا اور اس شخص کی طرح ہوتا جو شدتِ خوف سے عذاب میں ہو کیونکہ ایسا شخص نہیں جانتا کہ اللہ کی طرف سے اسے سعادت، شقاوت، دوری یا قرب میں سے کیا عطا ہوگا۔

کہتے ہیں کہ ایک مجلس میں شبلیؒ نے یہ بھی کہا: اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ اگر وہ جہنم پر اپنا لعابِ دہن بھی پھینک دیں تو اسے بجھا ڈالیں۔ ان کا یہ قول سننے والوں پر دشوار گذرا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: جہنم، قیامت کے دن مومن سے کہے گی: اے مومن! گذر جا کہ تیرے نور نے میرے شعلے کو سرد کر دیا۔

ابوبکر شبلیؒ کے اس ضمن میں اور بھی کئی واقعات و روایات ہیں مگر طوالت سے بچنے کی خاطر ان کا ذکر قلم انداز کیا جاتا ہے۔ بہر حال عقلمند کم سے بھی زیادہ کی طرف رہنمائی پا لیتا ہے بے شک اللہ ہی توفیق دہندہ ہے۔

---

[1] المومنون: ۱۱۰

۱۰۳

ابوبکر الواسطیؒ کے ملفوظات

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اللہ کی مہربانی کے ساتھ نہ کہ آپ کی مہربانی سے۔

حدیث کی تشریح یہ ہے کہ ام المومنین کا شرف، فضل اور فخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے، مگر انھوں نے واقعۂ افک کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا لحاظ نہ کیا بلکہ اللہ کا لحاظ کیا کیونکہ اس نے ان کی برأت کے لیے قرآن کی آیات نازل فرمائیں اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان کی بلندی، محبت، مقام اور فضیلت اور بڑھ گئی۔

اس سلسلے میں جس قدر بھی روایات و معلومات آپ کو ہوں انھیں مذکورہ تشریح کی کسوٹی پر پرکھ لیا کریں۔

فضیلتِ دُرُود

ابوبکر الواسطی علیہ الرحمۃ کے قول "پیغمبران کرام علیہم السلام پر اپنی دعاؤں میں درود بھیجو مگر درود بھیجنے کے عمل کو اپنے دل میں کوئی قدر نہ دو" اس سے مُراد وہ نہیں جو اعتراض کرنے والے نے بیان کیا ہے کہ واسطی نے کہا اپنے دل میں انبیاء علیہم السلام پر درود بھیجنے میں کثرت کا اپنے دل میں خیال مت لاؤ اور یہ نہ سمجھو کہ تم نے بہت زیادہ درود بھیجا کیونکہ

انبیاء علیہم السلام یہ حق رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بڑھ کر ان پہ درود بھیجا جائے ۔

کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : جس نے مجھ پر ایک بار درود بھیجا اللہ تعالیٰ نے اس پہ دس مرتبہ درود بھیجا۔ لہٰذا درود بھیجنے والے کو اپنے دل میں یہ خیال نہیں لانا چاہیے کہ اس نے درود بھیجا کیونکہ کوئی کتنا ہی زیادہ درود بھیجے اس کے جواب میں اس پر اللہ کا درُود پھر بھی زیادہ رہے گا جیسا کہ حدیث شریف سے واضح ہے ۔

جس نے واسطیؒ کے قول کہ "تو اس کے لیے اپنے دل میں قدر نہ پیدا کر" کی تشریح یوں کی ہے کہ اپنے دل میں انبیاء علیہم السلام کی قدر پیدا نہ کر تو اس سے مُراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے سامنے انبیاء علیہم السلام کی قدر پیدا نہ کہ کیونکہ قلوبِ مومنین میں اللہ کے عرش اور کرسی کی قدر بھی پیدا کرنا جائز نہیں ۔ یہ تشریح توحید و حقیقت تفرید کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ، جہاں تک علمی و دینی اعتبار سے اللہ نے تعظیم رسل ، ان پر ایمان رکھنے اور ان کی خصوصیات بیان کرنے کا مومنین کو حکم دیا ہے تو اس کا ذکر ہم صفحاتِ گذشتہ میں اس موضوع پر مستقل ابواب میں کر آئے ہیں ۔

سیدالرسل صلی اللہ علیہ وسلم لاثانی و بے نظیر ہیں

سیدالرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فضیلت سے متعلق اہلِ صفا کا سب سے جامع قول یہ ہے کہ بے شک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لاثانی و بے نظیر ہیں کسی کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کی تمام تر خصوصیات کا ادراک کر سکے ۔

بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ سے کسی نے پوچھا : کیا کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر بھی ہے ؟ آپ نے جواباً فرمایا : کیا کوئی ان کا ادراک بھی کر سکتا ہے بایزیدؒ نے مزید کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے مجد و شرف سے متعلق جملہ مخلوقات نے جو کچھ بھی پایا اور سمجھا وہ نہ پانے اور نہ سمجھنے کے مترادف ہے ۔ اور اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک صاف پانی سے لبریز مشک میں جو پانی مترشح ہوا اسی قدر لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبے کو جانا اور اس کے علاوہ کچھ بھی انھیں معلوم نہیں ۔

اہلِ تصوف سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے وعدہ فرمایا کہ وہ انھیں سب کچھ عطا فرمائے گا جو وہ طلب فرمائیں گے ۔ حدیثِ قدسی یوں ہے : اے محمدؐ ! (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) مانگیے آپ کو عطا کیا جائے گا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور مولائے کل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مانگیں اور وہ عطا نہ کرے ۔

دعائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اے اللہ ! میرے اوپر ، میرے نیچے ، میرے دائیں ، میرے بائیں ، میرے پیچھے ، میرے ورا ، اور میرے سامنے نور عطا کر ۔

اے اللہ ! میرے قلب میں ، میری آنکھوں میں ، میرے کانوں میں ، میرے جسم میں ، میرے استخوان میں نور پیدا فرما ۔

مقام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

صوفیہ کرام کہتے ہیں کہ ان کی دعا قبول ہوئی اور انھوں نے جو مانگا وہ عطا ہوا جس پر خود ان کی حدیث دلالت کر رہی ہے ۔ آپ نے فرمایا : خدا کی قسم ! میں تمھیں اپنی پیٹھ پیچھے بھی اس اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح تمھیں سامنے سے دیکھتا ہوں ۔

ہر فضیلت اور شرف جو امت کے کسی بھی فرد کو عطا ہوا ہو وہ درحقیقت فضیلت و شرف محمدی ہی ہے ۔ لہٰذا کسی کو وہ کچھ نہ کہنا چاہیئے جسے وہ جانتا نہ ہو ۔

اولیاء اللہ پر تنقید اللہ سے روگردانی کی علامت ہے

ایک اجل صوفی کا قول ہے : جب قلب اللہ تعالےٰ سے جدا ہونے اور منہ موڑنے کا خوگر ہو جائے تو اس کے نتیجے میں وہ اولیاء اللہ پر اعتراض و تنقید کے فتنے میں پڑ جاتا ہے ۔

۱۰۴

مدعیانِ تصوّف کی غلطیاں اور ان کی وجوہات

میں نے احمد بن علیؒ سے اور انھوں نے ابو علی رودباریؒ سے یہ سنا کہ ہم تصوف کے معاملہ میں اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ جیسے تلوار کی دھار پر ہوں اور ادھر کو جھکیں تو بھی جہنم اور ادھر کو جھکیں تو جہنم۔ یعنی ہم جس نکتے پر پہنچے ہوتے ہیں اگر اس میں ذرہ بھر بھی غلطی سرزد ہو تو اہلِ جہنم میں سے ہو جائیں کیونکہ تصوف اور اس کے علم میں غلطی کرنے کے علاوہ باقی ہر شئے میں غلطی کرنا زیادہ آسان ہے۔ اس لیے کہ تصوف مقامات، احوال، ارادات، مراتب اور اشارات پر مبنی ہے جس نے ان میں حقیقت سے ہٹ کر غلطی کی تو اس نے اللہ کی مخالفت پہ کمر باندھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نے اللہ کی دشمنی مول لی۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ اپنی خطا کی معافی مانگ لے یا اس پر ڈٹا رہے۔

جس شخص نے بتکلف اہلِ تصوف کے طریقوں کو اپنانے کا ارادہ کیا یا یہ اشارہ کیا کہ وہ تصوف سے متعلق کافی معلومات رکھتا ہے یا اس نے یہ خیال کیا کہ وہ صوفیہ کے بعض طریقوں پہ عمل پیرا ہے اور صوفیہ کے تین اصولوں پہ کاربند نہ رہا تو وہ دھوکے میں ہے چاہے وہ ہوا پر چلے، دانائی کی باتیں کرے یا خواص و عوام میں اسے قبولِ عام بھی کیوں نہ حاصل ہو۔

صوفیہ کے تین اصول

وہ تین اصول یہ ہیں:

۱ - ہر صغیرہ و کبیرہ گناہ سے اجتناب ۔

۲ - ہر مشکل اور آسان فرض کی ادائیگی ۔

۳ - دنیا کو اہلِ دنیا کے لیے چھوڑ دینا چاہیئے تھوڑی ہو یا زیادہ ۔ مگر اس قدر اختیار کرنا کہ جتنی مومن کے لیے ضروری ہو ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : چار چیزیں ایسی ہیں جو دنیا میں ہیں مگر دنیا میں سے نہیں :

۱ - روٹی کا وہ ٹکڑا جس سے تو اپنی بھوک کو مٹاتے ۔

۲ - کپڑا جس سے تو اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے ۔

۳ - گھر جس میں تو رہے ۔

۴ - نیک سیرت بیوی جس سے تو سکون حاصل کرے ۔

مذکورہ چیزوں کے علاوہ وہ سب کچھ جن کا تعلق جمع ، منع ، دنیوی چیزیں روکے رکھنے زیادہ کی چاہ اور فخر و گھمنڈ سے ہے وہ ایک حجاب ہے جو بندے کو خدا سے منقطع کر دیتا ہے ۔ ہر وہ شخص جس نے خاصانِ خدا کے احوال کا دعوٰی کیا یا اس کو یہ خیال ہوا کہ وہ اہلِ صفاء کے مقامات سے گذرا مگر سطورِ گذشتہ میں بیان کردہ تین اصولوں پر اپنی بنیاد استوار نہ کی تو وہ اپنے تمام دعاوی میں سچا ہونے کی نسبت جھوٹا ہونے کی طرف زیادہ قریب ہو گا ، اقرار کرنے والا عالم اور دعوٰی کرنے والا جاہل ہوتا ہے ۔

۱۰۵

تصوّف میں غلطی کرنے والوں کے طبقات اور ان کی غلطیوں کی نوعیت

پھر میں نے ان طبقوں کی طرف نظر کی جنھوں نے تصوف میں غلطیاں کیں۔ ان لوگوں کے تین طبقے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس نے اصولِ شریعت پر عمل کرنے میں کمی، صدق و اخلاص میں کمزوری اور قلتِ علم کی وجہ سے غلطیاں کیں۔ جیسا کہ کسی شیخ نے کہا: انھیں وصل سے اس لیے محروم کیا گیا کہ انھوں نے اصول کو ضائع کیا۔ دوسرا طبقہ وہ جس نے آداب، اخلاق، مقامات، احوال، افعال اور اقوال جیسی فروع میں غلطی کی جس کا سبب اصول کے بارے میں قلتِ معلومات، حظِ نفسانی اور طبعی مزاج کی اتباع ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کہ انھوں نے کسی ایسے شخص کی قربت نہیں حاصل کی جو انھیں ریاضت کراتا تلخیوں کے گھونٹ پلاتا اور انھیں اس راستے پر ڈال دیتا جو ان کے مطلوب کو جاتا ہے۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو تاریک گھر میں چراغ کے بغیر داخل ہوتا ہے اور سنوارنے کے بجائے زیادہ بگاڑ دیتا ہے، جب انھوں نے یہ سمجھا کہ اب جوہرِ نایاب ان کے ہاتھ لگ گیا تو حقیقت یہ تھی کہ سوائے ایک کم قیمت کنکری کے انھیں کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اہلِ بصیرت کی اتباع نہیں کی جو اشباہ، اشکال، اضداد اور اجناس کے درمیان تمیز کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان سے خطا سرزد ہوگئی اور لایعنی و مہمل باتوں میں کثرت کرنے لگے حتیٰ کہ وہ حیران و پریشان ہوکر شکست خوردہ، مفتون، زیادتی کرنے والے، غم خوردہ وہم و گمان کے دھوکے میں گرفتار، جنونی، خودسر، غموں سے چور، غلط دعویٰ کرنے والے اور فقط آرزو رکھنے والے ہو گئے۔ پاک ہے وہ ذات والاصفات جس نے انھیں یہ کچھ دیا اور وہی ان کی بیماری اور علاج کو جانتا ہے۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جنھوں نے غلطی کی تو اس میں کوئی بڑی علت یا کجی نہ تھی بلکہ صرف لغزش تھی جو جاتی رہی تو وہ مکارم اخلاق، اور بلند معاملات پر فائز ہو گئے، اپنی پراگندگی کو سمیٹا، عناد کو ترک کیا، حق کا اعلان کیا، اپنی عجز و انکساری کا اقرار کیا، اور اس طرح وہ اچھے احوال، روشن افعال، اور بلند درجات کی طرف لوٹ آئے اور ان کی لغزش نے ان کے مراتب کو کم نہ کیا اور ان پر کسی شدید غلطی نے وقت کو تاریک نہ کیا اور ان کی پاکیزگی و صفا مکدر نہ ہوئی۔

مختصراً یہ کہ یہ تینوں طبقات، ارادات، مقاصد اور نیتوں کے تفاوت کے لحاظ سے مختلف احوال رکھتے ہیں۔

کسی نے کہا ہے ؎

من تحلی بغیر ما هو فیه

فضحته لسان ما یدعیه

ترجمہ: جس نے خود کو ان اوصاف سے آراستہ کیا جو اس میں موجود نہ تھے تو اس کے غلط دعوے کی قلعی کو اس کی زبان نے کھول دیا۔

شاعر نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو پیشِ نظر رکھ کر یہ شعر کہا تھا آپ کا ارشاد ہے: ایمان، ظاہری طور پر خود کو اچھا ظاہر کرنے اور آرزو کرنے کا نام نہیں بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں سما جائے اور اعمال اس کی تصدیق کریں۔

جس نے اصول میں غلطی کا ارتکاب کیا وہ نہ تو گمراہی سے بچ سکتا ہے اور نہ ہی اس کی بیماری کا علاج ہو سکتا ہے مگر اس صورت میں کہ اللہ چاہے تو ممکن ہے اور جس نے فروع میں غلطی کی تو یہ کوئی بڑی آفت نہیں اگرچہ صحت سے بعید ہے۔

۱۰۶

فروعات میں غلطی کرنے والے

فقر و غنا میں غلطی کرنے والے طائفے

صوفیہ کے ایک گروہ نے یہ کہا کہ غنار کو فقر پر فضیلت حاصل ہے۔ اس سے ان کا اشارہ غنار باللہ کی طرف تھا۔ نہ دنیوی مال و اسباب جیسی حقیر چیزوں کی طرف مگر بعد میں ایک طائفہ نے اس میں ٹھوکر کھائی اور لگے آیات و روایات سے یہ ثابت کرنے کہ دنیوی مال و اسباب کا غنار ہی ایک بہترین حال اور طالبینِ آخرت کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ اس طائفے نے اپنی سعی کوشش کی اور غلطی کا مرتکب ہوا کیونکہ جن صوفیہ کرام نے فقر و غنار پر گفتگو کی اور غنار کو اللہ کی جانب جانے والوں کے احوال میں سے قرار دیا تو اس سے ان کی مراد اللہ کے ساتھ غنا اختیار کرنا تھا نہ کہ دنیا کے سازو سامان کا غنار جس کی قدر و قیمت اللہ کی نظر میں پَرِ پشہ کے برابر بھی نہیں۔

صوفیہ کی ایک جماعت نے فقر، افتقار، صبر، شکر، رضا، تفویض، سکون اور کچھ نہ رکھنے پر اطمینان کے حقائق پر گفتگو کی جب کہ ایک اور گروہ گمراہی میں پڑ گیا اور یہ خیال کرنے لگا کہ وہ فقیر محتاج کہ جس کے پاس صبر و رضا نہیں اسے اس کے فقر پر کوئی ثواب اور فضیلت حاصل نہیں ہوگی جب کہ وہ فقیر جو حالتِ اضطراری میں صبر و رضا سے خالی ہے وہ غنی بالدنیا سے افضل ہے۔

نفس کو بنیادی طور پر محتاج پیدا کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ قوت لایموت اور مہمانداری کی استطاعت سے محروم ہونے کی صورت میں اطمینان و سکون کا مظاہرہ کرنا صفاتِ بشری سے نہیں۔ نفس فقر کو پسند نہیں کرتا اور نہ ہی طبعیت و خواہش اس سے موافقت کرتی ہے کیونکہ اس کا

تعلق معشوق سے ہے جب کہ غنا، کو نفس پسند کرتا اور طبیعت و خواہش اس سے موافقت کرتی ہے کیونکہ اس کا تعلق محظوظ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غنی کو ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں دینے کا وعدہ فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا[1] — جو ایک نیکی لائے تو اس کے لیے اس جیسی دس ہیں۔

مگر فقیر کے تو ہر سانس کے بدلے نیکی شمار ہوتی ہے کیونکہ وہ فقر کی تلخی پر صبر کرتا ہے اور صبر کے ثواب کی کوئی معدود و محدود حد نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ[2] — صابروں ہی کو ان کا ثواب بھرپور دیا جائے گا بے گنتی۔

فقر اپنی ذات میں بہتر ہے اور اگر اس میں کوئی علت بھی شامل ہو جائے تو وہ علت ہی اس میں بُری ہو گی جیسا کہ قولِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے: فقر مومن کے لیے گھوڑے کی گال پر بہترین لگام سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ اس حدیث میں فقر کو کسی اور شے سے مشروط نہیں کیا گیا، جب کہ غنا، دنیا (دنیوی امارت) اپنی ذات میں مذموم ہے اگر اس میں اعمالِ صالحہ میں سے کوئی اچھی خصلت شامل ہو جائے تو وہ خصلت ہی اچھی ہے نہ کہ خود غنا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: غنا، کا تعلق کثرتِ مال و متاع سے ہے۔ گویا انھوں نے غنا کو غنا ہی سے مشروط کیا۔

ایک اور طبقے نے یہ کہا کہ فقر و غنا، دو ایسے احوال ہیں کہ بندے کو ان کی پیروی کے بجائے ان سے گذر جانا چاہیئے اور وہ ان میں ٹھہرا نہ رہے، یہ بات اہلِ معارف و حقائق کی ہے لیکن احکام حقیقت، آخری مقامات پر پہنچ کر حاصل ہوتے ہیں۔

ایک اور طائفے نے یہ گمان کیا کہ جس نے مذکورہ نظریہ پیش کیا اس نے فقر و غنا، کو ایک کر دیا اور کہا کہ باعتبارِ حال دونوں یکساں ہیں تو انھیں یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم نے آپ کے

---

[1] الانعام: ۱۶۰ [2] الزمر: ۹

فقر ناپسند کرنے والا سمجھا حالانکہ ہم نے آپ کو غنا پسند کرنے والا پایا۔ اگر فقر و غنا دونوں ایک جیسے احوال ہیں تو تمھارا یہ موقف دونوں کو یکساں قرار دینے کا اس وقت کہاں ہوتا ہے جب تم ان دونوں احوال کو بیک وقت سینے سے بھی نہیں لگاتے اور بیک وقت دونوں سے نفرت بھی نہیں کرتے۔ اس طرح ان لوگوں کی غلطی عیاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

ایک اور گروہ نے غلطی کرتے ہوئے کہا کہ فقر کے حال سے مراد صرف محرومی و فقر ہے۔ اور وہ اس معنی میں اس طرح کھو گئے کہ آداب فقر تک ان کے ارادے نہیں پہنچے۔ اور ان سے یہ بات پوشیدہ رہی کہ فقر میں فقیر کے لیے فقر کا احساس، حقیقت فقر تک پہنچنے کے لیے درحجاب بن جاتا ہے اور فقیرِ صادق کے لیے حالِ فقر میں کوئی ایسی خصلت نہیں جو کہ محرومی و فقر سے بہت کم ہو۔ صبر، رضا اور تفویض اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس فقر سے کہیں مکمل تر ہیں جو ان خصائل سے متصل نہ ہو۔ اسی طرح فقر کا احساس اور اس سے سکون و مسرت پانا بھی حال کی کجی کا پتہ دیتا ہے اور مقام تک پہنچنے میں حجاب ثابت ہوتا ہے۔

باقی اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور اسی کے ہاتھ میں توفیق ہے۔

۱۰۷

اسبابِ دنیوی کی کثرت و قلت اور کسبِ معاش

صرف نبی اور صدیق ہی کے لیے مال و متاع کی کثرت اختیار کرنا درست ہے۔ کیونکہ وہ اشیار سے دوسروں کی خاطر تعلق رکھے ہوئے ہیں اور مال و اسباب سے ان کا ناطہ حقوق کا ہوتا ہے نہ کہ خواہشاتِ نفس کا۔ اس لیے کہ وہ وہیں خرچ کرتے ہیں جہاں اللہ انھیں خرچ کرنے کی اجازت دے اور جہاں خرچ کرنے سے روک دے وہاں خرچ کرنے سے رک جاتے ہیں لہٰذا جس کو اللہ کی اجازت حاصل ہونے کی فضیلت عطا نہ گئی ہو اور نہ ہی وہ اہلِ کمال یا اہلِ نہایات میں سے ہو تو لامحالہ کثرتِ مال و متاع اختیار کرنے سے وہ دھوکے اور تاویلات میں پڑ کر غلطی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

جس نے یہ خیال کیا کہ وہ کثرتِ مال سے سکون حاصل نہیں کرتا تو اس سے ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص اسباب دنیوی سے جو اس کے پاس ہے، سکون حاصل نہیں کرتا تو اسے نہ خرچ کرنے سے ہاتھ روکنا چاہیے اور نہ ہی طلب کرنا چاہیے اور قلیل و کثیر اس کی نظر میں یکساں ہو اور جس کے نزدیک قلیل، کثیر پر بھاری نہ ہو اور اس کے ہاں ایک دو سے بڑھ کر نہ ہو، اس کا قلب دنیا کے مالِ مفقود کی طلب اور موجودہ مال و متاع کو جمع رکھنے سے خالی نہ ہو تو بلاشبہ وہ طالبِ دنیا اور اپنی خواہشاتِ نفس کی خاطر دنیوی مال کا اکتساب کرنے والا ہے اور جو خود کو اس اصول سے مستثنیٰ سمجھتا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔

ایک طبقہ نے تنگ حالی اور کم پسندی کو اختیار کر لیا، گھٹیا لباس اور کم غذا کا خود کو عادی

بنا لیا اور یہ گمان کرنے لگے کہ جس نے بھی نفس پر نرمی کی، مباح اشیاء حاصل کیں یا بہتر کھانا کھایا تو یہ اس کے لیے خرابی اور مقام سے گرنے کا باعث ہے اس طبقے کے لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کے حال کے علاوہ ہر حال لغزش ہے جو کہ ان کی غلطی ہے کیونکہ از خود بتکلف بلندی چاہنے، سہولت و امارت اختیار کرنے یا اسی طرح تنگی و کمی سے زندگی گذارنے میں بھی بنیادی طور پر علت و خرابی موجود ہے کیونکہ ایسا کرنے میں تکلف برتا جاتا ہے جو بلاشبہ علت سے خالی نہیں۔ ہاں اس حالت میں علت سے بری ہے کہ اس سے تادیب ریاضت نفس مقصود ہو۔ جب وہ ایسا کرنے کی مصیبتوں اور لوگوں کی طرف سے اپنا لحاظ دیکھ لے تو اسے چاہیئے کہ پوری کوشش کر کے خود کو اس سے جدا کرے ورنہ ہلاکت میں پڑ جائے گا اور ابد تک بہتری کی امید نہیں کی جا سکے گی۔

عبادت گذاروں کی ایک جماعت وہ ہے جو کما کر روزی حاصل کرنے کا موقف رکھتے ہیں اور اپنے کسب معاش کی طرف مائل ہیں وہ ان لوگوں پر اعتراض کرتے ہیں جو ان کی طرح کماتے نہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ حال کی صحت کا دارو مدار غذا کی صفائی پر ہے۔ اور غذا کی صفائی ان کے نزدیک کسب یعنی خود کما کر حاصل کرنے کے بغیر ممکن نہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اس موقف میں غلطی کی کیونکہ کسب میں رخصت و جواز تو صرف اس کے لیے ہے جو حال توکل کو اختیار کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اسلیے کہ رسول للہ صلی للہ علیہ کا حال ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے توکل کرنے اور یقین کرنے پر مامور فرمایا کہ اللہ ہی انکو انکا مقررہ رزق عطا فرمائیگا۔ اسی طرح تمام انسان بھی اس پر مامور ہیں کہ وہ اللہ پر توکل رکھیں اور اللہ نے جو وعدہ فرمایا اس پر یقین رکھیں اور رزق نہ ہونے کی صورت میں سکون کا مظاہرہ کریں حتیٰ کہ اللہ تعالے ان کے مقررہ رزق ان کو پہنچا دے جس سے اس طرح کا توکل نہ ہو سکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لیے چند شرائط کے ساتھ کسب کو مباح قرار دے دیا تاکہ وہ ہلاکت سے بچے رہیں۔ شرائط کسب یہ ہیں کہ کسب کی طرف مائل نہ ہو۔ یہ نہ سمجھے کے رزق کسب سے ملتا ہے۔ اپنے کسب کو اپنے لیے غنیمت نہ سمجھے بلکہ کمانے سے اس کا ارادہ مسلمانوں کی اعانت ہو۔ کسب معاش اسے فرض نماز کے اولین وقت میں ادائیگی سے غافل نہ کرے اور علم شریعت حاصل کرے تاکہ مباد احرام کھائے۔ اگر کسب معاش ان شرائط میں سے کسی ایک سے بھی خالی ہو تو بلاشک و ریب ایسی کمائی آفت و مصیبت سے عبارت ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو کہ

اس کے کچھ ساتھیوں نے کسب نہیں کیا اور وہ محتاج ہیں تو اس کا فرض ہے کہ اپنی روزی میں سے زائد انھیں دے۔ جس نے یہ شرائط پوری نہ کیں تو مجھے اس سے اکتساب میں غلطی کرنے کا خدشہ ہے۔

کچھ لوگ وہ ہیں جو کسب کرنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں، اپنے حال پر بھروسہ کئے انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کوئی آکر ان کو غذا مہیا کرے۔ ان کے نزدیک یہ حالت ان کا "حال" ہے حالانکہ ان کا یہ عمل سراسر غلطی پر مبنی ہے کیونکہ کسب کرنے سے رخصت صرف اسی کو ہے جس کو قوتِ یقین اور قوتِ صبر حاصل ہو اور اگر کسی کا یقین کمزور ہو اور اس کی طبیعت اور طمعِ نفس اس پر غالب ہو تو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ طلب کسب کرے اور ترک طلب ایمان کی قوت کے ساتھ مکمل و افضل ترین ہے۔

۱۰۸

ارادات میں غفلت، مجاہدات میں غلطی اور آرام و آسائش اختیار کرنا

صوفیہ کے ایک گروہ نے عبادات اور نفس کو مجاہدات و ریاضات سے گذارنے میں غلطی کی اور اس طرح انھوں نے عبادات و ریاضات میں اپنی اساس کو محکم نہ کیا، موقع کے لحاظ سے کوئی عمل نہ کیا، نتیجۃً وہ شکست کھا گئے اور اوندھے منہ گر پڑے یہ اس لیے کہ انھوں نے متقدمین کے مجاہدات کا سنا اور یہ دیکھا کہ کس طرح اللہ نے ان کے ذکر کو پھیلایا، لوگوں میں ان کی کرامات مشہور ہوئیں اور انھوں نے قبول عام حاصل کیا تو ان کے نفسوں کو بھی لالچ ہوا اور انھوں نے بھی تمنا کی کہ متقدمین کی سی شہرت و قبولیت حاصل کریں تو انھوں نے بتکلف ریاضات و مجاہدات شروع کر دیئے اور جب مدت طویل گذر گئی اور وہ اپنی مُراد کو نہ پہنچے تو وہ سست پڑ گئے اور جب انھیں کسی داعی علم تصوف نے مجاہدہ و عبادات اور ریاضتِ نفس کی دعوت دی تو اس بات کو انھوں نے بے وزن جانا۔ اگر حق تعالےٰ انھیں اپنی بارگاہ کی طرف لے جاتا انھیں اپنی طاعت پر مداومت اختیار کرنے کا ارادہ فرماتا اور انھیں اپنے لطف و عنایت سے نوازتا تو ان کی رغبتوں میں اضافہ ہو جاتا، ان کی نیتیں قوی ہو جاتیں اور وہ اپنے عمل پر اپنی نیتوں کو برقرار رکھتے مگر جب انھیں یہ کچھ حاصل نہ ہوا تو ان کے ارادے کمزور ان کی ہمتیں پست ہو گئیں بلکہ انھوں نے یہ خیال کیا کہ یہ سب کچھ وقفہ تھا حالانکہ انھوں نے غلط سوچا کیونکہ وقفہ وہ ہے جس سے مجاہدہ کرنے والوں کے قلوب کبھی کبھار خوشی پاتے ہیں اور پھر اپنے حال کی طرف لوٹ آتے ہیں

البتہ جس حالت سے یہ لوگ دوچار ہوئے تو وہ سستی کاہلی اور جھوٹی آرزوؤں کے سوا کچھ نہیں۔

میں نے احمد بن علی کرخیؒ سے اور انھوں نے ابوعلی رودباریؒ کو یہ کہتے سنا کہ آغاز انجام جیسا ہے اور انجام آغاز کی مانند تو جس نے کسی چیز کو انجام پر پہنچ کر چھوڑ دیا جب کہ وہ آغاز میں اس سے کام لیتا تھا تو بلاشبہ وہ دھوکے میں پڑ گیا۔

ایک طبقہ وہ ہے جنھوں نے سفر کیا، سیاحت کی، مشائخ سے ملے ان کے ساتھ نشست و برخاست کی اور واپس آکر اپنے ساتھیوں سے فخر کے ساتھ کہا کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور وہ جن لوگوں سے ملے وہ ان سے کبھی ملے ہی نہیں اور انھوں نے خود کو ثابت قدم صوفیا شمار کیا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے واضح غلطی کی کیونکہ سفر کو سفر اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ انسانوں کے اخلاق کو روشن بناتا ہے۔ اور صوفیہ سفر اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ انھیں اپنے نفوس کی برائیاں نظر آئیں تاکہ وہ ان کو دور کرنے کی کوشش کریں اور وہ ان پوشیدہ اسرار کو بھی پالیں جو وہ گھر بیٹھ کر نہیں جانتے تھے۔ معارف اور مشائخ کی ملاقات کا حصول، ادب، حرمت، رغبت اور ارادت کا تقاضا کرتا ہے۔ اسے شیخ سے ملتے وقت سب کچھ بھلا کر صرف شیخ کی نصیحت اور وعظ ہی قبول کرنا چاہیئے۔ وہ شیخ کے حضور حاضر ہونے کے لیے ہی اپنے نفس سے مطالبہ کرے نہ کہ اپنے نفس کے لیے وہ شیخ سے ملے اور نہایت نرمی و ادب کو ملحوظ رکھے، اپنے قلب کی حفاظت کرے، نظر شیخ پر رکھے اور اس بات سے ڈرتا رہے کہ کہیں شیخ سے اس کی ملاقات اور صحبت اس کے اپنے خلاف حجت ہی نہ بن جائے۔

جس شخص نے ہمارے بتاتے ہوئے اصولوں پر عمل کئے بغیر سفر کیا اور اپنے تئیں یہ سمجھا کہ وہ مسافر ہے یا اس نے مشائخ سے ملاقات کی ہوئی ہے تو وہ بہت بڑی بھول کا شکار ہے۔

ایک گروہ وہ ہے کہ جس نے اموال و جائیداد کو خرچ کر ڈالا اور یہ سمجھتے رہے کہ خرچ کرنا اور سخاوت کی عادت ڈالنا ہی شاید مُراد و مقصود ہے حالانکہ ایسا عمل درست نہیں کیونکہ صوفیہ کی مراد خرچ کرنے اور سخاوت و فیاضی سے یہ نہیں کہ شہرت حاصل کی جائے یا اظہارِ سخاوت کیا جائے بلکہ انھوں نے تو یہ دیکھا کہ مسبب سے تعلق رکھتے ہوئے اسباب سے ناطہ جوڑنا مقام کی

خرابی کا باعث اور حقیقت تک رسائی کے درمیان حجاب کا کام دیتا ہے۔ اگر وہ مال و اسبابِ دنیا خرچ کرتے ہیں تو اس لیے کہ وہ اس علت سے نجات پالیں جو اسباب سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل ہو گئی ہے۔ لہٰذا خرچ کرنے سے نہ دولت رہے گی اور نہ اس سے تعلق باقی رہے گا۔ اور جس نے فقط سخاوت فیاضی کی خاطر دولت کو خرچ کیا اور سمجھا کہ وہ طریق صوفیہ پر گامزن ہے تو اس نے بالکل غلط سوچا۔

ایک جماعت نے یہ کیا کہ مباحات میں پڑ کر اپنے اوقات کی کوئی حفاظت نہ کی اور یہ کہنے لگے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ کیا چیز ہے ہم نے تو جو کچھ پایا کھا لیا اور سو گئے یہی ہمارا "وقت" ہے انھوں نے جو کچھ کہا وہ غلط کیونکہ وقت جب ضائع ہو جائے تو پھر پایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی وقت صوفیہ کی نظر میں کوئی ایسی کیفیت ہے جس میں آسائش و سہولت ہو بلکہ 'وقت' دائمی ذکر، مسلسل اخلاص، شکر، رضا اور صبر سے معمور ہوتا ہے۔ نفس اور خواہشات دشمن ہیں جو بندے پر فتح و غلبہ پانے کی ٹوہ میں رہتے ہیں جب بندہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہو جائے تو پھر اس کی خیریت کی توقع کی جا سکتی ہے اور نہ اس کی ہلاکت ٹل سکتی ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ ایسے حال پر فائز ہو گیا ہے کہ وہ ان دشمنوں سے محفوظ ہے تو وہ غلطی پر ہے۔

○

۱۰۹

ترکِ طعام، عزلت نشینی اور ترکِ دنیا

مریدین و مبتدی سالکین نے جب مخالفتِ نفس کے علم کو سنا تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ جب نفس ترکِ طعام کے ذریعے عاجز ہو جاتا ہے تو اس کے شر، ظلم اور موانع سے بندہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اور نتیجۃً انھوں نے کھانے پینے کی عادت کو ترک کر دیا اور ترکِ طعام کے آداب کو ملحوظ نہ رکھا اور نہ ہی اساتذہ سے ان آداب کے بارے میں رہنمائی حاصل کی اور کئی کئی دن اور راتیں کھانا پینا چھوڑے رکھا۔ اور یہ سمجھتے رہے کہ یہ 'حال' ہے۔ ان کا یہ عمل غلط ہے کیونکہ مرید کےلیے مرشد و شیخ کا ہونا ضروری ہے جو اسے ہر وہ تعلیم دے جس کی اسے ضرورت ہے تاکہ مبادا اس کے ارادے سے کوئی ایسی مصیبت اور فتنہ پیدا ہو کہ اسے تلف کرنے کی اس میں طاقت ہی نہ ہو اور وہ اس فساد سے بچ نہ سکے۔ اس طرح وہ نفس کے شر سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور نہ ہی وہ اس سے شر ہٹا سکتا ہے جو اس کی جبلت میں شامل ہو گیا۔ یہی نفس برائی کے راستے پر ڈالنے والا ہے جس نے یہ جانا کہ جب نفس کم کھانے اور بھوک سے شکستہ ہو جائے تو اس کا شر اور آفات دُور ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ بندہ اس سے محفوظ ہو جاتا ہے تو اس نے غلط خیال کیا۔

ابن سالم علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ صوفیہ جب غذا کو کم کرنا چاہتے تو ہر جمعہ کے روز بلی کے کان کے برابر کھانا کم کر لیتے۔

میں نے ابن سالم علیہ الرحمۃ سے سنا کہ سہل بن عبداللہ اپنے مریدین کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ وہ ہر جمعہ کو ایک بار گوشت کھایا کریں تاکہ وہ اس قدر کمزور نہ ہو جائیں کہ عبادت نہ کر سکیں۔

میں نے ایک جماعتِ صوفیہ کو دیکھا کہ انھوں نے اپنے نفسوں کو قلتِ طعام، خشک گھاس کھانے اور پانی ترک کرنے کا عادی بنایا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان سے فرض نماز قضا ہو جاتی کیونکہ وہ وقت کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے تھے اور متقدمین کے ان آداب سے بے خبر تھے جو انھوں نے اس طرح کا عمل اختیار کرنے میں روا رکھے ہوئے تھے۔

ایک جماعت الگ ہو کر پہاڑوں کی کھوہ میں جا بیٹھی۔ اور ان عزلت نشینوں نے یہ سمجھا کہ وہ لوگوں سے بھاگ رہے ہیں یا پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر اپنے نفسوں کے شر سے چھٹکارا پاتے ہیں یا یہ کہ اللہ تعالےٰ انھیں بھی ترکِ دین کے ذریعے ان بلند احوال و مقامات پر فائز فرماتے گا جن تک اس نے اپنے اولیاء کو پہنچایا اور اگر وہ لوگوں میں رہیں گے تو اللہ تعالےٰ انھیں ترقی نہیں دے گا۔ حالانکہ ایسا کرنے میں ان سے خطا ہوئی کیونکہ ائمہ مشائخ کرام جن کی طمع کم اور خلوت و تنہائی دائمی تھی اور انھوں نے عزلت اختیار کی تو اس کی طرف انھیں مرشد نے راغب کیا اور حال کی قوت نے ان کی رہنمائی کی جس کے نتیجے میں ان کے قلوب پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی جس نے انھیں جان پہچان، وطن اور کھانے پینے سے دور رکھا اور حق نے انھیں اس طرح اپنی جانب کھینچا کہ اپنے سوا ہر شے سے بے نیاز کر دیا۔ الغرض جس کا حال قوی اور واردات کا غلبہ اس پر نہ ہو اور اس کے باوجود وہ تکلف اٹھائے اور اپنے نفس پر ایسا بوجھ ڈالے جس کا وہ متحمل ہی نہ ہو سکے اور نفس پر ظلم کرے تو اس نے اپنے نفس کو ضرر پہنچایا نہ وہ کھوئی ہوئی متاع کو حاصل کرے گا اور جو پاس ہو گا وہ بھی کھو بیٹھے گا۔ جس نے بتکلف ایسا کیا پھر یہ سوچا کہ وہ مرتبۂ خواص کو پہنچا تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔

میں نے نوجوانوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ وہ کم کھاتے، رات بھر جاگتے اور ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے یہاں تک کہ ان میں سے کسی پر غشی طاری ہو جاتی اور اس کے بعد کئی دنوں تک اسے علاج اور سہولت کی ضرورت ہوتی تاکہ وہ اتنی طاقت پائے کہ فرض نماز تو ادا کر سکے۔

ایک جماعت نے اپنے آلاتِ شہوت کٹوا دیے اور سمجھنے لگے کہ اب جب کہ انھوں نے ایسا کر لیا تو شہوتِ نفسانی کی آفات سے جان چھوٹ جائے گی۔ ان کا یہ عمل غلط ہے کیونکہ آفاتِ شہوت تو انسان کے اندر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر آلہ کاٹ دیا جائے اور علتِ باطن میں موجود رہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ الٹا نقصان پہنچتا ہے اور یہ آفت اور بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا

جس نے ظاہری آلہ کے کاٹ دینے کو ہی شر نفسانی سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا تو وہ غلطی پر ہے۔

کچھ صوفیہ گھومتے رہے تاآنکہ زادِ راہ لیے بغیر بے آب وگیاہ صحراؤں کی طرف نکل گئے اور یہ سمجھا کہ اس طرح انھوں نے صادقین کے حقیقت توکل کو پا لیا۔ توانھوں نے بھی یہ غلطی کی کیونکہ جن صوفیہ کا یہ عمل رہا وہ ان کی ابتدائی حالت تھی، دوسرے یہ کہ انھیں آداب کی تربیت حاصل تھی اور انھوں نے اس سے قبل اپنے نفوس کو مجاہدات پر راضی کر لیا تھا وہ اپنے احوال پر ثابت قدم تھے وہ نہ تو قلت کی پرواہ کرتے تھے اور نہ تنہائی سے گھبراتے تھے۔ وہ کتنی ہی موتیں مرے اور کتنی تلخیاں انھوں نے چکھیں حتیٰ کہ ان کے احوال، ویرانے، آبادی، میدان، پہاڑ، جماعت، تنہائی، عزت، ذلت، بھوک، سیری، زندگی اور موت میں یکساں ہو گئے۔

بعض لوگوں نے اُون کا لباس پہننے کا تکلف کیا، پیوندلگی قمیضیں پہنیں، چھاگل اٹھائے رنگے ہوئے کپڑے پہنے، اشارات سیکھے اور یہ سمجھتے رہے کہ جو ایسا کرے وہ بھی صوفیہ میں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے یہ سارے کام عبث کیے کیونکہ لباس، آرائش اور مشابہت کا تکلف کرکے کسی کو سوائے حسرت، ندامت، عتاب، ملامت، شرم اور قیامت کو جہنم کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ تلبس وتشبہ کرکے وہ اہل حقائق کے احوال کو پالے گا تو یہ اس کی خطا ہے۔

ایک گروہ نے صوفیہ کے علوم کو جمع کیا، ان کے اشارات کو جان لیا، ان کے واقعات یاد کر لیے، بولنے میں صحیح الفاظ اور فصیح عبارات کا تکلف کرنے لگے، اور یہ سمجھا کہ ایسا کرکے وہ صوفیہ میں شمار ہوں گے اور ان کے احوال بلند کو حاصل کر لیں گے، تو یہ ان کی غلط سوچ کا نتیجہ ہے۔

ایک جماعت نے پہلے روزی جمع کر لی، جب ان کے نفوس ان کے پاس موجود مال و دولت سے مطمئن ہو گئے تو وہ اپنے معمولات یعنی نماز، روزہ، قیام اللیل، ورع، کھردرا لباس پہننے، رونے، اور خشیت کی طرف لوٹے اور یہ سمجھے کہ یہی وہ مطلوبہ حال ہے جس کے بعد اور کوئی حال ہی نہیں۔ ان کا یہ خیال بھی سراسر غلط ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کسی علم تصوف کے جاننے والے شیخ نے ابتدا میں پہلے کی تمام

معلومات سے خروج نہ کیا ہو۔ اور اپنے مریدین کو ابتدار سلوک میں جملہ علائق چھوڑنے، اور غیب سے رزق کو متعین سمجھنے کا حکم نہ دیا ہو۔ اگر ان میں سے کوئی کسی سببِ معلوم کی طرف لوٹا ہو یا رزق جمع کرنے کا سوچا ہو تو یہ سب کچھ اس نے اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں یا اہل و عیال کی خاطر کیا ہوگا۔

جس نے تصوف کی طرف اشارہ کیا، صوفیہ کے حال کا دعویٰ کیا، خود کو ان میں سے گردانا مگر حقیقت اس کی وہ نہ ہو جو ہم نے بیان کی تو ایسا شخص غلط راستے پر گامزن ہے۔

تصوف لہو و لعب کا نام نہیں

ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ سماع و رقص، دعوتیں برپا کرنا، سہولت و آسائش طلب کرنا، سماع قصائد اور تواجد و رقص کے موقع پر کھانے کے اجتماعات کا تکلف کرنا خوبصورت آوازوں اور دلپسند نغموں کے الحان ترتیب دینے کا علم حاصل کرنا اور باکمال صوفیہ کے احوال پر مبنی غزلیہ اشعار اختراع کرنا، ہی تصوف کہلاتا ہے۔ بلاشبہ ایسا سوچنے والوں نے غلطی کا ارتکاب کیا کیونکہ ہر قلب جو حبِ دنیا میں ملوث اور ہر نفس جو باطل کام کرنے اور غفلت کا عادی ہو اس کا سماع و وجد غلطی و علت سے خالی نہیں اور اس طرح کا وجد و سماع کرنا محض بناوٹ ہے۔

اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ اپنے حیلوں اور تکلفات کے بل بوتے پر بوقتِ سماع و وجد، متحققین صوفیہ میں سے ہو جائے گا تو یہ اس کی غلطی ہے۔

○

۱۱۰

حرّیت و عبودیت

متقدمین میں سے ایک جماعت نے حریت و عبودیت کے مفہوم پر گفت گو کرتے ہوئے کہا کہ بندے کو اپنے اور خدا کے درمیان واقع ہونے والے احوال و مقامات میں آزاد لوگوں کی طرح نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ آزاد بندوں کی تو یہ عادت ہوتی ہے کہ جو کام کرتے ہیں اس کا معاوضہ طلب کرتے ہیں اور اس کا انتظار کرتے رہتے مگر غلاموں کی عادت ایسی نہیں ہوتی، کیونکہ غلام اپنے آقا کی طرف سے جس کام پر مامور ہو اس کے لیے نہ کوئی اجرت طلب کرتا ہے اور نہ معاوضے کا انتظار، جب بھی اسے کسی شے کی طمع دامن گیر ہو جائے تو گویا اس نے غلامی کی روش ترک کر دی۔ کیونکہ غلاموں کو الگ ان کا آقا ان کے عمل بدلے کچھ عطا کر دے تو یہ ان کے آقا کی مہربانی ہوگی نہ کہ ان کا استحقاق مگر احرار یعنی آزاد بندوں کا طریق ایسا نہیں ہوتا۔

مشائخ کرام میں سے کسی شیخ نے غلام اور آزاد بندوں کے مقامات سے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے مگر اس کے باوجود ایک گمراہ فرقے نے یہ سمجھا کہ حریت، عبودیت سے کہیں بلند تر ہے، چونکہ عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ آزاد بندے دنیوی احوال میں مرتبہ و درجہ کے اعتبار سے غلاموں سے اولیٰ و اعلیٰ ہوتے ہیں لہٰذا انھوں نے اسی بات کو پیمانہ بنا کر آزاد کو غلام پر ترجیح دی اور اس میں وہ گمراہ ہوئے، اور انھوں نے یہ خیال کیا کہ جب تک بندے اور اللہ کے درمیان تعبد کا تعلق قائم ہے تو وہ غلام کہلائے گا مگر جونہی وہ وصل الٰہی حاصل کرے گا تو وہ آزاد ہو جائے گا اور عبودیت یعنی بندگی اس سے ساقط ہو جائے گی۔

یہ فرقہ کم فہمی کم علمی اور اصولِ دین کو ضائع کرنے کی وجہ سے گمراہ ہوا۔ اس سے یہ بات پوشیدہ رہی کہ عبد اس وقت تک عبد نہیں جب تک اس کا قلب ہر ماسوا سے آزاد نہ ہو یہی وہ کیفیت ہے جس پر فائز ہو کر بندہ حقیقت میں اللہ کا بندہ بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عبد سے بڑھ کر کسی اچھے نام سے اپنے بندوں کو نہیں پکارا جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا[1] — اور رحمٰن کے وہ بندے کہ زمین پر آہستہ چلتے ہیں۔

اور فرمایا:

نَبِّئْ عِبَادِيْ[2] — خبر دو میرے بندوں کو۔

عبد وہ اسم ہے جس سے اس نے اپنے ملائکہ کو موسوم فرمایا:

عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ[3] — بندے ہیں عزت والے۔

پھر اسی اسم 'عبد' سے اپنے انبیاء و رسل کو پکارا:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَا[4] — اور یاد کرو ہمارے بندوں کو۔

اور فرمایا:

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا[5] — اور یاد کرو ہمارے بندہ کو۔

اور فرمایا:

نِعْمَ الْعَبْدُ[6] — کیا اچھا بندہ۔

اور اپنے صفی و حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ[7] — اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت میں رہو۔

---

[1] الفرقان: ۶۳ [2] الحجر: ۴۹ [3] الانبیاء: ۲۶ [4] ص: ۴۵ [5] ص: ۴۱ [6] ص: ۳۰، ۴۴ [7] الحجر: ۹۹

حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں مبارک میں نماز پڑھنے سے ورم آگیا تھا صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالےٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف نہیں فرما دیئے۔ آپ نے فرمایا: کیا میں شکر کرنے والا بندہ نہ بنوں!

اختیارِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

ایک اور روایت میں ہے کہ مجھے اس بات کا اختیار دیا گیا کہ چاہوں تو فرشتے کے جامے میں نبی بن کر آؤں اور چاہوں تو عبد کے جامے میں نبی بن کر آؤں، جبریلؑ نے میری طرف اشارہ کیا کہ عاجزی اختیار کر لیجئے، اور میں نے کہا: عبد کے جامے میں نبی بن کر آنا چاہتا ہوں۔

اگر خلق اور خدا تعالےٰ کے درمیان عبودیت کے درجہ سے بلند تر کوئی درجہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس پر فائز ہوتے اور اللہ تعالےٰ بھی انھیں وہی درجہ عطا فرماتا۔

۱۱۱

اِخلاص میں اہلِ عراق کی غلطی

اہلِ عراق میں سے ایک گمراہ فرقے کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اخلاص اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک بندہ خلق کی طرف متوجہ ہونے اور ہر اچھے بُرے عمل میں ان کی موافقت کو ترک نہیں کر دیتا۔ اس فرقے نے یہ بھی سمجھا کہ اہلِ معرفت کی ایک جماعت نے حقیقتِ اخلاص پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کے اخلاص میں صفا پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ قلب میں خلق کی طرف توجہ، کائنات کا خیال اور ماسوا اللہ ہر شے کا وجود ختم نہیں ہو جاتا۔ اسی نظریے کو انھوں نے اپنے لیے صحیح سمجھا کہ وہ اس کا دعویٰ کریں، اس کی تقلید کریں اور تکلف کو اپنائیں اس سے قبل کہ وہ راہ سلوک کو طے کریں، آداب تصوف کو سیکھیں، ابتدائی درجات سے آغاز کریں تاکہ وہ بتدریج ایک حال سے دوسرے حال اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ کر نہایات کو حاصل کر لیں مگر ان کا دعویٰ اور غلط توقعات انھیں قلتِ توجہ، ترکِ ادب اور تجاوزِ حدود کی طرف لے گئیں۔ شیطان نے انھیں اپنا اسیر بنا لیا اور نفس و خواہشات نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا۔ لیکن وہ اپنی طرف سے اسی خیال میں رہے کہ اخلاص میں طریقِ مخلصین پر کاربند ہیں حالانکہ وہ نقصان و گمراہی میں پڑے رہے اور ان کو اس سے نجات کیونکر ملے کہ ان سے اپنی بدبختی کے سبب یہ حقیقت پوشیدہ رہی کہ درجۂ اخلاص پر فائز مخلص بندہ وہ ہے جو مہذب و مؤدب ہو، گناہوں کو ترک کر چکا ہو، طاعات میں خود کو پوری طرح مشغول کر چکا ہو، ارادات پر عمل پیرا ہو اور احوال و مقامات تک پہنچ گیا ہو تاکہ یہ سب کچھ اسے خالص، اخلاص کی منزل پر پہنچا دے۔

جو بندہ اپنی خواہشات کا اسیر، اپنے نفس کا رہین اور شیطان کا قیدی ہو وہ ایسے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے جن کی طرف قرآن کریم نے یوں اشارہ کیا ہے :

ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۱؎

اندھیرے ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو سجھائی دینا معلوم نہ دے۔

ایسا شخص تو مبتدیوں کی منزل سے بھی پیچھے ہٹ جاتے کہ آگے بڑھے۔ اس طرح کے لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے نفیس و بیش قیمت موتی کے بارے میں سنا کہ وہ شفاف اور مدور ہوتا ہے۔ اب اس کے ہاتھ کہیں سے شیشے کا منکا آگیا جو مدور اور شفاف ہوتا ہے۔ تو اس نے یہ جانا کہ موتی ہے بعد میں اسے کوئی حاجت پیش آگئی اور وہ اسے جوہری کے پاس لے گیا، جوہری نے پرکھ کر کہا کہ یہ شیشہ ہے موتی نہیں اور اس کی کوئی قیمت نہیں مگر اس نے جہالت اور جھوٹی لالچ کو نہ چھوڑا اور یہ نہ کیا کہ اسے پھینک دیتا۔ حالانکہ اس کو خود شیشہ و موتی کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ الغرض ایسے لوگ ہر روز اپنی گمراہی اور سرکشی کے سبب نقصان اٹھاتے ہیں۔ اللہ تعالٰے ہمیں اور آپ کو ایسی گمراہی سے اپنی پناہ میں رکھے۔

○

۱؎ النور : ۴۰

۱۱۴

نبوّت و ولایت میں غلطی کرنے والے

فضیلتِ ولایت و نبوّت

ایک فرقہ اس گمراہی میں پڑگیا کہ ولایت کو نبوت پر فضیلت حاصل ہے۔ اور انھوں نے اپنا یہ موقف قرآن مجید میں موجود قصۂ موسےٰ و خضر علیہما السلام میں اپنی رائے کو شامل کرکے حاصل کیا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ	تو ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ
آتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا	پایا جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت
وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔[1]	دی اور اسے اپنا علمِ لدنّی عطا کیا۔

پھر موسیٰ علیہ السلام کو کلام و رسالت سے مختص کرتے ہوئے فرمایا:

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ	اور ہم نے اس کے لیے تختیوں میں لکھ دی
كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا	ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل۔
لِّكُلِّ شَيْءٍ۔[2]	

خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

---

[1] : الکہف : ۶۴ [2] : الاعراب : ۱۴۲

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا[1] — آپ ہرگز میرے ساتھ نہ ٹھہر سکیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام نے جواباً فرمایا:

لَا تُؤَاخِذْنِىْ بِمَا نَسِيْتُ وَ لَا — مجھ سے میری بھول پر گرفت نہ کرو اور

تُرْهِقْنِىْ مِنْ اَمْرِىْ عُسْرًا[2] — مجھ پر میرے کام میں مشکل نہ ڈالو۔

قرآن کریم میں موسیٰ وخضر علیہما السلام کے قصے سے اس گمراہ گروہ نے یہ مفہوم اخذ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں نقص تھا اور خضر علیہ السلام کو ان پر فضیلت حاصل ہے۔ اسی مفہوم نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا کہ انھوں نے اولیاء کرام کو انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی اور انھیں اس بات کی طرف توجہ ہی نہ رہی کہ اللہ تعالےٰ کی مرضی ہے جسے چاہے اور جیسے چاہے کسی بھی چیز سے مختص فرمائے جیسا کہ آدم علیہ السلام کو سجودِ ملائکہ سے، نوح علیہ السلام کو سفینہ سے صالح علیہ السلام کو ناقہ سے، ابراہیم علیہ السلام کو آگ کی ٹھنڈک اور سلامتی سے عیسٰی علیہ السلام کو مردے زندہ کرنے سے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شق القمر اور انگلیوں سے چشمے جاری ہونے سے مختص فرمایا۔

جہاں تک غیر انبیاء کا تعلق ہے تو اللہ تعالےٰ نے بی بی مریم کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا:

وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ — اور کھجور کی جڑ پکڑ کر اپنی طرف ہلا تجھ پر

تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا[3] — تازی پکی کھجوریں گریں گی۔

حالانکہ حضرت مریم نبیہ نہ تھیں تاہم انھیں جس چیز سے مخصوص فرمایا گیا اس سے انبیاء علیہم السلام کو بھی مختص نہ کیا گیا۔ اس سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو دیگر انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دے۔ اسی طرح آصف بن برخیاؔ کے پاس کتاب کا ایسا علم تھا کہ آنکھ جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کو اٹھا لائے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آصف بن برخیاؔ، حضرت سلیمانؑ سے افضل تھے جنھیں اللہ نے نبوت، فہم اور سلطنت عطا فرمائی تھی، اس کے علاوہ آپ کو اس ہُد ہُد پرندے کے قصے کا بھی علم ہو گا جسے پانی معلوم کرنے کا ایسا علم دیا گیا تھا جو اس کے علاوہ

---

[1] : الکہف : ۶۷   [2] : الکہف : ۷۳   [3] : مریم : ۲۵

کسی اور پرندے یا جن و انس کو حاصل نہ تھا۔

حضور سید دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: تم میں سب سے بڑھ کر علمِ فرائض جاننے والا زید سب سے بہترین قرأت کرنے والا ابی بن کعب اور سب سے بڑھ کر حلال و حرام کو جاننے والا معاذ بن جبل ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جنت کی بشارت دی جنھیں عشرہ مبشرہ کے نام سے موسوم کیا گیا، مگر ان دس صحابہ میں حضرت زید، حضرت ابی بن کعب اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم شامل نہیں۔

کرامات سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے ملتی ہیں

اولیاء اللہ رحمہم اللہ کو کرامات سید الکونین محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے حُسنِ اتباع کے نتیجے میں ملتی ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ تابع کو متبوع پر اور مقتدی کو امام پر فضیلت دی جاتے۔

انبیاء علیہم السلام کو جو کچھ عطا ہوتا ہے اس میں سے شمہ بھر اولیاء کرام علیہم الرحمہ کو عطا ہوتا ہے۔

جس نے یہ کہا کہ انبیاء علیہم السلام کو فرشتے کے ذریعے وحی ہوتی ہے جب کہ اولیاء کرام کو براہ راست الہام ہوتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں پر تو قائل نے غلطی کی کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو براہِ راست الہام مسلسل ہر وقت ہوتا رہتا ہے جب کہ اولیاء کو کبھی کبھی الہام ہوتا ہے۔ اور اس کے علاوہ انبیاء کو رسالت، نبوت اور جبریلؑ کے ذریعے وحی کی فضیلت حاصل ہوتی ہے جبکہ اولیاء کو ان میں سے کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہوتی۔

اگر خضر علیہ السلام پر موسیٰ علیہ السلام کے انوار اور تخصیص کلام سے ایک ذرہ بھی ظاہر ہوتا تو وہ فنا ہو جائے مگر اللہ نے انھیں ان انوار سے اس لیے حجاب میں رکھا کہ اس سے موسیٰ علیہ السلام کی مزید برآں آراستگی اور انہیں فضیلت عطا کرنا مقصود تھی

جہاں تک ولایت و صدیقیت کا تعلق ہے تو وہ خود انوارِ نبوت سے منور ہوتی ہے۔
صدیقیت و ولایت کو ہرگز نبوت سے ملحق نہیں قرار دیا جا سکتا چہ جائیکہ اسے نبوت پر فضیلت دی جائے۔

۱۱۳

اباحت و عدمِ اباحت میں غلطی کرنے والا فرقہ اور اس کے نظریات کی تردید

ایک فرقۂ گمراہ نے اباحت اور عدمِ اباحت میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے یہ کہا کہ دراصل اشیاء مباح ہیں ان سے ممانعت اور احتراز اس وقت لازم ہے جب کوئی ان میں حد سے بڑھ جائے اگر حد سے تجاوز نہ ہو تو اشیاء اپنی اصل حالت یعنی اباحت کی طرف لوٹ جاتی ہیں اور انھوں نے اس آیت سے اپنی تاویل کو منسوب کیا:

فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّ	تو اس میں اُگایا اناج اور انگور اور چارہ
قَضْبًا وَّزَیْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّ	اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغیچے اور میوے
حَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ	اور دوب تمھارے فائدے کو اور تمھارے
وَلِاَنْعَامِكُمْ[1]	چوپاؤں کے۔

انھوں نے اس آیت کو غیر مفصل قرار دیا اور اس عمل نے انھیں ان کی جہالت کے سبب اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ ان کے نفوس کو یہ لالچ ہوا کہ وہ چیز جسے مسلمانوں کے لیے ممنوع قرار دیا گیا ان کے لیے مباح ہے بشرطیکہ وہ اس میں حد سے تجاوز نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصول سے بے خبری، خواہشات کی پیروی اور علمِ شریعت کے بارے میں قلتِ معلومات ہی ان کی غلطی اور ایک لطیف سے نکتے کو نہ سمجھنے کا باعث تھی۔

---

[1] عبس: ۲۷-۳۲۔

جب انھوں نے مشائخ متقدمین کے مکارم اخلاق، حُسنِ معاشرت اور بھائی چارے کے بارے میں سنا تو انھوں نے بھی خواہشات اور آسائش و سہولت کی خاطر وہی طریق اپنایا، یہاں تک کہ ان میں سے ایک اپنے ساتھی کے گھر جا کر اس کے کھانے میں سے کھا لیتا، اس کی کمائی سے رقم لے لیتا اور اپنے ساتھی کی عدم موجودگی میں اس کے اموال میں اسی طرح تصرف کرتا جس طرح اپنے معاملات میں روا رکھتا۔

اسی ضمن میں فتح الموصلی کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے کسی ساتھی کے گھر گئے اور اس کی کنیز سے کہا: میرے بھائی کی رقم کی تھیلی مجھے لا دو۔ کنیز تھیلی لے آئی اور انھوں نے اپنی ضرورت کے مطابق رقم اس میں سے لے لی۔ جب ان کا ساتھی گھر لوٹا تو کنیز نے انھیں سب حال کہہ سنایا تب انھوں نے کہا: اگر تو نے سچ کہا ہے تو اللہ کی خاطر تو آزاد ہے۔

حسن بصریؒ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ایک ساتھی کی عدم موجودگی میں اس کی تھیلیوں میں سے کھاتے تھے۔ کسی نے اس کے بارے میں سوال کیا تو کہنے لگے: اے لئیم! کیا ہم سے پہلے ایسے لوگ نہ تھے کہ کوئی ان میں سے کسی کے گھر جاتا اس کے طعام اور دراہم میں سے کچھ لے لیتا اور اس سے اس کا ارادہ اپنے بھائی کو خوش کرنا مقصود ہوتا اور یہ سمجھتا کہ ایسی خوشی اس کے لیے سُرخ اونٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ اہلِ معرفت کے اس گروہ کے مسلک کی بنیاد باہمی رواداری پر ہے نہ کہ باہمی عداوت۔

جیسا کہ ابراہیم بن شیبان علیہ الرحمۃ نے کہا ہم اس شخص کی صحبت اختیار نہیں کرتے جو یہ کہے کہ ہم اعلیٰ ہیں الغرض اسطرح کے واقعات بے شمار ہیں۔

اس فرقہ گمراہ نے از خود یہ سمجھ لیا کہ صوفیہ کرام اباحت کے اسی غلط مفہوم پر قائم تھے جو انھوں نے اپنے طور پر سمجھ لیا کہ شرعی حدود کو ترک کرنا اور امر و نہی پر کاربند ہونے سے تجاوز کرنا جائز ہے حالانکہ اس طرح یہ لوگ اپنی جہالت میں صحیح راستے سے بہت دور نکل گئے اور اپنے جھوٹے حیلوں اور تاویلوں کے ساتھ ہر ممنوع چیز کی طلب اور اتباعِ خواہشات سے گریز نہ کیا۔

جو یہ سمجھتا ہے کہ ہر شے فی الحقیقت مباح ہے وہ یہ کیوں نہیں کہتا کہ ہر شے اصل میں ممنوع ہے

۔۔ امر و نہی کے ذریعے ان کی اباحت، رخصت و سہولت کی خاطر ہے تاکہ بندہ اس بات میں غلطی نہ کر بیٹھے کہ حلال وہ ہے جسے اللہ تعالےٰ حلال قرار دے اور حرام وہ ہے جسے اللہ حرام قرار دے اور مومنین میں کوئی بھی اس بات کا پابند نہیں بنایا گیا کہ وہ گذری ہوئی شریعتوں یا پہلے کے لوگوں کے اعمال کی اتباع کرے بلکہ ان کے ذمہ یہ فرض ہے کہ وہ انہی احکام کی بجاآوری کریں جن کا انھیں اللہ نے حکم دیا اور ان امور سے باز رہیں جن سے اللہ نے منع فرمایا اور مشتبہ امور سے اجتناب کریں جیسا کہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح، اور ان کے مابین مشتبہ امور ہیں، اور اللہ نے جن امور کو حرام قرار دیا وہ ایک ممنوعہ چراگاہ کی مثل ہیں پس جو اس کے اردگرد چلا گیا تو خدشہ ہے کہ اس کے اندر جا پڑے۔

جن لوگوں نے یہ کہا کہ دراصل اشیاء مباح ہیں ان کا یہ قول اس قول سے کہ دراصل اشیاء ممنوع ہیں، کسی طرح اولیٰ نہیں۔ اور جب کوئی کسی زمین کی ملکیت ظاہر کرے تو اس کے لیے ملکیت اسی صورت میں جائز ہو سکتی ہے کہ وہ اپنا دعویٰ دلیل کے ساتھ ثابت کرے۔

اور اس کو نجاست و طہارت کے مسئلہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ فقہا اور صوفیہ کی جماعت کے نزدیک اشیاء دراصل پاکیزہ ہیں جب تک کہ ان کی نجاست پر دلیل نہ لائی جائے۔ نجاست و طہارت اور اباحت و خطر میں فرق یہ ہے کہ نجاست و طہارت عبادات میں شامل ہیں جبکہ اباحت و خطر کا تعلق املاک سے ہے اور جو چیز کسی کی ملکیت میں ہو تو وہ کسی اور کے لیے اس وقت تک مباح نہیں ہو سکتی جب تک وہ دلیل و حجت پیش نہ کر دے۔

۱۱۴

فرقۂ حلولیہ کی لغزشیں اور ان کے نظریات

فرقۂ حلولیہ میں سے کسی کو میں خود نہیں جانتا اور ان سے متعلق تمام تر معلومات مجھے دوسرے لوگوں کے ذریعے پہنچی ہیں۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ حلولیۃ فرقے کے لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالٰے نے کچھ اجسام منتخب فرمائے اور ان میں معانئ ربوبیت کے ساتھ حلول کیا۔ اور ان سے بشری لوازمات کو زائل فرما دیا۔

اگر واقعۃً کسی نے یہ نظریہ پیش کیا اور اپنے تئیں یہ سمجھا کہ اس نے توحید کو پا لیا تو اس نے غلط سمجھا کیونکہ جب کوئی شے کسی دوسری شے میں حلول کرتی ہے تو وہ اس کی جنس سے ہوتی ہے۔ جب کہ اللہ تعالٰے کی ذات اقدس اشیاء سے بالکل جدا ہے اور اشیاء اس سے اپنی صفات کے لحاظ سے جدا ہیں اشیاء میں اس نے جو کچھ ظاہر فرمایا اس کا تعلق اس کے آثار صنعت اور دلیلِ ربوبیت سے ہے کیونکہ مصنوع، صانع پر دلالت کرتا ہے اور مُؤلَّف اپنے مُؤلِّف پر۔

اگر یہ سچ ہے کہ حلولیہ نے یہ کہا تو بلاشبہ وہ گمراہ ہوئے کیونکہ انھوں نے قادر کی صفتِ قدرت اور قدرت قادر و صنعتِ صانع پر دلالت کرنے والے شواہد کے درمیان کوئی تمیز ہی نہیں کی اور اس میں انھوں نے ٹھوکر کھائی۔

مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ فرقہ حلولیہ میں سے کسی نے کہا: اللہ تعالٰے انوار کے ذریعے حلول کرتا ہے۔ کسی نے کہا کہ مستحسن شواہد کی طرف ایک انجانی نظر کے ذریعے حلول کرتا ہے۔ کسی نے کہا:

مستحسنات وغیر مستحسنات میں حلول کیے ہوئے ہے اور ان میں سے کسی نے کہا: ایک وقت چھوڑ کر دوسرے وقت میں حلول کرتا ہے۔ الغرض ہر وہ شخص جس نے اس قسم کے نظریات واقعتاً پیش کیے ہیں تو وہ گمراہ اور اجماع امت کے تحت کافر ہے کیونکہ جو کچھ اس نے کہا اس سے کفر لازم آتا ہے۔

وہ اجسام جو اللہ نے منتخب فرمائے وہ اس کے اولیاء و اصفیاء کرام کے اجسام ہیں جنھیں اس نے اپنی طاعت وخدمت کے لیے چن لیا انھیں اپنی ہدایت سے آراستہ فرمایا اور خلق پر ان کو فضیلت دی، اور اللہ تعالیٰ اسی صفت سے موصوف ہے جیسا کہ اس نے خود اپنی صفت بیان فرمائی ہے کوئی شے اس کی طرح نہیں وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

حلولیوں نے یہ غلطی بھی کی کہ اوصافِ حق اور اوصافِ خلق میں امتیاز باقی نہیں رکھا۔ اللہ تعالیٰ قلوب میں حلول نہیں فرماتا بلکہ قلوب میں ایمان باللہ، تصدیق، توحید اور معرفتِ الٰہی حلول کرتی ہے اور یہ تمام چیزیں اللہ کی مصنوعات کی صفات ہیں جو ان میں اللہ کی صنعت کے طور پر موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود اپنی ذات یا صفات کے ساتھ قلوب میں حلول نہیں فرماتا۔

تعالی اللہ عزوجل عن ذالک علوا کبیرا۔

۱۱۵

فنائے بشریت کو غلط معانی پہنانے والے

جن لوگوں نے فنائے بشریت میں ٹھوکر کھائی اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے محققین کی فنا سے متعلق گفتگو سنی اور اسے فنائے بشریت سمجھ بیٹھے اور وسوسہ میں پڑ گئے۔ ان میں سے کچھ نے تو کھانا پینا بھی چھوڑ دیا کیونکہ ان کے نزدیک بشریت ایک قالب اور ڈھال ہے کمزور ہوا تو بشریت جاتی رہی لہٰذا یہ جائز قرار دیا کہ وہ موصوف بصفاتِ الٰہیہ ہیں۔ اس فرقہ گمراہ سے یہ نہ ہو سکا کہ بشریت اور اخلاقِ بشریت میں فرق کرتے۔ بشریت، بشر سے زائل نہیں ہوتی جیسا کہ سیاہ رنگت سیاہ آدمی سے اور گوری رنگت گورے آدمی سے زائل نہیں ہوتی جب کہ اخلاقِ بشریت، انوارِ حقائق کے غلبہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ صفاتِ بشریت، بشریت کا عین نہیں جس نے فنا کی بات کی تو اس سے وجودِ اعمال و طاعات کی فنا کے ذریعے قیام حق کے لیے وجودِ عبد کی بقا مراد ہے۔ اور اسی طرح اس سے مراد علم سے جہالت کی فنا اور ذکر سے غفلت کی فنا ہے۔

وہ چیز جو فنائے بشریت کی اصلیت ہے تو فنائے بشریت اس چیز کی اصلیت ہے اور بشریت کا بشریت کے ساتھ فنا ہونا صفتِ بشریت ہے۔ جس نے یہ سمجھا کہ نفس کا زائل ہونا اور بندے سے کبھی کبھی تلوین کی صفت کا جدا ہونا فنائے بشریت ہے تو اس نے سراسر غلط جانا اور بشریت کی تعریف سے بے خبر رہا۔ کیونکہ تغیر اور تلوین صفت بشریت ہے جب بشریت سے تغیر اور تلوین زائل ہو گئی تو وہ اپنی صفت سے متغیر ہو گئی اور اپنے معنیٰ سے بدل گئی کیونکہ بشریت خود تو نہ متلون ہوتی تھی اور نہ متغیر جب کہ وہ اپنی صفت سے اس وقت متغیر و متلون کر دی گئی۔

۱۱۶

رویت بالقلوب کو غلط سمجھنے والے

ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ اہلِ شام کی ایک جماعت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس دنیا میں انھیں رویت بالقلوب اسی طرح سے حاصل ہے جیسے آخرت میں عیاں طور پر رویت باری تعالیٰ ہو گی۔ میں نے خود ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی مجھے کسی نے یہ بتایا کہ اس نے ان میں سے کسی شخص کو رویت بالقلوب پر فائز پایا۔ ہاں ابو سعید خرازؒ کا ایک خط میری نظر سے گذرا ہے جس میں انھوں نے اہلِ شام کو مخاطب کر کے لکھا ہے: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے علاقے میں ایک جماعت ہے جو فلاں فلاں دعویٰ کرتی ہے اور انھوں نے آگے چل کر یہ بھی لکھا کہ ان کے زمانے میں بھی ایک قوم ایسی تھی جو اس مسئلہ میں الجھی اور گمراہ ہوئی۔

اہلِ حق و صداقت نے جب رویت بالقلوب کا ذکر کیا تو اس سے ان کا اشارہ تصدیق مشاہدہ بالایمان اور حقیقتِ یقین کی طرف تھا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رویت ہے کہ آپ نے فرمایا: "گویا کہ میں اپنے رب کے عرش کو ظاہر دیکھتا ہوں۔" جیسا کہ اس حدیث میں آگے چل کر بیان کیا گیا ہے: "بندہ جس کے قلب کو اللہ نے منور فرمایا.. او کما قال۔

جیسا کہ مجھ تک خبر پہنچی ہے کہ وہ بصرہ کے ابو عبداللہ الصبیحیؒ کے مریدین کی ایک جماعت تھی جو رویت بالقلوب کے بارے میں وسوسہ اور گمراہی کا شکار ہوئی۔ میں نے ان لوگوں کی جماعت کو دیکھا کہ انھوں نے بخوشی اپنے نفس کو مجاہدہ، شب بیداری، ترکِ طعام، خلوت نشینی خلق سے علیحدگی اور کثرتِ توکّل کی مشقت میں ڈال رکھا تھا کہ شیطان نے انھیں اپنے دام میں پھنسا لیا اور خود کو ان کے سامنے ایسے دکھایا کہ ایک تخت پر بیٹھا ہے اور اس سے انوار کی

شعائیں پھوٹ رہی ہیں۔ ان میں کچھ نے یہ واقعہ بعض شیوخ کے سامنے بیان کیا جو شیطان کی فریب کاریوں کو جانتے تھے شیوخ نے انھیں شیطان کی فریب کاری کے بارے میں بتایا اور انھیں ہدایت کر کے استقامت کی طرف لوٹا دیا۔

کہتے ہیں کہ سہل بن عبد اللہؒ کے ایک شاگرد نے ایک روز ان سے کہا: یا استاد! میں ہر رات اللہ تعالیٰ کو اپنی ان ظاہری آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ سہل بن عبد اللہؒ جان گئے کہ یہ دشمن (شیطان) کا دھوکہ ہے۔ انھوں نے کہا: عزیزم! جب تو اسے آج کی رات دیکھے تو اس پر تھوک دینا۔ جب رات کو شاگرد نے اس پر تھوکا تو اس کا تخت ہوا ہو گیا اور انوار تاریک ہو گئے۔ اس طرح اُس نے شیطان کے فریب سے چھٹکارا پایا اور اس کے بعد پھر کچھ بھی نہ دیکھا۔

جو ایسے معاملات میں اپنے اساتذہ و مشائخ سے رہنمائی حاصل نہیں کرتا وہ اسی طرح دھوکے میں رہتا ہے، ہوس کی باتیں کرتا رہتا ہے اور آخری عمر میں اپنے جھوٹے نظریات کے نتیجہ میں دین سے بھی خارج ہو جاتا ہے۔

مجھ تک یہ خبر پہنچی کہ عبد الواحد بن زیدؒ سے اس کی جماعت بھاگ گئی کیونکہ وہ انھیں مجاہدہ عبادت، رزق حلال کھانے اور دنیا میں زہد اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد عبد الواحد بن زیدؒ نے ان میں سے ایک کو دیکھا تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا حال دریافت کیا۔ شاگرد نے جواب دیا: یا استاذ! ہم ہر رات جنت میں داخل ہوتے ہیں، اور اس کے پھل کھاتے ہیں۔ استاذ نے کہا: آج کی رات مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ الغرض وہ ان کو اپنے ہمراہ صحرا میں لے گئے۔ جب رات ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جماعت سبز لباس پہنے ہوئے ہے اور باغات اور میوے ہیں۔ عبد الواحدؒ نے ان سبز پوش لوگوں کے پاؤں پر نظر کی تو وہ چوپایوں کے کھروں کی مانند تھے۔ وہ جان گئے کہ یہ شیاطین ہیں۔ جب انھوں نے منتشر ہونے کا ارادہ کیا تو عبد الواحدؒ نے ان سے کہا: کہاں جاتے ہو؟ کیا ادریس علیہ السلام جب جنت میں داخل ہوئے تو اس سے نکلے نہ تھے۔ جب صبح ہوئی تو انھوں نے خود کو چوپایوں کی پیشاب گاہوں پر گوبر اور گدھوں کی لید میں پایا۔ تب انھوں نے توبہ کی اور پھر سے عبد الواحد بن زیدؒ کی صحبت اختیار کر لی۔

بندے کو اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ جو انوار بھی یہ ظاہری آنکھیں اس دنیا میں دیکھیں وہ مخلوق ہیں۔ اس میں اور اللہ میں کوئی مشابہت موجود نہیں اور نہ ان کا تعلق اس کی صفات سے ہے، یہ سب خلق و مخلوق کے سوا کچھ نہیں۔

مشاہدۂ ایمان، حقیقت الیقین اور تصدیق کے ساتھ رویت بالقلب حق ہے جیسا کہ فرمانِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اس طرح اللہ کی عبادت کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

کسی تابعی رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر پردہ اٹھا دیا جاتا تو میرا یقین نہ بڑھتا۔ اس قول میں انھوں نے اپنے یقین کی حقیقت اور صفاءِ وقت کی جانب اشارہ کیا اور اپنے غلبۂ وجد کی خبر دی اور خبر کی حیثیت مشاہدے کی نہیں ہوتی۔

ارشادِ خداوندی ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى [1] — دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا۔

یعنے جو اس نے اپنے دل سے دیکھا اسے آنکھ نے نہیں جھٹلایا اور جو اُس نے آنکھ سے دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا اور یہ خصوصیت فقط نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کسی اور کی نہیں۔

---

[1] : النجم : ۱۱

۱۱۷

صفا وطہارت میں غلطی کرنے والے

ایک طائفہ صوفیہ نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ہمیشہ مکمل طور پاک وصاف رہتے ہیں اور ان کی پاکیزگی کبھی ان سے زائل نہیں ہوتی اور انھوں نے یہ سمجھا کہ بندہ تمام کدورتوں اور برائیوں سے اس طرح پاک ہوجاتا ہے کہ گو وہ ان سے جدا ہوجاتا ہے حالانکہ انھوں نے غلطی کی کیونکہ بندہ ہر وقت جملہ علتوں سے پاک نہیں رہ سکتا اور اگر ایک وقت اس کو طہارت حاصل ہوجائے تو بھی علتوں سے بری نہیں۔ اور صفا ایک وقت سے دوسرے وقت میں بندے کے مقامات کے مطابق حاصل ہوتی ہے تو وہ صفار کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس پر دوسری اشیار کا ذکر جاری ہوجاتا ہے۔

طہارت کا مطلب بندے کے قلب کو سرکشی، حسد، شرک اور تہمتوں سے پاک رکھنا ہے، علت سے خالی صفار اور بغیر تلوین و تغیر کے ہمیشہ کے لیے تمام بشری اوصاف سے پاک ہونا خلق کی صفت نہیں کیونکہ اللہ ہی کی ذات ایسی ہے جو ہر علت سے مبرّا اور اپنے سوا ہر شے سے پاک ہے۔ خلق کو ابتلار و آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو کیسے وہ علتوں اور اغیار سے مبرّا ہوسکتے ہیں جب بندہ کے لیے یہ حکم ہے تو اسے چاہیئے کہ اللہ کے حضور توبہ کرے اور ہر وقت اپنے گناہوں کی بخشش مانگے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

وَتُوبُوٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ [1]	اور اللہ کی طرف توبہ کرو اے مسلمانو! سب کے سب اس امید پر کہ تم فلاح پاؤ۔

اور جیسا کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میرے قلب پر ایک بادل سا چھا جاتا ہے تو میں ہر روز سوبار اللہ سے بخشش طلب کرتا ہوں۔"

---

[1]: النور: ۳۱

۱۱۸

انوار کا غلط مفہوم

ایک جماعت نے انوار کو سمجھنے میں غلطی کی اور یہ خیال کیا کہ وہ انوار کو دیکھتی ہے اور ان میں کچھ نے اپنے قلب کے بارے میں کہا کہ اس میں انوار ہیں یہ لوگ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ یہ وہی انوار ہیں جن سے اللہ نے خود کو متصف فرمایا ہے:

نورِ الٰہی

یہ جماعت یہ سمجھتی ہے کہ شاید نورِ الٰہی بھی چاند، سورج کے نور سے مشابہ ہے وہ یہ بھی سمجھتی ہے کہ نورِ الٰہی سے مراد انوار معرفت و توحید اور نور عظمت ہے اور یہ کہ وہ غیر مخلوق ہے۔

اس جماعت نے نورِ الٰہی کے مسئلے میں سخت غلطی کی کیونکہ سارے انوار مخلوق ہوتے ہیں جیسا کہ نورِ عرش، نورِ کرسی، نورِ شمس، نورِ قمر اور نورِ کواکب۔ اللہ کے لیے کوئی موصوف و محدود نور نہیں وہ نور جس سے اللہ نے خود کو موصوف کیا وہ نہ تو ادراک میں آسکتا ہے اور نہ ہی محدود خلق کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہر وہ نور جسے علوم اور فہم و ادراک احاطہ کر سکیں وہ مخلوق ہے۔ اللہ کے تمام انوار ہدایاتِ خلق ہیں جب کہ مصنوعات کے انوار عبرت و دلائل تاکہ ان کے ذریعے وہ معرفتِ توحید پر دلائل لا سکیں اور انکے ذریعے بحر و بر کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

انوارِ قلوب

انوارِ قلوب کا مفہوم اللہ کے فرقان و بیان کی معرفت حاصل کرنا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا[1]	اے ایمان والو! اگر اللہ سے ڈرو گے تو تمھیں وہ دے گا جس سے حق کو باطل سے جدا کر لو۔

آیت کی تفسیر میں کہا گیا کہ فرقان سے مراد وہ نور ہے جو دل میں اتارا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعے بندہ حق و باطل میں فرق کر سکے۔

انوار کے بارے میں یہی کچھ معلومات اس وقت موجود تھیں جو پیش کر دی گئیں۔

○

---

[1] : الانفال : ۲۳

۱۱۹

عین الجمع میں غلطی کرنے والوں کا بیان

ایک گروہ نے عین الجمع میں غلطی کی، جو کچھ اللہ نے خلق سے منسوب کیا اسے خلق سے جدا سمجھا اور اپنے ہر کام کو اپنے نفوس سے متعلق نہ جانا اور اپنے طور پر یہ سمجھتے رہے کہ وہ احتیاطاً ایسا کرتے ہیں تاکہ اللہ کے ساتھ اس کے سوا کوئی اور شئے شریک نہ رہے، یہ بات انھیں علت سے خروج اور شرعی حدود کو ترک کرنے کی طرف لے گئی کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے افعال میں مجبور ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلا حدودِ شریعت سے تجاوز اور اتباع کی مخالفت کرتے وقت ان میں اپنے نفس کو ملامت کرنے کی صفت بھی باقی نہ رہی۔ ان میں سے کچھ کو تو اس عقیدہ و نظریہ نے تجاوز کرنے اور بیکار و معطل بیٹھے رہنے کی جسارت دے دی اور نفس نے انھیں یہ جھانسا دیا کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس میں مجبور و معذور ہیں۔

ان لوگوں نے جو لغزش کی وہ محض فروع و اصول سے کم علمی کی بنیاد پر کی اور اصل و فرع میں فرق نہ کیا اور نہ ہی جمع و تفرقہ کا علم حاصل کیا اس کا انجام یہ ہوا کہ جو چیز فرع سے منسوب تھی اسے اصل سے منسوب کر دیا اور جو چیز تفرقہ سے منسوب تھی اسے جمع سے متعلق قرار دیا۔ الغرض انھوں نے ہر شئے کو بے محل کر دیا جو ان کی ہلاکت کا باعث بنا۔

صدیق اور زندیق

سہل بن عبداللہؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو یہ کہتا ہے:

میری مثال دروازے کی سی ہے کوئی حرکت دے تو ہلتا ہوں۔ سہل بن عبداللہؒ نے جواب دیا، ایسی بات دو آدمیوں میں سے ایک کر سکتا ہے۔ یا وہ شخص جو صدیق ہو یا وہ شخص جو زندیق ہو۔

سہل بن عبداللہؒ نے صدیق اس لیے کہا کہ وہ ہر شے کو اللہ کے ساتھ قائم اور اللہ کی طرف سے سمجھتا ہے، ہر معاملے میں اللہ کی جانب رجوع کرتا ہے اس کے باوجود کہ وہ اصول، فروع، حقوق، حظوظ، معرفتِ حق و باطل، متابعت امر و نہی، حسن طاعات، قیام آداب اور راہ تصوف کو استقامت سے طے کرنے کے بارے میں اپنی ضرورت کے مطابق علم رکھتا ہے۔ اور ان کے قول میں زندیق کا معنی یہ ہے کہ زندیق ایسا قول اس لیے کہتا ہے تاکہ کوئی چیز اسے ارتکاب گناہ سے نہ روکے۔ زندیق کو اس کی جہالت تجاور اور اس جرأت کی طرف لے جاتی ہے کہ وہ اپنے تمام افعال و حرکات کو اللہ سے منسوب کرتا ہے تاکہ اس طرح شیطان کے گمراہ کرنے سے ارتکاب گناہ اور تاویلِ باطل پر وہ نفس کی ملامت سے بچا رہے۔ اللہ ہمیں اور آپ کو اس سے پناہ میں رکھے۔

○

۱۲۰ انس، بسط اور ترکِ خشیّت کا غلط مفہوم سمجھنے والوں کا بیان

ایک طبقے نے قرب و انس کو بیان کرتے ہوئے یہ خیال کیا کہ چونکہ ان کے اور اللہ کے درمیان انتہائی قرب کی کیفیت موجود ہے تو انھیں ان آداب و حدود کی طرف رجوع کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہوتی ہے جن کا وہ پہلے لحاظ رکھتے اور پابندی کرتے تھے لہٰذا انھوں نے ان تمام اعمال کو چھوڑ دیا جن کے انجام دینے سے انھیں شرم دامنگیر ہوتی تھی اور ان افعال سے مانوس ہوگئے جو پہلے ان کو ناگوار گذرتے تھے، مختصر یہ کہ انھوں نے اسے اپنا قرب تصور کیا اور اس طرح وہ غلطی کا شکار ہوگئے اور ہلاکت میں پڑ گئے کیونکہ آداب، مقامات اور احوال، اللہ کی جانب سے بندوں کو انعام اور عزت کے طور پر عطا کیے جاتے ہیں اگر وہ اپنے ارادوں میں صادق و مخلص ہوں تو ان کے انعام و اکرام میں مزید اضافہ کیا جاتا ہے۔ مگر جب اللہ نے انھیں اپنی توفیق اور عنایت سے محروم کر دیا تو انھوں نے حدود سے تجاوز کیا، جن امور کے انجام دینے کا انھیں حکم دیا گیا اس کی انجام دہی سے الٹے پاؤں پھر گئے تو طاعات کے نتیجے میں جو انعامات و اکرامات ان کو عطا کئے گئے وہ سلب کر لیے گئے انھیں اللہ نے اپنے دَر سے دھتکار دیا، اور وہ گمراہوں کے راستوں پر چلنے لگے مگر وہ خود کو پھر بھی مقبول بندوں میں سے شمار کرتے ہیں جس قدر وہ خود کو اللہ سے قریب سمجھتے ہیں اس سے بڑھ کر وہ اس سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

ذوالنون علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: عارف کے لیے ضروری ہے کہ اس کا نورِ معرفت، نورِ ورع کو بجھا نہ دے علم تصوف میں سے کسی ایسی چیز پر باطنی لحاظ سے عقیدہ نہ رکھے جو ظاہری شریعت سے متصادم ہو اور کثرتِ کرامت اسے اللہ کے محارم کے پردے اٹھانے پر آمادہ نہ کرے جیسا کہ ایک عارف یہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے اپنے ذریعے اپنے سے غافل نہ فرما اور یاد چونکہ تیرے حضور بغیر طلب کئے مجھے حضور حاصل ہے پھر بھی مجھے اپنی طلب عطا فرما۔

۱۲۱

اوصافِ بشری کی فنا کا غلط معنی مُراد لینے والوں کا بیان

بغدادیوں کی ایک جماعت نے یہ کہہ کر غلطی کی کہ وہ اپنے اوصاف سے فنا ہو کر اوصافِ حق میں داخل ہو جاتے ہیں، حالانکہ اپنی جہالت کے باعث وہ یہ کہہ کر حلول یا اس عقیدے کے حامل ہو جاتے ہیں جو نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں رکھتے تھے۔ وہ اپنی طرف سے یہ سمجھے ہیں کہ بعض متقدمین صوفیہ نے اوصافِ بشری سے فنا کو اوصافِ حق میں داخل ہونے کا نظریہ پیش کیا۔ جب کہ حقیقت اس ضمن میں یہ ہے کہ بندے کو جو ارادہ حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کا عطیہ ہے اور یہ کہنا کہ اوصافِ بشری کو فنا کر کے بندہ اوصافِ حق میں داخل ہو جاتا ہے دراصل بندے کا اپنے ارادہ سے خروج اور اللہ کے ارادے میں داخل ہونے کے مترادف ہے اور جو یہ جان لیتا ہے کہ ارادہ اللہ کی جانب سے عطیہ ہے اور وہ مشیتِ الٰہی کے مطابق چاہتا اور اسی کے فضل کے ساتھ وہ اس مقام کو پہنچتا ہے کہ خود اپنے احساسِ نفس سے منقطع ہو کر کلیتہً اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے: تو یہ اہلِ توحید کا مقام ہے۔

جنھوں نے اس ضمن میں ٹھوکر کھائی اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک معمولی سی بات کو نہ سمجھ سکے اور یہ اوصافِ حق ہی کو حق سمجھ بیٹھے اور یہ سب کفر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قلوب میں حلول نہیں کرتا بلکہ قلوب میں ایمان باللہ توحید اور تعظیم ذکر، تحقیق و تصدیق کے نوازمات کے ساتھ حلول کیے ہوتے ہوتا ہے: اور اس سلسلے میں خاص و عام کی کوئی تفریق نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ خواص کو ایک حقیقت تک رسائی حاصل ہوتی ہے جو صرف ان ہی کا حصہ ہے کیونکہ وہ خواہشاتِ نفس کی دعوت کو ٹھکرا چکے ہوتے ہیں، گھر کی لذتیں ختم کر چکے ہوتے ہیں، ایمان باللہ میں پوری طرح مخلص و صادق ہوتے ہیں اور عوام اِن حقائق سے دور رہتے ہیں کیونکہ وہ نفس اور خواہشات کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ ہے عام اور خاص میں وہ فرق جو اس ضمن میں ہم نے بیان کر دیا۔

—— وباللہ التوفیق۔

۱۲۲

گمشدگیٔ حواس اور اس کا غلط مفہوم

اہلِ عراق میں سے ایک جماعت کا یہ نظریہ تھا کہ وجد کے عالم میں حواس کھو بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ انھیں کسی شے کا احساس تک نہیں رہتا اور وہ محسوسات کے اوصاف سے بھی خارج ہو جاتے ہیں۔

اس جماعت نے غلط سمجھا کیونکہ حس کا گم ہو جانا حس ہی کے ذریعے معلوم ہوتا ہے چونکہ حس صفتِ بشریت ہے اگر اس پر وہ واردات غالب آجائیں جو قلوب پر وارد ہوتی ہیں، تو حس ماند پڑ جاتی ہے جیسا کہ ستاروں پر سورج کی روشنی غالب ہونے کے سبب وہ ماند پڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح زندہ انسان کی حس بھی زائل ہوتی ہے اور نہ گم بلکہ بعض اوقات بندہ اپنی حس کے ذریعے اذکارِ قوی کے وقت شدید وجد کے باعث اپنی حس سے غائب ہو جاتا ہے جیسا کہ میں نے جعفر خلدیؒ سے اس ضمن میں پوچھا تو انھوں نے یہ بات سنائی کہ جنیدؒ نے کہا: میں نے سری سقطیؒ سے اذکارِ قوی کے وقت بندے پر شدید وجد کے غلبے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: ہاں! ایسا ہوتا ہے اور ایسی حالت میں اگر بندے کے منہ پر تلوار کا وار کیا جائے تو بھی اسے محسوس نہ ہوگا۔

یہاں محسوس نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ درد محسوس نہ کرے گا یعنی حس ہی کے ذریعے درد کو محسوس نہیں کرے گا اور حس ہی کے ذریعے درد محسوس کرے گا۔

جب تک انسان میں روح باقی رہتی ہے اور وہ زندہ ہو تو اس کی حس ختم نہیں ہوتی کیونکہ حس زندگی اور روح کے ساتھ لازم ہے۔

۱۲۳

روح سے متعلق غلط نظریات

ایک جماعت وہ ہے جس نے ارواح کے بارے میں غلطیاں کیں۔ ان کے کئی طبقے ہیں اور ان تمام نے غلطی کی اور گمراہ ہوئے۔ کیونکہ انھوں نے ایک ایسی چیز کی کیفیت میں غور و فکر کیا جس سے اللہ نے کیفیت ہی کو علیحدہ رکھا اور اسے احاطۂ علم سے دور کیا۔ اس نے کسی کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ روح کے بارے میں اللہ کی بیان کردہ تعریف کے علاوہ کچھ کہے۔

ایک جماعت نے کہا، روح، اللہ کے نور میں سے ایک نور ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کا نورِ ذاتی سمجھا جس نے انھیں ہلاکت سے دوچار کیا۔

ایک اور جماعت نے یہ کہا کہ روح، اللہ کی حیات سے ایک حیات ہے۔

بعض نے یہ کہا کہ ارواح مخلوق ہیں اور روح القدس اللہ کی ذات سے ہے۔

ایک گروہ نے یہ کہا کہ عوام کی ارواح مخلوق اور خواص کی ارواح غیر مخلوق ہیں۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ ارواح قدیم ہیں نہ مرتی ہیں نہ عذاب میں مبتلا کی جاسکتی ہیں اور نہ پرانی ہوتی ہیں۔

بعض کا یہ خیال ہے کہ ارواح ایک جسم سے دوسرے جسم میں حلول کرتی ہیں۔

ایک طائفہ یہ خیال رکھتا ہے کہ کافر کی ایک، مومن کی تین اور انبیاء و صدیقین کی پانچ ارواح ہوتی ہیں۔

کسی نے کہا کہ روح، نور سے پیدا کی گئی ہے۔

بعض نے یہ کہا کہ روح، روحانیت ہے جسے ملکوت سے پیدا کیا گیا جب صاف

ہوتی ہے تو عالم ملکوت کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ روحیں دو طرح کی ہیں لاہوتی اور ناسوتی۔

الغرض مذکورہ بالا تمام لوگوں نے جو کچھ بھی روح کے بارے میں کہا غلط کہا کھلی گمراہی میں پڑے اور اس سے بے خبر رہے کہ اس سلسلے میں وہ غلطی کا شکار ہوں گے اس کی وجہ ان چیزوں میں تعمق و تفکر ہے جس سے اللہ نے انھیں منع فرمایا جیسا کہ قول باری تعالے ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ[1]

اور تم سے روح کو پوچھتے ہیں تم فرماؤ! روح میرے رب کے حکم سے ایک چیز ہے۔

روح کے بارے میں اہل حق کا نظریہ

جہاں تک روح کے بارے میں اہل حق کے نظریہ کا تعلق ہے تو ان کے مطابق تمام ارواح مخلوق ہیں۔ وہ اللہ کے امور میں سے ایک امر ہے۔ ان کے اور اللہ کے درمیان کوئی ناطہ اور تعلق نہیں سوائے اس کے کہ وہ اس کی مملکت میں سے ہیں، اس کے تابع فرمان ہیں، مسلسل اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

ارواح ایک جسم سے نکل کر دوسرے میں داخل نہیں ہوتیں۔ وہ اسی طرح ذائقۂ موت چکھتی ہیں جس طرح بدن، بدن کے ساتھ ہی آرام و آسائش پاتے ہیں اور بدن ہی کے ساتھ عذاب محسوس کرتی ہیں۔ ارواح انھیں جسموں میں جمع ہوں گی جن سے نکلی ہوں گی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی روح کو اللہ نے ملکوت سے اور اس کے جسم کو خاک سے پیدا فرمایا۔

سطور گذشتہ میں ہم نے جن جن لوگوں کے روح کے بارے میں باطل نظریات پیش کئے ان کو ثابت کرنے سے متعلق ہر ایک کے پاس اپنے دلائل ہیں۔ اور اسی طرح اہل حق کے بھی ان کی تغلیط اور رد میں واضح بیانات موجود ہیں مگر ہم نے طوالت کے خوف سے اختصار پر اکتفا کیا۔ بہر حال جو کچھ بیان کیا گیا وہ اس علم کے طالبین کے لیے کافی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالے۔

○

---

[1]: بنی اسرائیل ۸۵

کتاب اللمع فی التصوف، اللہ جل جلالہٗ کی حمد اور اس کی اعانت و توفیق سے اختتام کو پہنچی، بے شک اللہ ہی ہمیں کافی اور وہی بہترین چارہ ساز ہے۔

بے حد و شمار، دائمی و مسلسل درود و سلام ہوں ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل اطہار پر جب تک کہ ستاروں میں چمک رہے، تاریکیاں سیاہ ہوتی رہیں، صبحیں طلوع ہوتی رہیں، وقت چلتا رہے، فکر کے چراغ جلتے رہیں، ذاکر ذکر کے روح پرور ترانے الاپتے رہیں، چلنے والوں کا سفر جاری رہے، گھٹائیں برستی رہیں، غروب ہونے والے غروب ہوتے رہیں، خطیب شعلہ نوائی کرتے رہیں، سائے پھیلتے رہیں، بہار کی پھواریں پڑتی رہیں، علم کی باتیں ذہن کے دریچوں میں اترتی رہیں، مخلوقات جامِ ہستی سے سرشار رہیں، حُسنِ اسلام باقی رہے، شبِ دیجور سمٹتی رہے، اندھیرے، اُجالے کا اختلاف باقی رہے، پَو پھٹتی رہے، ہوائیں چلتی رہیں، ملائک مشغولِ تسبیح رہیں، افلاک گردش میں رہیں، زوال کے سایے ڈھلتے رہیں، ذی رُوح زندگی کی نعمت سے شاد کام رہیں، عدد کا شمار ہوتا رہے، ابد کا دوام رہے، زباں گویا رہے، مشاہدے، سچائیاں اگلتے رہیں، شبنم کے موتی لٹتے رہیں، زمانہ پھیلتا رہے، موجوں میں اضطراب رہے، چراغوں میں روشنی رہے، انوار جھلملاتے رہیں، اوّلِ شب کی تاریکیاں گہری ہوتی رہیں۔

میں (کاتبِ کتاب) اس کتاب کی تکمیل سے ۱۰ ربیع الآخر ۶۸۳ھ کو فارغ ہوا۔

ناشر: ________ اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور

طابع: ________ آر۔ زیڈ پیکجز، لاہور

سال اشاعت: ________ ۱۹۸۴ء / ۱۴۰۵ھ

تعداد: ________ ایک ہزار

تقسیم کار: ________ المعارف، گنج بخش روڈ، لاہور

بسعی و اہتمام: نجیب احمد قریشی

(نوٹ: موجودہ اشاعت، اشاعت اولین کا ری پرنٹ ہے۔ حوالہ کیلئے اشاعت اولین کی پرنٹ لائن بھی محفوظ کر دی ہے)